الکوثر في تفسیر القرآن

جلد ہفتم

محسن علی نجفی

مِصْبَاحُ الْقُرآن ٹرسٹ۔ لاہور

الكوثر

في تفسير القرآن

خالی

الکوثر فی تفسیر القرآن

جلد ہفتم

محسن علی نجفی

مِصْبَاحُ الْقُرآن ٹرسٹ۔ لاہور

تفسیر

احزاب۔ سبأ۔ فاطر۔ یٰسٓ۔ صافات۔ صٓ۔ زمر۔ مؤمن۔

نام کتاب: الکوثر فی تفسیر القرآن (جلد ہفتم)
مفسر: محسن علی نجفی
کمپوزنگ و فارمٹنگ: خادم حسین
انتظامی امور: علی حیدری
تعداد: ایک ہزار
باراول: ؟؟؟ ھ/؟ ؟؟؟
مطبع: شوکت پریس۔ لاہور
پیشکش: جامعة الکوثر۔ اسلام آباد
ناشر: مصباح القرآن ٹرسٹ۔ لاہور
فون: 0321 448 1214
ای میل: info@misbahulqurantrust.com
ویب: www.misbahulaqurantrust.com

اس کتاب میں نقل شدہ اکثر روایات کے متن اور حوالوں کی اصلاح و تطبیق، کتب احادیث پر مبنی سافٹ ویئر ''جامع الاحادیث'' تیار کردہ کمپیوٹر ریسرچ سینٹر آف اسلامک سائنسز اور المحدث سے کی گئی ہے۔

نہج البلاغة کے اکثر اقتباسات کا ترجمہ نہج البلاغةترجمہ مفتی جعفر حسینؒ مطبوعہ امامیہ کتب خانہ لاہور سے نقل کیا گیا ہے۔

تشریح کلمات مفردات القرآن راغب اصفہانی، ترجمہ مولانا محمد عبدہ فیروز پوری سے ماخوذ ہے۔

ملنے کا پتہ: محمد علی بک ایجنسی۔ کراچی کمپنی۔ اسلام آباد
معراج کمپنی۔ غزنی سٹریٹ۔ اردو بازار۔ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض ناشر

قارئین کرام!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ!مصباح القرآن ٹرسٹ عہد حاضر کی بعض عظیم ترین تفاسیر و تالیفات کی نشر واشاعت کے سلسلے میں ایک عظیم اور پُر وقار مرکز کی حیثیت سے امت مسلمہ کے لیے اپنی عاجزانہ خدمات انجام دے رہا ہے۔ ادارہ ہذا کی یہ شہرت اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور آپ حضرات کی تائید واعانت کا ثمرہ ہے۔

خالقِ کائنات نے ''انسان'' کو روح و بدن سے مرکب ،عقلِ سلیم اور قوتِ گویائی کی نعمات سے مالا مال فرما کر موجوداتِ عالم میں منفرد و ممتاز مقام عطا فرمایا ہے۔ جس طرح بدن کو اپنے ہی اعضا کی تقویت وارتقا کے لیے خوراک کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح روح کی بلندی اور تازگی کے لیے زہدو تقویٰ سے ملبوس ہو کر علمی تفکر کے میدان میں اترنا پڑتا ہے۔ روحانی تسکین اور معرفت کی بلندیوں سے فیض یاب ہونے کے لیے آیاتِ قرآن پر غور وفکر کرنا، اس کے رموز وحقائق کو سمجھنا اور فرمودات الٰہی پر عمل پیرا ہو کر اپنی زندگی گزارنا آخرت کی کامیابی کا باعث ہے۔

بلاشبہ قرآنِ مجید دین اسلام کا حقیقی آئین و دستور ہے۔ دنیا کے ہر طبقہ اور ہر نسل کو اپنی استعداد کے مطابق اس سے استفادہ کرنا چاہیے۔ چنانچہ حضرت امام رضا علیہ السلام سے منقول روایت میں حضرت امام صادق علیہ السلام سے سوال کیا گیا: کیا وجہ ہے کہ قرآن مجید کو جس قدر بیان اور نشر کیا جاتا ہے اسی قدر اس میں مزید تازگی آجاتی ہے؟ جواب میں امام علیہ السلام نے فرمایا:'' اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو نہ ایک زمانے کے ساتھ مخصوص فرمایا، نہ کچھ لوگوں کے ساتھ بلکہ یہ ہر دور میں جدت اور ہر قوم کے لیے قیامت تک تازگی رکھتا ہے۔''

کامیاب زندگی گزارنے کے لیے دنیا کے ہر شخص کے لیے قرآنی آیات کے مفہوم اور تفاسیر کا سمجھنا ضروری ہے۔ اس ضرورت کے پیش نظر علمائے اسلام نے عربی، فارسی، انگریزی اور دیگر کئی زبانوں میں قرآن مجید کی بہت سی تفاسیر اور تراجم مرتب فرمائے ہیں۔ اس سلسلے میں برصغیر پاک و ہند کے اہل تشیع و اہل

سنت علماء نے بھی اردو زبان میں قرآن کریم کے متعدد تراجم و تفاسیر پیش کیے ہیں۔ پاکستان میں اردو زبان میں طبع شدہ اکثر تراجم و تفاسیر لکھنؤ (انڈیا) کے مترجمین و مفسرین کی محنت کا نتیجہ ہیں۔ لکھنؤ کی اُردو پاکستان کی موجودہ اردو سے ذرا مختلف ہے۔

دنیا کا ہر شخص دوسری زبانوں کے علاوہ اپنی قومی زبان بلکہ اپنے خطے کی زبان سے زیادہ مانوس ہوتا ہے لہٰذا خطے کی موجودہ اردو زبان کے پیش نظر اور قرآنی تصریحات کے بارے میں نئی نسل کی طرف سے اٹھنے والے سوالات کے جوابات اور جدید معاندانہ تحریروں اور الزام تراشیوں کے مقابلے میں مکتب اہل بیت علیہم السلام کا موقف بیان کرنے کے لیے ۱۰ جلدوں پر مشتمل زیر نظر تفسیر قرآن "الکوثر فی تفسیر القرآن" کی جلد ہفتم قارئین کرام کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ یہ تفسیری مجموعہ حجۃ الاسلام والمسلمین الشیخ محسن علی نجفی مدظلہ العالی کی غیر معمولی مساعی اور شبانہ روز محنت کا ثمر ہے۔ خداوند عالم اُن کا سایہ ہمارے سروں پر قائم و دائم رکھے اور انہیں طاقت و صحت کی نعمت سے سرفراز فرمائے۔

اراکین مصباح القرآن ٹرسٹ قبلہ موصوف کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انہوں نے ادارہ ہذا کو یہ تفسیری مجموعہ پرنٹ کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

مزید برآں آپ ہماری کتب مصباح القرآن ٹرسٹ کی ویب سائٹ:

www.misbahulqurantrust.com

کے ذریعے گھر بیٹھے بھی پڑھ سکتے ہیں۔

ہمیں اُمید ہے کہ صاحبانِ علم و تحقیق حسبِ سابق مصباح القرآن ٹرسٹ کی اس کوشش کو بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھیں گے۔ اس گوہر نایاب سے بھرپور علمی و عملی استفادہ فرمائیں گے اور ادارے کو اپنی قیمتی تجاویز و آراء سے ضرور مستفید فرمائیں گے۔

والسلام

اراکین

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور۔

پاکستان

سُورَةُ الاَحزاب

خالی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

زرّ، ابی بن کعب سے روایت کرتے ہیں:
مجھ سے ابی بن کعب نے کہا: تم سورۃ الاحزاب کی آیات کتنی شمار کرتے ہو؟ کہا: ۷۳ آیات۔ کہا: مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے ساتھ ابی بن کعب قسم کھاتا ہے کہ یہ سورہ سورۃ البقرۃ کے برابر یا اس سے زیادہ طویل ہے۔ ہم نے اس سورہ میں آیۂ رجم کی تلاوت کی ہے: الشیخ و الشیخۃ اذا زنیا فارجموھما البتۃ نکالا من اللہ واللہ عزیز حکیم۔
اس روایت کو نسائی، حاکم، طبرانی، ابن حبان اور ابن مردویہ نے بیان کیا ہے۔
زمخشری اس روایت کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:
ابی نے اس سے قرآن کا وہ حصہ مراد لیا ہے جو منسوخ ہو گیا ہے۔
پھر آگے لکھتے ہیں:
نقل کیا جاتا ہے کہ اس سورت کا زائد حصہ حضرت عائشہؓ کے گھر میں ایک صحیفہ میں تھا جو ایک بکری کھا گئی۔ یہ بات ملحد اور رافضی لوگوں کی ساختہ و بافتہ ہے۔
فاضل محشی نے اس کے ذیل میں لکھا ہے:
قلت: بل راویھا ثقۃ غیر متھم بلکہ اس روایت کے راوی ثقہ ہیں۔ ان پر کوئی الزام بھی عائد نہیں ہے۔
آخر میں لکھتے ہیں:

بل هذا مما نسخت تلاوته و بقى حكمه و اكل الدواجن وقع بعد النسخ ۔[1]

بلکہ یہ اس حصہ کی بات ہے جس کی تلاوت نسخ ہو گئی اور حکم باقی رہ گیا۔ بکری کے کھانے کا واقعہ نسخ کے بعد پیش آیا۔

واضح رہے شیعہ امامیہ کے نزدیک قرآن تواتر سے ثابت ہوتا ہے، اس قسم کی روایت آحاد سے قرآن ثابت نہیں ہوتا کہ نسخ کی نوبت آئے۔ جو لوگ ایسی روایات سے قرآن ثابت ہونا قرار دیتے ہیں وہ نسخ تلاوت کے ذریعے قرآنیت سے ہاتھ اٹھاتے ہیں جب کہ نسخ تلاوت ایک مفروضہ ہے۔ ایک ثابت متواتر اجماعی موقف نہیں ہے جس سے قرآن منسوخ ہو جائے۔ لہٰذا ان روایات کے مضمون کو قرآن ماننے کے لیے تواتر درکار ہے۔ اگر وہ اسے قرآن مانتے ہیں تو نسخ کے لیے تواتر درکار ہے ورنہ جسے ان لوگوں نے قرآن تسلیم کیا ہے اس کی تحریف لازم آتی ہے۔ فافهم ذلك۔

---

[1] الکشاف ذیل آیہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ
یٰۤاَیُّہَا النَّبِیُّ اتَّقِ اللّٰہَ وَ لَا تُطِعِ الۡکٰفِرِیۡنَ وَ الۡمُنٰفِقِیۡنَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیۡمًا حَکِیۡمًا ۙ﴿۱﴾

بنام خدائے رحمن رحیم
۱۔ اے نبی اللہ سے ڈریں اور کفار اور منافقین کی اطاعت نہ کریں، اللہ یقیناً بڑا جاننے والا، حکمت والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ یٰۤاَیُّہَا النَّبِیُّ: اس آیت کو سمجھنے کے لیے شان نزول کا مطالعہ ضروری ہے۔ چونکہ شان نزول سے محل کلام اور رخ سخن کا علم ہو جاتا ہے۔ شان نزول اس طرح ہے:

جنگ احد کے بعد ابوسفیان کی سربراہی میں مکہ کا ایک وفد مدینہ آتا ہے اور منافقین کے سربراہ عبد اللہ بن ابی کے پاس ٹھہرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی انہیں امان دی تھی کہ وہ رسول اللہ ﷺ سے بات کریں۔ چنانچہ ان لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے کہا: ہمارے معبودوں لات، عزیٰ اور مناۃ کے خلاف کچھ نہ کہیں اور یہ کہدیں کہ جو ان کی پوجا کرتے ہیں یہ ان کی شفاعت کریں گے تو ہم بھی آپ کے رب کو کچھ نہیں کہیں گے۔ یہ بات رسول اللہ ﷺ کے لیے گراں گزری۔ حضرت عمر پاس بیٹھے تھے۔ کہنے لگے: یا رسول اللہ ﷺ کیا انہیں قتل کر دوں؟ فرمایا: میں نے انہیں امان دی ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

۲۔ اتَّقِ اللّٰہَ وَ لَا تُطِعِ الۡکٰفِرِیۡنَ وَ الۡمُنٰفِقِیۡنَ: اس آیت کا موضوع سخن یہ نہیں ہے کہ رسول

اللہ ﷺ سے خلاف تقویٰ کوئی کام صادر ہونے کا خطرہ تھا یا کفار و منافقین کی اطاعت میں جانے کا اندیشہ تھا بلکہ موضوع سخن یہ ہے کہ کفار و منافقین نے مل کر ایک سازش کی ہے، اس سے بچنے کے لیے اللہ کی حفاظت میں رہیں۔ اتَّقِ اللّٰهَ: اور ان کی ہر تجویز کو مسترد کر دیجیے۔ وَلَا تُطِعِ: اس تعبیر کا مطلب کفار و منافقین کی سازش کی ناکامی کی بشارت ہے۔

۳۔ عَلِيۡمًا حَكِيۡمًا: اللہ ان کی نیتوں کو جانتا ہے اور جو حکم دے رہا ہے وہ تیر بہدف ہوگا چونکہ اللہ تعالیٰ کا ہر حکم حکیمانہ ہوتا ہے۔ اس جملے میں بھی کفار و منافقین کی مشترکہ سازش کی ناکامی کی طرف اشارہ ہے۔

وَّاتَّبِعۡ مَا يُوۡحٰٓى اِلَيۡكَ مِنۡ رَّبِّكَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرًا ۙ﴿۲﴾

۲۔ اور آپ کے پروردگار کی طرف سے آپ کی طرف جو وحی کی جاتی ہے اس کی اتباع کریں، اللہ تمہارے اعمال سے یقیناً خوب باخبر ہے۔

تفسیر آیات

ان سازشوں کو ناکام بنانے کے لیے آپ ﷺ کے پاس وحی جیسی طاقت موجود ہے۔ بے خبری میں کسی سازش کا شکار ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اس جملے سے سازشی کاموں کو ناامید کرنا مقصود ہو سکتا ہے کہ یہ وحی اس ذات کی طرف سے آئی ہے جو لوگوں کے اعمال سے سب سے زیادہ باخبر ہے۔

وَّتَوَكَّلۡ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيۡلًا ﴿۳﴾

۳۔ اور اللہ پر توکل کریں اور ضامن بننے کے لیے اللہ کافی ہے۔

تفسیر آیات

اس تعبیر میں بھی سازشی کاموں کو مایوس کرنا مقصود ہو سکتا ہے کہ اللہ پر تکیہ کرنے کی صورت میں کفار اور منافقین کی ملی بھگت کا مقابلہ کرنا کوئی مشکل کام نہ ہوگا۔

اہم نکات

۱۔ کافر اور منافق اسلام کے خلاف ہمیشہ متفق ہو جاتے ہیں۔

۲۔ احکام وحی کی تعمیل اور اللہ پر بھروسہ کرنا ہر سازش کے خلاف ایک ناقابل تسخیر طاقت ہے۔

مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنۡ قَلۡبَيۡنِ فِىۡ جَوۡفِهٖ ۚ وَمَا جَعَلَ اَزۡوَاجَكُمُ الّٰٓـِٔىۡ

۴۔ اللہ نے کسی شخص کے پہلو میں دو دل نہیں رکھے ہیں اور تمہاری ازواج کو جنہیں تم لوگ

تُظٰهِرُوۡنَ مِنۡهُنَّ اُمَّهٰتِکُمۡ ۚ وَ مَا جَعَلَ اَدۡعِیَآءَکُمۡ اَبۡنَآءَکُمۡ ؕ ذٰلِکُمۡ قَوۡلُکُمۡ بِاَفۡوَاهِکُمۡ ؕ وَ اللّٰهُ یَقُوۡلُ الۡحَقَّ وَ هُوَ یَهۡدِی السَّبِیۡلَ ﴿۴﴾

ماں کہہ بیٹھتے ہو ان کو اللہ نے تمہاری مائیں نہیں بنایا اور نہ ہی تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارے (حقیقی) بیٹے بنایا، یہ سب تمہارے منہ کی باتیں ہیں اور اللہ حق بات کہتا اور (سیدھا) راستہ دکھاتا ہے۔

تفسیر آیات

ا۔ مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنۡ قَلۡبَیۡنِ: اللہ نے انسان کے پہلو میں دو قلب نہیں بنائے کہ دو متصادم نظریات ایک شخص میں جمع ہو جائیں۔ ایک دل میں کفر و ایمان میں سے ایک ہو سکتا ہے۔ لہٰذا جن کے دلوں میں نفاق ہے ان میں ایمان نہیں آ سکتا اور جن کے دلوں میں اسلام سے بغض ہے ان میں محبت نہیں آ سکتی۔ جو منافقین، مشرکین کے ساتھ مل کر اسلام کے لیے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے تجاویز دیتے ہیں ان کے دلوں میں اسلام کے ساتھ عداوت ہے۔ ان دلوں میں اسلام کے ساتھ ہمدردی نہیں آ سکتی۔ لہٰذا تم ان کے فریب میں نہ آؤ۔

اس آیت میں ان لوگوں کے بارے میں فیصلہ کن موقف کا بیان ہے جو اسلام کو بھی ماننے کا دعویٰ کرتے ہیں اور ساتھ غیر اسلامی قوانین کے حامی ہیں۔ اس طرح وہ اسلام کو مسترد اور قبول کرنے میں کسی قسم کا تضاد نہیں سمجھتے۔ وہ بزعم خود شریعت کے منکر بھی نہیں ہیں اور شریعت سے متصادم طاغوت سے فیصلے لینے میں کوئی حرج بھی نہیں سمجھتے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے بہت سے معاصر مسلمانوں کے پہلو میں کئی قلب ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

لا یجتمع حبّنا و حبّ عدوّنا فی جوف انسان۔[1]

کسی انسان کے دل میں ہماری محبت اور ہمارے دشمنوں کی محبت جمع نہیں ہو سکتی۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

ما جعل اللّٰہ لرجل من قلبین فی جوفه یحب بهذا قوما و یحب بهذا اعدائهم۔[2]

اللہ نے ایک شخص کے پہلو میں دو دل نہیں بنائے کہ ایک دل سے کسی قوم سے محبت کرے اور دوسرے دل سے اس کے دشمنوں سے محبت کرے۔

---

[1] بحار الانوار ۲۴: ۳۱۸	[2] مجمع البیان

۲۔ وَ مَا جَعَلَ اَزۡوَاجَکُمُ الّٰٓیِٴۡ تُظٰہِرُوۡنَ: عربوں میں رواج تھا کہ اگر کسی نے اپنی بیوی سے کہہ دیا: تیری پیٹھ میرے لیے میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہے تو وہ عورت اس پر ہمیشہ کے لیے حرام ہو جاتی۔ اصطلاح میں اسے ظہار کہتے ہیں۔ اس آیت میں صرف یہ فرمایا کہ کسی کو ماں کہہ دینے سے وہ عورت ماں نہیں بنتی۔ ماں وہ ہے جس نے تمہیں جنا ہے۔ ظہار کے احکام سورۂ مجادلہ آیت ۲۔۴ میں بیان کیے گئے ہیں۔

۳۔ وَ مَا جَعَلَ اَدۡعِیَآءَکُمۡ اَبۡنَآءَکُمۡ: نہ ہی اللہ نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو حقیقی بیٹا بنایا۔ اس آیت کے نزول کے بعد منہ بولے بیٹوں کو حقیقی بیٹے کی حیثیت دینا ممنوع ہو گیا۔ سب سے پہلے حضرت زید بن حارثہ پر یہ حکم نافذ ہوا جنہیں لوگ زید بن محمد کہتے تھے اور اس رسم کو ختم کرنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے زید کی مطلقہ زینب بنت جحش سے ازدواج فرمایا۔

۴۔ ذٰلِکُمۡ قَوۡلُکُمۡ بِاَفۡوَاہِکُمۡ: منہ بولے کو بیٹا کہنا صرف تمہاری لفظی تعبیر ہے۔ کسی امر واقع کی نشاندہی نہیں ہے۔ اس لفظی تعبیر سے حقیقت نہیں بدلتی۔ حقیقت میں وہ اپنے باپ کا بیٹا ہے۔

۵۔ وَ اللّٰہُ یَقُوۡلُ الۡحَقَّ: اللہ امر واقع اور حقیقت کی نشاندہی فرماتا ہے کہ انہیں اپنے حقیقی باپ کی طرف نسبت دیا کرو۔

اہم نکات

۱۔ ایک دل میں دو متضاد عقیدے جمع نہیں ہو سکتے۔ مِّنۡ قَلۡبَیۡنِ فِیۡ جَوۡفِہٖ ۔۔۔۔

اُدۡعُوۡہُمۡ لِاٰبَآئِہِمۡ ہُوَ اَقۡسَطُ عِنۡدَ اللّٰہِ ۚ فَاِنۡ لَّمۡ تَعۡلَمُوۡۤا اٰبَآءَہُمۡ فَاِخۡوَانُکُمۡ فِی الدِّیۡنِ وَ مَوَالِیۡکُمۡ ؕ وَ لَیۡسَ عَلَیۡکُمۡ جُنَاحٌ فِیۡمَاۤ اَخۡطَاۡتُمۡ بِہٖ ۙ وَ لٰکِنۡ مَّا تَعَمَّدَتۡ قُلُوۡبُکُمۡ ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا ﴿۵﴾

۵۔ منہ بولے بیٹوں کو ان کے باپوں کے نام سے پکارو اللہ کے نزدیک یہی قرین انصاف ہے، پھر اگر تم ان کے باپوں کو نہیں جانتے تو یہ تمہارے دینی بھائی اور دوست ہیں اور جو تم سے غلطی سے سرزد ہو جائے اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں ہے، البتہ اس بات پر (گناہ ضرور ہے) جسے تمہارے دل جان بوجھ کر انجام دیں اور اللہ بڑا معاف کرنے والا، رحیم ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اُدۡعُوۡہُمۡ لِاٰبَآئِہِمۡ: ان کی نسبت اپنے باپوں کی طرف دینا منصفانہ عمل ہے اور جو اس کا حقیقی

باپ نہیں ہے اسے باپ کی حیثیت دینا منصفانہ نہیں ہے بلکہ یہ حقیقت اور امر واقع سے انحراف ہے۔

۲۔ فَاِنۡ لَّمۡ تَعۡلَمُوۡۤا: اگر حقیقی باپ کا علم نہیں ہے تو بھی غیر حقیقی باپ کی طرف نسبت دینا درست نہیں ہے۔ اس صورت میں وہ تمہارے دینی بھائی کہلائیں گے۔ وَ مَوَالِیۡکُمۡ: وہ تمہارے دوست کہلائیں گے۔ موالی آزاد کردہ غلام کو بھی کہتے ہیں۔ چنانچہ زید رسول ﷺ کا غلام تھا۔ آپؐ نے اسے آزاد کیا۔ اس نے اپنے باپ کے ساتھ جانے سے انکار کیا تو باپ نے کہا یہ میرا بیٹا نہیں ہے۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: زید میرا بیٹا ہے۔ لوگ بھی زید بن محمد کہتے تھے۔ اس آیت کے نزول کے بعد زید کو مولی رسول اللہؐ کہا جانے لگا۔

۳۔ وَ لَیۡسَ عَلَیۡکُمۡ جُنَاحٌ: اگر تکیہ کلام کی وجہ سے یا پیار میں کسی کو بیٹا، بیٹی، بہن یا ماں کہہ دیا تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ حرج اس میں ہے کہ مَّا تَعَمَّدَتۡ قُلُوۡبُکُمۡ تم دل سے حقیقتاً کسی کو واقعی بیٹا وغیرہ قرار دو اور نسلوں کو حقیقی بنیاد پر نہیں، جعلی بنیاد پر ملاؤ۔ یہ جائز نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ حقیقی نسب کا تحفظ ہونا چاہیے: اُدۡعُوۡہُمۡ لِاٰبَآئِہِمۡ ....

اَلنَّبِیُّ اَوۡلٰی بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ مِنۡ اَنۡفُسِہِمۡ وَ اَزۡوَاجُہٗۤ اُمَّہٰتُہُمۡ ؕ وَ اُولُوا الۡاَرۡحَامِ بَعۡضُہُمۡ اَوۡلٰی بِبَعۡضٍ فِیۡ کِتٰبِ اللّٰہِ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَ الۡمُہٰجِرِیۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ تَفۡعَلُوۡۤا اِلٰۤی اَوۡلِیٰٓئِکُمۡ مَّعۡرُوۡفًا ؕ کَانَ ذٰلِکَ فِی الۡکِتٰبِ مَسۡطُوۡرًا ﴿۶﴾

۶۔ نبی مومنین کی جانوں پر خود ان سے زیادہ حق تصرف رکھتا ہے اور نبی کی ازواج ان کی مائیں ہیں اور کتاب اللہ کی رو سے رشتے دار آپس میں مومنین اور مہاجرین سے زیادہ حقدار ہیں مگر یہ کہ تم اپنے دوستوں پر احسان کرنا چاہو، یہ حکم کتاب میں لکھا ہوا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اَلنَّبِیُّ اَوۡلٰی: نبیؐ مومنین کی جانوں پر خود مومنین سے زیادہ تصرف کا حق رکھتے ہیں۔ چونکہ رسول ﷺ کی ولایت اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ کا تسلسل ہے لہٰذا نبیؐ کو مومنین پر ہر اعتبار سے ولایت و حاکمیت حاصل ہے۔ ایسی حاکمیت جو مومنین کی خود مختاری کے منافی نہ ہو:

لَا تَکُنۡ عَبۡدَ غَیۡرِکَ وَ قَدۡ جَعَلَکَ اللّٰہُ　　دوسروں کے غلام نہ بن جاؤ جب اللہ نے تمہیں آزاد

حُرًّا۔[1] بنایا ہے۔

ایسی حاکمیت جو مومن کو عزت و سرفرازی دے:

وَلِلّٰہِ الۡعِزَّۃُ وَلِرَسُوۡلِہٖ وَلِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ...۔[2] عزت تو اللہ، اس کے رسول اور مومنین کے لیے ہے۔

۳۔ چونکہ اس ہستی کو حاکمیت کا حق دیا جا رہا ہے جو رحمۃ للعالمین ہے اور مومنوں پر تو خصوصی طور پر شفیق و مہربان ہے۔

لَقَدۡ جَآءَکُمۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ اَنۡفُسِکُمۡ عَزِیۡزٌ عَلَیۡہِ مَا عَنِتُّمۡ حَرِیۡصٌ عَلَیۡکُمۡ بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ رَءُوۡفٌ رَّحِیۡمٌ ○[3] تحقیق تمہارے پاس خود تم ہی میں سے ایک رسول آیا ہے تمہیں تکلیف میں دیکھنا ان پر شاق گزرتا ہے، وہ تمہاری بھلائی کا نہایت خواہاں ہے اور مومنین کے لیے نہایت شفیق، مہربان ہے۔

اس ہستی کی اطاعت اور اس کے حکم کے نفاذ سے مومن ہر قید و بند سے آزاد ہو جاتا ہے:

وَیَضَعُ عَنۡہُمۡ اِصۡرَہُمۡ وَالۡاَغۡلٰلَ الَّتِیۡ کَانَتۡ عَلَیۡہِمۡ ...۔[4] اور ان پر لدے ہوئے بوجھ اور (گلے کے) طوق اتارتے ہیں۔

لہٰذا رسول اللہ ﷺ کی ولایت مطلقہ ہے اور مومن کے تمام جوانب پر محیط ہے۔ مومن کی اپنی جان سے رسول کی جان عزیز ہے۔ حدیث ہے:

و الذی نفسی بیدہ لا یؤمن احدکم حتی اکون احب الیہ من نفسہ و مالہ و ولدہ و الناس اجمعین...۔[5] قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک اس کے نزدیک میں، اس کی جان و مال و اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ عزیز نہ ہو۔

رسول ﷺ کی جان مؤمن کی اپنی جان سے اولیٰ ہے کا مطلب یہ ہے کہ رسول ﷺ کی جان کو اگر کوئی خطرہ لاحق ہو جائے تو مؤمن پر فرض ہے کہ وہ اپنی جان کا نذرانہ دے کر رسول ﷺ کو بچائے۔ رسول ﷺ کی خواہش مؤمن کی خواہش پر مقدم ہے کہ مؤمن کی کسی چیز کی خواہش ہے لیکن نبی ﷺ کی خواہش اس کے خلاف ہے تو نبی ﷺ کی خواہش مقدم ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص کھانا کھا رہا ہو اور نبی ﷺ اسے بلائیں تو اس پر واجب ہے کہ کھانا ترک کر کے رسول ﷺ کی آواز پر لبیک کہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسولؐ کے بلانے پر کھانا ترک نہ کرنے والے کو یہ بددعا ملی:

لا اشبع اللّٰہ بطنہ۔[1] اللہ اسے شکم سیری نصیب نہ کرے۔

---

[1] نہج البلاغۃ: ۳۱ وصیت نامہ برائے امام حسن علیہ السلام۔ مستدرک الوسائل ۷: ۲۳۱ [2] ۶۳ منافقون: ۸ [3] ۹ توبۃ: ۱۲۸
[4] ۷ اعراف: ۱۵۷ [5] بحار الانوار ۲: ۱۸۲

کسی معاملے میں خواہ دینی ہو یا دنیوی، رسول ﷺ کا فیصلہ خود مومن کے اپنے فیصلے پر مقدم ہے:

وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّ لَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ وَ مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ؕ[۱]	اور کسی مومن مرد اور مومنہ عورت کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اللہ اور اس کے رسول کسی معاملے میں فیصلہ کریں تو انہیں اپنے معاملہ کا اختیار حاصل رہے اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی تو وہ صریح گمراہی میں مبتلا ہو گیا۔

جنہیں اللہ کی طرف سے حاکمیت کا حق حاصل ہے، وہ مؤمنین کی مصلحت اور مفاد کے مطابق حکومت کرتے ہیں۔ وہ اپنی حاکمیت کے ذریعے مؤمنین کی عزت، آزادی اور مفادات کو تحفظ دیتے ہیں جب کہ جنہیں اللہ کی طرف سے یہ حق حاصل نہیں ہے وہ اپنی خواہش، اپنے مفادات کے مطابق حکومت کرتے ہیں۔

حضرت ابی، عبداللّٰہ بن مسعود اور ابن عباس کے نزدیک و هو اَب لهم کی عبارت آیت کا حصہ ہے اور حضرت ابی کے مصحف میں یہ جملہ ثبت تھا۔[۳]

۲۔ وَ اَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ: اور نبی کی بیویاں ان کی مائیں ہیں۔ ازواج نبی مومنوں کی مائیں صرف اس لحاظ سے ہیں کہ مومنین پر ان کا احترام واجب ہے اور ان کے ساتھ نکاح کرنا اسی طرح حرام ہے جس طرح اپنی حقیقی ماؤں کے ساتھ نکاح کرنا حرام ہے:

وَ لَاۤ اَنْ تَنْكِحُوْۤا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖۤ اَبَدًا ..[۴] اور ان کی ازواج سے ان کے بعد کبھی بھی نکاح نہ کرو.

باقی احکام میں وہ ماں کی طرح نہیں ہیں۔ سب مومنین ان کے لیے نامحرم ہیں۔ ان پر سب مومنین سے پردہ کرنا واجب تھا۔ ان ازواج کی صاجزادیاں مومنین کے لیے مادری بہنیں نہیں ہیں کہ ان سے نکاح حرام ہو جائے۔ ان کے بھائی بہن مومنین کے خالہ اور ماموں نہیں ہیں کہ کوئی شخص خال المومنین بن جائے اور کوئی خاتون اخت المومنین بن جائے۔ اس طرح ماں ہونے کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ وہ مومنین کی وارث بن جائیں یا مومنین ان کے وارث بن جائیں۔

١٧

مولانا مودودی نے اس آیت کے ذیل میں طبرسی کی ایک روایت اصل کتاب کی طرف رجوع کیے بغیر نقل کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا:

یا ابالحسن ان هذا الشرف باق ما دمنا[۵] علی طاعة اللّٰه تعالیٰ فایتهن عصت اللّٰه تعالیٰ بعدی بالخروج علیك فطلقها من الازواج و اسقطها	اے ابوالحسن! یہ شرف تو اسی وقت تک باقی ہے جب تک ہم لوگ اللہ کی اطاعت پر قائم رہیں۔ میری بیویوں میں سے جو بھی میرے بعد تیرے خلاف خروج کر کے اللہ کی نافرمانی کرے اسے تو طلاق دیجیو اور

---

[۱] بحار الانوار ۲۲: ۲۴۸ [۲] ۳۳ احزاب: ۳۶ [۳] مجمع البیان۔ روح المعانی [۴] ۳۳ احزاب: ۵۳

[۵] اصل عبارت مادمن ہے۔ جب تک ازواج اللہ کی اطاعت پر قائم ہیں۔ انہوں نے یہ عبارت روح المعانی سے لی ہو گی چونکہ اس میں اس غلطی کے ساتھ یہ عبارت موجود ہے۔

من شرف امهات المومنين۔ اس کو امہات المومنین کے شرف سے ساقط کر دیجیو۔

۳۔ وَاُولُوا الۡاَرۡحَامِ بَعۡضُہُمۡ اَوۡلٰی بِبَعۡضٍ فِیۡ کِتٰبِ اللّٰہِ: ہجرت کے بعد مدینہ میں اسلامی معاشرہ تشکیل دینے والے مہاجرین و انصار تھے۔ مہاجرین اپنے گھر کاروبار اور رشتہ داروں سے دور زندگی گزار رہے تھے اس لیے رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مہاجرت اور مواخاۃ کے ذریعے ایک وقتی قانون نافذ فرمایا جس کے تحت مہاجرین و انصار مواخاۃ کے ذریعے ایک دوسرے کے وارث بن جاتے تھے۔ اس آیت کے ذریعے مواخاۃ کے ذریعے توارث کا قانون منسوخ ہو گیا اور بتایا گیا کہ آیندہ خونی رشتہ داری میں اقربیت کی بنیاد پر وراثت تقسیم ہو گی۔

وراثت اس آیت کی صراحت کی بنا پر رشتہ داری کی بنیاد پر تقسیم ہو گی اور رشتہ داری میں سب سے زیادہ قریب ترین اولاد اور والدین ہیں جو وراثت کی تقسیم میں موجود طبقات میں طبقہ اولیٰ میں آتے ہیں۔ لہٰذا باپ اور اس کی اولاد اس آیت کے مصداق اول ہیں۔

چنانچہ حضرت زہرا سلام اللہ علیہا نے اپنے وارث ہونے پر اس آیت سے استدلال فرمایا۔ میراث رسولؐ کے بارے میں تفصیل کے ملاحظہ ہو سورہ نمل آیت ۱۶۔ سورہ مریم آیت ۶۔

۴۔ اِلَّاۤ اَنۡ تَفۡعَلُوۡۤا اِلٰۤی اَوۡلِیٰٓئِکُمۡ مَّعۡرُوۡفًا: اپنے دوستوں پر احسان سے مراد وصیت ہے۔ وصیت کی صورت میں ارحام یعنی رشتہ داری کے بغیر حصہ دار بن جاتے ہیں۔ وصیت کی صورت میں وصیت کرنے والے کے اموال میں سے صرف ایک تہائی میں وصیت نافذ ہے۔

۵۔ کَانَ ذٰلِکَ فِی الۡکِتٰبِ مَسۡطُوۡرًا: وراثت کا یہ قانون اس کتاب میں درج ہے جس میں اللہ کے تمام اٹل فیصلے لکھے ہوئے ہیں۔ اس سے مراد لوح محفوظ ہو سکتی ہے اور قرآن بھی۔ اللہ تعالیٰ نے وارثت کے اس حکم کو بیان کرنے میں ایک خاص اہمیت کا اظہار فرمایا۔ ایک مرتبہ فِیۡ کِتٰبِ اللّٰہِ فرما کر یہ حکم کتاب اللہ میں اور دوسری بار کَانَ ذٰلِکَ فِی الۡکِتٰبِ مَسۡطُوۡرًا یہ حکم کتاب میں درج ہے فرما کر مزید تاکید فرمائی۔

اہم نکات

۱۔ کسی کو ماں، بہن اور بیٹا کہنے سے حقیقت نہیں بدلتی۔
۲۔ نبی کا حکم خود مومن کے اپنے ارادے سے زیادہ نافذ ہے: اَلنَّبِیُّ اَوۡلٰی ....

وَ اِذۡ اَخَذۡنَا مِنَ النَّبِیّٖنَ مِیۡثَاقَہُمۡ وَ مِنۡکَ وَ مِنۡ نُّوۡحٍ وَّ اِبۡرٰہِیۡمَ وَ مُوۡسٰی وَ عِیۡسَی ابۡنِ مَرۡیَمَ ۪

۷۔ اور (یاد کرو) جب ہم نے انبیاء سے عہد لیا اور آپ سے بھی اور نوح سے بھی اور ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ بن مریم سے بھی اور ان سب سے

وَّ اَخَذۡنَا مِنۡهُمۡ مِّیۡثَاقًا غَلِیۡظًا ۙ﴿۷﴾	ہم نے پختہ عہد لیا۔
لِّیَسۡـَٔلَ الصّٰدِقِیۡنَ عَنۡ صِدۡقِهِمۡ ۚ وَ اَعَدَّ لِلۡکٰفِرِیۡنَ عَذَابًا اَلِیۡمًا ﴿۸﴾	۸۔ تاکہ سچ کہنے والوں سے ان کی سچائی کے بارے میں دریافت کرے اور کفار کے لیے اس نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اِذۡ اَخَذۡنَا مِنَ النَّبِیّٖنَ مِیۡثَاقَهُمۡ: انبیاء علیہم السلام سے جو عہد و میثاق لیا گیا ہے وہ ان کی نبوت کے منصب سے متعلق ہے۔ لہٰذا یہ عہد و میثاق تبلیغ رسالت اور لوگوں کو توحید کی طرف دعوت اور اس راہ میں پیش آنے والے مصائب پر صبر کے بارے میں ہو سکتا ہے۔

بعض مفسرین نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اس میثاق میں یہ بات بھی شامل ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی آمد کی خبر اپنی امتوں کو دے دیں۔

۲۔ وَ مِنۡکَ: اور آپؐ سے بھی۔ خصوصی طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر اس بات کی طرف اشارے کے لیے ہو سکتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے جو عہد و میثاق لیا ہے ان میں آپؐ سے جو عہد لیا گیا ہے وہ زیادہ اہمیت کا حامل ہے اور سب سے قدیم ترین اور اولین عہد ہے۔ چنانچہ روایت میں آیا ہے۔ ابن عباس راوی ہیں کہ کسی نے پوچھا یا رسول اللہ! یہ میثاق کب لیا گیا تھا؟ جواب میں فرمایا:

و آدم بین الروح والجسد ....[۱]　جب آدم روح اور جسم کے درمیان تھا۔

۳۔ وَ مِنۡ نُّوۡحٍ وَّ اِبۡرٰهِیۡمَ: ان اولوالعزم پیغمبران کو خصوصیت کے ساتھ ذکر فرمایا چونکہ جو انبیاء علیہم السلام صاحبان شریعت ہیں ان کی مسئولیت زیادہ اور سنگین تھی۔

۴۔ وَّ اَخَذۡنَا مِنۡهُمۡ مِّیۡثَاقًا غَلِیۡظًا: یہ غلیظ، پختہ اور سخت میثاق بظاہر اولوالعزم انبیاء علیہم السلام سے لیا گیا۔ یہ ان عہد و میثاق کے علاوہ کوئی اضافی عہد تھا جو صرف ان بزرگ انبیاء علیہم السلام سے لیا گیا ہے۔

۵۔ لِّیَسۡـَٔلَ الصّٰدِقِیۡنَ: انبیاء علیہم السلام سے یہ عہد و میثاق اس لیے لیا گیا تاکہ قیامت کے دن جب ان سے سوال ہو گا تو ان کی سچائی ظاہر ہو۔ چنانچہ دوسری جگہ فرمایا:

یَوۡمَ یَجۡمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَیَقُوۡلُ مَاذَاۤ اُجِبۡتُمۡ ....[۲]	(اس دن کا خوف کرو) جس دن اللہ سب رسولوں کو جمع کر کے ان سے پوچھے گا: (امتوں کی طرف سے) تمہیں کیا جواب ملا؟

دوسری تفسیر یہ ہو سکتی ہے: قیامت کے دن انبیاء علیہم السلام سے سوال و جواب میں انبیاء علیہم السلام کی دعوت کی

---

[۱] روح المعانی ذیل آیہ　[۲] ۵ مائدۃ: ۱۰۹

سچائی ظاہر ہو جائے گی اور اس دعوت کی سچائی کے نتیجے میں مومن کو ثواب اور منکر کو عذاب دینا لازم آئے گا۔

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ۹

۹۔ اے ایمان والو! اللہ کی وہ نعمت یاد کرو جو اس نے تم پر کی جب لشکر تم پر چڑھ آئے تو ہم نے ان پر آندھی بھیجی اور تمہیں نظر نہ آنے والے لشکر بھیجے اور جو کچھ تم کر رہے تھے اللہ اسے خوب دیکھ رہا تھا۔

تفسیر آیات

یہ آیت اور اس کے بعد چند آیات جنگ احزاب جسے جنگ خندق بھی کہتے ہیں کے بارے میں نازل ہوئیں۔

جنگ احزاب کا واقعہ اس طرح پیش آیا:

احد کی جنگ کے بعد قریش نے یہ اعلان کر رکھا تھا کہ آئندہ سال بدر میں ہمارا آمنا سامنا ہو گا۔ اسلامی لشکر نے مقررہ تاریخ کو بدر میں آٹھ دن ابوسفیان اور اس کے لشکر کا انتظار کیا مگر وہ بدر میں آنے کی جرأت نہ کر سکا۔ اس سے پہلے یہود کے قبیلہ بنی نضیر کی سازش فاش ہو گئی تھی جس میں انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو شہید کرنے کی تدبیر سوچی تھی۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں دس دن کے اندر مدینہ چھوڑنے کا حکم دیا۔ بنی نضیر نے حکم ماننے سے انکار کیا۔ چنانچہ دس دن ختم ہونے پر بنی نضیر کا محاصرہ کیا گیا۔ چند دنوں میں وہ مدینہ چھوڑنے پر مجبور ہو گئے اور یہود مدینہ سے نکل کر خیبر، شام و دیگر علاقوں میں منتشر ہو گئے۔

اس طرح حضورؐ نے بنی غطفان کی سازش ناکام بنا دی۔ وہ مدینے پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہے تھے۔ ان پر مسلمانوں کی طرف سے اچانک حملہ ہوتا ہے اور وہ منتشر ہو جاتے ہیں۔

جنگ احزاب: ان حالات میں مدینہ کے مسلمانوں کو کچلنے کے لیے عرب قبائل اور یہود نے مل کر ایک بہت بڑا لشکر تیار کیا۔ چنانچہ سنہ ۵ ھ میں مدینہ پر چڑھائی کرنے کے لیے آ گئے۔ ان میں مدینہ سے جلا وطن ہونے والے بنی نضیر اور بنی قینقاع کے یہودی اور غطفان، بنو سلیم، فزارہ، مرہ، اشجع، سعد اور اسد وغیرہ کے قبائل اور قریش کا ایک بڑا لشکر شامل تھا۔

رسول اللہ ﷺ کو قبل از وقت اس خطرناک حملے کا علم ہو جاتا ہے۔ حضرت سلمان فارسیؓ کے

مشورے پر شہر مدینہ کے گرد خندق کھودی گئی اور شہر کو محفوظ کر لیا گیا۔ خندق کھودنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دوسرے عام مسلمانوں کی طرح حصہ لیا۔

اہل عرب اس طریق دفاع سے نا آشنا تھے اس لیے ان کی جنگی حکمت عملی میں اس کا کوئی حل معلوم نہ تھا۔ لہٰذا طویل اقامت کے لیے وہ تیار ہو کر نہیں آئے تھے۔ اس نئی صورت حال کا مقابلہ کرنے کی ان کے پاس صرف ایک صورت رہتی تھی۔ وہ یہ کہ مدینہ میں آباد بنی قریظہ کے یہودیوں کو مسلمانوں کے ساتھ معاہدہ توڑنے پر آمادہ کیا جائے چونکہ اسی معاہدے کی وجہ سے اس یہودی علاقے میں مسلمانوں نے کوئی دفاعی انتظام نہیں کیا تھا۔ دشمن نے اس علاقے سے فائدہ اٹھانے کو ہی غنیمت سمجھا۔ چنانچہ بنی نضیر کا وفد بنی قریظہ کے ہاں گیا اور انہیں عہد توڑنے پر آمادہ کیا جس سے مسلمانوں میں نہایت بے چینی پیدا ہو گئی۔ جسے قرآن نے ان لفظوں کے ساتھ ذکر کیا ہے:

وَاِذۡ زَاغَتِ الۡاَبۡصَارُ وَبَلَغَتِ الۡقُلُوۡبُ الۡحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوۡنَ بِاللّٰہِ الظُّنُوۡنَا ۝ [1]

اور جب آنکھیں پتھرا گئیں اور (مارے دہشت کے) دل (کلیجے) منہ کو آ گئے اور تم لوگ اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے۔

شہر کا وہ علاقہ بھی غیر محفوظ ہو گیا جہاں دفاع کا کوئی انتظام نہ تھا۔ چنانچہ بعض منافقین نے تو یہ کہنا شروع کیا محمد قیصر و کسریٰ کی فتح کی نوید سناتے ہیں، ادھر ہم رفع حاجت کے لیے بھی نہیں نکل سکتے۔ کچھ لوگوں نے خندق سے نکل جانے کی اجازت مانگنا شروع کی۔

ادھر محاصرے کو ۲۵ دن سے زیادہ ہو چکے تھے۔ دوسری طرف حملہ آوروں اور بنی قریظہ میں پھوٹ بھی پڑ چکی تھی جس سے حملہ آوروں کے حوصلے پست ہو گئے تھے۔ زمانہ بھی سردی کا تھا۔ اسی اثناء میں عربوں میں مشہور بہادروں نے انفرادی طور پر جنگ لڑنے کا فیصلہ کیا اور ایک تنگ جگہ سے خندق پار کر کے مبارزہ طلبی کی۔ ان میں سب سے مشہور شخص عمرو بن عبدود تھا جس نے بلند آواز سے پکارا: ہے کوئی میرے مقابلے میں آنے والا؟ حضرت علی علیہ السلام نے عرض کی: یا رسول اللہؐ میں اس کے مقابلے کے لیے حاضر ہوں۔ فرمایا: یہ عمرو ہے۔ بیٹھ جاؤ۔ جب کوئی جواب نہ آیا تو اس نے تمسخر کے طور پر کہا: تمہاری وہ جنت کہاں ہے جس کے بارے میں تمہارا یہ زعم ہے کہ تم میں سے جو مارا جائے گا وہ جنت جائے گا؟ تو حضرت علی علیہ السلام نے عرض کی: میں حاضر ہوں یا رسول اللہ!۔ پھر عمرو بن عبدود نے تیسری مرتبہ پکارا تو حضرت علی علیہ السلام نے عرض کیا: میں حاضر ہوں یا رسول اللہ! فرمایا: یہ عمرو ہے۔ عرض کیا: پھر بھی حاضر ہوں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اجازت دے دی۔

حاکم حسکانی کی روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کو ذات الفصول

---

[1] ۳۳ سورہ احزاب۔۱۰

نامی زرہ پہنائی، اپنی تلوار ذوالفقار عنایت کی اور اپنا عمامہ جو عمامۂ سحاب مشہور تھا پہنایا۔ پھر فرمایا: آگے بڑھو۔ پھر فرمایا:

برز الایمان کله الی الکفر کله۔[1] کل کا کل ایمان، کل کے کل کفر کے مقابلے میں نکلا ہے۔

علی علیہ السلام کو دیکھ کر عمرو نے کہا تم کون ہو؟ فرمایا: میں علی ہوں۔ کہا: میں تمہارا خون بہانا نہیں چاہتا۔ فرمایا: مگر میں تمہارا خون بہانا چاہتا ہوں۔ یہ سن کر وہ غصے میں آتا ہے اور گھوڑے سے اتر کر حضرت علی علیہ السلام پر حملہ کرتا ہے۔ آپ علیہ السلام نے اپنی ڈھال کو آگے کیا۔ اس کی تلوار ڈھال میں پھنس گئی اور حضرت علی علیہ السلام کے سر مبارک پر زخم آیا۔ حضرت علی علیہ السلام نے اس پر حملہ کیا۔ وہ زمین پر گر پڑا اور گرد و غبار اُٹھا۔ اس میں سے حضرت علی علیہ السلام کی تکبیر کی آواز سنائی دی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: علی نے اسے قتل کر دیا اور فرمایا:

لضربة علی خیر من عبادة الثقلین۔[2] علی کی ایک ضربت جن وانس کی عبادت سے بہتر ہے۔

ایک رات کڑک اور چمک کے ساتھ شدید آندھی آئی جس سے دشمن کے خیمے اکھڑ گئے۔ دشمن اس صورت حال کا مقابلہ نہ کر سکے اور راتوں رات میدان چھوڑ کر چلے گئے۔ صبح کو مسلمانوں نے دیکھا کہ دشمن نے راہ فرار اختیار کر لی ہے اور میدان دشمن سے خالی ہو گیا ہے۔ اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

و لا یغزوننا بعد الیوم و نحن نغزوهم ان شاء اللّٰه۔[3] آج کے بعد وہ ہم پر حملہ نہیں کر سکیں گے۔ انشاء اللہ ہم ان پر حملہ کریں گے۔

۱۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اذۡکُرُوۡا نِعۡمَةَ اللّٰهِ: اہل ایمان کو خندق کی جنگ میں اللہ کی طرف سے ملنے والی نعمت کا ذکر ہے۔ اس نعمت سے مراد امن کی نعمت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو دشمن کے حملے سے محفوظ رکھا۔

۲۔ جَآءَتۡکُمۡ جُنُوۡدٌ: ان لشکروں کی طرف اشارہ ہے جو اس جنگ میں شرکت کر رہے تھے۔ عام طور پر جنگ میں دونوں طرف ایک لشکر ہوتا ہے خواہ ایک طرف کا لشکر دوسری طرف کے لشکر سے بڑا یا چھوٹا ہو۔ جیسے جنگ بدر میں دو ہی لشکروں کا مقابلہ تھا لیکن اس جنگ میں اسلام کے صرف ایک لشکر کے مقابلے میں دشمن کے متعدد لشکر صف آرا تھے۔

i۔ بنی نصیر اور بنی قینقاع کے یہود کا لشکر۔

ii۔ غطفان کے قبائل کا لشکر۔

iii۔ قریش مکہ کا لشکر۔

ان تمام لشکروں میں بارہ ہزار افراد شریک تھے۔

---

[1] عوالی اللآلی ۴: ۸۸۔ شرح نہج البلاغة ۱۳: ۲۶۱۔ اس میں الکفر کی جگہ الشرک آیا ہے۔
[2] بحار الانوار ۱: ۳۹ [3] شرح نہج البلاغة ۱۹: ۶۲

۳۔ فَاَرۡسَلۡنَا عَلَیۡہِمۡ رِیۡحًا: دشمن پر یکا یک ایک شدید آندھی بھیجی جس کے زور سے ان کے خیمے اکھڑ گئے، ان میں شدید اضطراب پیدا ہوا اور راتوں رات وہ میدان چھوڑ کر چلے گئے۔

۴۔ وَّ جُنُوۡدًا لَّمۡ تَرَوۡہَا: ایسا لشکر بھیجا جو ظاہری دید میں نہ آتا تھا لیکن یہ طاقت ایک نہیں کئی لشکروں کا کام کر رہی تھی۔ ان لشکروں سے مراد فرشتے بھی ہو سکتے ہیں چونکہ انسان کو اللہ تعالیٰ فرشتوں کے ہی کے ذریعے داخلی طاقت فراہم فرماتا ہے۔

اِذۡ جَآءُوۡکُمۡ مِّنۡ فَوۡقِکُمۡ وَ مِنۡ اَسۡفَلَ مِنۡکُمۡ وَ اِذۡ زَاغَتِ الۡاَبۡصَارُ وَ بَلَغَتِ الۡقُلُوۡبُ الۡحَنَاجِرَ وَ تَظُنُّوۡنَ بِاللّٰہِ الظُّنُوۡنَا ﴿۱۰﴾

۱۰۔ جب وہ تمہارے اوپر اور نیچے سے تم پر چڑھ آئے اور جب آنکھیں پتھرا گئیں اور (مارے دہشت کے) دل (کلیجے) منہ کو آ گئے اور تم لوگ اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے۔

تفسیر آیات

۱۔ اِذۡ جَآءُوۡکُمۡ مِّنۡ فَوۡقِکُمۡ: مدینہ کے مشرقی علاقے سے آنے والے لوگ ہو سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے غطفان کے قبائل اور یہود کے لشکر ہوں۔

۲۔ وَ مِنۡ اَسۡفَلَ مِنۡکُمۡ: نچلی طرف سے آنے والے لشکروں سے مراد قریش اور ان سے ملحق ہونے والے دوسرے لشکر ہو سکتے ہیں۔

۳۔ وَ اِذۡ زَاغَتِ الۡاَبۡصَارُ: لشکروں نے مدینے کا مختلف سمتوں سے اس طرح محاصرہ کیا تھا کہ حملے کی صورت میں بچنے کی کوئی ظاہری امید نظر نہیں آتی تھی۔ واحد دفاعی ذریعہ خندق تھا۔ یہ بھی بنی قریظہ کے یہود کی عہد شکنی کے بعد غیر مؤثر نظر آتا تھا۔ ان حالات میں کچھ لوگوں کی آنکھیں پتھرا گئیں اور دل، کلیجے منہ کو آ گئے۔

زَاغَتِ: زیغ کے معنی کجی کے ہیں۔ یعنی آنکھیں حقائق کا درست مشاہدہ کرنے سے قاصر ہو گئی تھیں۔

۴۔ وَ تَظُنُّوۡنَ بِاللّٰہِ الظُّنُوۡنَا: اور تم لوگ اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے۔ منافقین اور کمزور ایمان والے اسلام کی حقانیت، رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی صداقت کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے کہ اب جاہلیت لوٹ آنے والی ہے وغیرہ وغیرہ۔

ہُنَالِکَ ابۡتُلِیَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ وَ زُلۡزِلُوۡا زِلۡزَالًا شَدِیۡدًا ﴿۱۱﴾

۱۱۔ اس وقت مومنین خوب آزمائے گئے اور انہیں پوری شدت سے ہلا کر رکھ دیا گیا۔

تفسیر آیات

۱۔ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ: اس جنگ کے امتحان میں جہاں منافقین اور ضعیف الایمان فاش ہو گئے وہاں مومنین خوب آزمائے گئے۔ اس آزمائش سے ان کے ایمان کی حقیقت نکھر گئی۔

۲۔ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا: اور مومنین کو ہلا کر رکھ دیا گیا۔ حالات اس قدر سنگین ہو گئے اور خطرہ اس قدر عظیم ہو گیا تھا کہ پختہ ایمان والوں کو بھی خوف و اضطراب نے ہلا دیا۔ ان کے ایمان میں تزلزل نہیں آیا بلکہ ان کے وجود میں تزلزل آیا۔ ہوسکتا ہے یہ ایمان کی پختگی اور خلوص کا نتیجہ ہو کہ وہ اس تصور سے ہل گئے ہوں کہ اسلام کا کیا بنے گا اور اہل ایمان کو کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس ہلنے کا ذکر منافقین کے مقابلے میں آیا ہے جن کے لیے فرمایا کہ وہ طرح طرح کے گمان کر رہے تھے جب کہ مومنین اس امتحان میں شدید اضطراب میں مبتلا ہوئے مگر وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے بارے میں طرح طرح کے گمان نہیں کر رہے تھے۔

وَاِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اِلَّا غُرُوْرًا ⑫	۱۲۔ اور جب منافقین اور دلوں میں بیماری رکھنے والے کہ رہے تھے: اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے جو وعدہ کیا تھا وہ فریب کے سوا کچھ نہ تھا۔

تفسیر آیات

قابل توجہ بات یہ ہے کہ یہاں منافقین کے ساتھ بیمار دل لوگوں کا بھی ذکر ہے کہ دونوں کا ایک ہی موقف ہے۔ منافقین وہ لوگ ہیں جو ایمان کا اظہار کرتے ہیں مگر دل سے ایمان کا انکار کرتے ہیں۔ بیمار قلب وہ لوگ ہیں جو ایمان کا اظہار کرتے ہیں لیکن ان کے دل کے ایمان میں تزلزل ہے۔ ایمان میں ثبات نہ ہونے کی وجہ سے وہ منافقین کے ہم خیال بن جاتے ہیں۔ لہٰذا قرآن کی صراحت کی روشنی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معاصرین تین گروہوں پر مشتمل تھے:

i۔ راسخ الایمان والے، جو اپنے امتحان میں کامیاب ثابت ہوتے ہیں۔

ii۔ بیمار دل والے، جن کے ایمان میں رسوخ نہیں۔ آزمائش کے وقت ان کے ایمان میں تزلزل آتا ہے اور منافقوں کے ہمنوا بن جاتے ہیں۔

iii۔ منافقین، جن کے دلوں میں کفر راسخ ہے اگرچہ زبان سے اسلام کا اظہار کرتے ہیں۔

۲۔ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اِلَّا غُرُوْرًا: منافقین اور مریض دل دونوں کی ایک ہی سوچ ہو گئی

تھی کہ جو فتح و نصرت کا وعدہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے دیا گیا ہے وہ بس ایک دھوکہ ہی تھا۔ نہ یہ وعدہ اللہ کا تھا، نہ کسی رسول کا۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول نہیں ہیں اور جو وعدۂ فتح اپنے کو رسول ظاہر کر کے اللہ کی طرف سے کیا ہے وہ ایک دھوکہ ہے۔ ورنہ وہ اگر اس وعدے کو اللہ کی طرف سے سمجھتے تو اللہ کی طرف دھوکے کی نسبت نہ دیتے۔

وَ اِذۡ قَالَتۡ طَّآئِفَۃٌ مِّنۡہُمۡ یٰۤاَہۡلَ یَثۡرِبَ لَا مُقَامَ لَکُمۡ فَارۡجِعُوۡا ۚ وَ یَسۡتَاۡذِنُ فَرِیۡقٌ مِّنۡہُمُ النَّبِیَّ یَقُوۡلُوۡنَ اِنَّ بُیُوۡتَنَا عَوۡرَۃٌ ؕ وَ مَا ہِیَ بِعَوۡرَۃٍ ۚۛ اِنۡ یُّرِیۡدُوۡنَ اِلَّا فِرَارًا ﴿۱۳﴾

۱۳۔ اور جب ان میں سے ایک گروہ کہنے لگا: اے یثرب والو! تمہارے لیے یہاں ٹھہرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے پس لوٹ جاؤ اور ان میں سے ایک گروہ نبی سے اجازت طلب کر رہا تھا یہ کہتے ہوئے: ہمارے گھر کھلے پڑے ہیں حالانکہ وہ کھلے نہیں تھے، وہ صرف بھاگنا چاہتے تھے۔

تشریح کلمات

یَثۡرِبَ: مدینے کا قدیمی نام یثرب تھا بعض کے مطابق یثرب ایک سرزمین کا نام ہے اور مدینہ اس سرزمین کا ایک حصہ ہے۔ بعض کے نزدیک یثرب اس شخص کا نام ہے جو عمالیق میں سے یہاں آباد ہوا۔[1] بقول بعضے مدینہ کو یثرب کہنے میں کراہت ہے چونکہ تثریب علامت کو کہتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اسی لیے اس شہر کا نام طیبہ رکھا تھا۔ چنانچہ ابن عباس سے روایت منقول ہے:

لا تدعونها یثرب فانها طیبة۔[2] اسے یثرب نہ کہو، یہ طیبہ ہے۔

عَوۡرَۃٌ: غیر محفوظ کے معنوں میں ہے۔ کہتے ہیں دار ذات عورة۔ جب اس گھر میں داخل ہونا آسان ہو اور ہر وہ جگہ جو غیر محفوظ ہو اسے عَوۡرَۃٌ کہتے ہیں۔ العورة: الشغر بین الجبلین الذی یتمکن العدو ان یتسرب منه الی الحی۔ العورة دو پہاڑوں کے درمیانی درے کو کہتے ہیں جہاں سے کسی آبادی میں گھسنا آسان ہو۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اِذۡ قَالَتۡ طَّآئِفَۃٌ مِّنۡہُمۡ یٰۤاَہۡلَ یَثۡرِبَ لَا مُقَامَ لَکُمۡ: منافقین کے ایک گروہ نے کہا: اے یثرب والو! آج تمہارے لیے یہاں ٹھہرنے کی گنجائش نہیں رہی۔ یعنی محاذ جنگ پر ٹھہرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

---

[1] الجامع قرطبی ۱۴: ۱۴۷ [2] روح المعانی

ہے۔ یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ اسلام میں ٹھہرنے کی اب گنجائش نہیں رہی۔

۲۔ فَارۡجِعُوۡا: پہلے معنی کے اعتبار سے اس جملے کا یہ مطلب ہو گا: گھروں کو واپس چلو۔ دوسرے معنی کے اعتبار سے معنی یہ ہوگا: اپنے آبائی مذہب کی طرف واپس ہو جاؤ۔

۳۔ وَیَسۡتَاۡذِنُ فَرِیۡقٌ مِّنۡہُمُ: منافقین اور بیمار قلب لوگوں میں سے ایک گروہ اجازت طلب کر رہا ہے۔ چونکہ منافقین اور بیمار قلب دونوں کا ایک ہی موقف ہو گیا تھا لہٰذا مِّنۡہُمُ کی ضمیر دونوں کی طرف جانا قرین سیاق ہے۔

۴۔ اِنَّ بُیُوۡتَنَا عَوۡرَۃٌ: ان لوگوں نے یہ عذر تراشا کہ ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں۔ ان کے اس خودساختہ بہانے کو فاش کرتے ہوئے فرمایا: وَمَا ہِیَ بِعَوۡرَۃٍ۔ حالانکہ ان کے گھر غیر محفوظ نہیں ہیں۔ اپنے نفاق اور ایمان کی کمزوریوں کو چھپانے کے لیے گھڑا ہوا ایک عذر ہے۔

۵۔ اِنۡ یُّرِیۡدُوۡنَ اِلَّا فِرَارًا: وہ اس بہانے جنگ سے فرار ہونا چاہتے ہیں۔

وَلَوۡ دُخِلَتۡ عَلَیۡہِمۡ مِّنۡ اَقۡطَارِہَا ثُمَّ سُئِلُوا الۡفِتۡنَۃَ لَاٰتَوۡہَا وَمَا تَلَبَّثُوۡا بِہَاۤ اِلَّا یَسِیۡرًا ﴿۱۴﴾	۱۴۔ اور اگر (دشمن) ان پر شہر کے اطراف سے گھس آتے پھر انہیں اس فتنے کی طرف دعوت دی جاتی تو وہ اس میں پڑ جاتے اور اس میں صرف تھوڑا ہی توقف کرتے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَوۡ دُخِلَتۡ عَلَیۡہِمۡ: اگر احزاب کے لشکر ان پر چڑھ آتے اور دشمن غالب آ جاتے اور انہیں فتنہ یعنی مرتد ہونے اور دوبارہ کفر اختیار کرنے کی دعوت دیتے تو یہ لوگ اس دعوت کو قبول کرنے میں صرف اتنا توقف کرتے جتنا وقت کفر کی دعوت دینے پر لگتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ منافقین کے ساتھ ضعیف الایمان لوگ بھی صرف آسودگی کی حالت میں اسلام کا دم بھرتے تھے۔ آزمائش میں یہ لوگ چند لمحوں میں کفر اختیار کرنے والے ہیں۔

بعض الۡفِتۡنَۃَ سے قتال مراد لیتے ہیں کہ یہ لوگ اسلام کے دفاع میں لڑنے کے لیے تو آمادہ نہیں ہیں لیکن مشرکین و کفار کے ساتھ اسلام کے خلاف لڑنے میں کوئی تامل نہیں کریں گے۔

الۡفِتۡنَۃَ سے دونوں باتیں مراد ہوسکتی ہیں۔ یعنی مرتد ہو کر مسلمانوں کے خلاف لڑنے کے لیے آمادہ ہوں گے۔

وَلَقَدۡ کَانُوۡا عَاہَدُوا اللّٰہَ مِنۡ قَبۡلُ لَا یُوَلُّوۡنَ الۡاَدۡبَارَ ؕ وَ کَانَ عَہۡدُ اللّٰہِ مَسۡـُٔوۡلًا ﴿۱۵﴾	۱۵۔ حالانکہ پہلے یہ لوگ اللہ سے عہد کر چکے تھے کہ پیٹھ نہیں پھیریں گے اور اللہ کے ساتھ ہونے والے عہد کے بارے میں باز پرس ہو گی۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَقَدۡ کَانُوۡا عَاہَدُوا اللّٰہَ مِنۡ قَبۡلُ: اس آیت کے مصداق کے بارے میں تین اقوال ہیں:

i۔ اس سے مراد لیلة العقبة کا معاہدہ ہے کہ مدینہ سے ستر افراد مکہ جاتے ہیں اور رسول اللہؐ سے معاہدہ کرتے ہیں۔ یہ ستر افراد انصار میں سابقین اولین ہیں۔

اگرچہ روح المعانی اور الکشاف میں ابن عباس سے اور تفسیر قرطبی میں مقاتل اور کلبی سے روایت کی گئی ہے کہ اس سے مراد لیلة العقبة کا معاہدہ ہے۔

لیکن بعید ہے انصار میں سے جو لوگ سابقین اولین ہیں وہ منافقت اور ضعف ایمانی میں اولین ہو جائیں اور دوسروں سے زیادہ جنگ سے فرار ہونے والے ثابت ہوں۔

ii۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو جنگ بدر میں شرکت نہ کرنے پر نادم تھے اور انہوں نے آیندہ ہر جنگ میں شرکت کرنے کا عہد کر رکھا تھا۔

iii۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد بنی حارثہ اور بنی مسلمہ کے دو قبیلے ہیں۔ ان دو قبیلوں نے جنگ احد میں بزدلی دکھائی تھی جن کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی تھی:

اِذۡ ہَمَّتۡ طَّآئِفَتٰنِ مِنۡکُمۡ اَنۡ تَفۡشَلَا ...[1]	(یہ اس وقت کی بات ہے) جب تم میں سے دو گروہ بزدلی دکھانے پر آمادہ ہو گئے تھے۔

لیکن اس عہد کے تعین کے لیے ان لوگوں کا تعین ضروری ہے جنہوں نے جنگ احزاب سے فرار ہونے کے بہانے تلاش کیے ہیں۔ روایات اس بارے میں متضارب ہیں۔

قُلۡ لَّنۡ یَّنۡفَعَکُمُ الۡفِرَارُ اِنۡ فَرَرۡتُمۡ مِّنَ الۡمَوۡتِ اَوِ الۡقَتۡلِ وَ اِذًا لَّا تُمَتَّعُوۡنَ اِلَّا قَلِیۡلًا ﴿۱۶﴾	۱۶۔ کہدیجیے: اگر تم لوگ موت یا قتل سے فرار چاہتے ہو تو یہ فرار تمہیں فائدہ نہ دے گا اور (زندگی کی) لذت کم ہی حاصل کر سکو گے۔

----

[1] ۳ آل عمران: ۱۲۲

تفسیر آیات

جنگ سے فرار ہونے کو نادان موت سے فرار ہونا تصور کرتا اور موت کا فیصلہ اپنے ہاتھ میں لیتا ہے جب کہ جنگ سے فرار کی وجہ سے موت سے فرار ہوا جا سکتا ہے نہ ہی موت کا فیصلہ انسان کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ صرف چند دنوں کا فاصلہ ہوگا جس کے بعد وہ موت کے منہ میں چلے جائیں گے۔ اگر راہ خدا میں جنگ میں ثابت قدم رہتے تو ممکن ہے مجاہد بن کر برسوں زندہ رہتے۔

قُلۡ مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَعۡصِمُکُمۡ مِّنَ اللّٰہِ اِنۡ اَرَادَ بِکُمۡ سُوۡٓءًا اَوۡ اَرَادَ بِکُمۡ رَحۡمَۃً ؕ وَ لَا یَجِدُوۡنَ لَہُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ وَلِیًّا وَّ لَا نَصِیۡرًا ﴿۱۷﴾

۱۷۔ کہد یجیے: اللہ سے تمہیں کون بچا سکتا ہے اگر وہ تمہیں نقصان پہنچانا چاہے؟ یا تم پر رحمت کرنا چاہے (تو کون روک سکتا ہے؟) اور یہ لوگ اللہ کے سوا کسی کو نہ ولی پائیں گے اور نہ مددگار۔

تفسیر آیات

۱۔ قُلۡ مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَعۡصِمُکُمۡ: جنگ سے فرار ہونے والوں سے پوچھیے: اللہ کے ارادے کے سامنے تمہارا کون سا بس چلے گا؟ کیا اللہ کی طرف سے آنے والے کسی فیصلے کو ٹالنے کی تم میں طاقت ہے؟

۲۔ اِنۡ اَرَادَ بِکُمۡ سُوۡٓءًا: اگر اللہ کا ارادہ یہ ہو تم پر بلا نازل ہو تو کیا تم اسے ٹال سکتے ہو:

وَ اِنۡ یَّمۡسَسۡکَ اللّٰہُ بِضُرٍّ فَلَا کَاشِفَ لَہٗۤ اِلَّا ہُوَ ...[1]

اور اگر اللہ آپ کو کسی تکلیف میں ڈالے تو اس کے سوا کوئی نہیں جو اس تکلیف کو دور کرے۔

۳۔ اَوۡ اَرَادَ بِکُمۡ رَحۡمَۃً: اور اگر اللہ کا ارادہ یہ ہو تم پر رحمت نازل ہو تو کیا اسے کوئی روک سکتا ہے؟

وَ اِنۡ یُّرِدۡکَ بِخَیۡرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضۡلِہٖ ...[2]

اور اگر اللہ آپ سے بھلائی کرنا چاہے تو اس کے فضل کو روکنے والا کوئی نہیں۔

جن پر اللہ کی طرف سے بلا نازل ہونے والی ہو یا کسی قوم پر اللہ کی رحمتوں کا نزول ہونے والا ہو تو دونوں صورتوں میں اللہ کے دشمن اس بلا کو نہیں ٹال سکتے اور رحمتوں کے نزول کے اہل لوگوں کے دشمن اس رحمت کو روک نہیں سکتے۔ چونکہ یہ عالم علل و اسباب کا عالم ہے اور علل و اسباب صرف اللہ کے اختیار میں ہیں۔ وہ کسی مقصد کے لیے سبب پیدا کر دیتا ہے۔ چونکہ وہی مسبب الاسباب ہے اور کسی مقصد کے لیے سبب سے اس کے اثر کو سلب کر دیتا ہے۔

---

[1] و [2] ۱۰ یونس: ۱۰۷

۴۔ وَلَا یَجِدُوۡنَ لَھُمۡ : یہ اسباب اللہ کے علاوہ کسی کے لیے مسخر نہیں ہیں کہ وہ کسی کی مدد کر سکیں۔

اہم نکات

۱۔ ارادۂ الٰہی کے سامنے کسی کا بس نہیں چلتا: اَرَادَبِکُمۡ سُوۡٓءًا....

۲۔ علل و اسباب صرف اللہ کے لیے مسخر ہیں۔

قَدۡ یَعۡلَمُ اللّٰہُ الۡمُعَوِّقِیۡنَ مِنۡکُمۡ وَالۡقَآئِلِیۡنَ لِاِخۡوَانِہِمۡ ھَلُمَّ اِلَیۡنَا ۚ وَلَا یَاۡتُوۡنَ الۡبَاۡسَ اِلَّا قَلِیۡلًا ﴿۱۸﴾

۱۸۔ اللہ تم میں سے رکاوٹیں ڈالنے والوں کو خوب جانتا ہے اور ان کو جو اپنے بھائیوں سے کہتے ہیں: ہماری طرف آؤ اور جو جنگ میں کبھی کبھار ہی شرکت کرتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ قَدۡ یَعۡلَمُ اللّٰہُ الۡمُعَوِّقِیۡنَ مِنۡکُمۡ : اللہ ان لوگوں کو بھی خوب جانتا ہے جو لوگوں کو جنگ میں شرکت سے روکتے ہیں۔ مِنۡکُمۡ : یہ لوگ خود مسلمانوں کی صفوں کے اندر ہیں اور ہوسکتا ہے مِنۡکُمۡ سے مراد خود منافقین ہوں جن سے لَّنۡ یَّنۡفَعَکُمُ کا خطاب ہے۔

۲۔ وَالۡقَآئِلِیۡنَ لِاِخۡوَانِہِمۡ : اپنی نظریاتی برادری کے لوگوں کو جو ضعیف الایمان اور منافقین ہیں ہماری طرف آجاؤ کہہ کر بلانے والے وہی معوقین، روکنے والے لوگ ہو سکتے ہیں۔ اس سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ یہ معوقین خود جنگ میں شریک نہیں ہیں اور دوسروں کو جو جنگ میں بظاہر شریک ہیں، اپنی طرف بلا رہے ہیں۔ آیت کا اگلا جملہ اس پر قرینہ بھی ہے۔

۳۔ وَلَا یَاۡتُوۡنَ الۡبَاۡسَ اِلَّا قَلِیۡلًا : یہ وہ لوگ ہیں جو خود جنگ میں شریک نہیں ہوتے۔ اِلَّا قَلِیۡلًا میں قلیل سے مراد وہ زمانہ ہوسکتا ہے جس میں مسلمانوں کے لشکر میں شامل رہے ہوں۔ چونکہ یہ لوگ بظاہر لشکر اسلام میں کچھ دیر شامل رہتے تھے پھر بہانے بنا کر میدان جنگ چھوڑ جاتے تھے۔

اَشِحَّۃً عَلَیۡکُمۡ ۚۖ فَاِذَا جَآءَ الۡخَوۡفُ رَاَیۡتَہُمۡ یَنۡظُرُوۡنَ اِلَیۡکَ تَدُوۡرُ اَعۡیُنُہُمۡ کَالَّذِیۡ یُغۡشٰی عَلَیۡہِ مِنَ الۡمَوۡتِ ۚ فَاِذَا ذَھَبَ

۱۹۔ تم سے دریغ رکھتے ہیں چنانچہ جب خوف کا وقت آ جائے تو آپ انہیں دیکھیں گے کہ وہ آنکھیں پھیرتے ہوئے ایسے آپ کی طرف دیکھ رہے ہیں جیسے کسی مرنے والے پر غشی طاری ہو رہی ہو،

الۡخَوۡفُ سَلَقُوۡكُمۡ بِاَلۡسِنَةٍ حِدَادٍ اَشِحَّةً عَلَى الۡخَيۡرِ ؕ اُولٰٓئِكَ لَمۡ يُؤۡمِنُوۡا فَاَحۡبَطَ اللّٰهُ اَعۡمَالَهُمۡ ؕ وَ كَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيۡرًا ﴿۱۹﴾

پھر جب خوف ٹل جاتا ہے تو وہ مفاد کی حرص میں چرب زبانی کے ساتھ تم پر بڑھ چڑھ کر بولیں گے، یہ لوگ ایمان نہیں لائے اس لیے اللہ نے ان کے اعمال حبط کر دیے اور یہ اللہ کے لیے (بہت) آسان ہے۔

تشریح کلمات

اَشِحَّةً: (ش ح ح) الشح کے معنی حرص کے ساتھ بخل کے ہیں جو انسان کی عادت میں داخل ہو چکا ہے۔

سَلَقُوۡكُمۡ: (س ل ق) السلق غصے کے ساتھ زبان درازی کے معنی میں ہے۔

حِدَادٍ: (ح د د) حداد تیزی کے معنی میں ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اَشِحَّةً عَلَيۡكُمۡ: وہ جانی قربانی دینے میں بخل سے کام لیتے ہیں۔ عَلَيۡكُمۡ یعنی رسولؐ اور مسلمانوں کی مصلحت میں کوئی کردار ادا کرنے سے کتراتے اور مال خرچ کرنے سے دریغ کرتے ہیں۔

۲۔ فَاِذَا جَآءَ الۡخَوۡفُ: ان منافقین کے دلوں میں چونکہ ایمان نہیں ہے لہذا وہ جنگ میں نہ صرف دلچسپی نہیں رکھتے بلکہ اسے مال و جان کا ضیاع تصور کرتے ہیں۔ لہٰذا ان پر خوف طاری ہونا ایک قدرتی بات ہے۔

ان منافقین کے دلوں میں خوف کی حالت اس وقت دیکھنے میں آئی ہو گی جب عمرو بن عبدود خندق پھلانگ کر آیا۔ چنانچہ مؤلف التحریر و التنویر نے اس آیت کے ذیل میں لکھا ہے:

والظاھران الایة تشیر الی ما حصل فی بعض ایام الاحزاب من القتال بین الفرسان الثلاثة الذین اقتحموا الخندق من اضیق جھاته و بین علی بن ابی طالب و من معه من المسلمین۔

ظاہراً یہ آیت اس واقعہ کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو جنگ احزاب کے بعض دنوں میں خندق پھلانگ کر آنے والے تین شہسواروں اور علی بن ابی طالب اور ان کے ساتھ مسلمانوں کے درمیان واقع ہوا۔

۳۔ تَدُوۡرُ اَعۡيُنُهُمۡ: خوف کے مارے ان کی آنکھیں دائیں بائیں اوپر نیچے گھوم رہی تھیں اور حالت موت کا منظر پیش کر رہی تھیں۔

۴۔ فَاِذَا ذَهَبَ الۡخَوۡفُ سَلَقُوۡكُمۡ: جب خوف کا بادل چھٹ جاتا ہے اور غنیمت کی تقسیم کا وقت

آتا ہے تو بولنے میں بڑی تیزی دکھاتے ہیں اور سَلَقُوْكُمْ وہ تم سے بڑھ چڑھ کر بولتے ہیں۔ غیض و غضب کے ساتھ بولتے ہیں۔ بِاَلْسِنَةٍ حِدَادٍ۔ چرب زبانی کے ساتھ بولتے ہیں جیسے پورا معرکہ ان ہی لوگوں نے سر کیا ہو۔

۵۔ اُولٰٓئِكَ لَمْ يُؤْمِنُوْا: ان کے دلوں میں ایمان کبھی جاگزین نہیں ہوا تھا۔ اس لیے ایمان کی کسی قسم کی علامت ان سے ظاہر نہ ہوتی تھی۔

۶۔ فَاَحْبَطَ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ: عدم ایمان کے ساتھ جو بھی اچھا عمل سرزد ہو گا وہ حبط ہو جائے گا۔ حبط، عمل کو باطل اور بے اثر قرار دینے کو کہتے ہیں۔ چنانچہ احباط دم القتیل اس وقت کہتے ہیں جب مقتول کا قصاص لینے کا حق سلب کیا جاتا ہے۔ اہل لغت نے کہا ہے: حبط کے اصل میں معنی زیادہ گھاس کھانے کی وجہ سے اونٹ کے شکم پھولنے کی وجہ سے مر جانے کو کہتے ہیں۔ اس مناسبت سے خواہش پرستی کی وجہ سے ایمان ترک کرنے کو بھی حبط کہا چونکہ اس میں بھی ہلاکت ہے۔

اسلامی تعلیمات کے مطابق انسان کا عمل اس وقت حبط، باطل اور بے اثر ہو جاتا ہے جب اس عمل کے بجا لانے کے اصل محرک میں خلل آ جائے۔ مثلاً ریاکاری سے عمل حبط ہو جاتا ہے۔ ایمان چونکہ اعمال صالحہ بجالانے کے محرکات میں بنیادی محرک ہے لہٰذا ایمان میں خلل آنے کی صورت میں عمل حبط ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں قابل توجہ بات یہ ہے کہ اگر کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقام رسالت کا حق ادا نہ کرے تو یہ اس کے ایمان میں خلل کی علامت ہے اور اس کے اعمال حبط ہو جاتے ہیں۔ جیسے فرمایا:

لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۝ [1]

اپنی آوازیں نبی کی آواز سے بلند نہ کرو اور نبی کے ساتھ اونچی آواز سے بات نہ کرو جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے سے اونچی آواز میں بات کرتے ہو کہیں تمہارے اعمال حبط ہو جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔

یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آواز سے اپنی آواز اونچی کرنا مقام رسالت کے احترام کے منافی ہے جو اصل ایمان میں خلل ہونے کی علامت ہے۔ اس سے عمل حبط ہو جاتا ہے۔ ہم نے یہ بات مکرر لکھی ہے کہ عمل میں حسن و خوبی عمل کرنے والے میں موجود حسن و خوبی کے تابع ہے۔ لہٰذا بعض آیات میں حبط عمل کو بطلانِ عمل کے ساتھ تعبیر فرمایا ہے:

لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ... [2]　اپنی خیرات کو احسان جتا کر اور ایذا دے کر برباد نہ کرو۔

اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ ۝ [3]　اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو ضائع نہ کرو۔

۱؎ ۴۹ حجرات: ۲　۲؎ ۲ بقرۃ: ۲۶۴　۳؎ ۴۷ محمد: ۳۳

بعض دیگر آیات نے حبط کو خاکستر اور ھباء منثور پراگندہ غبار کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ اسی طرح نفاق بھی حبط عمل کا موجب ہے۔

حبط عمل کے اسباب درج ذیل ہیں:

کفر، شرک، نفاق اور مرتد ہونا۔ ریاکاری، رسول اللہ ﷺ کی بے احترامی، احسان جتانا اور اعمال کی انجام دہی میں اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کو بنیاد نہ بنانا۔

اس جگہ ایک اختلاف یہ سامنے آیا کہ مسلمان مرتد ہو جاتا ہے تو اس کا عمل حبط ہو جاتا ہے۔ اگر وہ دوبارہ اسلام میں داخل ہو جاتا ہے تو کیا اس کا حبط شدہ عمل بحال ہو گا یا نہیں؟ مالکی و حنفی کے نزدیک بحال نہ ہو گا۔ مثلاً اگر اس نے حج کیا ہے تو ارتداد کے بعد دوبارہ اسلام قبول کرنے پر دوبارہ حج کرنا پڑے گا۔ شافعی کے نزدیک بحال ہو گا، دوبارہ حج نہیں کرنا پڑے گا۔

لیکن قرآن نے حبط اعمال کے لیے کفر کی حالت میں مرنے کی شرط عائد کی ہے:

وَ مَنۡ یَّرۡتَدِدۡ مِنۡکُمۡ عَنۡ دِیۡنِہٖ فَیَمُتۡ وَ ہُوَ کَافِرٌ فَاُولٰٓئِکَ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُہُمۡ فِی الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَۃِ ...[1]	اور تم میں سے جو اپنے دین سے پھر جائے گا اور کفر کی حالت میں مرے گا ایسے لوگوں کے اعمال دنیا اور آخرت دونوں میں اکارت ہوں گے۔

لہٰذا اگر دیگر آیات میں بطور مطلق حبط اعمال کا ذکر ہے تو انہیں اس مقید آیت پر محمول کیا جاتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ اسلام کے لیے عدم ایثار، حالت خوف میں بے چینی سے پیچھے ہٹنا، امن کی حالت میں مفاد پرستی میں آگے آنا نفاق کی علامات ہیں۔

یَحۡسَبُوۡنَ الۡاَحۡزَابَ لَمۡ یَذۡہَبُوۡا ۚ وَ اِنۡ یَّاۡتِ الۡاَحۡزَابُ یَوَدُّوۡا لَوۡ اَنَّہُمۡ بَادُوۡنَ فِی الۡاَعۡرَابِ یَسۡاَلُوۡنَ عَنۡ اَنۡۢبَآئِکُمۡ ؕ وَ لَوۡ کَانُوۡا فِیۡکُمۡ مَّا قٰتَلُوۡۤا اِلَّا قَلِیۡلًا ﴿۲۰﴾	۲۰۔ یہ خیال کر رہے ہیں کہ (ابھی) فوجیں گئی نہیں ہیں اور اگر وہ پھر حملہ کریں تو یہ آرزو کریں گے کہ کاش! صحرا میں دیہاتوں میں جا بسیں اور تمہاری خبریں پوچھتے رہیں، اگر وہ تمہارے درمیان ہوتے تو لڑائی میں کم ہی حصہ لیتے۔

تشریح کلمات

بَادُوۡنَ: (ب د و) البادی صحرا نشین۔ سواء العاکف فیه و الباد۔

---

[1] ۲ بقرۃ: ۲۱۷

تفسیر آیات

۱۔ منافقین کے لیے یہ خبر غیر متوقع تھی کہ لشکر ہائے کفار یہاں سے چلے گئے۔ لہٰذا ان کو اس پر یقین نہیں آ رہا تھا اور ابھی ان کے دلوں میں خوف و اضطراب موجود ہے۔

۲۔ وَاِنۡ یَّاۡتِ الۡاَحۡزَابُ: ان کے خوف و اضطراب کا یہ عالم تھا کہ اگر لشکر ہائے کفار دوبارہ حملہ آور ہوتے تو یہ اس قدر دہشت زدہ ہو جاتے کہ یہ آرزو یا کوشش کرتے کہ صحرا نشینوں میں بیٹھ کر جنگ کے خطرات سے محفوظ ہو جائیں۔

۳۔ یَسۡاَلُوۡنَ عَنۡ اَنۡۢبَآئِکُمۡ: انہیں تمہاری خبروں میں دلچسپی ہوتی کہ احزاب کی جنگ میں مسلمانوں کا کیا حشر ہوا۔

۴۔ وَلَوۡ کَانُوۡا فِیۡکُمۡ مَّا قٰتَلُوۡۤا اِلَّا قَلِیۡلًا: اگر وہ لشکر میں شریک ہوتے تو بھی لڑائی میں کم حصہ لیتے۔ لہٰذا اسلامی لشکر کو ان کی عدم شمولیت سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اہم نکات

۱۔ منافق کو مسلمانوں کی سرنوشت کی خبر میں دلچسپی ہوتی ہے۔

لَقَدۡ کَانَ لَکُمۡ فِیۡ رَسُوۡلِ اللّٰہِ اُسۡوَۃٌ حَسَنَۃٌ لِّمَنۡ کَانَ یَرۡجُوا اللّٰہَ وَ الۡیَوۡمَ الۡاٰخِرَ وَ ذَکَرَ اللّٰہَ کَثِیۡرًا ﴿۲۱﴾

۲۱۔ بتحقیق تمہارے لیے اللہ کے رسول میں بہترین نمونہ ہے، ہر اس شخص کے لیے جو اللہ اور روز آخرت کی امید رکھتا ہو اور کثرت سے اللہ کا ذکر کرتا ہو۔

تشریح کلمات

اُسۡوَۃٌ: (ا س و) انسان کی اس حالت کو کہتے ہیں جس میں وہ دوسرے کا متبع ہوتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ لَقَدۡ کَانَ لَکُمۡ فِیۡ رَسُوۡلِ اللّٰہِ اُسۡوَۃٌ حَسَنَۃٌ: بہتر نمونہ عمل فِیۡ رَسُوۡلِ اللّٰہِ ذات رسولؐ میں ہے۔ کسی صفت کے اعتبار سے نہیں۔ مثلاً یہ نہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی شجاعت یا صبر و استقلال میں نمونۂ عمل ہے۔ اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ذات رسولؐ مجموعہ کمالات ہے۔ رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جو مسلمانوں کے لیے نمونہ عمل نہ ہو۔ اس سے دو باتیں سامنے آتی ہیں:

i۔ رسولؐ کی عصمت کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے کوئی عمل نسیان یا خطا کی وجہ سے صادر نہیں ہو سکے گا۔

اگر رسولؐ سے غلطی صادر ہو سکتی ہے تو رسولؐ کی ذات اسوہ نہیں ہے بلکہ دیگر مسلمانوں کی طرح واتبعوھم باحسان نیک چال چلن میں ان کی پیروی کرنا ہو گی۔ لہٰذا جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو جائز الخطا مجتہد مانتے ہیں وہ قرآن اور عصمت رسولؐ کے خلاف ہیں۔

ii۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے حکم کے خلاف جانا کسی صورت جائز نہیں ہے۔ جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے حکم کے خلاف جانے والوں کے بارے میں یہ کہتے ہیں دو مجتہدوں میں اختلاف میں کوئی حرج نہیں۔ وہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ذات میں موجود اسوہ حسنہ کے منکر ثابت ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک رسولؐ کا فرمان اور آپؐ کا عمل حجت نہیں ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ آیت اسوہ کا ذکر اللہ تعالیٰ نے دو حالات کے درمیان فرمایا ہے: ایک طرف مومنین کی آزمائش اور ان کے لیے وَزُلۡزِلُوۡا زِلۡزَالًا شَدِیۡدًا اور منافقین اور ضعیف الایمان لوگوں کی اضطرابی حالت بیان فرمائی ہے۔ اور دوسری طرف آیت ۲۲ میں ان مومنین کا ذکر آیا ہے کہ لشکر ہائے کفر کو دیکھ کر ان کے ایمان و یقین میں اضافہ ہوتا ہے۔

ان دو متضاد کرداروں کے درمیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ذات کو اسوہ قرار دیا گیا کہ منافقین اور ضعیف الایمان لوگوں کے لیے اسوۂ رسولؐ ایک دلیل و حجت تھی جس سے آپؐ کی رسالت اور اس کی حقانیت واضح طور پر ثابت ہو جاتی ہے۔

چنانچہ حضرت علی علیہ السلام اپنی شجاعت و بہادری میں یکتا ہونے کے باوجود فرماتے ہیں:

کُنَّا اِذَا احۡمَرَّ الۡبَأۡسُ اتَّقَیۡنَا بِرَسُوۡلِ اللّٰہِ ص فَلَمۡ یَکُنۡ اَحَدٌ مِنَّا اَقۡرَبَ اِلَی الۡعَدُوِّ مِنۡہُ...[1]	جب جنگ شدید ہو جاتی تو ہم رسول اللہؐ کی پناہ میں جاتے تھے چنانچہ رسول اللہؐ ہم سب سے زیادہ دشمن کے نزدیک ہوتے تھے۔

اور خندق کی کھدائی میں دیگر مسلمانوں کے ساتھ ساتھ کھدائی کے کام میں برابر کا حصہ لیتے تھے۔ اس طرح مومنین کو اپنے ایمان میں اضافے اور یقین کو مزید پختہ کرنے کا موقع ملا۔

۲۔ لِّمَنۡ کَانَ یَرۡجُوا اللّٰہَ وَ الۡیَوۡمَ الۡاٰخِرَ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو وہ لوگ اسوہ قرار دیتے ہیں جو اللہ کی بارگاہ میں جانے پر یقین رکھتے ہیں چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کو قبول کرنے کی صورت میں نجات ہے۔ اس میں اشارہ ہے ان لوگوں کی طرف جو رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے قول و فعل میں شک و شبہ کرتے ہیں خواہ جنگ میں شریک معاصرین ہوں یا بعد والے وہ لوگ ہوں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو جائز الخطا سمجھتے ہیں۔

۳۔ وَ ذَکَرَ اللّٰہَ کَثِیۡرًا: اور رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اسوہ کو وہ لوگ مشعل راہ قرار دیں گے جو خواب غفلت

---

[1] نہج البلاغہ۔ قصار الکلمات: ۹ فصل الغرائب

میں نہیں ہیں۔ کثرت سے ذکر خدا کرتے ہیں۔ یہ لوگ بیدار دل ہوتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے تمام گوشے نمونہ عمل ہیں۔

۲۔ اسوہ کا مطلق ذکر کرنے سے یہ بات واضح ہو گئی کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جائز الخطا نہیں ہیں۔ اگر جائز الخطا ہوتے تو اللہ بِاِحۡسَانٍ کی طرح کوئی قید عائد فرماتا۔

وَ لَمَّا رَاَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الۡاَحۡزَابَ ۙ قَالُوۡا ہٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰہُ وَ رَسُوۡلُہٗ وَ صَدَقَ اللّٰہُ وَ رَسُوۡلُہٗ ۫ وَ مَا زَادَہُمۡ اِلَّاۤ اِیۡمَانًا وَّ تَسۡلِیۡمًا ﴿ؕ۲۲﴾

۲۲۔ اور جب مومنوں نے لشکر دیکھے تو کہنے لگے: یہ وہی ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا اور اللہ اور اس کے رسول نے سچ کہا تھا اور اس واقعے نے ان کے ایمان اور تسلیم میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ لَمَّا رَاَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الۡاَحۡزَابَ: جب صدق دل سے ایمان پر قائم لوگوں نے لشکر ہائے کفر کو دیکھا تو جو وعدہ الٰہی ان کے ذہنوں میں راسخ تھا وہ یاد آ گیا۔ بعض کے نزدیک اس وعدے سے مراد سورہ بقرہ آیت ۲۱۴ ہے جو ابن عباس کی روایت کے مطابق واقعہ احزاب سے ایک سال پہلے نازل ہوئی تھی۔ وہ آیت یہ ہے:

اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّۃَ وَ لَمَّا یَاۡتِکُمۡ مَّثَلُ الَّذِیۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلِکُمۡ ؕ مَسَّتۡہُمُ الۡبَاۡسَآءُ وَ الضَّرَّآءُ وَ زُلۡزِلُوۡا حَتّٰی یَقُوۡلَ الرَّسُوۡلُ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَہٗ مَتٰی نَصۡرُ اللّٰہِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ نَصۡرَ اللّٰہِ قَرِیۡبٌ ﴿﴾

کیا تم خیال کرتے ہو کہ یونہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تمہیں اس قسم کے حالات پیش نہیں آئے جو تم سے پہلوں کو پیش آئے تھے؟ انہیں سختیاں اور تکالیف پہنچیں اور وہ اس حد تک جھنجھوڑے گئے کہ (وقت کا) رسول اور اس کے مومن ساتھی پکار اٹھے کہ آخر اللہ کی نصرت کب آئے گی؟ (انہیں بشارت دے دی گئی کہ) دیکھو اللہ کی نصرت عنقریب آنے والی ہے۔

بعض دیگر کے نزدیک خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خبر دی تھی اور وعدۂ نصرت کا ذکر کیا تھا۔ بہرحال دونوں صورتوں میں اہل ایمان نے جب احزاب یعنی لشکر ہائے کفر کو دیکھا تو وعدۂ الٰہی یاد آ گیا اور ایمان میں پختگی آ گئی چونکہ اس وعدے کا پہلا حصہ وقوع پذیر ہو رہا ہے۔ وہ یہ تھا کہ اہل ایمان سابقہ امتوں کی

طرح سختیوں اور تکلیفوں کے ذریعے جھنجھوڑ دیے جائیں گے۔ مومنین نے دیکھا کہ انہیں وعدۂ الٰہی کے تحت جھنجھوڑا جا رہا ہے۔

احزاب کے لشکر اور اس وعدے اور پیشگوئی کا پہلا حصہ وقوع پذیر ہوتے دیکھ کر کہہ اٹھے: صدق اللّٰہ و رسولہ۔ اللہ اور اس کے رسولؐ نے سچ فرمایا۔

۲۔ وَ مَا زَادَهُمۡ اِلَّاۤ اِیۡمَانًا وَّ تَسۡلِیۡمًا: اس وعدہ الٰہی کا پہلا حصہ وقوع پذیر ہونے کے بعد اللہ کے وعدۂ نصرت اور رسول ﷺ کی رسالت پر ان کے ایمان میں مزید پختگی آ گئی۔

یہ بات واضح ہے کہ ایمان کے درجات ہوتے ہیں۔ کچھ ضعیف الایمان ہوتے ہیں۔ کچھ متوسط درجے کے ایمان پر فائز ہوتے ہیں اور چند ایک ہستیاں ایمان کے اعلیٰ ترین درجے پر فائز ہوتی ہیں۔ ایمان کا اعلیٰ ترین درجہ ایمان بالغیب سے بالاتر ایمان بالشہود کی منزل میں ہے۔ روایت ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

وَ اَبۡیَنُ مِمَّا تَرَی الۡعُیُوۡنِ ....[1]　وہ (اللہ) ان چیزوں سے بھی زیادہ (اپنے مقام پر) ثابت و آشکارا ہے کہ جنہیں آنکھیں دیکھتی ہیں۔

جب ایمان، شہود کی منزل میں آ جاتا ہے تو یہ مقام عصمت ہے لیکن جن کا ایمان، بالغیب کی منزلوں میں ہوتا ہے ان کا ایمان ترقی پذیر ہے۔

لِیَزۡدَادُوۡۤا اِیۡمَانًا مَّعَ اِیۡمَانِهِمۡ ....[2]　تاکہ ان کے ایمان کے ساتھ مزید ایمان کا اضافہ کرے۔

فَاَمَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا فَزَادَتۡهُمۡ اِیۡمَانًا ....[3]　پس ایمان والوں کے ایمان میں تو اس نے اضافہ ہی کیا ہے.

واقعۂ احزاب قرآن کی طرح ثابت ہوا قرآن میں مؤمنین کے لیے شفا و رحمت ہے اور کافروں کے لیے خسارت میں اضافہ ہے۔

وَ نُنَزِّلُ مِنَ الۡقُرۡاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحۡمَةٌ لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ۙ وَ لَا یَزِیۡدُ الظّٰلِمِیۡنَ اِلَّا خَسَارًا ○[4]　اور ہم قرآن میں سے ایسی چیز نازل کرتے ہیں جو مومنین کے لیے تو شفا اور رحمت ہے لیکن ظالموں کے لیے تو صرف خسارے میں اضافہ کرتی ہے۔

اسی قرآن میں رحمت ہے مومن کے لیے اور خسارہ ہے کافر کے لیے۔ جنگ احزاب سے مومن کے ایمان اور منافقین کے نفاق میں اضافہ ہوتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ آزمائش کی منزل میں ایمان اور نفاق، دونوں میں اضافہ ہوتا ہے۔

۲۔ رسول کے وعدے کو مومن صدق اللّٰہ و رسولہ کہتے ہیں جب کہ منافق اسے دھوکہ قرار دیتے ہیں۔

---

[1] نہج البلاغۃ خ ۱۵۵　[2] ۴۸ فتح: ۴　[3] ۹ توبہ: ۱۲۴　[4] ۱۷ بنی اسرائیل: ۸۲

مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ رِجَالٌ صَدَقُوۡا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَیۡهِ ۚ فَمِنۡهُمۡ مَّنۡ قَضٰی نَحۡبَهٗ وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ یَّنۡتَظِرُ ۫ۖ وَ مَا بَدَّلُوۡا تَبۡدِیۡلًا ﴿۲۳﴾

۲۳۔ مومنین میں ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو سچا کر دکھایا، ان میں سے بعض نے اپنی ذمے داری کو پورا کیا اور ان میں سے بعض انتظار کر رہے ہیں اور وہ ذرا بھی نہیں بدلے۔

تشریح کلمات

نَحۡبَهٗ: (ن ح ب) النحب: اس نذر کو کہتے ہیں جس کا پورا کرنا واجب ہو۔ مجازاً اس سے موت مراد لی جاتی ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ رِجَالٌ: ان مؤمنوں کا ذکر رجال کے ساتھ کرنے میں ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہو کہ یہ لوگ استقامت والے ہیں چونکہ رجل، رِجل پاؤں سے ماخوذ ہے جو استقامت کا ذریعہ ہے۔ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اہل ایمان میں سے ایک جماعت کا ذکر ہے جنہوں نے میدان کارزار میں استقامت دکھائی ہے۔ اس کے مصداق کے لیے تاریخی شواہد کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ راوی کی روایت کی طرف نہیں مگر یہ کہ راوی کی روایت تاریخی شواہد کے مطابق ہو۔

۲۔ صَدَقُوۡا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَیۡهِ: ہر مومن کا اللہ کے ساتھ ایک عہد و میثاق ہوتا ہی ہے تاہم ممکن ہے اس عہد و میثاق کی طرف اشارہ ہو جو خاص طور پر جنگ سے فرار نہ ہونے پر لیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

وَ لَقَدۡ کَانُوۡا عَاهَدُوا اللّٰهَ مِنۡ قَبۡلُ لَا یُوَلُّوۡنَ الۡاَدۡبَارَ ؕ وَ کَانَ عَهۡدُ اللّٰهِ مَسۡـُٔوۡلًا ﴿۱﴾

حالانکہ پہلے یہ لوگ اللہ سے عہد کر چکے تھے کہ پیٹھ نہیں پھیریں گے اور اللہ کے ساتھ ہونے والے عہد کے بارے میں باز پرس ہو گی۔

اس میں ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو اس عہد کی خلاف ورزی کرتے ہوئے جنگ سے فرار ہو گئے۔

۳۔ فَمِنۡهُمۡ مَّنۡ قَضٰی نَحۡبَهٗ: ان میں سے کچھ ایسے ہیں جنہوں نے اپنی نذر پوری کی ہے۔ دوسرے معنی کے اعتبار سے ان مومنین میں سے کچھ ایسے ہیں جو وفا بہ عہد کی راہ میں دنیا سے چلے گئے۔ راہ خدا میں موت کو گلے لگانا بھی وفا بعہد ہے بلکہ وفا بعہد کا سب سے اعلیٰ درجہ اور فرد اکمل اس عہد کے تحت جان دینا ہے۔

مجمع البیان میں آیا ہے کہ عالم اہل سنت حاکم حسکانی روایت کرتے ہیں: حضرت علی علیہ السلام

نے فرمایا:

آیہ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ رِجَالٌ ہماری شان میں نازل ہوئی۔ میں مَّنۡ یَّنۡتَظِرُ کا مصداق ہوں اور حمزہ سید الشہداء مَّنۡ قَضٰی نَحۡبَہٗ کے مصداق ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام کوفہ میں زیب منبر تھے۔ کسی نے آپؑ سے اس آیت کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا:

یہ آیت میرے، میرے عم بزرگوار حضرت حمزہ اور میرے ابن عم عبیدۃ بن حارث بن عبد المطلب کے بارے میں نازل ہوئی۔ عبیدۃ نے جنگ بدر میں اپنی جان دے کر اپنا عہد پورا کیا، حضرت حمزہ نے احد کے دن شہادت اختیار کر کے اپنی ذمے داری پوری کر دی اور میں اس امت کے شقی ترین شخص (کے ظلم) کا انتظار کر رہا ہوں جو میری اس جگہ کے خون سے اسے رنگین کرے گا۔ پھر اپنے سر اور ریش مبارک کی طرف اشارہ کیا۔ پھر فرمایا: یہ وہ عہد ہے جو میرے حبیب ابو القاسم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے میرے سپرد کیا ہے۔[۲]

امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

یَا عَلِیُّ مَنْ اَحَبَّکَ ثُمَّ مَاتَ فَقَدْ قَضَی نَحْبَہُ ....[۳]	اے علی! جو آپ سے محبت رکھے اور مر جائے تو اس نے اپنی ذمے داری پوری کی۔

یہ روایت آیت کے وسیع مصداق کے بارے میں ہے۔

۴۔ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ یَّنۡتَظِرُ: ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو اس بات کے انتظار میں ہیں کہ وفا بعہد کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہوں۔ راہ خدا میں جان دے دیں یا اسلام کے لیے فتح و نصرت حاصل کریں۔

۵۔ وَمَا بَدَّلُوۡا تَبۡدِیۡلًا: یہ لوگ اپنے عہد پر قائم رہے اور کسی قسم کی تبدیلی کے مرتکب نہیں ہوئے۔ یہ انتظار کرنے والوں کے بارے میں ہے کہ جس مدت میں انتظار کرتے رہے اس میں کسی قسم کی تبدیلی کا ارتکاب نہیں کیا۔ اس میں ممکن ہے ان لوگوں کی طرف اشارہ ہو جنہوں نے دین میں تبدیلیاں لائیں اور خود بھی حالات کے ساتھ بدلتے رہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کے ساتھ عہد کرنے والوں کی ایک جماعت نے اپنا عہد سچا کر دکھایا۔

۲۔ اللہ کے عہد و پیان پر قائم لوگ، منتظر شہادت ہوتے ہیں: وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ یَّنۡتَظِرُ ....

۳۔ مومن کے موقف میں تبدیلی نہیں آتی: وَمَا بَدَّلُوۡا تَبۡدِیۡلًا۔

---

[۱] ۳۳ احزاب: ۱۵ [۲] حاشیہ تفسیر شواھد التنزیل ذیل آیت و صواعق محرقہ صفحہ ۸۰۔ [۳] الکافی ۸: ۳۰۶

لِّیَجۡزِیَ اللّٰہُ الصّٰدِقِیۡنَ بِصِدۡقِہِمۡ وَ یُعَذِّبَ الۡمُنٰفِقِیۡنَ اِنۡ شَآءَ اَوۡ یَتُوۡبَ عَلَیۡہِمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا ﴿ۚ۲۴﴾

۲۴۔ تاکہ اللہ سچوں کو ان کی سچائی کی جزا دے اور چاہے تو منافقین کو عذاب دے یا ان کی توبہ قبول کرے، اللہ یقیناً بڑا معاف کرنے والا، رحیم ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ لِّیَجۡزِیَ اللّٰہُ الصّٰدِقِیۡنَ بِصِدۡقِہِمۡ: عہد و پیمان اس لیے لیا گیا تاکہ اس عہد کو سچا کر کے دکھانے والوں کو ان کی سچائی کا صلہ دیا جائے اور ایمان و نفاق میں عملی میدان میں تمیز ہو جائے۔

۲۔ وَ یُعَذِّبَ الۡمُنٰفِقِیۡنَ اِنۡ شَآءَ: منافقین کو عذاب دیا جائے اِنۡ شَآءَ اللہ نے اگر چاہا تو عذاب دیا جائے۔ نہیں چاہا تو عذاب دینا ضروری نہیں ہے چونکہ منافق اگر توبہ کرے تو اس کے سابقہ نفاق کا عذاب نہ ہو گا۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ منافق کو عذاب دینے کے لیے اِنۡ شَآءَ کی قید ہے۔ صادقین کو صلہ دینے کے لیے کسی قید کا ذکر نہیں ہے چونکہ صادقین کو صلہ دینا رحمت الٰہی کے تحت اللہ نے اپنے اوپر واجب کر رکھا ہے:

کَتَبَ رَبُّکُمۡ عَلٰی نَفۡسِہِ الرَّحۡمَۃَ ...۔[۱] تمہارے رب نے رحمت کو اپنے اوپر لازم قرار دیا ہے۔

اہم نکات

۱۔ ایمان کا صلہ لازمی ہے اور نفاق پر عذاب توبہ سے ٹل سکتا ہے۔

وَ رَدَّ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِغَیۡظِہِمۡ لَمۡ یَنَالُوۡا خَیۡرًا ؕ وَ کَفَی اللّٰہُ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ الۡقِتَالَ ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ قَوِیًّا عَزِیۡزًا ﴿ۚ۲۵﴾

۲۵۔ اللہ نے کفار کو اس حال میں پھیر دیا کہ وہ غصے میں (جل رہے) تھے، وہ کوئی فائدہ بھی حاصل نہ کر سکے، لڑائی مومنین کے لیے اللہ ہی کافی ہے اور اللہ بڑا طاقت والا، غالب آنے والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ رَدَّ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا: اللہ نے کافروں کو واپس کیا۔ اللہ نے ایسے اسباب پیدا کیے جن کے

---

[۱] ۶ انعام: ۵۴

نتیجے میں ان حملہ آوروں کو نامراد واپس جانا پڑا۔ وہ اسباب خندق کھدوانا اور سخت ترین سردی میں آندھی چلانا تھے۔

۲۔ بِغَيْظِهِمْ: کفار کو غم و غصہ اور غیض و غضب کے ساتھ واپس جانا پڑا۔ ان کے لیے یہ ایک عظیم حادثہ تھا کہ ہزاروں کی تعداد میں لشکر کی تشکیل کی، اس پر زر کثیر خرچ کیا اور پچیس دن تک مدینہ میں بلا نتیجہ رکنا پڑا۔ پھر مدینہ کی خیرات پر قبضے، مسلمانوں کو نابود کرنے کا جو خواب وہ دیکھ رہے تھے اس میں ناکامی دیکھنا پڑی۔

۳۔ لَمْ يَنَالُوا خَيْرًا: کافروں کے غم و غصہ کی وجہ یہ بھی تھی کہ اس عظیم اہتمام کے ساتھ اتنا بڑا لشکر بنانے کے باوجود کسی نتیجہ تک نہیں پہنچ پائے اور نامراد واپس جانا پڑا۔

۴۔ وَ كَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ: جب اللہ تعالیٰ کی کمک و حمایت حاصل ہو گئی تو پھر کسی غیر اللہ کا احتیاج باقی نہیں رہتا۔ اس جگہ قتال اللہ کی طرف سے ہوا اور کافر اللہ کے قتال کا مقابلہ نہ کر سکے۔ اور مومنین کے لیے کسی قسم کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ متعدد مصادر میں آیا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود اپنے مصحف میں اس آیت کو اس طرح پڑھتے تھے وكفى الله المؤمنين القتال بعلي بن ابي طالب۔ لڑائی میں مؤمنین کے لیے اللہ کافی ہے علی بن ابی طالب کے ذریعہ۔ ملاحظہ ہو شواهد التنزیل ذیل آیت، تاریخ دمشق ابن عساکر در حالات امیر المؤمنین، الدر المنثور ذیل آیت۔ حضرت ابن عباس کی روایت ہے کہ یہ آیت حضرت علی علیہ السلام کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ ملاحظہ ہو شواهد التنزیل ذیل آیت۔

۵۔ وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ: اللہ کی قوت اور بالادستی کے مقابلے ان کافروں کی کیا حیثیت ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کی کمک حاصل ہونے کی صورت میں دشمن کے سارے حربے ناکام ہو جاتے ہیں: لَمْ يَنَالُوا خَيْرًا....

وَاَنْزَلَ الَّذِيْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ صَيَاصِيْهِمْ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ وَتَاْسِرُوْنَ فَرِيْقًا ﴿۲۶﴾	۲۶۔ اور اہل کتاب میں سے جن لوگوں نے ان (حملہ آوروں) کا ساتھ دیا اللہ نے انہیں ان کے قلعوں سے اتار دیا اور ان کے دلوں میں (تمہارا) رعب ڈال دیا کہ تم ان میں سے ایک گروہ کو قتل کرنے لگے اور ایک گروہ کو تم نے قیدی بنا لیا۔

تشریح کلمات

صَيَاصِيۡهِمۡ (ص ی ص) الصیصة ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس کے ذریعے اپنے آپ کو محفوظ کیا جائے۔ مثلاً قلعہ۔

تفسیر آیات

مدینہ کے جنوب مشرق میں آباد یہود کا قبیلہ جو بنی قریظہ کے نام سے پہچانا جاتا تھا آباد تھا۔ ان لوگوں نے حملہ آوروں کا ساتھ دیا۔ ابوسفیان کو جنگ کرنے پر آمادہ کیا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم جنگ خندق سے واپس مدینہ پہنچتے ہیں تو جبرائیل بنی قریظہ کی طرف جانے کا حکم لے کر نازل ہوتے ہیں۔ ظہر کا وقت تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اعلان فرمایا کہ نماز عصر بنی قریظہ کے ہاں پڑھیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے مدینہ میں حضرت ابن ام مکتوم کو اپنا جانشین مقرر فرمایا اور علم حضرت علی علیہ السلام کو دیا۔ لشکر اسلام بنی قریظہ کے ہاں پہنچ گیا تو بنی قریظہ قلعہ بن ہو گئے۔ مسلمانوں نے قلعہ کو محاصرے میں لے لیا اور بنی قریظہ کا پچیس دن تک محاصرہ کیا۔ آخر میں بنی قریظہ نے رئیس قبیلۂ اوس، سعد بن معاذ کو حَکَم کے طور پر قبول کیا کہ جو وہ فیصلہ کریں ہمیں قبول ہے۔ چونکہ زمان جاہلیت میں اوس اور بنی قریظہ میں معاہدہ تھا۔ یہود کو امید تھی وہ ہمارے ساتھ نرمی برتے گا۔ حضرت سعد نے یہ فیصلہ دیا کہ بنی قریظہ کے جنگجو لوگ قتل کیے جائیں، بچوں اور عورتوں کو اسیر بنایا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا: اے سعد! تم نے یہ فیصلہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے مطابق کیا ہے۔ چنانچہ بنی قریظہ کے جنگ میں شریک ہونے کے قابل مردوں کو قتل کیا گیا جو سات سے آٹھ سو تک تھے۔

۱۔ وَاَنۡزَلَ الَّذِيۡنَ ظَاهَرُوۡهُمۡ مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ: اللہ تعالیٰ نے ان یہودیوں کو ان کے قلعوں سے نکالا۔ یہ نسبت اللہ کی طرف اس لیے ہے کہ یہودیوں کے قلعوں سے نکلنے میں لوگوں کا کردار ظاہری سبب تھا۔ حقیقتاً ان کے نکلنے کا سبب اللہ نے پیدا فرمایا جو اگلے جملے میں مذکور ہے۔

۲۔ وَقَذَفَ فِيۡ قُلُوۡبِهِمُ الرُّعۡبَ: وہ حقیقی سبب یہ ہے کہ اللہ نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا جس کی وجہ سے وہ قلعہ چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔

۳۔ فَرِيۡقًا تَقۡتُلُوۡنَ وَتَاۡسِرُوۡنَ فَرِيۡقًا: جس گروہ کو قتل کر رہے تھے وہ جنگ میں شریک ہونے کے قابل یہود کے لوگ تھے۔ ان لوگوں نے عہد شکنی کر کے ابوسفیان کے ساتھ جنگ میں شریک ہونے کا اعلان کیا تھا۔

اہم نکات

۱۔ دشمن کے لیے کمک رساں طاقتوں سے غافل نہیں رہنا چاہیے: ظَاهَرُوۡهُمۡ ....

۲۔ جنگ میں نفسیاتی حربے فیصلہ کن ہوتے ہیں: فِیۡ قُلُوۡبِہِمُ الرُّعۡبَ ....

وَ اَوۡرَثَکُمۡ اَرۡضَہُمۡ وَ دِیَارَہُمۡ وَ اَمۡوَالَہُمۡ وَ اَرۡضًا لَّمۡ تَطَـُٔوۡہَا ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرًا ﴿۲۷﴾

۲۷۔ اور اس نے تمہیں ان کی زمین اور ان کے گھروں اور ان کے اموال اور ان کی ان زمینوں کا جن پر تم نے قدم بھی نہیں رکھا وارث بنایا اور اللہ ہر چیز پر خوب قدرت رکھتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اَوۡرَثَکُمۡ اَرۡضَہُمۡ: سعد بن معاذ کے فیصلے کا ایک حصہ یہ بھی تھا کہ بنی قریظہ کے گھر مہاجرین کو دے دیے جائیں چونکہ مہاجر ابھی تک بے گھر تھے۔ اگرچہ زمین اور گھر صرف مہاجرین کو ملے ہیں تاہم خطاب پوری امت سے ہے۔ اس قسم کی مثالیں قرآن میں زیادہ ہیں۔

۲۔ وَ اَرۡضًا لَّمۡ تَطَـُٔوۡہَا: اور وہ زمین بھی تم کو دے دی گئی جسے تم نے فتح نہیں کیا۔ وہ زمین جو بغیر جنگ کے تمہارے ہاتھ لگی۔ اس سے کون سی زمین مراد ہے؟ اس میں اختلاف ہے۔ میرے نزدیک قرین واقع یہ ہے کہ اس زمین سے مراد بنی نضیر کی زمین ہے۔ چنانچہ بنی نضیر کے یہودیوں کو اس سے پہلے اپنے گھروں سے بیدخل کر دیا تھا۔ اس کی مزید تشریح سورۂ حشر میں آئے گی۔

یٰۤاَیُّہَا النَّبِیُّ قُلۡ لِّاَزۡوَاجِکَ اِنۡ کُنۡتُنَّ تُرِدۡنَ الۡحَیٰوۃَ الدُّنۡیَا وَ زِیۡنَتَہَا فَتَعَالَیۡنَ اُمَتِّعۡکُنَّ وَ اُسَرِّحۡکُنَّ سَرَاحًا جَمِیۡلًا ﴿۲۸﴾

وَ اِنۡ کُنۡتُنَّ تُرِدۡنَ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ وَ الدَّارَ الۡاٰخِرَۃَ فَاِنَّ اللّٰہَ اَعَدَّ لِلۡمُحۡسِنٰتِ مِنۡکُنَّ اَجۡرًا عَظِیۡمًا ﴿۲۹﴾

۲۸۔ اے نبی! اپنی ازواج سے کہد یجیے: اگر تم دنیاوی زندگی اور اس کی آسائش کی خواہاں ہو تو آؤ میں تمہیں کچھ مال دے کر شائستہ طریقے سے رخصت کر دوں۔

۲۹۔ لیکن اگر تم اللہ اور اس کے رسول اور منزل آخرت کی خواہاں ہو تو تم میں سے جو نیکی کرنے والی ہیں ان کے لیے اللہ نے یقیناً اجر عظیم مہیا کر رکھا ہے۔

تفسیر آیات

جب بنی نضیر کی املاک رسول اللہ ﷺ کی ملکیت میں آ گئیں، بنی قریظہ کی املاک مہاجرین

کے درمیان تقسیم ہونے پر ازواج رسولؐ کی توقعات زیادہ ہوگئیں تو رسول ﷺ سے ان کے مطالبات بھی بڑھ گئے اورانہوں نے رسول اللہ ﷺ کو اذیت دینا شروع کی۔ ازواج کو یہ گمان ہو چلا تھا کہ یہودیوں کے عمدہ اموال خود رسول اللہ ﷺ نے اپنے لیے رکھے ہیں اس وجہ سے وہ رسول اللہ ﷺ کے گرد بیٹھ گئیں اور کہا:

کسریٰ وقیصر کی بیٹیاں زیب و زینت، حشم و خدام میں ہیں اور ہم فاقے سے ہوتی ہیں۔
ہمیں بھی وہی سہولتیں فراہم کی جائیں جو شہنشاہوں کی بیویوں کو حاصل ہیں۔[1]

اس کے بعدازواج کی تنبیہ کے لیے یہ آیات نازل ہوئیں اور ازواج کو اختیار دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عقد میں رہیں اور اسی زندگی پر قناعت کریں یا رسول اللہ ﷺ سے جدا ہو جائیں۔

۱۔ یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلۡ لِّاَزۡوَاجِكَ: زوجات سے کہد یجیے: اگر موجودہ زندگی پر راضی نہیں ہو اور بہتر زندگی کی خواہش رکھتی ہو تو میں تمہیں دنیا کی بہتر زندگی نہیں دے سکتا۔ مسلمانوں کی سطح زندگی میں ایک مسلمان کی طرح زندگی اگر پسند نہیں ہے تو دوسری صورت یہ نہیں ہو گی کہ تمہیں بہتر زندگی مل جائے گی بلکہ دوسری صورت جدائی ہو گی۔

۲۔ اُمَتِّعۡكُنَّ وَاُسَرِّحۡكُنَّ: دوسری صورت یہ ہے کہ تمہیں کچھ مال دے کر شائستہ طور پر رخصت کروں۔ یہ حق مہر کے طور پر نہ ہو گا چونکہ حق مہر تو آپؐ نے پہلے ہی سب ازواج کا ادا کر دیا تھا جیسا کہ اس آیت میں فرمایا:

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَحۡلَلۡنَا لَكَ اَزۡوَاجَكَ الّٰتِیۡۤ اٰتَیۡتَ اُجُوۡرَهُنَّ ....[2]	اے نبی! ہم نے آپ کے لیے آپ کی وہ بیویاں حلال کی ہیں جن کے مہر آپ نے دے دیے ہیں۔

بلکہ کچھ مال مطلقہ کو دیا جاتا ہے تا کہ دو طلاق کے بعد عدت کے ایام گزار سکے۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

وَ لِلۡمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالۡمَعۡرُوۡفِ حَقًّا عَلَی الۡمُتَّقِیۡنَ ۝[3]	اور مطلقہ عورتوں کو دستور کے مطابق کچھ خرچہ دینا، یہ متقی لوگوں کی ذمے داری ہے۔

۳۔ سَرَاحًا جَمِیۡلًا: سے مراد بغیر کسی نزاع کے شائستہ طریقے سے طلاق دینا ہے۔

۴۔ وَ اِنۡ کُنۡتُنَّ تُرِدۡنَ اللّٰهَ وَ رَسُوۡلَهٗ: ازواج کو اختیار دیا جا رہا ہے کہ اگر تم اللہ، رسول اور آخرت کی خواہاں ہو تو اسی زندگی پر قناعت کر کے رسول اللہ ﷺ کی زوجیت میں رہو۔

۵۔ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلۡمُحۡسِنٰتِ مِنۡكُنَّ: اگر رسول ﷺ کی زوجیت میں ہو تو پھر تمہیں نیکی کرنا ہو گی۔ اللہ کے پاس اجر عظیم صرف محسنات کے لیے ہے۔ اس کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ زوجیت رسول ﷺ میں رہ کر اگر محسنات میں شامل ہوئیں تو اجر عظیم ملے گا۔

---

[1] البحر المحیط ۸: ۴۷۱ [2] ۳۳ احزاب: ۵۰ [3] ۲ بقرۃ: ۲۴۱

اہم نکات

۱۔ اسلامی قیادت کو خاندانی دباؤ سے آزاد ہونا چاہیے: قُلۡ لِّاَزۡوَاجِكَ ....

۲۔ اسلامی قیادت سے وابستہ افراد کو عامۃ المسلمین کی سطح زندگی سے زیادہ بہتر زندگی نہیں ملنی چاہیے۔

۳۔ زوجہ کو انتخاب زندگی میں آزاد چھوڑنا چاہیے: اُسَرِّحۡكُنَّ سَرَاحًا ....

یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ مَنۡ یَّاۡتِ مِنۡكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَیِّنَةٍ یُّضٰعَفۡ لَهَا الۡعَذَابُ ضِعۡفَیۡنِ ؕ وَ كَانَ ذٰلِكَ عَلَی اللّٰهِ یَسِیۡرًا ﴿۳۰﴾

۳۰۔ اے نبی کی بیویو! تم میں سے جو کوئی صریح بے حیائی کی مرتکب ہو جائے اسے دگنا عذاب دیا جائے گا اور یہ بات اللہ کے لیے آسان ہے۔

تفسیر آیات

خطاب براہ راست ازواج سے ہے چونکہ یہ مقام تنبیہ کا ہے۔ اگر ازواج میں سے کوئی ایسا گناہ کبیرہ بجا لائے جیسے نبی کو اذیت دینا، کسی پر ناجائز بہتان لگانا، حکم رسول ﷺ کی نافرمانی کرنا وغیرہ اور ساتھ یہ گناہ کبیرہ مُّبَیِّنَةٍ آشکار طریقہ سے بجا لائے تو اس زوجہ کو دوگنا عذاب ہو گا۔ ایک عذاب اللہ کی نافرمانی کرنے کا اور دوسرا عذاب خانۂ رسول ﷺ میں رہ کر آشکارا گناہ کا ارتکاب کرنے کا، جس سے دوسرے لوگوں میں گناہ کرنے کی جرات آئے گی کہ جب خانۂ رسول ﷺ کا کوئی فرد ایسے گناہ کا ارتکاب کرتا ہے وہ بھی علاناً تو دوسرے لوگوں سے گناہ سرزد ہونا عام ہو جائے گا۔ اگر یہ گناہ مبینہ (آشکار) طور پر نہ ہو تو عذاب دوگنا نہ ہو گا۔

وَ كَانَ ذٰلِكَ عَلَی اللّٰهِ یَسِیۡرًا: رسول کی زوجہ ہونے کی وجہ سے عذاب سے نہیں بچے گی۔

اہم نکات

۱۔ اعلانیہ گناہ کا اثر زیادہ ہوتا ہے: بِفَاحِشَةٍ مُّبَیِّنَةٍ ....

۲۔ عمل کے اثر کے مطابق جزا و سزا مرتب ہوتی ہے: یُّضٰعَفۡ لَهَا الۡعَذَابُ ....

وَ مَنۡ یَّقۡنُتۡ مِنۡكُنَّ لِلّٰهِ وَ رَسُوۡلِهٖ وَ تَعۡمَلۡ صَالِحًا نُّؤۡتِهَاۤ اَجۡرَهَا

۳۱۔ اور تم میں سے جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گی اور نیک عمل انجام دے گی اسے ہم اس کا دگنا ثواب دیں گے اور ہم نے اس کے

مَرَّتَيۡنِ ۙ وَ اَعۡتَدۡنَا لَهَا رِزۡقًا كَرِيۡمًا ﴿۳۱﴾　　اس کے لیے عزت کا رزق مہیا کر رکھا ہے۔

تشریح کلمات

يَّقۡنُتۡ : (ق ن ت) القنوت: اطاعت کرنا۔

تفسیر آیات

۱۔ازواج میں سے کوئی زوجہ اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کر کے عمل صالح بجا لائے تو اس زوجہ کو دوگنا ثواب ملے گا۔ ایک عمل صالح کا ثواب اور دوسرا لوگوں پر اچھا اثر چھوڑنے کا ثواب ہے کہ جس گھر سے اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے کی دعوت ہوتی ہے اس گھر کے افراد سے عملی دعوت ہونا بہت مؤثر ہوتا ہے۔

۲۔ وَ اَعۡتَدۡنَا لَهَا رِزۡقًا: رزق کریم سے مراد جنت کی نعمتیں ہیں۔

اہم نکات

۱۔ زوجہ رسول ہونا کافی نہیں، عمل صالح ضروری ہے: وَ تَعۡمَلۡ صَالِحًا ...

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسۡتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيۡتُنَّ فَلَا تَخۡضَعۡنَ بِالۡقَوۡلِ فَيَطۡمَعَ الَّذِيۡ فِيۡ قَلۡبِهٖ مَرَضٌ وَّ قُلۡنَ قَوۡلًا مَّعۡرُوۡفًا ﴿۳۲﴾

۳۲۔ اے نبی کی بیویو! تم دوسری عورتوں کی طرح نہیں ہو اگر تم تقویٰ رکھتی ہو تو نرم لہجے میں باتیں نہ کرنا، کہیں وہ شخص لالچ میں نہ پڑ جائے جس کے دل میں بیماری ہے اور معمول کے مطابق باتیں کیا کرو۔

تفسیر آیات

۱۔ لَسۡتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ: رسول اللہ ﷺ کی ازواج کی سیرت و کردار کے اثرات دیگر خواتین کی طرح نہیں ہیں۔ ازواج کی سیرت دیگر خواتین کے لیے نمونۂ عمل ثابت ہوتی ہے جب کہ دیگر خواتین کی سیرت و کردار ان کی ذات تک محدود رہتا ہے۔ اسی وجہ سے ان کے لیے ثواب و گناہ بھی دوگنا ہوتا ہے۔

۲۔ اِنِ اتَّقَيۡتُنَّ: اگر تقویٰ اختیار کیا گیا تو ازواج، امت کی دیگر خواتین کی طرح نہیں ہیں۔ ان کا مرتبہ بلند ہے۔ ان کے تقویٰ کے اثرات زیادہ ہیں۔ اگر تقویٰ اختیار نہ کیا جائے تو یہ امتیاز حاصل نہ ہوگا۔

۳۔ فَلَا تَخۡضَعۡنَ بِالۡقَوۡلِ: دیگر خواتین کی طرح نہ ہونے کا لازمہ یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ اس طرح نرمی اور ناز کے ساتھ بات نہ کرو۔ کمزور ایمان لوگوں کے دلوں میں بری خواہش نہ آئے۔ یہ حکم دیگر خواتین کے لیے بھی ہے تاہم ازواج رسول کے لیے مزید تاکید کے ساتھ ہے۔

۴۔ وَّ قُلۡنَ قَوۡلًا مَّعۡرُوۡفًا: لوگوں سے اسلامی اور معاشرتی عرف کے مطابق بات کرو۔ انداز گفتگو میں اس قدر شیرینی نہ ہو کہ مغلوب شہوت مرد کی توقعات اور جذبات برانگیختہ ہو جائیں۔ اس سے ایسی شعری ونثری گفتگو عورتوں پر حرام ہے جس سے سننے والے مردوں کے جذبات بیدار ہوتے ہوں۔

اہم نکات

۱۔ نامحرم مردوں سے بات کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

۲۔ کسی فساد میں پڑنے کے لیے پہلے اشارے عورتوں کی طرف سے ملتے ہیں۔

۳۔ اپنی عصمت کے تحفظ کے لیے بنیادی کردار عورت کو ادا کرنا ہے۔

وَ قَرۡنَ فِیۡ بُیُوۡتِکُنَّ وَ لَا تَبَرَّجۡنَ تَبَرُّجَ الۡجَاہِلِیَّۃِ الۡاُوۡلٰی وَ اَقِمۡنَ الصَّلٰوۃَ وَ اٰتِیۡنَ الزَّکٰوۃَ وَ اَطِعۡنَ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ ؕ اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیُذۡہِبَ عَنۡکُمُ الرِّجۡسَ اَہۡلَ الۡبَیۡتِ وَ یُطَہِّرَکُمۡ تَطۡہِیۡرًا ﴿۳۳﴾

۳۳۔ اور اپنے گھروں میں جم کر بیٹھی رہو اور قدیم جاہلیت کی طرح اپنے آپ کو نمایاں کرتی نہ پھرو نیز نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دیا کرو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، اللہ کا ارادہ بس یہی ہے ہر طرح کی ناپاکی کو اہل بیت ! آپ سے دور رکھے اور آپ کو ایسے پاکیزہ رکھے جیسے پاکیزہ رکھنے کا حق ہے۔

تشریح کلمات

قَرۡنَ: (ق ر ر) قرّ کے معنی کسی جگہ جم کر ٹھہر جانے کے ہیں۔

تَبَرَّجۡنَ: (ب ر ج) التبرج ظاہر ہونا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ قَرۡنَ فِیۡ بُیُوۡتِکُنَّ: اپنے گھروں میں جم کر بیٹھی رہو۔ جناب مودودی کا ترجمہ ہے: اپنے گھروں میں ٹک کر رہو۔ یہ حکم تمام عورتوں کے لیے ہے لیکن خطاب رسولؐ کی ازواج سے ہے چونکہ نفاذ اسلام کی ابتدا اس کے داعی کے گھر سے ہونی چاہیے۔

عورت کا وقار، عزت اور عظمت اس کی عفت میں پوشیدہ ہے اور اسے تحفظ گھر ہی میں ملتا ہے۔ چنانچہ عورتوں کا بیرون خانہ عفت کے منافی سرگرمیوں میں شریک ہونے کا نتیجہ ایک المیہ ہے۔

۲۔ وَ لَا تَبَرَّجۡنَ تَبَرُّجَ الۡجَاہِلِیَّۃِ: اس آیت کریمہ میں دو لفظوں کے معنی قابل توجہ ہیں: تبرج

اور جاھلیت اولیٰ۔

تبرج برج ظاہر اور نمایاں ہونے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ لہٰذا عورت کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے حسن و جمال، چال ڈھال اور زیب و زینت نمایاں کرے کہ غیر مردوں کی نگاہ پڑ سکے۔

مولانا مودودی اس جگہ لکھتے ہیں:

عورت کی بیرون خانہ سرگرمیوں کے جواز میں جو بڑی سی بڑی دلیل پیش کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ نے جنگ جمل میں حصہ لیا تھا لیکن یہ استدلال جو پیش کرتے ہیں انہیں شاید معلوم نہیں ہے کہ خود حضرت عائشہؓ کا اپنا خیال اس باب میں کیا تھا؟ عبد اللہ بن احمد بن حنبل نے الزھدین الزھدین، ابن المنذر، ابن ابی شیبہ اور ابن سعد نے اپنی کتابوں میں مسروق کی روایت نقل کی ہے کہ حضرت عائشہؓ جب تلاوت قرآن کرتے ہوئے اس آیت وَقَرۡنَ فِیۡ بُیُوۡتِکُنَّ پر پہنچتی تھیں تو بے اختیار رو پڑتی تھیں یہاں تک ان کا دوپٹہ بھیگ جاتا تھا کیونکہ اس پر انہیں اپنی غلطی یاد آتی تھی جو ان سے جنگ جمل میں ہوئی۔

چنانچہ حضرت عائشہؓ نے حضرت علی علیہ السلام سے جنگ کرنے کے لیے مکہ میں ام المومنین ام سلمہؓ سے اس جنگ میں ساتھ دینے کے لیے کہا تو ام سلمہؓ نے کہا:

قد جمع القرآن ذیلک فلا تندحیہ۔[1] قرآن نے تمہارا دامن سمیٹا ہے تو اسے مت پھیلاؤ۔

۲۔ الۡجَاهِلِیَّةِ الۡاُوۡلٰی: اسلام آنے سے پہلے زمان جاہلیت کی عورتوں کی طرح نہ نکلو چونکہ جاہلیت میں بے پردگی کے ساتھ بے عفتی عام تھی۔ جاہلیت سے مراد وہ جاہلیت ہے جو اسلام آنے سے پہلے تھی اور اسلام آنے کے بعد جاہلیت پر عمل کرنے والے جاہلیت ثانیہ کے مرتکب ہوں گے۔ چنانچہ حضرت امام صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

ستکون جاھلیة اخری....[2] دوسری جاہلیت آنے والی ہے۔

آج ہر شخص کو نظر آتا ہے کہ دوسری جاہلیت شروع ہو چکی ہے بلکہ اپنی جاہلیت کو پیش کرنے کے لیے جو وسائل و ذرائع آج کل کی دوسری جاہلیت کے پاس ہیں وہ جاہلیت اولیٰ کے پاس نہ تھے۔

۳۔ وَاَقِمۡنَ الصَّلٰوۃَ: اگرچہ نماز قائم کرنے، زکوۃ دینے، اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کرنے کا حکم عام مسلمانوں کے لیے بھی ہے تاہم ازواج رسول کے لیے ان کے مراتب اور رسالت سے قربت کی وجہ سے زیادہ تاکید کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔

اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰهُ لِیُذۡهِبَ عَنۡكُمُ الرِّجۡسَ اَهۡلَ الۡبَیۡتِ وَیُطَهِّرَكُمۡ تَطۡهِیۡرًا:

---

[1] بلاغات النسآ ص ۱۵   [2] بحار الانوار: ۲۲: ۱۸۹

اس آیہ شریفہ میں سب سے پہلے ہم اس بات کی وضاحت کریں گے کہ یہاں اہل بیت علیہم السلام سے مراد کون ہیں:

اَھۡل: پہلے ہم قرآنی استعمالات کا ذکر کرتے ہیں کہ لفظ اھل کن معنوں میں استعمال ہوا ہے:

i۔ زوجہ کے لیے استعمال ہوا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے میں فرمایا: وَسَارَ بِاَهۡلِهٖۤ ...[1] یہاں اہل سے مراد زوجۂ موسیٰ علیہ السلام ہے۔ قَالَتۡ مَا جَزَآءُ مَنۡ اَرَادَ بِاَهۡلِكَ سُوۡٓءًا ...[2] یہاں اہل سے مراد عزیز مصر کی زوجہ ہے۔

ii۔ خاندان: جس میں اولاد و ازواج دونوں شامل ہیں۔ چنانچہ فرمایا: اِنَّا مُنَجُّوۡكَ وَ اَهۡلَكَ اِلَّا امۡرَاَتَكَ كَانَتۡ مِنَ الۡغٰبِرِيۡنَ ۔[3]

iii۔ قریبی رشتہ دار اور قبیلہ کے افراد: اس معنی میں فرمایا: وَ اِنۡ خِفۡتُمۡ شِقَاقَ بَيۡنِهِمَا فَابۡعَثُوۡا حَكَمًا مِّنۡ اَهۡلِهٖ وَ حَكَمًا مِّنۡ اَهۡلِهَا ...[4] وَ شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنۡ اَهۡلِهَا[5] پہلی آیت میں اہل سے مراد زن و شوہر کے رشتہ دار ہیں۔ دوسری آیت میں عزیز مصر کے رشتہ دار ہیں۔ کہتے ہیں جس نے یوسف علیہ السلام کے حق میں گواہی دی تھی وہ عزیز مصر کا بھانجا یا چچازاد بھائی تھا۔

iv۔ اولاد: جیسا کہ ارشاد ہے: فَاسۡتَجَبۡنَا لَهٗ فَكَشَفۡنَا مَا بِهٖ مِنۡ ضُرٍّ وَّ اٰتَيۡنٰهُ اَهۡلَهٗ وَ مِثۡلَهُمۡ مَّعَهُمۡ ...[6] یہاں اہل سے مراد اولاد ہے۔ چنانچہ ایوب علیہ السلام کو دوگنی اولاد دی گئی۔

v۔ صاحب عمل: کسی عمل کے انجام دینے والے کو بھی اہل کہتے ہیں۔ جیسے اھل الکتاب، اہل علم: وَ لَا يَحِيۡقُ الۡمَكۡرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهۡلِهٖ ...[7]

بیت: عربی محاورے میں انسان جس چیز کی پناہ میں ہوتا ہے اسے بیت کہتے ہیں۔ اسی وجہ سے حسب و نسب کو بیوت کہتے ہیں اور بیوتات العرب کہہ کر انساب مراد لیتے ہیں۔[8]

لسان العرب میں آیا ہے:

بیت العرب شرفھا۔ بیت العرب سے شرف العرب مراد لیتے ہیں۔

آگے لکھتے ہیں:

البیت من بیوتات العرب الذی یضم شرف القبیلۃ کآل حصن الفزاریین۔ عرب بیوتات کا محاورہ قبائلی شرافت کے بیان کے لیے ہوتا ہے۔

ان استعمالات سے یہ بات سامنے آ گئی کہ لفظ اَھۡل کے مطلق استعمال سے معنی و مطلب کا تعین نہیں ہوتا۔ جب یہ لفظ بیت کی طرف اضافہ ہوگا اھل البیت تو گھر کے اندر رہنے والے سب افراد شامل

---

[1] ۲۸ قصص: ۲۹ [2] ۱۲ یوسف: ۲۵ [3] ۲۹ العنکبوت: ۳۳ [4] ۴ النساء: ۳۵ [5] ۱۲ یوسف۔ ۲۶
[6] ۲۱ انبیاء۔ ۸۴ [7] ۳۵ فاطر: ۴۳ [8] مجمع البیان ذیل آیہ

ہوں گے خواہ وہ اس گھر کے نوکر ہی کیوں نہ ہو۔ لہٰذا لفظ اھل کے دائرہ استعمال کی وسعت کے پیش نظر ہر استعمال کے ساتھ ایک قرینہ ہوتا ہے جس سے اس کے اطلاق کی تقیید ہو جاتی ہے۔

یہ طریقہ درست نہیں ہے کہ معنی کے تعین کے لیے ان استعمالات میں سے ایک استعمال کو پیش کیا جائے۔ مثلاً یہ کہا جائے کہ قرآن میں ایک دو جگہ اھل سے مراد زوجہ لی گئی ہے لہٰذا یہاں بھی زوجات ہی مراد ہیں، جیسا کہ بعض اہل قلم ایسا کرتے ہیں۔ اس طرز استدلال کا لازمہ یہ ہو گا کہ اگر ایک دو جگہ اہل کا لفظ زوجہ کے لیے استعمال ہوا ہے، ہر جگہ اس لفظ سے زوجہ ہی مراد ہو، اس کا کوئی قائل نہیں ہے۔

اَهۡلَ الۡبَيۡتِ کون ہیں؟: قرآن میں ایک تعبیر مختلف معانی میں استعمال ہوتی ہے تو ان معانی میں سے ایک معنی کے تعیّن کے لیے ہم رسول اللہ ﷺ کی طرف رجوع کریں گے جن کے قلب پر قرآن نازل ہوا ہے۔ اگر رسول اللہ ﷺ کی طرف سے کسی آیت کی کوئی تشریح نہ آئی ہو تو ہم سیاق و سباق و دیگر علامات کی طرف رجوع کریں گے۔

واضح رہے قرآن کی تفسیر و تشریح کے لیے سیاق و سباق پر سنت رسول ﷺ مقدم ہے چونکہ سیاق و سباق سے مطلب ظاہراً اور سنت رسولؐ سے صراحتاً سمجھا جاتا ہے۔ فتقدم السنة على السياق تقدم النص على الظهور۔

نیز اگر قرآن، سنت نبوی کے بغیر سمجھنے کی کوشش کی جائے تو بقول بعضے قرآن اس کشتی کی مانند ہو کر رہ جائے گا جس کا ناخدا نہ ہو۔

ہم نے بہت سے مقتدر مفسرین کو دیکھا ہے کہ وہ ایک ضعیف ترین روایت کی وجہ سے قرآن کی صریح نص کے خلاف جاتے ہیں۔ ایک مثال پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں: سورۂ انعام کی ان آیات کو پڑھیے:

49

وَ اِنۡ یَّرَوۡا کُلَّ اٰیَۃٍ لَّا یُؤۡمِنُوۡا بِہَا ؕ حَتّٰۤی اِذَا جَآءُوۡکَ یُجَادِلُوۡنَکَ یَقُوۡلُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اِنۡ ہٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِیۡرُ الۡاَوَّلِیۡنَ ﴿۲۵﴾ وَ ہُمۡ یَنۡہَوۡنَ عَنۡہُ وَ یَنۡـَٔوۡنَ عَنۡہُ ۚ وَ اِنۡ یُّہۡلِکُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡفُسَہُمۡ وَ مَا یَشۡعُرُوۡنَ ﴿۲۶﴾ [1]	اور اگر وہ تمام نشانیاں دیکھ لیں پھر بھی ان پر ایمان نہیں لائیں گے یہاں تک کہ یہ (کافر) آپ کے پاس آتے ہیں تو آپ سے جھگڑتے ہیں، کفار کہتے ہیں: یہ تو بس قصہ ہائے پارینہ ہیں۔ اور یہ (لوگوں کو) اس سے روکتے ہیں اور (خود بھی) ان سے دور رہتے ہیں اور وہ صرف اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال رہے ہیں مگر اس کا شعور نہیں رکھتے۔

ان آیات میں وَ ہُمۡ یَنۡہَوۡنَ عَنۡہُ میں وَ ہُمۡ کی ضمیر صریحاً ان مشرکین کی طرف ہے جو رسول اللہ ﷺ سے جھگڑتے ہیں لیکن بعض مفسرین اس ضمیر کو اس شخصیت کی طرف لوٹاتے ہیں جس نے رسول ﷺ

---

[1] ۶ انعام: ۲۵۔ ۲۶

کی حمایت کی ہے۔ یعنی قرآن کی اس صراحت کے خلاف بعض مفسر حضرات یہ موقف اختیار کرتے ہیں کہ وَهُمۡ سے مراد حضرت ابوطالب علیہ السلام ہیں جب کہ وَهُمۡ کی ضمیر اس چیز کی طرف جاتی ہے جو اس سے پہلے لفظاً یا حکماً مذکور ہو۔ اس سے پہلے مشرکین کا لفظ مذکور ہے۔ ان کی طرف ضمیر کا جانا نص صریح ہے۔ اس کے باوجود ایک مجہول راوی حبیب بن ابی ثابت اور دیگر صحیح روایات کے ساتھ متصادم روایت کی بنا پر قرآن کی اس صراحت کے خلاف جاتے ہیں۔

اس سلسلے میں ہمارا موقف یہ ہے کہ قرآن کی نص صریح کے خلاف کسی روایت کو قرآن کے ساتھ متصادم تصور کیا جائے گا اور اس روایت کو رد کیا جائے گا۔

اگر کوئی روایت نص کے نہیں، ظاہر قرآن کے خلاف ہے تو اس صورت میں اگر اس ظہور کے خلاف سنت ثابتہ موجود ہے تو ہم قرآن کے سیاق و سباق اور دیگر ظہور سے ہاتھ اٹھائیں گے لیکن روایت ضعیف ہونے کی صورت میں ہم قرآنی ظہور کے خلاف نہیں جائیں گے۔

آیۂ تطہیر میں تین باتیں ہمارے پیش نظر ہیں: ایک یہ کہ اَهۡلَ کے معانی میں سے ایک معنی کے تعین کے لیے سنت ثابتہ پر مشتمل دلیل کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ دوسری یہ کہ آیت میں سیاق و سباق اگر ہے تو اس بارے میں سنت ثابتہ کی طرف رجوع کرنا ہوگا کہ کیا سنت ثابتہ سیاق کے مطابق ہے یا نہیں۔ تیسری بات خود سیاق کے بارے میں بحث ہوگی۔

ہم اَهۡلَ الۡبَیۡتِ میں معنی مقصود کے تعین کے لیے حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ حدیث چونکہ مفسر قرآن ہے تو ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ حدیث ملے گی کہ اھل البیت سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، علی علیہ السلام، فاطمہ سلام اللہ علیہا اور حسن و حسین علیہما السلام ہیں۔ اس حدیث کو اہل سنت نے چالیس طرق سے اور شیعہ نے کم سے کم تیس طرق سے روایت کیا ہے۔ ائمہ اھل بیت علیہم السلام کا تو اس پر اجماع ہے۔ یہاں ہم چند ایک طرق کا ذکر کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ ۵۰

i۔ حضرت ام المومنین ام سلمہؓ فرماتی ہیں: یہ آیت میرے گھر میں نازل ہوئی: اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیُذۡهِبَ عَنۡکُمُ الرِّجۡسَ اَهۡلَ الۡبَیۡتِ وَ یُطَهِّرَکُمۡ تَطۡهِیۡرًا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی، فاطمہ اور حسن و حسین علیہم السلام کو بلایا اور ان پر کساء ڈال دی پھر فرمایا:

اللهم هؤلاء اهل بیتی۔ اے اللہ! یہ ہیں میرے اہل بیت۔

حضرت ام سلمہؓ کی ایک روایت میں آیا ہے کہ حضرت ام سلمہؓ نے عرض کی: یا رسول اللہ! کیا میں بھی اہل البیت میں سے نہیں ہوں؟ فرمایا:

انک علی خیر انک من ازواج النبی۔ تم خیر پر ہو تم ازواج نبی میں ہو۔

اس مضمون کی حدیث مختلف لفظوں میں درج ذیل نو شخصیات نے حضرت ام سلمہؓ سے روایت کی ہے:

الف۔ عطا بن یسار۔ ملاحظہ ہو المستدرک۔

ب۔ شھرب بن حوشب۔ ملاحظہ ہو المعجم الکبیر، تفسیر طبری ذیل آیہ۔

ج۔ ابوسعید خدری۔ دیکھیے تفسیر طبری، مشکل الآثار۔

د۔ ابوھریرۃ۔ رجوع ہو: تفسیر طبری۔

ھ۔ ابو لیلیٰ ملاحظہ ہو مسند احمد بن حنبل حدیث ۲۶۵۵۱۔

و۔ حکیم بن سعد۔ ملاحظہ ہو المعجم الکبیر۲۳: ۳۲۷

ز۔ عبد اللّٰہ بن وھب ابن زمعہ ملاحظہ ہو تفسیر طبری ذیل آیہ۔

ک۔ عمرۃ الھمدانیۃ۔ ملاحظہ ہو مشکل الآثار۔

ل۔ والد عطیہ طفاوی۔ ملاحظہ ہو مسند احمد بن حنبل ۶: ۳۰۴۔

ii۔سعد بن ابی وقاص ۔ ان کی روایت ملاحظہ ہو سنن نسائی ۵: ۱۰۷۔ مستدرک ۲: ۱۱۷ حدیث نمبر۴۵۷۵

iii۔حضرت ام المومنین عائشہؓ۔ ان کی روایت ملاحظہ ہو تفسیر ابن کثیر ذیل آیہ۔

iv۔ عمر بن ابی سلمہ۔ ملاحظہ ہو سنن ترمذی۔

v۔ ابو سعید خدری۔ ان کی روایت میں نہایت صراحت سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ہذہ الایۃ فی خمسۃ فیّ و وفی علی و حسن و حسین و فاطمہ۔	یہ آیت پنجتن کی شان میں ہے۔ یعنی میرے اور علی اور حسن و حسین و فاطمہ کی شان میں ہے۔

ملاحظہ ہو تفسیر ابن کثیر ذیل آیہ۔ تفسیر ابن ابی حاتم ذیل آیت۔

vi۔عبد اللہ بن عباس۔ ان کی روایت ملاحظہ ہو سنن نسائی ۵: ۱۱۲ حدیث ۸۴۰۹

vii۔الامام حسن علیہ السلام۔ آپؑ نے فرمایا:

ہم وہ اہل بیت ہیں جن کی شان میں اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ ...۔ نازل ہوئی۔

ملاحظہ ہو تفسیر ابن کثیر ذیل آیہ۔ المعجم الکبیر طبرانی ۳: ۹۳۔

viii۔امام حسین علیہ السلام۔ آپؑ نے ایک شامی سے فرمایا:

کیا تو نے سورۂ احزاب میں اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَ يُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا۔ پڑھی ہے؟ اس نے کہا: ہاں۔ کیا وہ آپ لوگ ہیں؟ فرمایا: ہاں۔

ix۔واثلہ بن اسقع۔ ملاحظہ ہو مصنف ابی شیبہ حدیث ۳۲۱۰۳۔ مسند احمد بن حنبل ۴: ۱۰۷

x۔ عبداللّٰہ بن جعفر۔ ملاحظہ ہو المستدرك ۳: ۱۴۸

xi۔ حضرت براء ابن عازب۔ المعجم الکبیر طبرانی ۲۳: ۳۹۶۔ حدیث نمبر ۹۴۷۔ اس روایت میں آیا ہے: ھؤلاء عترتی و اھلی۔

xii۔ ابوالحمرا بلال بن حارث مولی رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ مسند ابی شیبہ صفحہ ۲۳۲ حدیث ۲۰۷۔ ۲۲۷

xiii۔ انس بن مالك۔ مسند احمد بن حنبل ۳: ۱۰۹

xiv۔ زینب بنت ام سلمہ۔ المعجم الکبیر طبرانی ۲۴: ۲۸۱۔ حدیث ۷۱۳

xv۔ معقل بن یسار۔ سنن ترمذی باب مناقب اہل بیت۔

مخالف روایتیں: صحیح السند متعدد طرق سے ثابت ہے کہ آیۂ تطہیر پنجتن علیہم السلام کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ چند ایک متروك السند روایات کا بھی ذکر آتا ہے جو ان صحیح السند روایتوں کے خلاف ہیں۔ ان کا بھی ذکر ضروری ہے:

۱۔ عِکْرمہ: حضرت ابن عباس کا غلام۔ اس بات کا قائل تھا کہ یہ آیت صرف ازواج کی شان میں ہے۔ یہاں تک وہ بازاروں میں اعلان کرتا تھا:

لیس بالذی تذھبون الیہ انما ھو نساء النبی۔	تمہارا نظریہ درست نہیں ہے بلکہ یہ نبی کی ازواج کی شان میں ہے۔

چنانچہ عکرمہ کا اعلان بتاتا ہے کہ اس زمانے میں سب لوگوں کا نظریہ تھا کہ یہ پنجتن علیہم السلام کی شان میں ہے۔

عکرمہ کون ہے؟ یہ حضرت عبد اللہ بن عباس کا غلام اور خارجی تھا اور مغربی عرب میں خارجیت کو اسی نے رواج دیا ہے۔[۱] قابل توجہ بات یہ ہے کہ امام احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین، امام مالك اور مصعب الزبیری نے کہا ہے: وہ صفریہ خوارج میں سے تھا۔ اسی نے مغری عرب میں خوارج کے عقائد پھیلائے[۲]۔ خوارج کا فرقہ صفریہ تمام غیر خوارج کو کافر سمجھتا ہے لہٰذا عکرمہ، خارجی المذھب ہونے کے اعتبار سے اہل بیت علیہم السلام کا بدترین دشمن تھا۔

اس نے عبد اللہ بن عباس کا غلام ہونے سے فائدہ اُٹھا کر جھوٹی روایات ان کی طرف منسوب کیں یہاں تک کہ ضرب المثل بن گیا۔ چنانچہ عبد اللّٰہ بن عمر اپنے غلام نافع اور سعید المسیب اپنے غلام برد سے کہتے تھے:

لا تکذب علیّ کما کذب عکرمۃ علی بن عباس۔[۳]	میری طرف جھوٹی نسبت نہ دو جس طرح عکرمہ نے ابن عباس کی طرف نسبت دی ہے۔

۱؎ تہذیب التہذیب ۷: ۲۶۷ ۲؎ سیر اعلام النبلاء ۳: ۳۶۲۰ ۳؎ تہذیب التہذیب ۷: ۲۶۷

حتیٰ کہ حضرت ابن عباس کے صاحبزادے علی بن عبد اللّٰہ نے عکرمہ کو اصطبل کے دروازے پر باندھ کر رکھا تھا۔ عبد اللّٰہ بن حارث کہتے ہیں: میں نے کہا: کیا تم اپنے غلام کے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہو۔ جواب میں کہا: ان ھذا یکذب علی ابی۔ یہ میرے والد کی طرف جھوٹی نسبت دیتا ہے۔[1]

اسی لیے اصحاب رجال نے اسے کذاب، خبیث، قلیل العقل کہا ہے۔ ملاحظہ ہو تہذیب التھذیب ۷: ۲۶۷۔ جب عکرمہ مر گیا تو اس کا جنازہ اٹھانے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ چار کرایے کے لوگوں سے اُٹھوایا گیا۔ ملاحظہ ہو سیر اعلام النبلاء صفحہ ۳۴۔

دوسرا راوی مقاتل بن سیلمان ہے۔ اس کے بارے میں اصحاب رجال کے یہ الفاظ ہیں: فاسق فاجر ہے۔ خارجۃ اسے جائز القتل سمجھتے تھے۔ وکیع اسے کذاب کہتے تھے۔[2] نسائی نے اسے مشہور کذابوں میں شمار کیا ہے۔[3]

۲۔ ابن عباس کی روایت ہے کہ آیۂ تطہیر ازواج کی شان میں نازل ہوئی ہے۔

اس روایت کے راویان میں بعض مجہول ہیں اور بعض کا کتب رجال اور جرح و تعدیل میں کوئی ذکر تک نہیں ہے اور بعض راوی کذاب ہیں۔ اس روایت کے راویان ابا یحییٰ الحمانی اور خصیف کے بارے میں تہذیب التھذیب ۶: ۱۲۰، الکاشف ۱: ۲۸۰ ملاحظہ ہو۔

جب کہ عبد اللّٰہ بن عباس کی صحیح السند روایت میں کہا ہے کہ آیۂ تطہیر پنجتن علیہم السلام کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ لہٰذا صحیح السند روایت کے مقابلے میں ان ضعیف اور مجہول الحال و کذاب راویوں کی روایت کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

۳۔ واثلہ بن اسقع کی روایت: واثلہ کی ایک روایت کے آخر میں یہ جملہ بھی آیا ہے: واثلہ نے رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے عرض کیا: کیا میں بھی اہل بیت میں شامل ہوں؟ تو فرمایا: وانت من اھلی۔ ہاں تو بھی میرے اہل بیت میں سے ہے۔[4]

اولاً تو واثلہ کی وہ روایت ہمارے سامنے ہے جس میں یہ آخری جملہ نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو المستدرک ۳: ۱۴۷۔ السنن الکبری ۲: ۱۵۲۔ مسند احمد ۴: ۱۰۷ ثانیاً خود واثلہ بن اسقع کی شخصیت ان کی چند ایک دیگر روایات سے سامنے آتی ہے۔

واثلہ کہتے ہیں رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا:

الامناء عند اللّٰہ ثلاثۃ: انا و جبرئیل و معاویۃ۔[5]	اللّٰہ کے نزدیک امین تین ہیں: میں، جبرئیل اور معاویہ۔

---

[1] تہذیب التھذیب ۷: ۲۶۸ [2] تہذیب التھذیب ۱۰: ۲۸۰۔۲۸۱
[3] وفیات الاعیان ۷: ۲۶۸ [4] تفسیر طبری ذیل آیہ [5] اللئالی المصنوعۃ ۱: ۴۱۷

۴۔ ام المومنین ام سلمہؓ کی ایک روایت کے آخر میں آیا ہے: ام سلمہ نے عرض کیا: یا رسول اللہؐ مجھے بھی ان کے ساتھ شامل کیجیے تو رسول اللہؐ نے فرمایا: انك من اھلی تو بھی میرے اہل بیت میں شامل ہے۔[۱]

یہ روایت اس کے راویان موسیٰ بن عقوب اور خالد بن مخلد کی وجہ سے قابل اعتنا نہیں ہیں۔ یہ روایت ان صحیح السند روایات کے خلاف ہے جس میں حضرت ام سلمہؓ کو اہل کساء میں شامل ہونے کی اجازت نہیں ملی تھی لہٰذا قابل توجہ نہیں ہے۔

۵۔ اسید الساعدی کی روایت: اس روایت میں کہا ہے کہ رسول اللہؐ نے ابن عباس اور اپنے اوپر ایک چادر ڈال دی پھر فرمایا:

یارب ھذا عمی و صنو ابی وھؤلاء اھل بیتی فاسترھم من النار کسترتی ایاھم بملاء تی ھذه فامنت اسکفة الباب و حوائط البیت فقال آمین وھی ثلاثا۔[۲]	اے مالک! یہ میرے چچا، میرے والد کے بھائی ہیں یہ میرے اہل بیت ہیں ان کو آتش سے ایسے چھپا لے جیسا کہ میں نے اپنی چادر سے چھپایا ہے۔ دروازے کی چوکھٹ اور دیواروں نے تین مرتبہ آمین کہا۔

اس روایت کی سند میں واقع رجال میں محمد بن یونس الکدیمی جعلی حدیث بنانے میں ماہر کذاب ہے۔[۳]

ایک اور سند سے بھی یہ روایت آئی ہے جس کی سند میں عبد اللہ بن عثمان ہے جس کے بارے میں ماہرین رجال کہتے ہیں: یروی احادیث مشتبھة یہ مشتبہ احادیث بیان کرتا ہے۔[۴] دیگر بعض نے اسے منکر الحدیث، بعض نے مجہول کہا ہے۔[۵]

سب سے اہم یہ کہ اس قسم کی ضعیف روایتیں ان معنوی تواتر سے ثابت احادیث کے خلاف ہیں جن سے اہل البیت کا تعین ہوتا ہے۔

احاطہ خانہ کے اندر، احاطۂ چادر یا گھر کے اندر گھر: رسول اللہ ﷺ نے کساء (چادر) کو ایک احاطہ اور چار دیواری کی شکل دینے کے بعد اس میں موجود افراد کی طرف اشارہ فرما کر فرمایا:

اللّٰھم ھؤلاء اھل بیتی۔	اے اللہ! یہ ہیں میرے اہل بیت۔

اس طرح رسول کریم ﷺ نے قولاً و عملاً اہل بیت کا تعین فرمایا۔

چادر کے احاطے میں لیے بغیر اگر اشارہ فرماتے تو بہت سے لوگ اپنے آپ کو بھی مشار الیہ سمجھنے لگ جاتے کہ ہم بھی تو گھر میں موجود تھے۔ لہٰذا گھر کے اندر ایک گھر بنایا، پھر فرمایا: ھولاء اھل بیتی۔ رسول کریم ﷺ کے اس جملے سے ہم بھی وہی سمجھیں گے جو ازواج نے سمجھا ہے۔ اگر کساء (چادر) کی احاطہ

---

۱ تفسیر طبری ذیل آیہ
۲ الصواعق المحرقہ: ۱۴۴
۳ دلائل النبوۃ بیہقی ۶: ۷۱
۴ لسان المیزان ۳: ۳۶۸
۵ تہذیب ۵: ۳۷۲

حد بندی نہ ہوتی اور چادر کے باہر موجود افراد بھی اہل بیت میں شامل ہوتے تو یہ افراد چادر کے اندر داخل ہونے کی خواہش نہ کرتے۔ اس خواہش کے جواب میں رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے جو ارشاد فرمایا اس سے اہل بیت کا تعین واضح ہو جاتا ہے۔

۱۔ چنانچہ حضرت ام سلمہؓ سے فرمایا:

انك من ازواج النبی۔[1]	تمہارا شمار ازواج نبی میں ہوتا ہے۔

۲۔ دوسری روایت کے مطابق ام سلمہؓ سے فرمایا:

انت علی مکانك انت علی خیر۔	تم اپنی جگہ رہو۔ تو خیر پر ہے۔

۳۔ حضرت عائشہؓ کی روایت میں عائشہؓ نے کہا:

فدنوت منهم فقلت: یا رسول اللّٰہ و انا من اهل بیتك؟ فقال صلی اللّٰہ علیه وسلم تنحی فانك علی خیر۔[2]	جب رسول اللہ نے ھؤلاء اھل بیتی فرمایا تو میں نزدیک چلی گئی اور عرض کیا: کیا میں بھی آپ کے اہل بیت میں شامل ہوں؟ حضور نے فرمایا: ایک طرف ہو جا۔ تو خیر پر ہے۔

ازواج کے اہل بیت میں شامل نہ ہونے کے بارے میں جو بات آج کل کے اہل قلم کے لیے مسلم ہے وہ حضرت عائشہؓ کے لیے مسلم نہیں ہے اور سوال کرنے پر حضور نے تنحی ایک طرف ہو جاؤ فرما کر بات واضح فرمائی۔

حضرت زید بن ارقمؓ سے سوال ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اہل بیت کون لوگ ہیں؟ کیا ان سے مراد ان کی ازواج ہیں؟ انہوں نے کہا:

لا، وایم اللّٰہ ان المراۃ تکون مع الرجل العصر من الدهر ثم یطلقها فترجع الی ابیها و قومها، اهل بیته اهله و عصبته الذین حرموا الصدقة بعده۔[3]	نہیں اللہ کی قسم! بیوی تو ایک مدت تک مرد کے ساتھ رہتی ہے، پھر اسے طلاق دی جاتی ہے تو اپنے باپ اور قوم کی طرف واپس چلی جاتی ہے۔ ان کے اہل بیت ان کے اہل اور قبیلہ کے رشتہ دار ہیں جن پر ان کے بعد صدقہ حرام ہے۔

مسند احمد ۵: ۲۹۲ کی روایت میں آیا ہے کہ حضرت ام سلمہؓ نے فرمایا: میں نے بھی داخل ہونے کے لیے چادر اٹھائی تو حضور نے چادر میرے ہاتھ سے چھین لی اور فرمایا: انك علی خیر۔

۴۔ اس سے زیادہ صراحت حضرت ام سلمہؓ کی اس خواہش میں ہے۔ فرماتی ہیں:

---

[1] مشکل الآثار ۱: ۲۳۳۔ تفسیر ابن کثیر جامع الاصول ۱۰: ۱۰۰۔ الدرالمنثور ۵: ۱۹۸

[2] تفسیر ابن کثیر ذیل آیت [3] صحیح مسلم باب فضائل علی

فقلت یا رسول اللّٰہ انا من اھل البیت فقال: ان لک عند اللّٰہ خیراً فوددت انہ قال نعم فکان احب الی مما تطلع الشمس و تغرب۔[1]

میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا میں بھی اہل بیت میں شامل ہوں؟ فرمایا: تیرے لیے اللہ کے ہاں خیر ہے۔ ام سلمہ فرماتی ہیں: میری خواہش تھی کہ آپ ہاں فرما دیں۔ تب یہ بات میرے لیے ہر اس چیز سے بہتر تھی جس پر سورج طلوع اور غروب کرتا ہے۔

حضرت ام سلمہؓ کے اس جملے میں ان لوگوں کا جواب ہے جو انت علی خیر کا یہ مفہوم لیتے ہیں: تم تو ہو ہی خیر پر۔

یہ لوگ کہتے ہیں:

ان میں سے بعض روایات میں جو یہ بات آئی ہے کہ حضرت عائشہؓ اور حضرت ام سلمہؓ کو نبی نے اس چادر کے نیچے نہیں لیا جس میں حضورؐ نے ان چاروں اصحاب کو لیا تھا، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حضورؐ نے ان کو اپنے گھر والوں سے خارج قرار دیا تھا بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ بیویاں تو اہل بیت میں شامل تھیں ہی، کیونکہ قرآن نے انہی کو مخاطب کیا تھا لیکن حضورؐ کو اندیشہ ہوا کہ ان دوسرے اصحاب کے متعلق ظاہر قرآن کے لحاظ سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو جائے کہ یہ اہل بیت سے خارج ہیں۔ اس لیے آپؐ نے تصریح کی ضرورت ان کے حق میں محسوس فرمائی، نہ کہ ازواج مطہرات کے حق میں...۔[2]

۵۔ ان سب سے زیادہ صراحت براء بن عازب کی روایت میں ہے جس میں حضورؐ نے فرمایا:

ھؤلاء عترتی و اھلی فاذھب عنھم الرجس۔[3]

یہ ہیں میری عترت اور اہل ان سے پلیدی کو دور فرما۔

اس حدیث نے کسی قسم کی تاویل و توجیہ کے لیے گنجائش ختم کر دی چونکہ اہل بیت کو عترت کے ساتھ مربوط کرنے کی صورت میں غیر عترت ان میں شامل نہیں ہیں۔

۶۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ایک حدیث میں وہ صراحت موجود ہے جس کے بعد منکر کے علاوہ کسی اور کے لیے توجیہ و تاویل کا کوئی جواز نہیں ہے۔ فرمایا:

نزلت ھذہ الایۃ فی خمسۃ فیّ و فی علی و حسن و حسین و فاطمہ انما یرید اللّٰہ...۔[4]

یہ آیت پانچ ہستیوں کی شان میں ہے۔ میری، علی، حسن اور حسین اور فاطمہ کی شان میں ہے۔

۷۔ عبد اللہ بن جعفر کی روایت میں آیا ہے:

---

[1] مشکل الآثار ۱: ۲۳۶ [2] تفہیم القرآن
[3] ملاحظہ ہو المعجم الکبیر طبرانی ۲۳: ۳۹۶ حدیث نمبر ۹۴۷۔ کامل ابن عدی ۷: ۳۳۴ راوی نمبر ۱۱۱۱۶۶۳ھ
[4] تفسیر ابن کثیر ذیل آیت۔ تفسیر طبری ذیل آیہ۔ الدار المنثور ۵: ۱۹۸۔ تفسیر ابن ابی حاتم ذیل آیت۔

اللّٰھم ھؤلاء آلی فصل علی محمد وآل محمد۔[1] اے اللہ! یہ میری آل ہیں۔ محمد اور آل محمد پر درود بھیج۔

دو اہم دلائل: آیت تطہیر کے تحت اہل بیت رسول ﷺ میں ازواج کے شامل نہ ہونے پر گزشتہ احادیث کی روشنی میں دو اہم دلائل اور موجود ہیں:

پہلی دلیل: پہلی دلیل احادیث میں موجود وہ جملے ہیں جن میں ازواج کو دور، اپنی جگہ رہنے کا حکم دیا گیا اور صریح لفظوں میں اہل بیت علیہم السلام کا تعین فرمایا۔

پہلا جملہ: تنحیّ ایک طرف ہو جاؤ ہے۔ حافظ ابن کثیر نے امام احمد بن حنبل سے روایت کی ہے:

جب حضورؐ علی اور حضرت فاطمہ، ام سلمہ کے ہاں گھر میں داخل ہونا چاہتے تھے اس موقع پر حضورؐ نے حضرت ام سلمہؓ سے فرمایا: قومی فتنحی عن اھل بیتی۔ اٹھو میرے اہل بیت سے ایک طرف ہو جاؤ۔[2]

حضرت عائشہؓ خود روایت کرتی ہیں:

میں قریب گئی اور کہا: اے رسول اللہ! کیا میں بھی آپ کے اہل بیت میں شامل ہوں؟ اس پر رسول اللہؐ نے فرمایا: تنحی فانك علی خیر۔ تم ایک طرف ہو جاؤ۔ تم خیر پر ہو۔[3]

دوسرا جملہ: انتِ من ازواج النبی۔ تیرا شمار ازواج نبی میں ہوتا ہے۔ حضرت ام سلمہؓ نے حضورؐ سے سوال کیا: کیا میں اہل بیت سے نہیں ہوں؟ جواب میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تو ازواج نبی سے ہے۔ یعنی اہل بیت سے نہیں ہے۔[4]

تیسرا جملہ: اللّٰھم ھؤلاء اھل بیتی و خاصتی: اے اللہ! یہ ہیں میرے اہل بیت اور میرے خاص افراد۔

متعدد مصادر میں ہے:

رسول اللہ ﷺ نے حضرات علی، فاطمہ اور حسنین علیہم السلام کو کساء کے نیچے بٹھا کر فرمایا: اے اللہ! یہ ہیں میرے اہل بیت اور میرے خاص افراد۔[5]

چوتھا جملہ: مکانك۔ جہاں ہو، وہیں رہو۔ حضرت ام سلمہؓ کی چند ایک روایات میں یہ جملہ آیا ہے کہ جب ام سلمہؓ نے کساء میں داخل ہونے کی خواہش ظاہر کی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مکانك۔ جہاں ہو، وہیں رہو۔ یعنی اہل بیت میں شامل ہونے کی توقع نہ رکھو۔[6]

---

[1] ملاحظہ ہو المستدرک ۲: ۱۴۷۔ قال الحاکم ھذا حدیث صحیح الاسناد۔ [2] تفسیر ابن کثیر ذیل آیت [3] حوالہ سابق
[4] تفسیر ابن کثیر و تفسیر طبری
[5] تفسیر طبری ذیل آیت۔ تفسیر ابن ابی حاتم ذیل آیت [6] تفسیر طبری۔ تفسیر قرطبی

پانچواں جملہ: فوددت انه قال نعم فکان احب الی مما تطلع الشمس و تغرب۔ حضرت ام سلمہؓ کی ایک روایت میں آیا ہے:

میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا میں بھی اہل بیت سے ہوں؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ان لك عند اللّٰه خیراً۔ تیرے لیے اللہ کے ہاں خیر ہے۔ یہ جواب سن کر حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں: میری خواہش تھی آپ ہاں فرمائیں۔ تب یہ بات میرے لیے ہر اس چیز سے بہتر تھی جس پر سورج طلوع اور غروب کرتا ہے۔

چھٹا جملہ: ھؤلاء عترتی و اھلی۔ حضرت براء بن عازب کی روایت میں ہے کہ اصحاب کساء کو کساء میں جمع کرنے کے بعد فرمایا: ھؤلاء عترتی و اھلی۔ یہ میری عترت اور میرے اہل ہیں۔ ظاہر ہے عترت کی تعبیر کے بعد ازواج کی اہل بیت میں شمولیت کا تصور ہی نہیں ہو سکتا۔ حضرت براء بن عازب کی روایت ملاحظہ ہو: المعجم الکبیر طبرانی ۲۳: ۳۹۶ حدیث نمبر ۹۴۷ وغیرہ۔

ساتواں جملہ: اللھم ھولاء آلی۔ اے اللہ یہ میری آل ہیں۔ یہ روایت حضرت عبد اللّٰه بن جعفر کی ہے۔ ملاحظہ ہو المستدرک ۲: ۱۴۷۔ مؤلف نے کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے۔ آل محمد کون ہیں اسے سمجھنے کے لیے آل ابراہیم کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ چونکہ درود میں آل محمد کو آل ابراہیم کے ساتھ مقرون کیا گیا ہے۔ اللّٰھم صلی علی محمد و آل محمد کما صلیت علی ابراھیم و علی آل ابراھیم۔

آٹھواں جملہ: فجذبه من یدی: رسولؐ نے چادر میرے ہاتھ سے کھینچ لی۔ حضرت ام سلمہؓ کی ایک روایت میں یہ جملہ مذکور ہے۔ چنانچہ آپ فرماتی ہیں:

فرفعت الکساء لا دخل معھم فجذبه من یدی وقال: انك علی خیر۔[1]

میں نے چادر اٹھائی تاکہ میں بھی ان میں داخل ہو جاؤں لیکن آنحضرت ﷺ نے چادر میرے ہاتھ سے کھینچ لی اور فرمایا تم خیر پر ہو۔

دوسری دلیل: انتہائی قابل توجہ ہے۔ اپنے اہل بیت کے تعین کے لیے ممکنہ تمام اہتمامات کے ساتھ نص صریح قائم فرمانے کے بعد مستقبل بعید پر نگاہ رکھنے والے رسول برحق ﷺ نے اس بات کو مزید راسخ کرنے کے لیے ایک حکمت عملی اختیار فرمائی جو رسول کریم ﷺ کی رسالت پر ایمان رکھنے والے ہر مسلمان کے لیے لمحہ فکریہ ہے:

ششماہہ دورانیہ

: وہ لمحہ فکریہ یہ ہے کہ رسول کریم ﷺ ایک مدت تک روزانہ ہر نماز کے وقت حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کے دروازے پر تشریف لے جاتے اور فرماتے:

السلام علیکم و رحمة اللّٰه و برکاته اهل البیت! اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیُذۡہِبَ عَنۡکُمُ الرِّجۡسَ اَہۡلَ الۡبَیۡتِ وَ یُطَہِّرَکُمۡ تَطۡہِیۡرًا ۔

[1] مسند احمد ۳: ۲۹۲ اور ۳۲۳

۱۔ حضرت ابن عباس کہتے ہیں: میں نو ماہ تک رسول اللہؐ کے ساتھ یہ دیکھتا رہا کہ آپؐ ہر نماز کے وقت دروازہ فاطمہ سلام اللہ علیہا پر جا کر اسی آیت کی تلاوت کرتے رہے۔[1]

۲۔ ابوبرزہ راوی ہیں: میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سترہ ماہ تک نماز پڑھتا رہا ہوں۔ میں نے دیکھا رسول اللہ ﷺ اپنے گھر سے نکل کر دروازہ فاطمہ سلام اللہ علیہا پر جا کر السلام علیکم فرماتے اور اس آیت کی تلاوت فرماتے۔[2]

۳۔ انس بن مالك راوی ہیں: رسول اللہ ﷺ چھ ماہ تک صبح کی نماز کے وقت باب فاطمہ سلام اللہ علیہا پر جا کر فرماتے رہے: الصلوة یا اهل البیت! اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیُذۡهِبَ عَنۡکُمُ الرِّجۡسَ ...۔[3]

۴۔ ابوالحمراء سے روایت ہے:

حفظت من رسول اللّٰہ ثمانیة اشهر بالمدینة لیس من مرة یخرج الی صلوة الغداة الا اتی علی باب علی فوضع یده علی جبنتی الباب ثم قال: الصلوة الصلوة اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیُذۡهِبَ عَنۡکُمُ الرِّجۡسَ اَهۡلَ الۡبَیۡتِ وَ یُطَهِّرَکُمۡ تَطۡهِیۡرًا.

مجھے یاد ہے کہ آٹھ ماہ تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ رسول اللہؐ صبح کی نماز کے لیے گھر سے نکلے ہوں اور دروازۂ علیؑ پر نہ آئے ہوں اور دروازے کے چوکھٹوں پر ہاتھ رکھ کر یہ نہ فرمایا ہو: الصلوة الصلوة اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیُذۡهِبَ عَنۡکُمُ الرِّجۡسَ اَهۡلَ الۡبَیۡتِ وَ یُطَهِّرَکُمۡ تَطۡهِیۡرًا۔

بعض دیگر روایات میں یہ مدت سترہ ماہ اور انیس ماہ کا بھی ذکر ملتا ہے۔ ملاحظہ ہو تفاسیر ابن کثیر، طبری ذیل آیہ۔ اسد الغابہ، مشکل الآثار وغیرہ

رسول کریم ﷺ کی طرف سے قائم ان نصوص اور صراحتوں کے بعد اہل بیت علیہم السلام کے تعین میں کوئی شبہ باقی نہیں رہ جاتا۔

اہل بیت رسولؐ کے مصداق کا تعین

اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تعین میں کوئی دشواری درپیش نہیں ہے۔ حیات رسول ﷺ میں بہت سے مواقع ایسے آئے ہیں جن میں بلا نزاع اہل بیت علیہم السلام کا تعین ہوگیا ہے۔ بعنوان مثال درجہ ذیل مواقع قابل مطالعہ ہیں:

۱۔ مباہلہ: تقریباً تمام مفسرین، مورخین اور محدثین نے لکھا ہے کہ مباہلہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ

[1] الدر المنثورہ ۵: ۳۷۸ [2] مجمع الزوائد باب فضل اهل البیت

[3] صحیح الترمذی ۵: ۳۲۸۔ مسند احمد بن حنبل ۲: ۲۰۹۔ المستدرك ۳: ۱۵۸

نے اپنے ہمراہ حضرت علی، حضرت فاطمہ وحسنین علیہم السلام کو لیا اور یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ قرآن مجید میں جہاں بھی ابناء کے ساتھ نساء کا ذکر آیا ہے وہاں نساء سے مراد بیٹیاں ہیں۔ جیسے: وَيُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ....[1]

۲۔ آیت مودت: قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ....[2] اس آیت کے شان نزول میں ابن تیمیۃ تک کو اعتراف ہے کہ الْقُرْبٰى سے مراد علی، فاطمہ اور حسنین علیہم السلام ہیں۔

۳۔ حالت جنابت: رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کی اس حدیث سے بھی اہل بیت کا تعیّن ہوتا ہے۔ ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے فرمایا:

الا ان مسجدی حرام علی کل احائض من النسآء و کل جنب من الرجال الا علی محمد و اہل بیتہ علی و فاطمة والحسن والحسین۔[3]	آگاہ رہو! بے شک میری مسجد میں عورتوں میں سے حائض اور مردوں میں سے ہر مجنب شخص کا آنا حرام ہے سوائے محمد اور ان کے اہل بیت علی، فاطمہ اور حسن و حسین کے۔

۴۔ عترتی اہل بیتی: اہل بیت کے تعین کے لیے ایک اہم دلیل وہ احادیث ہیں جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے متعدد مقامات میں جملۂ اہل البیت کے ساتھ عترتی کا توضیحی لفظ شامل فرمایا۔

سیاق و سباق: گزشتہ صحیح الاسناد احادیث سے یہ بات واضح ہوگئی کہ یہ آیت صرف اہل بیت علیہم السلام یعنی رسول کریمؐ، حضرت علی، حضرت فاطمہ، حضرت امام حسن و حسین علیہم السلام کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ اس سے یہ بات از خود واضح ہو جاتی ہے کہ یہ آیت دوسری آیات سے جدا نازل ہوئی ہے۔

ثانیاً سیاق آیات لفظاً و معناً ایک نہیں ہے۔ چنانچہ ازواج کے لیے جمع مؤنث کا صیغہ استعمال ہوا ہے اور آیۂ تطہیر میں جمع مذکر کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔

معنی میں ایک جیسا لہجہ کلام نہیں ہے بلکہ آیت میں ازواج کے لیے تنبیہ کا لہجہ ہے۔ ازواج سے فرمایا:

وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى	اپنے گھروں میں ٹک کر کے بیٹھی رہو اور جاہلیت اولی کی طرح اپنے آپ کو نمایاں نہ کرو۔

اہل بیت اطہار علیہم السلام کے لیے تطہیر کا مژدہ، انداز تخاطب میں واضح فرق اہل خرد کے لیے دعوت فکر ہے۔

نیز سیاق سے استدلال کرنے کے لیے ضروری ہے کہ یہ بات ثابت ہو کہ یہ آیات ایک ساتھ اور ایک مناسبت سے نازل ہوئی ہیں جب کہ گزشتہ صحیح الاسناد روایات سے تو یہ ثابت ہے کہ آیۂ تطہیر جدا نازل ہوئی ہے۔

۱۔ چنانچہ ابو المحاسن حنفی اپنی کتاب معتصر المختصر ۲: ۲۶۷ میں آیت تطہیر کے

---

[1] ۱۴ ابراهیم: ۶ [2] ۴۲ شوری: ۲۳ [3] السنن الکبریٰ ۷: ۶۵۔ الغدیر ۳: ۲۱۲

استقلال کے بارے میں لکھتے ہیں:

والکلام لخطاب ازواج النبی ثم عند قوله: وَ اَقِمۡنَ الصَّلٰوۃَ وَ اٰتِیۡنَ الزَّکٰوۃَ و قوله تعالی: اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیُذۡہِبَ عَنۡکُمُ الرِّجۡسَ اَہۡلَ الۡبَیۡتِ استئناف تشریفاً لاهل البیت و ترفیعاً لمقدارهم الاتری انه جاء علی خطاب المذکر فقال: عَنۡکُمُ و لم یقل عنکن فلا حجة لاحد فی ادخال الازواج فی هذه الایة یدل علیه ماروی ان رسول الله صلی الله علیه و سلم کان اذا اصبح اتی باب فاطمة فقال: السلام علیکم اهل البیت! اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیُذۡہِبَ عَنۡکُمُ الرِّجۡسَ اَہۡلَ الۡبَیۡتِ وَ یُطَہِّرَکُمۡ تَطۡہِیۡرًا۔

ازواج سے خطاب کا کلام وَ اَقِمۡنَ الصَّلٰوۃَ وَ اٰتِیۡنَ الزَّکٰوۃَ پر ختم ہوگیا اور اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیُذۡہِبَ عَنۡکُمُ الرِّجۡسَ اَہۡلَ الۡبَیۡتِ نیا کلام ہے۔ اس میں اھل البیت کے لیے شرافت اور ان کی قدر و منزلت کی بلندی کی بات ہے۔ چنانچہ یہ بات آپ کے سامنے ہے کہ اس میں مذکر سے خطاب کا طرز آیا اور فرمایا عَنۡکُمُ اور عنکنّ نہیں فرمایا۔ لہٰذا ازواج کو اہل بیت میں داخل کرنے کے لیے کسی کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ اس پر وہ روایت بھی دلالت کرتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صبح کے وقت فاطمہ کے دروازے پر تشریف لاتے اور فرماتے: السلام علیکم اهل البیت! اِنَّمَا یُرِیۡدُ اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیُذۡہِبَ عَنۡکُمُ الرِّجۡسَ اَہۡلَ الۡبَیۡتِ وَ یُطَہِّرَکُمۡ تَطۡہِیۡرًا۔

سوال: پھر یہ آیت ازواج کے ذکر کے درمیان کیوں ہے؟

جواب: ہم نے مقدمہ میں ترتیب آیات اور ترتیب نزول کے بارے میں لکھا ہے اس کا یہاں دوبارہ ذکر دیتے ہیں:

یہ بات ایک واضح حقیقت ہے کہ موجودہ قرآن میں آیات جس ترتیب سے درج ہیں وہ ترتیب نزولی کے مطابق نہیں کیونکہ:

> ترتیب نزولی، وقت نزول کے تقاضوں کے مطابق ہے اور ترتیب قرآن، نظام قرآن کے تقاضوں کے مطابق ہے۔

اس کی وضاحت کے سلسلے میں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

۱۔ شروع میں شوہر کی وفات کی صورت میں عورت کے لیے ایک سال کی عدت واجب تھی اور پورا سال شوہر کے گھر سے نکلنا جائز نہ تھا نیز عورت کو شوہر سے میراث میں صرف ایک سال کا خرچہ ہی ملتا تھا۔ اس کا حکم اس طرح نازل ہوا:

وَ الَّذِیۡنَ یُتَوَفَّوۡنَ مِنۡکُمۡ وَ یَذَرُوۡنَ　اور تم میں سے جو وفات پا جائیں اور بیویاں چھوڑ

اَزۡوَاجًا ۚۖ وَّصِیَّۃً لِّاَزۡوَاجِهِمۡ مَّتَاعًا اِلَی الۡحَوۡلِ غَیۡرَ اِخۡرَاجٍ ...[1] جائیں انہیں چاہیے کہ وہ اپنی بیویوں کے بارے میں وصیت کر جائیں کہ ایک سال تک انہیں (نان ونفقہ سے) بہرہ مند رکھا جائے اور گھر سے نہ نکالی جائیں۔

مذکورہ بالا آیت کا حکم اسی سورہ کی اس سے پیشتر آنے والی ایک آیت کے ذریعے منسوخ ہو گیا جس میں ارشاد فرمایا:

وَالَّذِیۡنَ یُتَوَفَّوۡنَ مِنۡکُمۡ وَیَذَرُوۡنَ اَزۡوَاجًا یَّتَرَبَّصۡنَ بِاَنۡفُسِهِنَّ اَرۡبَعَۃَ اَشۡهُرٍ وَّعَشۡرًا ...[2] اور تم میں سے جو وفات پا جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں تو وہ بیویاں چار ماہ دس دن اپنے آپ کو انتظار میں رکھیں۔

یہاں ترتیب نزولی کے مطابق پہلی آیت بعد میں نازل ہوئی کیونکہ یہ ناسخ ہے مگر قرآنی ترتیب میں ناسخ کا ذکر پہلے اور منسوخ کا ذکر بعد میں ہے۔

۲۔ ابن عباس، سدی، جبائی اور بلخی کے مطابق آیہ: اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ وَاَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ وَرَضِیۡتُ لَکُمُ الۡاِسۡلَامَ دِیۡنًا ...[3] کے بعد کوئی فرض حکم نازل نہیں ہوا اور حضرت محمد باقر اور حضرت جعفر صادق علیہما السلام سے بھی یہی منقول ہے۔ چنانچہ سدی کے الفاظ یہ ہیں:

لم ینزل بعدھا حلال و لا حرام۔[4] اس آیت کے بعد حلال وحرام کا کوئی حکم نازل نہیں ہوا۔

حالانکہ اب یہ آیت سورہ مائدہ میں درج ہے اور اس کے بعد بے شمار آیات احکام موجود ہیں۔

۳۔ اِنَّ الصَّفَا وَالۡمَرۡوَۃَ مِنۡ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ...[5] صلح حدیبیہ کے بعد اس وقت نازل ہوئی جب مسلمانوں کے لیے حج کرنا ممکن ہوا۔ جب کہ یہ آیت سورۂ بقرہ میں درج ہے جو کہ مدینے میں نازل ہونے والا سب سے پہلا سورہ ہے۔

۴۔ وَاتَّقُوۡا یَوۡمًا تُرۡجَعُوۡنَ فِیۡهِ اِلَی اللّٰهِ۔ بقولے سب سے آخر میں اتری ہے اور اگر سب سے آخر میں نہیں تو اواخر میں یقیناً ہے۔ جب کہ اب یہ آیت سورہ بقرہ کی ۲۸۱ ویں آیت ہے۔

لہٰذا موجودہ نظام قرآن کے بارے میں سنت ثابتہ کی طرف سے آنے والی وضاحت ہی حجت ہے۔ اس کی موجودگی میں سیاق کا انعقاد نہیں ہوتا۔

سیاق و سنت ثابتہ: ہم اگر یہ فرض بھی کر لیں کہ یہ آیات ایک ساتھ ایک ہی مناسبت میں اور ایک ہی جگہ نازل ہوئی ہیں تو اگر سنت ثابتہ قرآن کے سیاق کے مطابق نہ ہو تو اس صورت میں سنت ثابتہ سیاق پر مقدم ہے چونکہ سیاق سے تو بظاہر معنی سمجھا جاتا ہے جب کہ سنت ثابتہ سے صراحت کے ساتھ سمجھا جاتا

[1] ۲ بقرہ: ۲۴۰ [2] ۲ بقرہ: ۲۳۴ [3] ۵ مائدہ: ۳ [4] سیوطی الدرالمنثور ۲: ۲۵۹ [5] ۲ بقرہ: ۱۵۸

ہے اور ظاہر پر صراحت مقدم ہے۔ چنانچہ ہم نے پہلے بھی اس کا ذکر کیا ہے: فتقدم السنه علی السیاق تقدم النص علی الظهور۔ چونکہ سنت مفسر کتاب اور مبین رموز قرآن ہے لہٰذا سنت بعنوان مفسر و مبین، ظہور پر مقدم ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ قرآن کے ظہور سے ہم نے جو کچھ سمجھا ہے ہماری سمجھ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی تعلیم مقدم ہے۔ ورنہ اگر سنت سے ہٹ کر قرآن کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے تو اس صورت قرآن اس کشتی کے مانند ہو کر رہ جائے گا جس کا ناخدا نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں اگر قرآن کو سنت ثابتہ کی روشنی میں سمجھنے کو گوارا نہ کیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس نے اپنی سمجھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی سمجھ پر مقدم کیا ہے۔ فافهم ذلك۔

ہمارا فہم مقدم ہے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا؟: سیاق سے جو ظاہری معنی سمجھ میں آتا ہے وہ ہماری سمجھ ہے اور آیت کی تشریح جو سنت ثابتہ میں موجود ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا فہم ہے۔ کوئی مسلمان اس بات کی جرأت نہیں کرے گا کہ رسولؐ کے فہم پر اپنے فہم کو مقدم قرار دے۔ نہ ہی کوئی مسلمان احادیث رسولؐ کو نظر انداز کر سکے گا۔ لہٰذا اهل البیت کی تشریح جو رسول اللہؐ نے فرمائی ہے اسے تسلیم کرنا ایمان کا تقاضا ہے۔ البتہ ناصبی ان احادیث کو تسلیم نہیں کرے گا چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا اٹل فیصلہ ہے: مؤمن علی سے بغض نہیں رکھے گا اور منافق علی سے محبت نہیں کرے گا۔

واضح رہے جنہیں عصر رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم میں منافق کہتے تھے، انہیں عصر علی علیہ السلام میں خوارج اور ہمارے زمانے میں ناصبی کہتے ہیں۔

ذوق سلیم۔ فہم سلیم: ایسے علماء کی بھی کمی نہیں جن کا فہم و ذوق کسی قسم کے تعصب کی وجہ سے مجروح نہ ہوا۔ چنانچہ اہل سنت کے قدیم اور متاخرین جلیل القدر علماء نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ اہل بیت سے مراد کون ہیں۔ ہم ذیل صرف چند ایک علمائے سلف کی تصریحات پر اکتفا کرتے ہیں:

۱۔ ابو جعفر طحاوی متوفی ۳۲۱ ھ کہتے ہیں:

ان المرادین بمافیهاهم رسول صلی الله علیه و سلم و علی و فاطمه و حسن و حسین دون من سواهم۔[1]	اس آیت سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، علی، فاطمہ، حسن اور حسین ہیں۔ ان کے علاوہ اور کوئی مراد نہیں ہے۔

۲۔ ابوبکر نقاش متوفی ۳۵۱ ھ آیت تطہیر کے بارے میں لکھتے ہیں:

اجمع اکثر اهل التفسیر انها نزلت فی علی و فاطمة و الحسن و الحسین صلوات الله علیهم۔[2]	اکثر اہل تفسیر کا اجماع ہے کہ یہ آیت علی، فاطمہ، حسن اور حسین صلوات اللہ علیہم کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

---

[1] مشکل الآثار ۲: ۲۶۹ حدیث نمبر ۶۵۵ کے ذیل میں۔
[2] مقریزی فضل آل البیت صفحہ ۷۵

۳۔ ابوبکر شافعی متوفی ۳۵۴ ھ اپنی کتاب الفوائد میں لکھتے ہیں:

و اهل البیت رسول الله صلی الله علیه وسلم و علی و فاطمه و الحسن و الحسین۔[1]

اور اہل بیت، رسول صلی اللہ علیہ وسلم، علی، فاطمہ، حسن اور حسین ہیں۔

۴۔ اجری بغدادی متوفی ۳۶۰ ھ کتاب الشریعۃ ۴: ۴۷ میں تصریح کرتے ہیں:

وهم علی و فاطمة والحسن و الحسین رضی الله عنهم۔

اور وہ علی، فاطمہ، حسن اور حسین رضی اللہ عنہم ہیں۔

۵۔ حاکم نیشاپوری متوفی ۴۰۵ ھ آیت تطہیر کے شان نزول کے بارے میں بعض احادیث جو مسلم اور بخاری کی شرط کے مطابق صحیح ہیں، نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

انّما خرجته لیعلم المستفید ان اهل البیت و الآل جمیعاً هم۔[2]

میں نے ان احادیث کو اس کے لیے بیان کیا تاکہ ان سے استفادہ کرنے والا یہ جان لے کہ اہل بیت اور آل صرف یہی لوگ ہیں۔

۶۔ ابن عساکر دمشقی شافعی متوفی ۵۷۱ ھ اپنی کتاب الاربعین فی مناقب امہات المؤمنین میں پنجتن علیہم السلام کے ذکر کے بعد لکھتے ہیں:

و الایة نزلت خاصة فی هؤلاء المذکورین والله اعلم۔

یہ آیت صرف مذکورہ ہستیوں کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ واللہ اعلم۔

۷۔ شمس الدین ذہبی متوفی ۷۴۸ ھ تاریخ الاسلام ۱: ۳۷۲ میں لکھتے ہیں:

وفی فاطمة و زوجها و بنیها نزلت انما اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیُذۡہِبَ عَنۡکُمُ الرِّجۡسَ اَہۡلَ الۡبَیۡتِ وَ یُطَہِّرَکُمۡ تَطۡہِیۡرًا فجلّلهم رسول الله صلی الله علیه وسلم وقال: اللهم هؤلاء اهل بیتی۔

آیت اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیُذۡہِبَ عَنۡکُمُ الرِّجۡسَ اَہۡلَ الۡبَیۡتِ وَ یُطَہِّرَکُمۡ تَطۡہِیۡرًا صرف فاطمہ، ان کے شوہر نامدار، اور ان کے دو بیٹوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ (وآلہ) وسلم نے ان ہستیوں چادر ڈالی اور فرمایا ہے: بارالہا! یہ میرے اہل بیت ہیں۔

۸۔ نظام الدین نیشاپوری متوفی ۷۲۸ ھ اپنی کتاب غرائب القرآن میں تصریح کرتے ہیں: آیت مباہلہ و آیت تطہیر علی، فاطمہ اور حسنین کی شان میں نازل ہوئی۔

۱۔ علامہ الشیخ حسن بن علی السقاف، البانی کی اس بات کے جواب میں کہ شیعہ کا اس

---

[1] الفوائد الغیلانیات ۳: ۲۶۴ حدیث ۲۵۹
[2] المستدرک ۳: ۱۴۸

آیت کو علی، فاطمہ، حسن اور حسین علیہم السلام کے ساتھ تخصیص کرنا اور ازدواج کو خارج سمجھنا ان کی طرف سے ان آیات کی تحریف ہے۔ لکھتے ہیں:

> البانی کی یہ بات سنت رسولؐ کو رد کرنے کے لیے اٹھائے جانے والے شبہات اور کج روی میں سے ہے۔ اهل البیت کی تشریح میں موجود سنت رسولؐ کی رد کے لیے وہ قاری کو یہ دھوکہ دینا چاہتا ہے جو اهل کساء کو ہی اهل البیت مانتا ہے وہ شیعہ ہے۔ جب کہ حق یہ ہے کہ تمام اہل سنت اسی بات کے قائل ہیں۔ ان سے پہلے خود رسولؐ جو لاینطق عن الهوی ہیں اسی بات کے قائل ہیں لیکن ناصبیت نے البانی کے لیے رد حدیث کو سجایا ہے۔[1]

معجم الفاظ القرآن الکریم۔ مجمع اللغة العربیه کی طرف سے ترتیب دی گئی اس کتاب کے جلد اول صفحہ ۱۳۸ میں البیت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

اهل بیت الرجل اسرته و اطلق فی القران اهل البیت علی اسرة ابراهیم و تعورف فی الاستعمال اهل البیت لآل المصطفیٰ صلی اللّٰہ علیه و سلم۔

انسان کے اہل بیت کے معنی انسان، اس کا خاندان ہے اور قرآن میں اہل بیت کا لفظ حضرت ابراہیم کے خاندان کے لیے استعمال ہوا ہے اور آل مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اہل بیت کا استعمال متعارف ہے۔

علامہ ابوبکر حضرمی رشفة الصادی الباب الاول میں لکھتے ہیں:

والذی قال به الجماهیر وقطع به اکابر الائمة وقامت به البراهین و تظافرت به الادلة ان اهل البیت المرادین فی الایة هم سیدنا علی و فاطمة و ابناهما و ما تخصیصهم بذلك منه صلی اللّٰہ علیه وسلم الا عن امر۔

جس بات کا جمہور قائل ہے اور اکابر ائمہ نے جس پر یقین کیا ہے اور جس بات پر براہین قائم ہیں اور دلائل سے جو بات ثابت ہے وہ یہ ہے اہل البیت سے مراد سیدنا علی، فاطمہ اور ان کے دونوں بیٹے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم خاص سے ہی ان کو مخصوص کیا ہے۔

آگے لکھتے ہیں:

> مؤلف روح البیان نے جو کہا ہے کہ اہل بیت سے صرف پنجتن مراد لینا شیعہ نظریہ ہے، صرف زور گوئی ہے چونکہ کتب احادیث اور کتب اہل سنت میں جو کچھ ہے وہ چشم بینا رکھنے والوں کے لیے کافی ہے۔

---

[1] صحیح شرح العقیدة الطحاوی: ۶۵۵

علامہ شوکانی ان لوگوں کی رد میں لکھتے ہیں جو کہتے ہیں یہ آیت ازواج کے بارے میں ہے:

ویجاب عن هذا بانه و رد بالدلیل الصحیح انها نزلت فی علی و فاطمه و الحسنین۔[1]

اس کا یہ جواب دیا جاتا ہے کہ صحیح دلیل وارد ہے کہ یہ آیت علی، فاطمہ اور حسنین کی شان میں نازل ہوئی ہے۔

علامہ سمہودی جواهر العقدین باب اول میں لکھتے ہیں:

وهولاءهم اهل الکساء فهم المرادین من الایتین الباهلة و التطهیر۔

ان سے مراد اهل کساء ہیں اور آیہ مباهلہ و آیہ تطهیر سے یہی حضرات مراد ہیں۔

علامہ ابو منصور ابن عساکر اپنی کتاب الاربعین فی مناقب امهات المؤمنین میں ام سلمہؓ کی روایت کے بعد لکھتے ہیں

اهل البیت سے مراد رسول اللہ علی فاطمہ حسن اور حسین ہیں۔

علامہ سید محمد حبسوس شرح الشمائل میں حدیث کے ذکر کے بعد اهل کساء کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

وفی ذلك اشارة الی انهم المراد باهل البیت فی الآیة۔

اس حدیث میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہی ہستیاں ہی اهل البیت سے مراد ہیں۔

جناب توفیق ابو علم نے اپنی کتاب اهل البیت میں عبدالعزیز بخاری کو رد کرتے ہوئے لکھا ہے:

وقد اوضحنا بما لا مزید علیه ان المقصود من اهل البیت هم العترة الطاهرة لا الازواج۔

ہم نے اس بات کی وضاحت کر دی ہے کہ مزید کی ضرورت نہیں ہے کہ اَهۡلَ الۡبَیۡتِ سے مراد عترت طاہرین ہیں، نہ کہ ازواج۔

علامہ ابن الجوزی اس بات کا جواب دیتے ہیں کہ اس آیت میں مذکر کا صیغہ کیسے استعمال ہوا؟:

اول یہ کہ اہل البیتؑ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ شامل ہیں لہٰذا تغلیباً مذکر کا صیغہ استعمال ہوا ہے دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ آیت علی، حسن و حسین علیہم السلام کے ساتھ خاص ہے۔[2]

طحاوی حضرت ام سلمہؓ سے حدیث کساء کی متعدد روایات ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں:

ان روایات میں جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ نے جو کچھ حضرت ام سلمہ سے فرمایا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ام سلمہ اس آیت میں شامل نہیں ہیں اور اس سے مراد رسول اللہؐ، علی، فاطمہ حسن و حسین علیہم السلام ہیں، نہ کہ دوسرے۔[3]

---

[1] ارشاد الفحول البحث الثامن من المقصد الثالث [2] زاد المسیر ۶: ۳۸۱
[3] تحفة الاخیار بترتیب شرح مشکل الآثار ۸: ۴۷۶

ابوالمحاسن علامہ یوسف بن موسی الحنفی صحیح شرح العقیدہ الطحاویۃ صفحہ ۶۵۵ میں فرماتے ہیں:

ازواج کے لیے خطاب وَاَقِمۡنَ الصَّلٰوۃَ پر ختم ہو گیا اور اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰہُ سے نئے سرے سے خطاب، اھل البیت کے لیے دستور بیان کرنے، ان کی شان کی بلندی کا ذکر کرنے کے لیے ہے۔ اسی لیے جمع مذکر کا صیغہ استعمال ہوا اور عنکم فرمایا عنکن نہیں فرمایا۔ لہٰذا ازواج کو داخل کرنے کے لیے کسی کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے بلکہ ازواج کے داخل نہ ہونے کی دلیل یہ بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ صبح کے وقت فاطمہ علیہا السلام کے دروازے پر جا کر السلام علیکم اھل البیت فرمایا کرتے تھے۔

جناب مولانا ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی صاحب مفتی رشید احمد کی رد میں لکھتے ہیں:

بہر حال اصل موضوع سے متعلق عرض ہے کہ حضرت مولانا (مفتی رشید احمد) نے علیؓ، حسنؓ، حسینؓ اور فاطمہؓ کو اہل بیت میں شامل کرنے والوں کو ملحد قرار دیا ہے اور یہ جو انہوں نے فرمایا ہے کہ شیعہ، خانوادۂ نبویؐ کے ان اولین افراد کو اہل بیت کہتے ہیں، یہ بڑی افسوس ناک غلط بیانی ہے۔ ہم نے اس مقالے کے ابتدا ہی میں امام طبری و حافظ ابن کثیر کی تفاسیر سے متعدد احادیث نقل کی ہیں جن میں سورۂ احزاب کی آیت تطہیر کی تفسیر میں اہل بیت کا اطلاق صرف حضرات فاطمہ، علی، حسن، حسین اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر ہے تو کیا اہل سنت کے یہ دونوں امام و محدث و مفسر بھی شیعہ تھے؟ حیف صد حیف کہ سنت کا دعویٰ کرنے والے احادیث نبوی کو اس طرح جھٹلا رہے ہیں۔[1]

مولانا ڈاکٹر سید رضوان ندوی صاحب اسی رسالہ کے صفحہ ۲۷ پر لکھتے ہیں:

اور پھر جہاں تک احادیث کا تعلق ہے اور جن سے ہم ناصبی فکر کے خلاف کافی ثبوت پیش کر چکے ہیں ان میں ایک بدیہی ثبوت یہ ہے کہ حدیث کے انتہائی مشہور متداول اور مستند مجموعے مشکوۃ میں کتاب المناقب کا ایک باب ہے: باب مناقب اھل بیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے فوراً بعد ایک دوسرا باب: باب مناقب ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ اگر ازواج النبی ہی اھل البیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم ہوتیں تو ازواج النبی علیہ الصلوۃ والسلام کے نام سے ایک علیحدہ باب کی کیا ضرورت تھی؟ ذرا غور کریں۔ مزید کہ مناقب اھل النبی علیہ

---

[1] ناصبیت تقدس کے بھیس میں ص ۲۲

الصلوۃ والسلام کے تحت جتنی احادیث مشکوۃ میں درج ہیں خواہ علی حدہ علی حدہ امام بخاری و مسلم کی ہوں، خواہ متفق علیہ ہوں، خواہ ترمذی و دیگر کتب حدیث سے منقول ہوں، ان سب میں حضرت فاطمہؑ، حضرت علیؑ و حضرات حسنینؑ کے مناقب مذکور ہیں، ازواج مطہرات کے نہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے جیسا کہ صحیح مسلم میں حضرت زید بن ارقم کی حدیث میں ہے کہ حقیقی اہل بیت خاندان نبوی کے افراد ہیں۔

اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَذِکۡرٰی لِمَنۡ کَانَ لَہٗ قَلۡبٌ اَوۡ اَلۡقَی السَّمۡعَ وَ ہُوَ شَہِیۡدٌ ۔[1]

وَ اذۡکُرۡنَ مَا یُتۡلٰی فِیۡ بُیُوۡتِکُنَّ مِنۡ اٰیٰتِ اللّٰہِ وَ الۡحِکۡمَۃِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ لَطِیۡفًا خَبِیۡرًا ﴿۳۴﴾	۳۴۔ اور اللہ کی ان آیات اور حکمت کو یاد رکھو جن کی تمہارے گھروں میں تلاوت ہوتی ہے، اللہ یقیناً بڑا باریک بین، خوب باخبر ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اذۡکُرۡنَ مَا یُتۡلٰی فِیۡ بُیُوۡتِکُنَّ: وَ اذۡکُرۡنَ تذکر سے ہے۔ یعنی ان آیات کو یاد رکھو اور غفلت اور عدم توجہ کی شکار نہ ہوں۔ چونکہ ان آیات کی خود تمہارے گھروں میں تلاوت کی جاتی ہے، تم مقام وحی کے قریب ہو، دوسرے لوگوں تک یہ آیات بعد میں پہنچتی ہیں۔ اسی لیے ان کی ذمے داری سنگین اور ان کے لیے گناہ و ثواب بھی دوسروں سے مختلف ہے۔

۲۔ مِنۡ اٰیٰتِ اللّٰہِ وَ الۡحِکۡمَۃِ: یہاں آیات اور حکمت میں کیا فرق ہے؟ اس میں اختلاف ہے۔ میرے نزدیک قرآن، آیات ہیں اور سنت نبوی حکمت ہے۔ اگرچہ آیت بھی حکمت ہے تاہم جب ان دونوں کا ذکر یکجا ہو جائے تو معانی مختلف ہونے چاہئیں۔ قرآن کو بھی حکمت کہا گیا ہے:

ذٰلِکَ مِمَّاۤ اَوۡحٰۤی اِلَیۡکَ رَبُّکَ مِنَ الۡحِکۡمَۃِ ...[2]	یہ حکمت کی وہ باتیں ہیں جو آپ کے پروردگار نے آپ کی طرف وحی کی ہیں۔

۳۔ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ لَطِیۡفًا خَبِیۡرًا: اللہ نہایت باریک بین، ذرہ برابر نیکی اور ذرہ برابر برائی کا جاننے والا ہے۔

---

[1] ۵۰ ق: ۳۷ [2] ۱۷ بنی اسرائیل: ۳۹

اِنَّ الۡمُسۡلِمِیۡنَ وَ الۡمُسۡلِمٰتِ وَالۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتِ وَالۡقٰنِتِیۡنَ وَالۡقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِیۡنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِیۡنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالۡخٰشِعِیۡنَ وَ الۡخٰشِعٰتِ وَ الۡمُتَصَدِّقِیۡنَ وَ الۡمُتَصَدِّقٰتِ وَ الصَّآئِمِیۡنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالۡحٰفِظِیۡنَ فُرُوۡجَہُمۡ وَالۡحٰفِظٰتِ وَالذّٰکِرِیۡنَ اللّٰہَ کَثِیۡرًا وَّالذّٰکِرٰتِ ۙ اَعَدَّ اللّٰہُ لَہُمۡ مَّغۡفِرَۃً وَّ اَجۡرًا عَظِیۡمًا ﴿۳۵﴾

۳۵۔ یقیناً مسلم مرد اور مسلم عورتیں، مومن مرد اور مومنہ عورتیں، اطاعت گزار مرد اور اطاعت گزار عورتیں، راستگو مرد اور راستگو عورتیں، صابر مرد اور صابرہ عورتیں، فروتنی کرنے والے مرد اور فروتن عورتیں، صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں، روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں، اپنی عفت کے محافظ مرد اور عفت کی محافظہ عورتیں نیز اللہ کا بکثرت ذکر کرنے والے مرد اور اللہ کا ذکر کرنے والی عورتیں وہ ہیں جن کے لیے اللہ نے مغفرت اور اجر عظیم مہیا کر رکھا ہے۔

شان نزول: مجمع البیان میں آیا ہے:

اسماء بنت عمیس جب اپنے شوہر جعفر بن ابی طالب کے ساتھ حبشہ سے واپس آئیں تو ازواج رسول سے پوچھا: کیا ہمارے بارے میں کوئی قرآنی آیت نازل ہوئی ہے؟ انہوں نے کہا: نہیں۔ یہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ عورتیں نامراد، گھاٹے میں ہیں۔ فرمایا: کس چیز میں؟ عرض کیا: چونکہ عورتوں کا کوئی ذکر خیر نہیں ہوتا جیسا کہ مردوں کا ہوتا ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّ الۡمُسۡلِمِیۡنَ وَ الۡمُسۡلِمٰتِ وَالۡمُؤۡمِنِیۡنَ: ایمان اور عمل صالح پر اجر و ثواب ملنے میں مرد و زن میں کوئی امتیاز نہیں ہے:

اَنِّیۡ لَاۤ اُضِیۡعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنۡکُمۡ مِّنۡ ذَکَرٍ اَوۡ اُنۡثٰی ...[1]

میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کا عمل ضائع نہیں کروں گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔

مسلم اور مومن میں کیا فرق ہے؟ جواب یہ ہے کہ جب ایمان و اسلام ایک دوسرے کے مقابلے میں استعمال ہوں تو اس صورت میں اسلام، ظاہراً تسلیم ہونے کا نام ہے اور ایمان، قلبی اعتبار سے یقین حاصل

---

[1] ۳ آل عمران: ۱۹۵

ہونے کا نام ہے لیکن جب یہ دونوں جدا استعمال ہوں گے تو اس صورت میں بھی اسلام سے مراد وہ تسلیم و رضا ہو گا جس میں ایمان ہو یعنی قلبی یقین ہو۔

اس آیت کے آخر میں چونکہ فرمایا ہے: اَعَدَّ اللّٰہُ لَہُمۡ مَّغۡفِرَۃً وَّ اَجۡرًا عَظِیۡمًا۔ ان سب کے لیے اللہ نے مغفرت اور اجر عظیم مہیا کر رکھا ہے۔ لہٰذا مسلمات کے لیے بھی مغفرت اور اجر عظیم ہو گا۔ اس سے ہم یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں گے کہ یہاں قرآن کے دیگر متعدد مقامات کی طرح اس اسلام کا ذکر ہے۔ جس میں ایمان بھی موجود ہے۔

بعض مفسرین کے مطابق یہاں اسلام و ایمان کے درمیان مفہوماً فرق ہے، مصداقاً نہیں۔

۲۔ وَ الۡقٰنِتِیۡنَ وَ الۡقٰنِتٰتِ: قنوت اس اطاعت کو کہتے ہیں جس میں خضوع وخشوع ہے۔

۳۔ وَ الصّٰدِقِیۡنَ وَ الصّٰدِقٰتِ: حقیقت میں صادق وہ ہے جس کا عمل اس کے ایمان کے منافی نہ ہو۔ وہ اپنے عمل سے دعوائے ایمان سچا ثابت کرتے ہیں۔

۴۔ وَ الصّٰبِرِیۡنَ وَ الصّٰبِرٰتِ: دین پر عمل کرنے میں جو دشواریاں پیش آتی ہیں ان میں صبر کا مظاہرہ کریں۔ صَبْرٌ عَلَی الطَّاعَۃِ وَ صَبْرٌ عَلَی الْمَعْصِیَۃِ...۔[1] اطاعت رب کی تلخی اختیار اور معصیت کی شیرینی سے پرہیز کر کے صبر سے کام لینے والوں کے لیے مغفرت و اجر عظیم مہیا ہو گا۔

۵۔ وَ الۡخٰشِعِیۡنَ وَ الۡخٰشِعٰتِ: خشوع، قلبی اور باطنی فروتنی کو کہتے ہیں۔ جیسا کہ خضوع اعضا و جوارح کی ظاہری فروتنی کو کہتے ہیں۔ تکبر، غرور اور نخوت و خود بینی سے دور پوری فروتنی اور جھکنے کی صورت میں اجر عظیم کا مژدہ سنا جا رہا ہے۔

۶۔ وَ الۡمُتَصَدِّقِیۡنَ وَ الۡمُتَصَدِّقٰتِ: صدقہ دینے سے مراد ہر قسم کا مالی انفاق ہے جس میں واجب زکوۃ، مستحب انفاق دونوں شامل ہیں۔ غریب پروری اسلامی تعلیمات کے متن میں شامل ہے۔

۷۔ وَ الصَّآئِمِیۡنَ وَ الصّٰٓئِمٰتِ: اس میں واجب اور مستحب روزے دونوں شامل ہیں۔

۸۔ وَ الۡحٰفِظِیۡنَ فُرُوۡجَہُمۡ: عفت اور پاکدامنی کو اپنا شعار بنانے والے ہوں۔

۹۔ وَ الذّٰکِرِیۡنَ اللّٰہَ کَثِیۡرًا: ذکر خدا کے ساتھ کثیرا کا وصف اس لیے ذکر ہوتا ہے کہ ذکر خدا انسان کے کسی عمل کے ساتھ متصادم نہیں ہے۔ ہر عمل میں ذکر خدا ہو سکتا ہے۔

۱۰۔ اَعَدَّ اللّٰہُ لَہُمۡ مَّغۡفِرَۃً وَّ اَجۡرًا عَظِیۡمًا: مذکورہ اوصاف کے مالک مرد اور عورت کے لیے بلا امتیاز اللہ کے ہاں مغفرت اور اجر عظیم تیار ہے۔ وہ اجر کتنا عظیم ہو گا جسے اللہ عظیم کہے۔

وَ مَا کَانَ لِمُؤۡمِنٍ وَّ لَا مُؤۡمِنَۃٍ اِذَا ۳۶۔ اور کسی مؤمن اور مومنہ کو یہ حق نہیں پہنچتا

---

[1] الکافی ۲: ۹۱

قَضَی اللّٰہُ وَ رَسُوۡلُہٗۤ اَمۡرًا اَنۡ یَّکُوۡنَ لَہُمُ الۡخِیَرَۃُ مِنۡ اَمۡرِہِمۡ ؕ وَ مَنۡ یَّعۡصِ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ فَقَدۡ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِیۡنًا ﴿۳۶﴾

کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملے میں فیصلہ کریں تو انہیں اپنے معاملے کا اختیار حاصل رہے اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی وہ صریح گمراہی میں مبتلا ہو گیا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ مَا کَانَ لِمُؤۡمِنٍ وَّ لَا مُؤۡمِنَۃٍ: ایمان باللّٰہ و بالرسول کا مطلب یہی ہے کہ امر و نہی کا حق صرف اللہ ہی کو حاصل ہے اور مومن اسے صدق دل سے تسلیم کرے۔ یہ بات معقول نہیں ہے کہ اللہ کے فیصلے کے مقابلے میں کسی کو اپنا فیصلہ صادر کرنے کا اختیار ہو خواہ وہ مومن یا مومنہ ہی کیوں نہ ہو۔

اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کے خلاف فتویٰ دینے کو اجتہادی اختلاف قرار دینا اور یہ کہنا: رسول بھی ایک مجتہد ہیں نیز نص صریح کے مقابلے میں اجتہاد کرنا اس آیت کی رو سے ضلال مبین ہے۔

۲۔ اِذَا قَضَی اللّٰہُ: جب اللہ کوئی فیصلہ کرے۔ اللہ کا تشریعی فیصلہ مراد ہو سکتا ہے کہ کسی مسئلے میں اللہ کا کوئی فیصلہ اپنے رسول کے ذریعے بندوں تک پہنچ جاتا ہے۔

۳۔ وَ رَسُوۡلُہٗ: رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فیصلہ اللہ کے فیصلے کے تابع ہے۔ اللہ نے اپنے رسول کو حاکمیت کا حق دیا ہے۔ اس حق کی بنیاد پر رسول کوئی فیصلہ صادر فرماتا ہے تو کسی مومن یا مومنہ کو اس فیصلے کے خلاف اپنا اختیار استعمال کرنے کا حق حاصل نہیں ہے چونکہ اللہ نے کسی مومن کو ایسا اختیار نہیں سونپا۔

۴۔ وَ مَنۡ یَّعۡصِ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ: اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیصلے کے خلاف اپنا اختیار استعمال کرنا اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معصیت اور ضلال مبین ہے۔

مولانا مودودی اس جگہ لکھتے ہیں:

> ... جسے مسلمان رہنا ہو اس کو لازماً حکم خدا و رسول کے آگے جھک جانا ہو گا اور جسے نہ جھکنا ہو اس کو سیدھی طرح ماننا پڑے گا وہ مسلمان نہیں ہے۔ نہ مانے گا تو چاہے اپنے مسلمان ہونے کا وہ کتنا ہی ڈھول پیٹے، خدا اور خلق خدا دونوں کی نگاہ میں وہ منافق ہی قرار پائے گا۔

اہم نکات

۱۔ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فیصلہ اللہ کا فیصلہ ہے۔ اسے مسترد کرنا ضلال مبین ہے۔

۲۔ اللہ کا فیصلہ قرآن وسنت اور رسول ﷺ کا فیصلہ سنت سے معلوم ہوتا ہے۔

۳۔ اللہ کے فیصلے کے مقابلے اپنا فیصلہ لانے والا مسلمان نہیں۔

وَ اِذۡ تَقُوۡلُ لِلَّذِیۡۤ اَنۡعَمَ اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِ اَمۡسِکۡ عَلَیۡکَ زَوۡجَکَ وَ اتَّقِ اللّٰہَ وَ تُخۡفِیۡ فِیۡ نَفۡسِکَ مَا اللّٰہُ مُبۡدِیۡہِ وَ تَخۡشَی النَّاسَ ۚ وَ اللّٰہُ اَحَقُّ اَنۡ تَخۡشٰہُ ؕ فَلَمَّا قَضٰی زَیۡدٌ مِّنۡہَا وَطَرًا زَوَّجۡنٰکَہَا لِکَیۡ لَا یَکُوۡنَ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ حَرَجٌ فِیۡۤ اَزۡوَاجِ اَدۡعِیَآئِہِمۡ اِذَا قَضَوۡا مِنۡہُنَّ وَطَرًا ؕ وَ کَانَ اَمۡرُ اللّٰہِ مَفۡعُوۡلًا ﴿۳۷﴾

۳۷۔ اور (اے رسول یاد کریں وہ وقت) جب آپ اس شخص سے جس پر اللہ نے اور آپ نے احسان کیا تھا، کہہ رہے تھے: اپنی زوجہ کو نہ چھوڑو اور اللہ سے ڈرو اور وہ بات آپ اپنے دل میں چھپائے ہوئے تھے جسے اللہ ظاہر کرنا چاہتا ہے اور آپ لوگوں سے ڈر رہے تھے حالانکہ اللہ زیادہ حقدار ہے کہ آپ اس سے ڈریں، پھر جب زید نے اس (خاتون) سے اپنی حاجت پوری کر لی تو ہم نے اس خاتون کا نکاح آپ سے کر دیا تاکہ مومنوں پر اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں (سے شادی کرنے) کے بارے میں کوئی حرج نہ رہے جب کہ وہ ان سے اپنی حاجت پوری کر چکے ہوں اور اللہ کا حکم نافذ ہو کر ہی رہے گا۔

تشریح کلمات

وَطَرًا: (و ط ر) کسی چیز کی انتہائی خواہش اور اہم ضرورت کے معنوں میں ہے۔

شان نزول: یہ آیات زید بن حارثہ کی حضرت زینب بن جحش کے ساتھ نکاح کے سلسلے میں نازل ہوئیں۔ زید بن حارثہ رسول اللہ ﷺ کے آزاد کردہ غلام تھے اور حضرت زینب، رسول اللہ ﷺ کی پھوپھی امیمہ بنت عبدالمطلب کی بیٹی تھیں۔ سماجی اعتبار سے یہ رشتہ نہایت نامناسب سمجھا جاتا تھا۔ جب زید کے ساتھ زینب کے نکاح کا پیغام دیا گیا تو خود حضرت زینب اور ان کے بھائی عبد اللّٰہ بن جحش نے اسے ناپسند کیا۔ بعد میں جب معلوم ہوا یہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا فیصلہ ہے تو سب خاندان والوں نے اس رشتے کو قبول کیا لیکن یہ رشتہ کامیاب نہ رہ سکا۔ حضرت زینب کے ذہن سے یہ احساس دور نہ ہو سکا کہ وہ قریش کے شریف ترین خاندان کی بیٹی ہے اور زید ایک آزاد کردہ غلام ہے۔ چنانچہ ایک سال اور کچھ مہینوں بعد طلاق کی نوبت آ گئی۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اِذۡ تَقُوۡلُ لِلَّذِیۡۤ اَنۡعَمَ اللّٰہُ عَلَیۡہِ: زید پر اللہ اور رسول ﷺ کے احسان کا واقعہ کچھ اس طرح ہے کہ زید، حارثہ بن شراحیل کا بیٹا تھا۔ ان کی ماں ایک بار انہیں اپنے میکے لے کر گئیں وہاں ان پر حملہ ہوتا ہے اور لوٹ مار میں چند آدمیوں کو وہ پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ ان میں حضرت زید بھی تھے۔ ان کی عمر اس وقت آٹھ سال تھی۔ پھر زید کو ان لوگوں نے حباشہ کے بازار میں لے جا کر فروخت کر دیا اور حضرت خدیجہ کے بھتیجے حکیم بن حزام نے اسے خریدا اور انہوں نے اسے اپنی پھوپھی حضرت خدیجہ کی خدمت میں پیش کیا۔ جب حضرت خدیجہ کا رسول اللہ ﷺ سے عقد ہوا تو زید رسول اللہ ﷺ کی ملکیت میں آ گیا۔ اب زید پندرہ سال کا ہو گیا تھا۔ جب ان کے والد اور چچا کو پتہ چلا کہ زید مکہ میں ہے تو وہ ان کی تلاش میں رسول اللہ ﷺ تک پہنچ گئے اور فدیہ کے عوض بچہ ان کے حوالہ کرنے کو کہا: حضور ﷺ نے فرمایا: خود زید کی مرضی پر چھوڑتا ہوں۔ اگر وہ تمہارے ساتھ جانا چاہتا ہے تو فدیہ نہیں لوں گا۔ زید کو بلایا تو زید نے اپنے والد کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ اس پر حضور ﷺ نے زید کو آزاد کر دیا اور اسے اپنا بیٹا بنا لیا۔

یہ اس وقت کا واقعہ ہے کہ ابھی آپؐ مبعوث نہیں ہوئے تھے۔ جب آپؐ مبعوث برسالت ہوئے تو زید سابقین میں سے تھے۔ ہجرت کے چوتھے سال آپؐ نے ان کا عقد اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینب سے کیا۔

۲۔ اَمۡسِکۡ عَلَیۡکَ زَوۡجَکَ وَ اتَّقِ اللّٰہَ: جس پر اللہ اور خود آپ نے احسان کیا تھا۔ اس سے آپ کہہ رہے تھے اپنی بیوی کو نہ چھوڑو اور اللہ سے ڈرو۔ یہ اس وقت کا ذکر ہے جب زید اور زینب کے تعلقات انتہائی خراب ہو گئے تھے اور زید طلاق دینے پر آمادہ ہو رہا تھا۔

۳۔ تُخۡفِیۡ فِیۡ نَفۡسِکَ مَا اللّٰہُ مُبۡدِیۡہِ: آپؐ اپنے دل میں وہ بات چھپائے ہوئے تھے جسے اللہ ظاہر کرنے والا ہے۔ مجمع البیان میں آیا ہے:

> جس چیز کو رسول اللہ ﷺ چھپانا چاہتے تھے وہ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو بذریعہ وحی بتایا تھا کہ زینب کو طلاق ہونے والی ہے اور زینب آپؐ کی زوجیت میں آ جائے گی۔ اس کے باوجود جب زید آیا اور آپ سے کہا کہ میں زینب کو طلاق دینا چاہتا ہوں تو آپؐ نے کہا: اپنی بیوی کو نہ چھوڑ اور اللہ سے ڈر۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: آپ نے یہ کیوں کہا اپنی بیوی کو نہ چھوڑ حالانکہ میں نے آپ کو بتلا دیا تھا کہ زینب آپ کی ازواج میں شامل ہونے والی ہے۔

مجمع البیان میں کہا ہے کہ یہ بات حضرت زین العابدین علیہ السلام سے منقول ہے:

ظاہر ہے حضورؐ اس جگہ اپنے علم کا اظہار نہیں کر سکتے تھے بلکہ مصالحانہ نصیحت کے طور پر فرما رہے تھے: اپنی بیوی کو نہ چھوڑ۔ یہ کوئی حکم تشریعی نہ تھا کہ زید پر اس کی تعمیل واجب ہو جاتی۔

۴۔ وَ تَخۡشَی النَّاسَ ۚ وَ اللّٰہُ اَحَقُّ اَنۡ تَخۡشٰہُ: اور آپؐ لوگوں سے ڈر رہے تھے حالانکہ اللہ زیادہ حقدار ہے کہ آپ اس سے ڈریں۔

زینب کو اپنی ازواج میں شامل کرنے کی بات کے ظاہر ہونے کی صورت میں لوگوں کی چہ میگوئیوں سے حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم خوفزدہ تھے۔ یہ خوف اگرچہ لوگوں سے تھا تاہم اس خوف کا تعلق صرف رسولؐ کی اپنی ذات سے نہ تھا بلکہ خوف موسیٰ علیہ السلام فَاَوۡجَسَ فِیۡ نَفۡسِہٖ خِیۡفَۃً مُّوۡسٰی ۔[1] کی طرح تھا کہ منافقین اس بات کو اچھالیں گے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی بہو کے ساتھ شادی کی ہے جب کہ خود قرآن میں حرام عورتوں میں وَحَلَآئِلُ اَبۡنَآئِکُمُ ...[2] بہو بھی شامل ہے۔ اس سے کمزور ایمان والے شکوک میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ یہ تھا خوف فی الدین عن طریق الناس۔ اللہ ارشاد فرماتا ہے: خود خدا سے خوف کریں۔ دین خدا کے بارے میں لوگوں سے خوف نہ کریں۔ یہ بالکل اسی طرح ہے کہ اعلان ولایت میں بھی لوگوں سے جو خوف لاحق تھا اس بارے میں فرمایا: وَ اللّٰہُ یَعۡصِمُکَ مِنَ النَّاسِ ....[3]

لہٰذا وہ روایات درست نہیں ہیں اور مقام رسالت پر ایک نازیبا بہتان ہیں جو کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اتفاقاً زینب کو دیکھا تو ان کے حسن پر فریفتہ ہو گئے اور آپؐ اس بات کو دل میں چھپائے ہوئے تھے۔

یہ روایت کذب و افترا ہے۔ اس لیے کہ حضرت زینب، رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے خاندان کی ایک فرد ہیں۔ زینب کا حسن و جمال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے پوشیدہ نہ تھا۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے زید کے لیے رشتہ مانگا ہے۔ اگر رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم چاہتے تو زید سے شادی ہونے سے پہلے انہیں اپنی زوجیت میں لا سکتے تھے۔

حقیقت امر یہ ہے کہ یہ اللہ کا حکم تھا کہ زینب کو طلاق ہونے کی صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم زینب کو اپنی زوجیت میں لے آئیں اور دور جاہلی کی رسم کا خاتمہ کر دیں۔ ایک تو منہ بولے بیٹا بیٹا نہیں ہوتا، زید رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا بیٹا نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہ ایک آزاد کردہ غلام کی طرف سے طلاق یافتہ عورت سے نکاح کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ کسی کی عظمت اور خاندانی شرافت پر اس کا کوئی برا اثر نہیں پڑتا۔ اسلام اپنی اسلامی قدروں کا لحاظ رکھتا ہے، جاہلی قدروں کا نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اپنی ذاتی خواہش نہیں چھپا رہے تھے، حکم خدا کی تعمیل میں سماجی مشکلات پیش آ رہی تھیں۔ زینب کے ساتھ نکاح کرنا اللہ کا حکم تھا۔ اس پر وَ کَانَ اَمۡرُ اللّٰہِ مَفۡعُوۡلًا (اللہ کا حکم نافذ ہو کر رہے گا) دلیل ہے نیز اگلی آیت میں فِیۡمَا فَرَضَ اللّٰہُ لَہٗ ''اللہ نے ان کے لیے مقرر کیا ہے'' بھی دلیل ہے کہ اس

---

[1] ۲۰ طٰہ: ۶۷ [2] ۴ نساء: ۲۳ [3] ۵ مائدہ: ۶۷

نکاح کو انجام دینے کا اللہ کی طرف سے حکم تھا۔

۵۔ فَلَمَّا قَضٰی زَیۡدٌ مِّنۡہَا وَطَرًا زَوَّجۡنٰکَہَا: جب زید نے اس خاتون سے اپنی حاجت پوری کر لی۔ زید اس عورت سے پوری طرح فارغ ہو گئے اور اس میں کسی قسم کی خواہش باقی نہ رہی۔ اگر کوئی خواہش باقی ہوتی تو عدت کے دوران اس کا اظہار ہو سکتا تھا اور رجوع کر سکتا تھا وہ بھی نہ ہوا تو زَوَّجۡنٰکَہَا ہم نے اس خاتون کا نکاح آپ سے کر دیا۔ اس تزویجی عمل کو اللہ نے براہ راست اپنی طرف نسبت دے کر یہ بات اور واضح فرما دی کہ یہ کام خالصتاً اللہ کی طرف سے انجام پایا۔ رسولؐ کی ذاتی خواہش کا کوئی دخل نہ تھا۔

۶۔ لِکَیۡ لَا یَکُوۡنَ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ حَرَجٌ: تا کہ مومنوں پر اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں سے شادی کرنے میں کوئی مضائقہ نہ رہے۔

اسلامی قانون میں منہ بولا بیٹا، بیٹی نہیں ہوتا اور جس عورت کو ماں کہدے وہ ماں نہیں ہوتی۔ اس قانون پر بہت سے احکام مترتب ہوتے ہیں۔

۷۔ وَکَانَ اَمۡرُ اللّٰہِ مَفۡعُوۡلًا: اللہ کا حکم نافذ ہو کر رہے گا۔ یہ ازدواج بھی اللہ کی طرف سے ایک حکم تھا وہ نافذ ہو کر رہا۔ اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو اس پر عمل کرنے میں سماجی دشواریاں زیادہ تھیں لیکن اللہ کا حکم غالب آیا اور نافذ ہو گیا۔

اہم نکات

۱۔ زن و شوہر کی ناچاکی کی صورت میں طلاق کا مشورہ نہیں دینا چاہیے: اَمۡسِکۡ عَلَیۡکَ ....

۲۔ حکم الٰہی کے نفاذ کے لیے معاشرتی رکاوٹوں کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے: وَتَخۡشَی النَّاسَ ....

مَا کَانَ عَلَی النَّبِیِّ مِنۡ حَرَجٍ فِیۡمَا فَرَضَ اللّٰہُ لَہٗ ؕ سُنَّۃَ اللّٰہِ فِی الَّذِیۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلُ ؕ وَکَانَ اَمۡرُ اللّٰہِ قَدَرًا مَّقۡدُوۡرَا ﴿۳۸﴾

۳۸۔ نبی کے لیے اس (عمل کے انجام دینے) میں کوئی مضائقہ نہیں ہے جو اللہ نے ان کے لیے مقرر کیا ہے، جو (انبیاء) پہلے گزر چکے ہیں ان کے لیے بھی اللہ کی سنت یہی رہی ہے اور اللہ کا حکم حقیقی انداز سے طے شدہ ہوتا ہے۔

تفسیر آیات

الفرض: التعیین و الاسھام۔ فرض، تعیین اور حصہ مقرر کرنے کے معنوں میں ہے۔ اس کا مطلب مباح کرنا ہے۔ یعنی جو چیز اللہ نے اپنے نبی کے لیے مباح کی ہے اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ گزشتہ انبیاء علیہم السلام میں ایسی مثالیں موجود ہیں کہ ان کی بھی متعدد ازواج موجود تھیں۔

۱۔ اللہ تعالیٰ جب کوئی حکم اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر فرض فرماتا ہے تو اس فرض کو انجام دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ یہ نفی حرج، تکوینی ہو سکتا ہے۔ یعنی اللہ اس میں کوئی حرج نہیں آنے دے گا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے جو دشواریاں آئی ہیں انہیں دور کر دے گا۔

۲۔ سُنَّۃَ اللّٰہِ فِی الَّذِیۡنَ خَلَوۡا: گزشتہ انبیاء علیہم السلام میں بھی اللہ تعالیٰ کا طریقہ عمل یہی رہا ہے۔ یہ سنت الٰہی کیا تھی؟ ممکن ہے انبیاء علیہم السلام کے بارے میں اللہ کی اس روش کی طرف اشارہ ہو کہ جب بھی احکام الٰہی کی تعمیل میں کوئی دشواری پیش آئی تو اللہ نے اسے دور فرمایا یا یہ مراد ہو کہ گزشتہ انبیاء علیہم السلام بھی اس قسم کے مراسم توڑنے کے لیے مبعوث ہوئے ہیں یا یہ مراد ہو کہ انبیاء علیہم السلام کی یہ روش ہے کہ تبلیغ کے سلسلے میں غیر اللہ کا خوف نہیں کرتے جس کی طرف اگلی آیت اشارہ کر رہی ہے۔

۳۔ وَ کَانَ اَمۡرُ اللّٰہِ قَدَرًا مَّقۡدُوۡرَا: امور خدا غیر منظم نہیں ہوتے بلکہ امر خدا ایک طے شدہ ضابطے کے تحت ہوتا ہے۔ قدر یعنی طے شدہ۔ مقدورا اس کی تاکید ہے۔ جیسے ظلا ظلیلا کہتے ہیں۔ لہٰذا یہ ممکن نہیں ہے کہ اللہ اپنے انبیاء علیہم السلام کو کوئی ایسا حکم دے جو قابل عمل نہ ہو یا اس پر عمل کرنے سے مفاسد لازم آتے ہوں۔ جیسا کہ ایک ظاہر بین انسان سمجھتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ تمام انبیاء علیہم السلام نے جاہلی مراسم کا مقابلہ کیا ہے: سُنَّۃَ اللّٰہِ فِی الَّذِیۡنَ ....

۲۔ احکام الٰہی ایک ضابطے کے مطابق ہوتے ہیں: وَ کَانَ اَمۡرُ اللّٰہِ قَدَرًا مَّقۡدُوۡرَا۔

الَّذِیۡنَ یُبَلِّغُوۡنَ رِسٰلٰتِ اللّٰہِ وَ یَخۡشَوۡنَہٗ وَ لَا یَخۡشَوۡنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰہَ ؕ وَ کَفٰی بِاللّٰہِ حَسِیۡبًا ﴿۳۹﴾

۳۹۔ (وہ انبیاء) جو اللہ کے پیغامات پہنچاتے ہیں اور اسی سے ڈرتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے اور محاسبے کے لیے اللہ ہی کافی ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ الَّذِیۡنَ یُبَلِّغُوۡنَ رِسٰلٰتِ اللّٰہِ: جو اللہ کے پیغامات کی تبلیغ کرتے ہیں ان کے دلوں میں صرف خوف خدا ہوتا ہے۔ غیر اللہ کا خوف ان کے دلوں میں نہیں ہوتا۔ تبلیغ رسالت کے سلسلے میں ایک خوف تبلیغ نہ کرنے کی صورت میں پیش آتا ہے اور دوسرا خوف تبلیغ کرنے کی صورت میں پیش آتا ہے۔ تبلیغ نہ کرنے کی صورت میں اللہ کا خوف ہے اور تبلیغ کرنے کی صورت میں لوگوں کا خوف ہے۔ انبیاء علیہم السلام ان دونوں خوفوں میں خوف خدا کو مقدم رکھتے ہیں اور لوگوں سے جو خوف لاحق ہوتا ہے اسے اعتنا میں نہیں لاتے۔

خلاصہ یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام تبلیغ رسالت کے سلسلے میں صرف اللہ سے ڈرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ وہ غیر اللہ سے کسی صورت میں نہیں ڈرتے۔ بعض حالات میں خوف لاحق ہونا قدرتی بات ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اژدھے سے خوف لاحق ہو گیا تھا۔ یہ خوف، اللہ کے خوف کے مقابلے میں نہیں تھا بلکہ ایک قدرتی خوف تھا۔

۲۔ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا: اللہ کا محاسبہ یقیناً بڑا دقیق محاسبہ ہوگا جس میں کسی قسم کے سہو اور نسیان کا امکان نہیں ہے۔ لہٰذا اسی ہی کا خوف دل میں ہونا چاہیے۔

اہم نکات

۱۔ تبلیغ کے لیے شجاعت اور صبر درکار ہوتا ہے: وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا ....

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۝

۴۰۔ محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں ہاں وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیّین ہیں اور اللہ ہر چیز کا خوب جاننے والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ: محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں۔ مخالفین کا اعتراض یہ تھا کہ آپؐ نے اپنی بہو سے نکاح کر لیا ہے جب کہ ان کی شریعت میں بیٹے کی بیوی سے نکاح حرام ہے۔

جواب میں فرمایا: محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں اور زید جو رجال میں سے ہے، وہ محمد کا بیٹا نہیں ہے۔ یعنی زمان نزول قرآن میں آپ کسی مرد کے باپ نہیں ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی اولاد قاسم، طیب اور طاہر بچپنے میں فوت ہو گئے اور حسنین علیہما السلام اس آیت کے نزول کے وقت ابھی رجال میں سے نہ تھے۔ وہ بھی بچے تھے۔[1]

لہٰذا جب منہ بولے بیٹے کو اسلام بیٹا تسلیم نہیں کرتا، چونکہ منہ بولے بیٹے کی پیدائش میں ان کا کردار نہیں ہے، تو وہ حقیقتاً بیٹا نہیں ہے۔ جب واقع میں بیٹا نہیں ہے تو کسی قرارداد سے واقع نہیں بدلتا۔

۲۔ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ: اور محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ہیں۔ ان کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔

------

[1] المیزان

خاتم کی دو قرائتیں ہیں: خاتِم اور خاتَم۔

خاتم: لفظ، اگر خاتِم پڑھے تو اس کے معنی ہوں گے نبیوں کا سلسلہ ختم کرنے والا اور اگر خاتَم پڑھے تو اس کے معنی ہوں گے مہر لگانے والا۔ بند کرنے والا۔ دونوں صورتوں میں معنی ایک ہیں۔ جب آپؐ خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ ہیں تو لازماً خاتم المرسلین ہیں چونکہ رسالت کا درجہ نبوت کے بعد آتا ہے۔ چونکہ نبی وہ ہیں جن پر خواب میں وحی ہوتی ہے اور رسول وہ ہیں جن پر فرشتہ وحی نازل ہوتا ہے اور دعوت کا حکم دیتا ہے۔ لہٰذا ہر رسول نبی ہے۔

اس آیت میں حضورؐ کے اسم شریف کے ساتھ رسالت اور نبوت دونوں کا ذکر ہے۔

قرآن کی متعدد آیات سے رسول اللہؐ کی خاتمیت کا اشارہ ملتا ہے۔ جیسے:

وَ اُوۡحِیَ اِلَیَّ ہٰذَا الۡقُرۡاٰنُ لِاُنۡذِرَکُمۡ بِہٖ وَ مَنۡۢ بَلَغَ ...[1] اور یہ قرآن میری طرف بذریعہ وحی نازل کیا گیا ہے تاکہ میں تمہیں اور جس تک یہ پیغام پہنچے سب کو تنبیہ کروں۔

پیغام پہنچنے کا ذمہ اللہ نے لیا ہے:

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ ﴿۹﴾[2] اس ذکر کو یقیناً ہم ہی نے اتارا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

تَبٰرَکَ الَّذِیۡ نَزَّلَ الۡفُرۡقَانَ عَلٰی عَبۡدِہٖ لِیَکُوۡنَ لِلۡعٰلَمِیۡنَ نَذِیۡرَا ﴿۱﴾[3] بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر فرقان نازل فرمایا تاکہ وہ سارے جہاں والوں کے لیے انتباہ کرنے والا ہو۔

حدیث نبوی سے تواتر سے ثابت ہے کہ رسول خاتمؐ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ اسی لیے ختم نبوت پر امت کا اجماع قائم ہے۔ اس اجماع میں اصحاب رسولؐ، ائمہ اہل بیت علیہم السلام اور تمام علمائے اسلام شامل ہیں۔ اگر کسی نبی نے آنا ہوتا تو رسول کریمؐ پر واجب تھا کہ اس کی آمد کی خبر دیتے، اس کی علامات بیان فرماتے، اس پر ایمان لانے کا حکم دیتے۔ چنانچہ حضرت مہدی آخر الزمان علیہ السلام کی آمد کی خبر دی، علامات بیان فرمائیں، ان پر ایمان لانے کا حکم دیا اور ان کے اوصاف بیان کیے ہیں۔ اس جگہ چند سوالات پیدا ہوتے ہیں:

i۔ اسلام کے بعد کسی پیغمبر کی ضرورت کیوں باقی نہیں رہی؟

جواب یہ ہے کہ سابقہ آسمانی کتابوں کی طرح اسلام کی کتاب قرآن میں کسی قسم کی تحریف و تغییر نہیں ہوئی ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ انسان عہد طفولیت سے نکل کر ارتقاء کی اس منزل پر پہنچ چکا ہے کہ ایک جامع نظام حیات اس کے سپرد کیا جائے۔ اس سلسلے میں اگر ہم عہد موسیٰ علیہ السلام

---

[1] ۶ انعام: ۱۹ [2] ۱۵ حجر: ۹ [3] ۲۵ فرقان: ۱

کا مطالعہ کریں تو بات سمجھ میں آتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے نو اہم معجزے دکھانے، دریا شق ہونے، فرعون کے غرق آب ہونے کے بعد بھی موسیٰ علیہ السلام کی قوم حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ مطالبہ کر رہی تھی: اجۡعَلۡ لَّنَاۤ اِلٰـهًا كَمَا لَهُمۡ اٰلِهَةٌ ....[1] اے موسیٰ! ہمارے لیے بھی ایسا معبود بنا جیسے ان لوگوں کے معبود ہیں۔ جب کہ شاگردان رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذوق توحید نہایت قابل توجہ ہے۔

ii۔ کیا ایک ثابت، غیر متغیر دین، ایک متغیر انسان کی قانونی ضرورتیں پوری کر سکتا ہے؟

کچھ کم علم لوگوں کا یہ خیال ہے، دین صرف اپنے خاص زمانے کے لیے قابل نفاذ ہے، ہر زمانے کے لیے نہیں۔ چونکہ دینی احکام ثابت ہیں اور قابل تغیر نہیں ہیں جب کہ انسان تحول و تغیر کی زد میں ہے۔ زمان و مکان کے اعتبار سے حالات بدلتے رہتے ہیں۔ لہٰذا یا دونوں کو ثابت ہونا چاہیے یا دونوں کو متغیر۔ ایک ثابت کا متغیر کے ساتھ کیا جوڑ ہے؟

فقیہ بزرگ حضرت آیۃ اللہ محسنی دام ظلہ اپنی کتاب مباحث علمی دینی میں اس کا جواب دیتے ہیں۔ ہم اس کا خلاصہ یہاں ذکر کرتے ہیں۔ اس کے جواب کے دو حصے ہیں:

۱۔ انسان کی طبیعت اور نفسیات کے اہم ترین حالات ثابت اور غیر متغیر ہیں۔

۲۔ اسلامی احکام و قوانین کا ایک اہم حصہ متغیر اور متحرک ہے۔

لہٰذا اسلام کے ثابت احکام انسان کی ثابت شقوں کے لیے اور متغیر احکام انسان کے متغیر حالات کے لیے ہیں۔

۱۔ ثابت انسان: انسان کی بہت خصلتیں اور اس کے فطری تقاضے ثابت اور لا یتغیر ہیں۔ درج ذیل مثالوں پر توجہ دیجیے:

i۔ انسان اپنی اولاد اپنے والدین اور رشتہ داروں کے ساتھ محبت کرتا ہے۔

ii۔ بھوک اور پیاس کی صورت میں کھانے پینے کی چیزوں کے ضرورت کا احساس کرتا ہے۔

iii۔ دوست کے ساتھ محبت اور دشمن کے ساتھ عداوت رکھتا ہے۔

iv۔ احسان کی وجہ سے محبت اور برائی کی وجہ سے عداوت ہوتی ہے۔

v۔ سالم انسان ازدواج کی خواہش رکھتا ہے۔

vi۔ زن و شوہر اولاد کی خواہش رکھتے ہیں۔

vii۔ انسان جمال پرست ہوتا ہے۔

viii۔ حب ذات، جذب منفعت اور دفع ضرر انسان کی جبلت میں ہے۔

ix۔ انسان کسی ضرورت کے تحت ہی قتل اور ظلم کا اقدام کرتا ہے۔

x۔ جب تک کوئی مانع نہ ہو، اپنی خواہشات کو نہیں چھوڑتا۔

xi۔ انسان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ تمام مادی وسائل فراہم ہوں۔
xii۔خواہش ہوتی ہے کہ سب اس کا احترام کریں اور اس کی تذلیل نہ کریں۔
xiii۔خواہش ہوتی ہے محتاج، مریض، مظلوم بدنام نہ ہوں۔ خواہش ہوتی ہے لوگ اس کے فرمانبردار ہوں، سرداری ملے۔
xiv۔ غالبًا اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے دوسروں کے مال و عزت پر تجاوز کرتا ہے۔
xv۔ مناسب موقع پر ریاکاری بری نہیں لگتی۔
xvi۔علم و کمال کو پسند کرتا ہے۔
xvii۔ یہ بات اسے پسند نہیں کہ اسے جاہل اور عیب دار کہا جائے۔
xviii۔ انسان خود پسند اور خودخواہی کا شکار ہوتا ہے مگر یہ کہ اس کی عقلی قوت بہت زیادہ ہو۔
xix۔ غالبًا لالچی، بخیل ہوتا ہے اور کبھی سخی اور قناعت پسند ہوتا ہے۔
xx۔ دوسروں پر برتری کا خواہشمند ہوتا ہے۔
xxi۔موت اور نابودی کو ناپسند کرتا ہے مگر بعض نادر حالات میں موت کو قبول کرتا ہے۔
xxii۔ اپنی صحت اور نفسیاتی سکون کا خواہاں ہوتا ہے۔
xxiii۔ گندگی اور غلاظت سے نفرت ہوتی ہے۔
xxiv۔ بغیر زحمت کے منافع کو پسند کرتا ہے۔
xxv۔ سردی اور گرمی سے متاثر ہوتا ہے۔
xxvi۔ نیند کی ضرورت ہوتی ہے۔
xxvii۔ انسان کا طریقہ تولید تبدیل نہیں ہوتا۔
xxviii۔سنگین بوجھ اٹھانے سے تھک جاتا ہے۔
xxix۔کوئی بچہ دانت اور داڑھی کے ساتھ پیدا نہیں ہوتا۔
xxx۔کوئی بچہ کئی سال ماں کے شکم میں نہیں رہتا نہ ہی چند روز میں پیدا ہوتا ہے۔

اس طرح بیسیوں دیگر باتیں ہیں جو ابتدائی انسان سے لے کر آج تک کے انسان میں ثابت اور لا یتغیر ہیں۔ البتہ مذکورہ چیزوں میں تغیر و تبدل وجود میں آتا ہے۔ کھانے پینے اور لباس کی کیفیت اور سفری وسائل میں تبدیلیاں ہو جاتی ہیں۔ تاہم ان تبدیلیوں کا تعلق اس کے عارضی ماحول سے مربوط ہے، خود انسانی طبیعت سے نہیں۔ مثلاً اپنا دفاع انسان کا ایک طبیعی امر ہے۔ خواہ اپنے ہاتھ سے ہو یا ایٹمی ہتھیار سے۔

۲۔ متحرک قوانین: احکام و قوانین اسلامی کی دو قسمیں ہیں: اولیٰ اور ثانوی:

ا۔ اَوّلی قوانین وہ ہیں جو بذات خود موضوع سے متعلق ہیں۔ اس موضوع پر آنے والے عارضی

حالات سے قطع نظر، جیسے شراب بذات خود حرام ہے۔

۲۔ ثانوی قوانین وہ ہیں جو اس موضوع پر آنے والے عارضی حالات سے متعلق ہیں۔ جیسے شراب پینے پر زندگی کا بچنا اگر موقوف ہے تو حلال ہے۔

اس طرح متحرک قوانین کی تین قسمیں ہیں:

پہلی قسم۔ ثانوی قوانین: جن کی تعریف کا ذکر ہو گیا کہ عارضی حالات کے مطابق مترتب ہونے والے قوانین کو ثانوی قوانین کہیں گے۔ وہ عارضی حالات جن کی وجہ سے قانون اور حکم بدل جاتا ہے حسب ذیل ہیں:

i۔ اضطراری حالت: اضطراری حالت میں بہت سی حرام چیزیں حلال ہو جاتی ہیں۔ فرمایا:

وَ قَدۡ فَصَّلَ لَکُمۡ مَّا حَرَّمَ عَلَیۡکُمۡ اِلَّا مَا اضۡطُرِرۡتُمۡ اِلَیۡہِ ....[۱] حالانکہ اللہ نے جن چیزوں کو اضطراری حالت کے سوا تم پر حرام قرار دیا ہے ان کی تفصیل اس نے تمہیں بتا دی ہے۔

ii۔ عسر و حرج: ایک واجب عمل انجام دینے میں معمول سے زیادہ مشقت اٹھانا پڑتی ہے تو وہ حکم اٹھ جاتا ہے۔ غسل کرنے میں عسر و حرج اور مشقت ہے تو غسل کا حکم اُٹھ جاتا ہے اس کی جگہ تیمم کا حکم آتا ہے۔ فرمایا:

وَمَا جَعَلَ عَلَیۡکُمۡ فِی الدِّیۡنِ مِنۡ حَرَجٍ ....[۲] اور دین کے معاملے میں تمہیں کسی مشکل سے دوچار نہیں کیا۔

یُرِیۡدُ اللّٰہُ بِکُمُ الۡیُسۡرَ وَلَا یُرِیۡدُ بِکُمُ الۡعُسۡرَ ....[۳] اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے اور تمہیں مشقت میں ڈالنا نہیں چاہتا۔

iii۔ تقیہ: جان و مال کو خطرہ ہونے کی صورت میں بھی قانون میں لچک آ جاتی ہے۔ فرمایا:

لَا یَتَّخِذِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الۡکٰفِرِیۡنَ اَوۡلِیَآءَ مِنۡ دُوۡنِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ۚ وَمَنۡ یَّفۡعَلۡ ذٰلِکَ فَلَیۡسَ مِنَ اللّٰہِ فِیۡ شَیۡءٍ اِلَّاۤ اَنۡ تَتَّقُوۡا مِنۡہُمۡ تُقٰىۃً ....[۴] مومنوں کو چاہیے کہ وہ اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو سرپرست نہ بنائیں اور جو کوئی ایسا کرے، اس کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں، ہاں اگر تم ان (کے ظلم) سے بچنے کے لیے کوئی طرز عمل اختیار کرو۔

iv۔ ضرر: کسی کو کسی چیز سے ضرر پہنچتا ہے تو اس کا حکم بدل جاتا ہے۔ مثلاً اسلامی قوانین کے تحت انسان اپنے مال کا مالک ہے لیکن اس مال سے کسی کو ضرر پہنچتا ہے تو ملکیت کا حق سلب ہو جاتا ہے۔ حدیث نبوی ہے:

---

[۱] ۶ انعام: ۱۱۹ [۲] ۲۲ الحج: ۷۸ [۳] ۲ البقرۃ: ۱۸۵ [۴] ۳ آل عمران: ۲۸

لَا ضَرَرَ وَ لَا ضِرَارَ فِی الْاِسْلَامِ۔[1] اسلام میں نہ ضرر اٹھانا ہے نہ ضرر پہنچانا۔

یعنی ایسا قانون نہیں ہے جس کی وجہ سے ضرر اُٹھانا یا ضرر پہنچانا پڑے۔

v۔ جبر و اکراہ: کسی کی طرف سے مجبور کیے جانے کی صورت میں بھی حکم بدل جاتا ہے۔

vi۔ بیماری اور سفر کی حالت میں روزہ کا حکم بدلتا ہے۔

vii۔خوف کی حالت میں حکم بدلتا ہے۔

viii۔ عاجز: عمل انجام دینے سے عاجز رہ جائے تو حکم بدل جاتا ہے۔

ix۔ جہالت: نہ جاننے کی وجہ سے حکم اٹھ جاتا ہے، اگر یہ نہ جاننا کوتاہی کی وجہ سے نہ ہو بلکہ ممکن نہ ہونے کی وجہ سے ہو۔ جسے جاہل قاصر کہتے ہیں۔

xx۔ نذر، قسم، عھد کے ذریعے ایک جدید حکم کو وجود دیا جا سکتا ہے۔

xi۔ دو حکموں میں تزاحم (ٹکراؤ) کی وجہ سے بہت سے احکام بدل جاتے ہیں۔کسی کے مال پر بلا اجازت تصرف کرنا جائز نہیں ہے لیکن اگر کسی مومن کی جان بچانا اس تصرف پر موقف ہو تو جائز ہے۔

xii۔ جامع الشرائط مکلّف موجود نہ ہونے کی وجہ سے واجب کفائی، عینی میں بدل جاتا ہے۔

دیگر اور بہت سی ایسی باتیں ہیں جن کی وجہ سے احکام بدل جاتے ہیں۔ البتہ جب عارضی حالت ختم ہو جاتی ہے تو حکم اَوّلی واپس آ جاتا ہے۔

دوسری قسم: متحرک قوانین کی دوسری قسم یہ ہے کہ کسی موضوع کے بارے میں شریعت خاموش ہے۔اسے فقہاء منطقة الفراغ کا نام دیتے ہیں۔ جہاں انسان خود اجتماعی طور پر شوریٰ کے ذریعے یا انفرادی طور پر قانون بنانے میں آزاد ہے۔ جیسے ٹریفک کے قوانین۔ اس میں دیگر اسلامی قوانین سے متصادم نہ ہونے کی صورت میں انسان خود قانون بنا سکتے ہیں۔

تیسری قسم: متحرک قوانین میں سے تیسری قسم یہ ہے کہ حکومت اسلامی میں حاکم ملکی مصلحت کے تحت فقہ اسلامی کے دائرے میں رہ کر ہنگامی قانون نافذ کرتا ہے اور کبھی بعض دیگر اسلامی قوانین کو وقتی طور پر متوقف کر دیا جاتا ہے۔

امید ہے محترم قارئین کے لیے بات واضح ہوگئی ہوگی کہ اسلامی شریعت کس طرح ہر زمانے کے تقاضوں کو پورا کر دیتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نسب کے اعتبار سے کسی مرد کے باپ نہیں، ولایت کے اعتبار سے روحانی باپ ہیں۔

۲۔ منہ بولا بیٹا، بیٹا نہیں ہے۔

---

[1] وسائل الشیعة ۲۶: ۱۴

۳۔ رسول خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک شریعت لے کر آئے ہیں جو تمام عصر کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ﴿۴۱﴾

۴۱۔ اے ایمان والو! اللہ کو بہت کثرت سے یاد کیا کرو۔

وَّسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ﴿۴۲﴾

۴۲۔ اور صبح و شام اس کی تسبیح کیا کرو۔

تفسیر آیات

۱۔ اذْكُرُوا اللّٰهَ: یاد کرنا، نسیان کے مقابلے میں ہے۔ اللہ کو یاد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہر حالت اور ہر عمل میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اس کا غضب پیش نظر ہو۔ نیک عمل کے وقت یاد خدا کا مطلب یہ ہے کہ یہ نیک عمل برائے رضایت خدا انجام دیا جائے اور گناہ کا سامنا کے وقت یاد خدا کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی ناراضگی کو سامنے رکھ کر اسے ترک کیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے:

مَنْ اُعْطِیَ لِسَاناً ذَاكِراً فَقَدْ اُعْطِیَ خَيْرَ الدُّنْيَا وَ الْآخِرَةِ ....[۱]

جسے یاد خدا کرنے والی زبان عنایت ہوئی ہو اسے دنیا و آخرت کی بھلائی عنایت ہوئی ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

مِنْ اَشَدِّ مَا فَرَضَ اللّٰهُ عَلَى خَلْقِهِ ذِكْرُ اللّٰهِ كثيراً. ثُمَّ قَالَ: لَا اَعْنِی سُبْحَانَ اللّٰهِ وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اَكْبَرُ وَ اِنْ كَانَ مِنْهُ وَ لٰكِنْ ذِكْرَ اللّٰهِ عِنْدَ مَا اَحَلَّ وَ حَرَّمَ فَاِنْ كَانَ طَاعَةً عَمِلَ بِهَا وَ اِنْ كَانَ مَعْصِيَةً تَرَكَهَا۔[۲]

اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق پر جو فرض کیا ہے ان میں اہم ترین فرض کثرت سے اللہ کو یاد کرنے کا حکم ہے۔ میری مراد ذکر خدا سے سبحان اللہ اور الحمد اللہ اور لا الہ الا اللہ نہیں ہے اگرچہ یہ بھی ذکر اللہ میں شامل ہے مگر اللہ کو یاد کرنا ہے، جو حلال و حرام کیا گیا ہے اس وقت خدا کو یاد کرنا ہے۔ اگر طاعت ہے تو بجا لائے اگر گناہ ہے چھوڑ دیا جائے۔

حضرت امام صادق علیہ السلام سے دوسری روایت میں آیا ہے:

تَسْبِيحُ فَاطِمَةَ الزَّهْرَاءِ ع مِنَ الذِّكْرِ الْكَثِيْرِ الَّذِی قَالَ اللّٰهُ عَزَّ وَ جَلَّ اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا۔[۳]

تسبیح فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا ذکر کثیر میں شامل ہے جسے اللہ عز و جل نے فرمایا: اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا۔

---

[۱] الکافی۔ ۲: ۴۹۸ [۲] الکافی: ۲: ۸۰ [۳] الکافی ۲: ۵۰۰

واضح رہے تسبیح حضرت زہرا سلام اللہ علیہا یہ ہے: ۳۴ مرتبہ اللّٰہ اکبر، ۳۳ مرتبہ الحمد اللّٰہ، ۳۳ مرتبہ سبحان اللّٰہ پڑھے۔

۲۔ وَّسَبِّحُوۡہُ: اور صبح و شام اس کی تسبیح کرو۔ تسبیح، ہر نقص سے اللہ تعالیٰ کو پاک و منزہ قرار دینے کو کہتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں تصور توحید کو درست کرنے کو تسبیح کہتے ہیں۔ مشرکین اور انحرافی مذاہب نے اللہ کی ذات و صفات اور افعال میں اس قسم کے عقائد کو شامل کر دیے جو ذات اقدس الٰہی کی شان میں نہایت گستاخی ہیں۔

صحیح تصور توحید کے لیے امام الموحدین علی بن ابی طالب علیہ السلام کے خطبۂ توحید کا مطالعہ ضرور فرمائیں: اَوَّلُ الدِّینِ مَعْرِفَتُہُ....[1]

۳۔ بُکۡرَۃً وَّ اَصِیۡلًا: صبح و شام اس کی تسبیح کرو۔ دن کی ابتدا اللہ کی تسبیح سے کرو اور دن کا اختتام بھی اللہ کی تسبیح سے کرو۔ ممکن ہے اس طرح اللہ تعالیٰ اپنے لطف و کرم سے سارا دن عبادت شمار فرمائے۔

اہم نکات

۱۔ صرف ذکر خدا کے لیے لفظ کَثِیۡرًا کی تاکید آئی ہے۔

۲۔ تسبیح حضرت زہرا سلام اللہ علیہا کو ہر نماز کے بعد فراموش نہیں کرنا چاہیے۔

هُوَ الَّذِیۡ یُصَلِّیۡ عَلَیۡکُمۡ وَ مَلٰٓئِکَتُہٗ لِیُخۡرِجَکُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ ؕ وَ کَانَ بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ رَحِیۡمًا ﴿۴۳﴾

۴۳۔ وہی تم پر رحمت بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے بھی (دعا کرتے ہیں) تاکہ تمہیں تاریکیوں سے روشنی کی طرف نکال لائے اور وہ مومنوں کے بارے میں بڑا مہربان ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ هُوَ الَّذِیۡ یُصَلِّیۡ عَلَیۡکُمۡ: جس ذات کا ذکر کثیر کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہ تمہارا خالق، رازق اور محافظ ہونے کے ساتھ ساتھ وہ تم پر رحمت بھیجتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی دعا ہے:

رَبِّ لَا تَکِلْنی اِلٰی نَفْسِی طَرْفَۃَ عَیْنٍ اَبَداً۔[2]

میرے مالک مجھے چشم زدن کے لیے بھی میرے حال پر نہ چھوڑ۔

---

[1] نہج البلاغۃ خ ۱ [2] الکافی ۲: ۵۸۱

۲۔ وَ مَلٰٓئِکَتُہٗ: اپنی رحمتوں کے علاوہ اس کے فرشتے بھی تمہارے لیے رحمتوں کے نزول اور مغفرت کے لیے دعا کر رہے ہیں:

وَالۡمَلٰٓئِکَۃُ یُسَبِّحُوۡنَ بِحَمۡدِ رَبِّہِمۡ وَیَسۡتَغۡفِرُوۡنَ لِمَنۡ فِی الۡاَرۡضِ ....[1]

اور فرشتے اپنے پروردگار کی ثناء کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور اہل زمین کے لیے استغفار کرتے ہیں

اَلَّذِیۡنَ یَحۡمِلُوۡنَ الۡعَرۡشَ وَمَنۡ حَوۡلَہٗ یُسَبِّحُوۡنَ بِحَمۡدِ رَبِّہِمۡ وَیُؤۡمِنُوۡنَ بِہٖ وَیَسۡتَغۡفِرُوۡنَ لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ....[2]

جو (فرشتے) عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور جو (فرشتے) اس کے اردگرد ہیں سب اپنے رب کی ثناء کے ساتھ تسبیح کر رہے ہیں اور اس پر ایمان لائے ہیں اور ایمان والوں کے لیے مغفرت طلب کرتے ہیں۔

۳۔ لِیُخۡرِجَکُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ: ان رحمتوں کا نزول اس غرض کے لیے ہوتا ہے کہ تمہیں تاریکیوں سے نور کی طرف نکال لائے۔ اس سے معلوم ہوا تمام رحمتوں کا سرچشمہ، ہدایت ہے۔ ظلمت سے نور کی طرف ہدایت، کفر سے ایمان کی طرف ہدایت، غفلت و ناآگاہی سے ذکر و عبادت کی طرف ہدایت۔

۴۔ وَکَانَ بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ رَحِیۡمًا: اہل ایمان پر اللہ کی مہربانیوں کا نتیجہ ہے کہ وہ رحمتوں کا نزول فرماتا ہے۔ فرشتوں کو دعائے مغفرت کا حکم دیتا ہے۔ ظلمت سے نور کی طرف ہدایت فرماتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کی طرف سے ہر آن رحمتوں کا نزول ہوتا ہے: یُصَلِّیۡ عَلَیۡکُمۡ ....

۲۔ اللہ کے فرشتے بھی مومنوں کے لیے دعا کرتے ہیں۔ وَ مَلٰٓئِکَتُہٗ ....

۳۔ ظلمت سے نور کی طرف ہدایت، سب رحمتوں کا سرچشمہ ہے۔

تَحِیَّتُہُمۡ یَوۡمَ یَلۡقَوۡنَہٗ سَلٰمٌ ۚۖ وَ اَعَدَّ لَہُمۡ اَجۡرًا کَرِیۡمًا ﴿۴۴﴾

۴۴۔ جس روز وہ اس سے ملیں گے ان کی تحیت سلام ہوگی اور اللہ نے ان کے لیے باعزت اجر مہیا کر رکھا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ تَحِیَّتُہُمۡ یَوۡمَ یَلۡقَوۡنَہٗ سَلٰمٌ: یوم لقاء کی تحیت سلام ہو گی۔ اللہ سے ملاقات کے دن کا آغاز سلام سے ہوگا۔ یوم لقاء ممکن ہے موت کا وقت ہو۔ موت کے وقت سلام سے استقبال ہوگا۔ چنانچہ فرمایا:

---

[1] ۴۲ شوری: ۵ [2] ۴۰ غافر: ۷

الَّذِیۡنَ تَتَوَفّٰہُمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ طَیِّبِیۡنَ ۙ یَقُوۡلُوۡنَ سَلٰمٌ عَلَیۡکُمُ ۙ ادۡخُلُوا الۡجَنَّۃَ بِمَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ○ [1]

جن کی روحیں فرشتے پاکیزہ حالت میں قبض کرتے ہیں (اور انہیں) کہتے ہیں: تم پر سلام ہو! اپنے (نیک) اعمال کی جزا میں جنت میں داخل ہو جاؤ۔

یوم لقا اگر روز حشر برائے حساب ہے تو بھی وہاں اعراف کی بلندیوں سے سلام کی آواز آئے گی:

وَ نَادَوۡا اَصۡحٰبَ الۡجَنَّۃِ اَنۡ سَلٰمٌ عَلَیۡکُمۡ ۟ [2]

اور اہل جنت سے پکار کر کہیں گے: تم پر سلامتی ہو۔

یوم لقاء سے مراد لوگوں کے داخل جنت ہونے کا وقت ہے تو بھی سلام ہے:

وَ قَالَ لَہُمۡ خَزَنَتُہَا سَلٰمٌ عَلَیۡکُمۡ طِبۡتُمۡ فَادۡخُلُوۡہَا خٰلِدِیۡنَ ○ .... [3]

اور جنت کے منتظمین ان سے کہیں گے: تم پر سلام ہو تم بہت خوب رہے، اب ہمیشہ کے لیے اس میں داخل ہو جاؤ۔

یوم لقاء اگر جنت ہے تو یہاں بھی سلام سلام ہوگا:

لَا یَسۡمَعُوۡنَ فِیۡہَا لَغۡوًا وَّ لَا تَاۡثِیۡمًا ○ۙ اِلَّا قِیۡلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ○ [4]

وہاں وہ نہ بیہودہ کلام سنیں گے اور نہ ہی گناہ کی بات۔ ہاں! سلام سلام کہنا ہوگا۔

غرض اللہ سے تعالیٰ ملاقات کے تمام مراحل میں سلام وسلام ہوگا۔ سلامتی کے علاوہ کوئی دکھ عذاب نہ ہوگا۔

۲۔ وَ اَعَدَّ لَہُمۡ اَجۡرًا کَرِیۡمًا: مومنوں کے لیے اجر و ثواب مہیا ہو گا۔ وہ کریم ہو گا۔ باعزت، بااحترام اجر ملے گا۔ عزت و احترام کی وجہ سے اجر وثواب زیادہ پرکشش بن جاتا ہے۔ واضح رہے کریم یہاں عزیز کے معنوں میں ہے۔ جیسے فرمایا:

وَ مَنۡ یُّہِنِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ مِنۡ مُّکۡرِمٍ ... [5]

جسے اللہ خوار کرے اسے عزت دینے والا کوئی نہیں۔

اہم نکات

۱۔ مومن اللہ کی بارگاہ میں سلام کی تحیت کے ساتھ جائے گا۔

۲۔ مومن کو اجر وثواب عزت و احترام کے ساتھ ملے گا۔

یٰۤاَیُّہَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ شَاہِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیۡرًا ﴿ۙ۴۵﴾

۴۵۔ اے نبی! ہم نے آپ کو گواہ اور بشارت دینے والا اور تنبیہ کرنے والا بنا کر بھیجا ہے،

وَّ دَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذۡنِہٖ وَ سِرَاجًا مُّنِیۡرًا ﴿۴۶﴾

۴۶۔ اور اس (اللہ) کے اذن سے اللہ کی طرف دعوت دینے والا اور روشن چراغ بنا کر۔

---

[1] ۱۶ نحل: ۳۲ [2] ۷ اعراف: ۴۶ [3] ۳۹ زمر: ۷۳ [4] ۵۶ واقعہ۔ ۲۵۔۲۶ [5] ۲۲ حج۔ ۱۸

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ شَاہِدًا: ہر رسول اپنی امت کے اعمال کا شاہد اور گواہ ہے اور رسول خاتم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ان تمام گواہوں پر گواہ ہیں:

فَکَیۡفَ اِذَا جِئۡنَا مِنۡ کُلِّ اُمَّۃٍۭ بِشَہِیۡدٍ وَّ جِئۡنَا بِکَ عَلٰی ہٰۤؤُلَآءِ شَہِیۡدًا ؕ﴿۴۱﴾ [1]

پس (اس دن) کیا حال ہو گا جب ہم ہر امت سے ایک گواہ لائیں گے اور (اے رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) آپ کو ان لوگوں پر بطور گواہ پیش کریں گے۔

پس ہمارے رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم تمام امتوں کے گواہوں کے گواہ ہوں گے اور اپنی امت کے اعمال پر گواہ ہیں۔ اپنی حیات مبارکہ میں لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ساتھ کیا سلوک کیا، آپ شاہد ہیں:

کن لوگوں نے آپؐ کی دعوت پر لبیک کہی۔

کن لوگوں نے آپؐ کی دعوت کو رد کیا۔

کن لوگوں نے آپؐ کے بعد آپؐ کی شریعت میں تبدیلیاں کیں۔

حدیث حوض میں آیا ہے:

لیردن علیّ اناس من اصحابی الحوض حتی اذا رأیتھم و عرفتھم اختلجوا دونی فاقول یا رب اصیحابی اصیحابی فیقال لی: انك لا تدری ما اھدثوا بعدك فاقول: تبا و سحقا لمن احدث بعدی۔

میرے اصحاب میں سے کچھ لوگ حوض پر میرے پاس پہنچ جائیں گے۔ جب میں انہیں دیکھ لوں گا اور پہچان لوں گا۔ وہ میرے سامنے جھگڑنے لگیں گے تو میں کہوں گا اے رب میرے اصحاب، میرے اصحاب۔ جواب میں کہا جائے گا: آپ کو کیا معلوم ان لوگوں نے آپ کے بعد کیا تبدیلیاں کی ہیں۔ اس پر میں کہوں گا: ہلاکت و تباہی ہو ان لوگوں کے لیے جنہوں نے میرے بعد تبدیلیاں کی ہیں۔

۲۔ وَّ مُبَشِّرًا: آپؐ ان لوگوں کو بشارت دیں گے جن لوگوں نے آپؐ کی دعوت پر لبیک کہی۔ ایمان لائے۔ آپؐ کے ساتھ جہاد کیا۔ قربانیاں دیں آپؐ کے بعد آپؐ کی شریعت کا تحفظ کیا اور تبدیلیاں لانے والوں کا مقابلہ کیا:

وَ یُبَشِّرَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ الَّذِیۡنَ یَعۡمَلُوۡنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَہُمۡ اَجۡرًا حَسَنًا ۙ﴿۲﴾ [2]

اور ان مومنین کو بشارت دے جو نیک عمل کرتے ہیں کہ ان کے لیے بہتر اجر ہے۔

۳۔ وَّ نَذِیۡرًا: انسان خطرات میں گھرا رہتا ہے۔ اس کے داخلی اور بیرونی دشمن بے تحاشا ہیں۔ اس

[1] ۴ نساء: ۴۱　[2] ۱۸ کہف: ۲

لیے انسانی سعادت و کامیابی میں تنبیہ کا بنیادی کردار ہے۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

مَنْ حَذَّرَكَ كَمَنْ بَشَّرَكَ۔[۱] جو (برائیوں سے) خوف دلائے وہ تمہارے لیے مژدہ سنانے والے کے مانند ہے۔

قرآن مجید میں اسی لیے لوگوں کے مقام نذارت کو زیادہ اہتمام کے ساتھ بیان فرمایا ہے:

اِنۡ اَنۡتَ اِلَّا نَذِیۡرٌ ۝[۲] آپ تو صرف تنبیہ کرنے والے ہیں۔

وَ اِنۡ مِّنۡ اُمَّۃٍ اِلَّا خَلَا فِیۡہَا نَذِیۡرٌ ۝[۳] اور کوئی امت ایسی نہیں گزری جس میں کوئی متنبہ کرنے والا نہ آیا ہو۔

جب جہنمیوں کو جہنم کی طرف لے جایا جائے گا تو وہاں بھی ان سے پوچھا جائے گا: اَلَمۡ یَاۡتِکُمۡ نَذِیۡرٌ۔[۴] کیا تمہارے پاس کوئی تنبیہ کرنے والا نہ آیا تھا؟ کیونکہ کسی تنبیہ پر توجہ دی جاتی تو آج جہنم جانے کی نوبت نہ آتی۔

۴۔ وَّ دَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ: غیر اللہ کی بندگی کو چھوڑ کر اللہ کی بندگی کی طرف دعوت دینے والے کی اس دعوت میں اپنی ذات، اپنے مفاد کا شائبہ تک نہیں ہے۔ صرف اور صرف اللہ کی طرف دعوت دینے والا ہے۔

۵۔ بِاِذۡنِہٖ: یہ دعوت باذن خدا ہوگی۔ اذن خدا سے ممکن ہے اشارہ ہو اس بات کی طرف کہ رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم جس جس بات کی دعوت دیں گے وہ اپنی طرف سے نہیں باذن خدا ہے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے: اذن خدا سے اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ دعوت الی اللہ نہایت مشکل کام ہے۔ اس کام کی انجام دہی کے لیے اذن خدا یعنی مدد خدا لازم ہے۔ بعض دیگر مفسرین اس کی اس طرح تشریح کرتے ہیں کہ بشارت و نذارت کے لیے اذن خدا لازم نہیں ہے جب کہ اللہ کی بارگاہ میں بلانا ہے تو اذن خدا لازم ہے۔ یہ تفسیر قابل تائید نہیں ہے چونکہ بِاِذۡنِہٖ کا تعلق مذکورہ تمام فرائض کے ساتھ ہے، صرف دَاعِیًا کے ساتھ نہیں۔ چنانچہ سِرَاجًا مُّنِیۡرًا کا تعلق صرف دَاعِیًا کے ساتھ نہیں ہے۔

۶۔ وَ سِرَاجًا مُّنِیۡرًا: روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے۔ ظلمت کی اتھاہ گہرائیوں میں گرے ہوئی جاہل قوم کو سعادت دارین کا راستہ دکھانے کے لیے جس روشنی کی ضرورت ہے وہ روشنی اس رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم میں ہے۔ روشن چراغ کی گمراہ اور ہدایت یافتہ دونوں کے لیے ضرورت ہے۔ گمراہ کو راستہ دکھانے اور ہدایت یافتہ کو راستے کے خطرات سے بچانے کے لیے۔ ممکن ہے ایک شخص صحیح منزل کی سمت رواں دواں ہو مگر روشنی نہ ہونے کی وجہ سے کسی کھائی میں گر جائے۔ چنانچہ ہمیں بہت سے نظریاتی مسلمان کھائی میں گرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کی وجہ اس سراج منیر سے کماحقہ استفادہ نہ کرنا ہے۔

---

۱ نہج البلاغۃ۔ حکمت: ۵۹　۲ ۳۵ فاطر: ۲۳　۳ ۳۵ فاطر: ۲۴　۴ ۶۷ ملک: ۸

اہم نکات

۱۔ رسول ﷺ ہمارے اعمال پر گواہ ہیں۔
۲۔ بشارت اور نذارت دونوں کا تعلق انسانی اعمال سے ہے۔
۳۔ روشن چراغ سے چشم بینا فائدہ اٹھا سکتی ہے۔

وَ بَشِّرِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ بِاَنَّ لَہُمۡ مِّنَ اللّٰہِ فَضۡلًا کَبِیۡرًا ﴿۴۷﴾

۴۷۔ اور مومنین کو یہ بشارت دیجیے کہ ان کے لیے اللہ کی طرف سے بڑا فضل ہو گا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ بَشِّرِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ: جو لوگ ایمان پر ثابت قدم ہیں یہ بشارت ان لوگوں سے مربوط ہے۔

۲۔ بِاَنَّ لَہُمۡ مِّنَ اللّٰہِ فَضۡلًا کَبِیۡرًا: ان مومنین کے لیے اللہ کی طرف سے بڑا فضل ہو گا چونکہ مومن جو عمل صالح بجا لاتا ہے اس سے ان نعمتوں کا بھی حق ادا نہیں ہوتا جو دنیا میں انہیں اللہ کی طرف سے مل جایا کرتی ہیں:

وَ اِنۡ تَعُدُّوۡا نِعۡمَۃَ اللّٰہِ لَا تُحۡصُوۡہَا ... [1]

اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنے لگو تو انہیں شمار نہیں کر سکو گے۔

خود اعمال صالحہ بھی اللہ کی طرف سے توفیق ملنے پر انجام پاتے ہیں۔

لہٰذا اعمال صالحہ پر جو بھی اجر و ثواب عطا ہو گا وہ از باب استحقاق نہیں بلکہ تفضلاً ہو گا۔ اللہ تعالیٰ نے جس فضل کبیر کی بشارت دینے کا حکم فرمایا ہے اس کی طرف دیگر آیات میں اشارے ملتے ہیں:

وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِیۡ رَوۡضٰتِ الۡجَنّٰتِ ۚ لَہُمۡ مَّا یَشَآءُوۡنَ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ ؕ ذٰلِکَ ہُوَ الۡفَضۡلُ الۡکَبِیۡرُ ﴿﴾ [2]

اور جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور نیک اعمال بجا لائے ہیں وہ جنت کے گلستانوں میں ہوں گے، ان کے لیے ان کے پروردگار کے پاس جو وہ چاہیں گے موجود ہو گا، یہی بڑا فضل ہے۔

ان رَوۡضٰتِ الۡجَنّٰتِ میں کیا ہے؟ ان کی طرف اشارہ فرمایا:

وَ فِیۡہَا مَا تَشۡتَہِیۡہِ الۡاَنۡفُسُ وَ تَلَذُّ الۡاَعۡیُنُ ۚ [3]

اور اس میں ہر وہ چیز موجود ہو گی جس کی نفس خواہش کرے اور جس سے نگاہیں لذت حاصل کریں۔

دوسری جگہ فرمایا:

---

[1] ۱۶ نحل: ۱۸ [2] ۴۲ شوریٰ: ۲۲ [3] ۴۳ زخرف: ۷۱

فَلَا تَعۡلَمُ نَفۡسٌ مَّاۤ اُخۡفِیَ لَہُمۡ مِّنۡ قُرَّۃِ اَعۡیُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿﴾ [1]

اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ ان کے اعمال کے صلے میں ان کی آنکھوں کو ٹھنڈک کا کیا کیا سامان پردۂ غیب میں موجود ہے۔

نیز قابل توجہ بات یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اعمال صالحہ کے لیے جو اجر و ثواب معین فرمایا ہے، اس سے بھی بیشتر اللہ عنایت فرماتا ہے:

لِلَّذِیۡنَ اَحۡسَنُوا الۡحُسۡنٰی وَ زِیَادَۃٌ ...[2] جنہوں نے نیکی کی ہے ان کے لیے نیکی ہے اور مزید بھی۔

نیکی کرنے والوں کے لیے جو نیکی الۡحُسۡنٰی ہے وہ معین ثواب ہے وَ زِیَادَۃٌ اس پر مزید بھی ہے۔

لَہُمۡ مَّا یَشَآءُوۡنَ فِیۡہَا وَ لَدَیۡنَا مَزِیۡدٌ ﴿﴾ [3] وہاں ان کے لیے جو وہ چاہیں گے حاضر ہے اور ہمارے پاس مزید بھی ہے۔

جن چیزوں تک انسان کی خواہشوں کی رسائی نہیں ہوتی وہ بھی ان کو ملیں گی۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ دنیا میں ہم اپنی خواہشوں کو وسائل اور علل و اسباب کے ذریعے پورا کرتے ہیں۔ جنت میں صرف ارادے یَشَآءُوۡنَ کے ذریعے خواہشات پوری ہوں گی۔

اہم نکات

۱۔ جس فضل و کرم کو اللہ نے کبیر فرمایا ہے وہ قابل وصف و بیان سے بڑھ کر ہے۔

وَ لَا تُطِعِ الۡکٰفِرِیۡنَ وَ الۡمُنٰفِقِیۡنَ وَ دَعۡ اَذٰىہُمۡ وَ تَوَکَّلۡ عَلَی اللّٰہِ ؕ وَ کَفٰی بِاللّٰہِ وَکِیۡلًا ﴿۴۸﴾

۴۸۔ اور آپ کافروں اور منافقوں کی باتوں میں نہ آئیں اور ان کی اذیت رسانی پر توجہ نہ دیا کریں اور اللہ پر بھروسہ رکھیں اور ضمانت کے لیے اللہ کافی ہے۔

90

تفسیر آیات

۱۔ وَ لَا تُطِعِ الۡکٰفِرِیۡنَ وَ الۡمُنٰفِقِیۡنَ: اس جملے کی تشریح ابتدائے سورہ آیت نمبر ۱ میں ہو چکی ہے۔

۲۔ وَ دَعۡ اَذٰىہُمۡ: کافر اور منافقین کی طرف سے جو اذیتیں ہو رہی ہیں انہیں اعتنا میں نہ لائیں اور ان میں مشغول نہ ہوں۔ ان اذیتوں کو ہم پر چھوڑ دیں۔ وَ کَفٰی بِاللّٰہِ وَکِیۡلًا بھروسہ کے لیے اللہ کافی ہے۔ اس میں رسول کریم ﷺ کے لیے بشارت ہے کہ آپ ﷺ کو کامیابی حاصل ہو گی اور یہ اذیت دینے والے ناکام ہوں گے۔

---

[1] ۳۲ سجدہ: ۱۷ [2] ۱۰ یونس: ۲۶ [3] ۵۰ ق: ۳۵

يَاۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا نَكَحۡتُمُ الۡمُؤۡمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقۡتُمُوۡهُنَّ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تَمَسُّوۡهُنَّ فَمَا لَكُمۡ عَلَيۡهِنَّ مِنۡ عِدَّةٍ تَعۡتَدُّوۡنَهَا ۚ فَمَتِّعُوۡهُنَّ وَسَرِّحُوۡهُنَّ سَرَاحًا جَمِيۡلًا ﴿۴۹﴾

۴۹۔ اے مومنو! جب تم مومنات سے نکاح کرو اور پھر ہاتھ لگانے سے پہلے انہیں طلاق دے دو تو تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ انہیں عدت میں بٹھاؤ، لہٰذا انہیں کچھ مال دو اور شائستہ انداز میں انہیں رخصت کرو۔

تفسیر آیات

۱۔ اِذَا نَكَحۡتُمُ الۡمُؤۡمِنٰتِ: نکاح اس عقد کو کہتے ہیں جو مرد و زن کے درمیان باندھا جاتا ہے تاکہ دونوں زوجین (میاں بیوی) ہو جائیں۔ لغت میں اگرچہ نکاح، تزویج اور ہمبستری دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہے مگر قرآن میں یہ لفظ صرف تزویج کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ تَمَسُّوۡهُنَّ میں مس کرنا، چھونا، اشارہ ہے ہمبستری کی طرف۔ عدت، اس مدت کو کہتے ہیں جو عورت کو اپنے شوہر سے طلاق یا وفات کی وجہ سے فارغ ہونے کے بعد گزارنا پڑتی ہے جس کے بعد اس کے لیے دوسری شادی کرنا جائز ہو جاتا ہے۔

۲۔ ثُمَّ طَلَّقۡتُمُوۡهُنَّ: نکاح کے بعد ہمبستری سے پہلے اگر طلاق ہو جائے تو عدت ٹھہرنا واجب نہیں ہے۔ چونکہ ہمبستری نہ ہونے کی وجہ سے عورت کا رحم فارغ ہے لہٰذا وہ طلاق ملتے ہی دوسرا عقد کر سکتی ہے۔

۳۔ فَمَتِّعُوۡهُنَّ وَسَرِّحُوۡهُنَّ: تمتع مال کو کہتے ہیں۔ طلاق دینے کے بعد انہیں کچھ مال دے کر اچھے طریقے سے فارغ کرو۔ یہ اس صورت کی بات ہے کہ اگر مہر کا تعین نہ ہوا ہو۔ اگر مہر کا تعین ہوا ہے تو سورہ بقرہ آیت ۲۳۷ میں فرمایا نصف مہر ادا کرنا ہے:

وَاِنۡ طَلَّقۡتُمُوۡهُنَّ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تَمَسُّوۡهُنَّ وَقَدۡ فَرَضۡتُمۡ لَهُنَّ فَرِيۡضَةً فَنِصۡفُ مَا فَرَضۡتُمۡ ....

اور اگر تم عورتوں کو ہاتھ لگانے سے قبل اور ان کے لیے مہر متعین کر چکنے کے بعد طلاق دو تو اس صورت میں تمہیں اپنے مقرر کردہ مہر کا نصف ادا کرنا ہوگا۔

اور اگر ہاتھ لگانے اور مہر معین کرنے سے پہلے طلاق دی جائے تو اس صورت میں کچھ مال دیا جائے۔ مالدار اپنی وسعت کے مطابق اور غریب اپنی وسعت کے مطابق دے۔ یہ حکم سورہ بقرہ آیت ۲۳۶ میں آ گیا ہے۔

اہم نکات

۱۔ نکاح کے بعد ہمبستری سے پہلے طلاق ہو جائے تو:

الف: حق مہر کا تعین ہو گیا ہے تو اس کا نصف دیا جائے۔

ب: اگر حق مہر کا تعین نہیں ہوا تو کچھ مال دیا جائے۔ امیر اور غریب اپنی اپنی وسعت کے

مطابق دیں۔

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَحۡلَلۡنَا لَكَ اَزۡوَاجَكَ الّٰتِیۡۤ اٰتَيۡتَ اُجُوۡرَهُنَّ وَمَا مَلَكَتۡ يَمِيۡنُكَ مِمَّاۤ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيۡكَ وَبَنٰتِ عَمِّكَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَبَنٰتِ خَالِكَ وَبَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِیۡ هَاجَرۡنَ مَعَكَ ۫ وَامۡرَاَةً مُّؤۡمِنَةً اِنۡ وَّهَبَتۡ نَفۡسَهَا لِلنَّبِیِّ اِنۡ اَرَادَ النَّبِیُّ اَنۡ يَّسۡتَنۡكِحَهَا ۚ خَالِصَةً لَّكَ مِنۡ دُوۡنِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ؕ قَدۡ عَلِمۡنَا مَا فَرَضۡنَا عَلَيۡهِمۡ فِیۡۤ اَزۡوَاجِهِمۡ وَ مَا مَلَكَتۡ اَيۡمَانُهُمۡ لِكَيۡلَا يَكُوۡنَ عَلَيۡكَ حَرَجٌ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا ۞

۵۰۔ اے نبی! ہم نے آپ کے لیے آپ کی وہ بیویاں حلال کی ہیں جن کے مہر آپ نے دے دیے ہیں اور وہ لونڈیاں بھی جو اللہ نے (بغیر جنگ کے) آپ کو عطا کی ہیں نیز آپ کے چچا کی بیٹیاں اور آپ کی پھوپھیوں کی بیٹیاں اور آپ کے ماموں کی بیٹیاں اور آپ کی خالاؤں کی بیٹیاں جنہوں نے آپ کے ساتھ ہجرت کی ہے (سب حلال ہیں) اور وہ مومنہ عورت جو اپنے آپ کو نبی کے لیے ہبہ کرے اور اگر نبی بھی اس سے نکاح کرنا چاہیں، (یہ اجازت) صرف آپ کے لیے ہے مومنوں کے لیے نہیں، ہمیں معلوم ہے کہ ہم نے مومنوں پر ان کی بیویوں اور کنیزوں کے بارے میں کیا (حق مہر) معین کیا ہے (آپ کو یہ رعایت اس لیے حاصل ہے) تاکہ آپ پر کسی قسم کا مضائقہ نہ ہو اور اللہ بڑا معاف کرنے والا، مہربان ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ يَاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَحۡلَلۡنَا لَكَ اَزۡوَاجَكَ: یہ اعتراض بیمار ذہنوں میں پیدا ہو رہا تھا کہ مومنین کے لیے صرف چار بیویوں کی اجازت ہے اور رسولؐ خود چار سے زیادہ بیویاں رکھ رہے ہیں۔

جواب یہ ہے: جس اللہ نے عام مومنین کے لیے چار کی حد بندی کی ہے، اسی اللہ نے اپنے رسولؐ کے لیے یہ حد بندی نہیں رکھی۔

ثانیاً: چونکہ رسول اللہؐ مقام عصمت پر فائز ہیں اس لیے دوسرے بشری تقاضوں کی حد بندی اپنے رسول کے لیے نہیں ہے:

ثالثاً: ان ازواج کے ذریعے مختلف قبائلی عداوتیں ختم ہو گئیں۔

رابعاً: ان ازواج کے ذریعے بہت سی نسوانی تربیت آسان ہو گئی جو دوسری صورت میں نہیں ہو سکتی تھی۔ چنانچہ ازواج کے ذریعے تعلیمات اسلامی کا ایک قابل توجہ حصہ نسوانی معاشرے میں آسانی سے پہنچ گیا۔ اگر یہ ذاتی خواہشات کی بنیاد پر ہوتیں تو ازواج میں اکثر سن رسیدہ معمر نہ ہوتیں۔

الّٰتِیۡۤ اٰتَیۡتَ اُجُوۡرَہُنَّ: آپؐ کے لیے وہ ازواج حلال ہیں جن کے مہر آپؐ نے ادا کر دیے ہیں۔ اس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ حضورؐ مہر نقداً ادا فرماتے تھے۔

اس آیت سے ایک اہم اعتراض ثابت ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ رسول ﷺ کا کوئی وارث نہیں بن سکتا تو پھر ازواج کو رسول اللہ ﷺ کے گھر کس طرح مل گئے؟ کچھ لوگ جواب دیتے ہیں کہ مہر میں۔ جب کہ اس آیت میں صراحت ہے کہ کسی زوجہ کا حق مہر رسولؐ کے ذمے نہیں تھا۔ سب کا مہر ادا ہو گیا تھا۔ اس کے بعد ان ازواج کا ذکر ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے حلال کر دیا ہے۔

۲۔ وَ مَا مَلَکَتۡ یَمِیۡنُکَ مِمَّاۤ اَفَآءَ اللّٰہُ عَلَیۡکَ: دوسری قسم کی ازواج وہ ہوں گی جو مال فیٔ میں، بغیر جنگ کے غنیمت میں ہاتھ آ گئی ہوں۔ وہ رسول اللہ ﷺ کی ملکیت ہوتی ہیں۔ چنانچہ ماریہ قبطیہ مادر ابراہیم، غنائم سے تھیں اور صفیہ اور جویریہ انفال سے۔ ان دونوں کو آپؐ نے آزاد کر کے اپنی زوجات میں شامل فرمایا۔ حضرت صفیہ، خیبر کی جنگ میں اور حضرت جویریہ، بنی المطلق کی لڑائی میں اسیر ہو کر آئی تھیں۔

۳۔ وَ بَنٰتِ عَمِّکَ: چچازاد، ماموں زادے، پھوپھی زاد اور خالہ زاد خواتین میں سے جن خواتین نے ہجرت کی ہے وہ بھی آپ کے لیے حلال ہیں۔ ابتدائے اسلام میں ہجرت کو ایمان کے مترادف قرار دیا جاتا تھا اور ہجرت کے بغیر کوئی فرد مسلمانوں کے ساتھ رشتہ ولایت میں شامل نہیں ہو سکتا تھا۔

۴۔ وہ خاتون جو اپنے آپ کو رسول اللہ ﷺ کو ہبہ کر دے اور بلا مہر رسول اللہ ﷺ کی زوجیت میں آنا پسند کرے۔ خَالِصَۃً لَّکَ: یہ حکم صرف رسول اللہ ﷺ کے لیے خاص ہے، باقی مومنین کے لیے نہیں ہے۔ اس میں اختلاف ہے کہ حضور ﷺ نے کسی خاتون کو اس اجازت کے تحت اپنی زوجیت میں لیا ہے۔ کہتے ہیں حضرت میمونہ کو اس اجازت کے تحت اپنی زوجیت میں لیا تھا لیکن چونکہ آپؐ نے حضرت میمونہ کو بھی مہر دے دیا تھا اس لیے کچھ مفسرین انہیں اس اجازت میں شمار نہیں کرتے۔ بعض کے نزدیک زینب بنت خزیمہ نے اپنے آپ کو ہبہ کیا تھا۔ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام سے منقول ایک روایت کے مطابق یہ خاتون ام شریك بنت جابر تھیں۔ (مجمع البیان)

۵۔ قَدۡ عَلِمۡنَا مَا فَرَضۡنَا عَلَیۡہِمۡ: ہمیں معلوم ہے کہ عام مومنین پر ان کی بیویوں اور کنیزوں کے بارے میں ہم نے کیا حد بندیاں متعین کی ہیں۔ ان کے لیے مہر کا تعین اور عدد کی چار تک حد بندی ہے۔ کنیز ہے تو خرید، ارث، ہبہ اور اسیری کے ذریعے ہی مالک بن سکتے ہیں۔

۶۔ لِكَيۡلَا يَكُوۡنَ عَلَيۡكَ حَرَجٌ: تاکہ اے رسول ﷺ! آپؐ پر کوئی تنگی اور مضائقہ نہ ہو۔
اس جملے کا تعلق اِنَّاۤ اَحۡلَلۡنَا لَكَ سے ہے کہ ہم نے ازواج آپؐ کے لیے حلال کر دی ہیں تاکہ آپؐ کسی مضائقے میں نہ ہوں یا اس جملے کا تعلق اِنۡ وَّهَبَتۡ نَفۡسَهَا سے ہے؟ اگر اس کا تعلق اِنَّاۤ اَحۡلَلۡنَا سے ہو تو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے چار سے زیادہ نکاح کرنے کی اجازت اس لیے دی کہ آپؐ کو چار کی حد بندی کی وجہ سے کوئی مضائقہ نہ ہو اور اگر اس کا تعلق اِنۡ وَّهَبَتۡ نَفۡسَهَا سے ہے تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ عام مسلمانوں کے لیے جائز نہیں کہ کوئی عورت اپنے آپ کو ہبہ کر کے بلا مہر کسی کی زوجیت میں جائے۔ یہ سہولت صرف آپؐ کے لیے ہے تاکہ آپؐ پر کوئی مضائقہ نہ ہو۔

میرے نزدیک اس جملے کا تعلق اِنَّاۤ اَحۡلَلۡنَا سے ہے۔ ہم نے چار سے زیادہ ازواج آپؐ کے لیے حلال کر کے بہت سے تبلیغی مسائل میں آسانیاں پیدا کی ہیں۔ چنانچہ ہم نے پہلے اس بات کو بیان کیا ہے کہ ازواج کے ذریعے قبائلی عداوتیں ختم ہو گئیں، بہت سی نسوانی تربیت آساں ہو گئی اور خواتین سے متعلق اسلامی تعلیمات کا حصہ نسوانی معاشرے میں منتقل ہو گیا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے لیے تبلیغ و ارشاد میں سہولت فراہم فرمائی۔

تُرۡجِیۡ مَنۡ تَشَآءُ مِنۡهُنَّ وَ تُــٔۡوِیۡۤ اِلَیۡكَ مَنۡ تَشَآءُ ؕ وَ مَنِ ابۡتَغَیۡتَ مِمَّنۡ عَزَلۡتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیۡكَ ؕ ذٰلِكَ اَدۡنٰۤی اَنۡ تَقَرَّ اَعۡیُنُهُنَّ وَ لَا یَحۡزَنَّ وَ یَرۡضَیۡنَ بِمَاۤ اٰتَیۡتَهُنَّ كُلُّهُنَّ ؕ وَ اللّٰهُ یَعۡلَمُ مَا فِیۡ قُلُوۡبِكُمۡ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِیۡمًا حَلِیۡمًا ﴿۵۱﴾

۵۱۔ آپ ان بیویوں میں سے جسے چاہیں علیحدہ رکھیں اور جسے چاہیں اپنے پاس رکھیں اور جسے آپ نے علیحدہ کر دیا ہو اسے آپ پھر اپنے پاس بلانا چاہتے ہوں تو اس میں آپ پر کوئی مضائقہ نہیں ہے، یہ اس لیے ہے کہ اس میں زیادہ توقع ہے کہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں اور وہ رنجیدہ نہ ہوں اور جو کچھ بھی آپ انہیں دیں وہ سب اسی پر راضی ہوں اور جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اللہ اسے جانتا ہے اور اللہ بڑا جاننے والا، بردبار ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ تُرۡجِیۡ مَنۡ تَشَآءُ مِنۡهُنَّ: اس جملے کا تعلق ازواج سے ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک طرف تو تبلیغی مصلحتوں کی بنا پر متعدد قبائل کی خواتین کو اپنی زوجیت میں لیا تھا، دوسری طرف ان خواتین کی آپس کی رقابتوں اور دیگر رنجشوں کی وجہ سے جھگڑوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ ان الجھنوں کو دور کرنے کے لیے

یہ آیت نازل ہوئی اور حضور ﷺ کو مکمل اختیار دیا کہ ازواج کے ساتھ جو برتاؤ مناسب سمجھیں کریں۔ اللہ کی طرف سے یہ اختیارات ملنے کے بعد ازواج کی توقعات ختم ہو گئیں۔ حضورؐ کے ہر برتاؤ کے لیے وہ آمادہ ہو گئیں اور کسی قسم کی پریشانی کا امکان بھی ختم ہو گیا۔ روایات کے مطابق حضورؐ نے ان اختیارات کے بعد بھی سب کے ساتھ یکساں برتاؤ کیا۔

۲۔ وَ مَنِ ابۡتَغَیۡتَ مِمَّنۡ عَزَلۡتَ: یہ اختیار بھی آپ ﷺ کو دیا گیا کہ جس زوجہ کو آپؐ نے دور رکھا تھا اسے دوبارہ پاس بلا لیں۔ اس اختیار سے رسول اللہ ﷺ کو اپنا اختیار بدلنے کا بھی حق مل گیا۔ اس سے ازواج کی توقعات اور کم ہو گئیں اور ازواج کے درمیان تقسیم میں رد و بدل بھی ممکن ہو گیا۔

۳۔ ذٰلِکَ اَدۡنٰۤی اَنۡ تَقَرَّ اَعۡیُنُہُنَّ: اللہ کی طرف سے اس فیصلے کے آنے اور ازواج کی تمام توقعات ختم ہونے کے بعد ازواج، رسول اللہ ﷺ کے ہر فیصلے پر خوش ہوں گی۔ خصوصاً جب رسول اللہؐ نے اس اختیار کے باوجود ازواج کے درمیان تقسیم اوقات میں یکساں برتاؤ فرمایا۔

۴۔ وَ اللّٰہُ یَعۡلَمُ مَا فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ: اللہ تمہاری قلبی حالت سے واقف ہے کہ تم کس حکم کو پسند اور کس حکم کو ناپسند کرتے ہو۔

۵۔ وَ کَانَ اللّٰہُ عَلِیۡمًا حَلِیۡمًا: اللہ اپنے علم کی بنیاد پر قانون بناتا ہے اور اپنے حلم کی بنا پر حکم کو ناپسند کرنے والوں کو سزا دینے میں عجلت سے کام نہیں لیتا۔

اہم نکات

۱۔ زوجہ کو دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے: رضایت قلبی اور بے غمی: تَقَرَّ اَعۡیُنُہُنَّ وَ لَا یَحۡزَنَّ....

۲۔ توقعات زیادہ ہونے سے رنجشیں زیادہ ہو جاتی ہیں۔

لَا یَحِلُّ لَکَ النِّسَآءُ مِنۡۢ بَعۡدُ وَ لَاۤ اَنۡ تَبَدَّلَ بِہِنَّ مِنۡ اَزۡوَاجٍ وَّ لَوۡ اَعۡجَبَکَ حُسۡنُہُنَّ اِلَّا مَا مَلَکَتۡ یَمِیۡنُکَ ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ رَّقِیۡبًا ﴿۵۲﴾

۵۲۔ اس کے بعد آپ کے لیے دوسری عورتیں حلال نہیں ہیں اور نہ اس بات کی اجازت ہے کہ ان بیویوں کو بدل لیں خواہ ان (دوسری) عورتوں کا حسن آپ کو کتنا ہی پسند ہو سوائے ان (کنیز) عورتوں کے جو آپ کی ملکیت میں ہوں اور اللہ ہر چیز پر نگران ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ لَا یَحِلُّ لَکَ النِّسَآءُ: بظاہر آیت کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ مذکورہ چھ اصناف اور نو ازواج کے بعد

آپ کے لیے دیگر عورتیں حلال نہیں ہیں۔ جس طرح عام مومنین کے لیے چار سے زیادہ جائز نہیں اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے لیے نو ازواج سے زیادہ جائز نہیں۔ اگر مِنۡۢ بَعۡدُ کے بعد مضاف الیہ من ذکرن ہے تو مذکورہ اصناف اور اعداد دونوں ہو سکتے ہیں اور اگر مِنۡۢ بَعۡدُ کے بعد ''وقت'' کو مضاف الیہ مان لیا جائے یعنی من بعد الیوم تو اس صورت میں آیت اِنَّاۤ اَحۡلَلۡنَا ... کے لیے ناسخ ہو گی۔

مجمع البیان کی ایک روایت کے مطابق لَا یَحِلُّ لَکَ النِّسَآءُ میں النِّسَآءُ سے مراد سورہ نساء میں مذکور خواتین ہیں۔ دیگر اور اقوال بھی ہیں لیکن ہم ظہور کی وجہ سے پہلی صورت اختیار کرتے ہیں۔

۲۔ وَلَاۤ اَنۡ تَبَدَّلَ بِہِنَّ: اسی طرح تبدیل کرنا بھی جائز نہ ہو گا کہ ان موجودہ ازواج میں سے کسی ایک کو طلاق دی جائے اور اس کی جگہ کسی اور عورت سے ازدواج کیا جائے۔

۳۔ اِلَّا مَا مَلَکَتۡ یَمِیۡنُکَ: کنیز عورتوں کے بارے میں یہ پابندی نہیں ہے۔ کنیز عورتوں کو تو آپ اپنی زوجیت میں لا سکتے ہیں۔

بعض روایات کے مطابق ہر قبیلہ کی یہ خواہش تھی کہ رسول اللہ ﷺ کو رشتہ دینے کا شرف حاصل رہے۔ اس پر حکم نازل ہوا چونکہ قبائل کی اس خواہش پر عمل کرنا رسول اللہ ﷺ کے لیے ممکن نہ تھا۔ البتہ یہ مسئلہ لونڈیوں کے بارے میں پیش نہیں آتا تھا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اس استثنا سے فائدہ نہیں اُٹھایا اور اس حکم کے بعد کسی لونڈی کو اپنے نکاح میں نہیں لائے۔

اہم نکات

۱۔ تعدد ازواج کی رسول خدا ﷺ تک کے لیے حد بندی ہے: لَا یَحِلُّ لَکَ النِّسَآءُ ....

۲۔ ظاہری حسن کو معیار نہیں بنانا چاہیے: وَّ لَوۡ اَعۡجَبَکَ حُسۡنُہُنَّ ....

۳۔ خود رسول اللہ ﷺ بھی اللہ کی طرف سے حلال و حرام کے پابند ہیں: لَا یَحِلُّ لَکَ ....

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَدۡخُلُوۡا بُیُوۡتَ النَّبِیِّ اِلَّاۤ اَنۡ یُّؤۡذَنَ لَکُمۡ اِلٰی طَعَامٍ غَیۡرَ نٰظِرِیۡنَ اِنٰىہُ ۙ وَ لٰکِنۡ اِذَا دُعِیۡتُمۡ فَادۡخُلُوۡا فَاِذَا طَعِمۡتُمۡ فَانۡتَشِرُوۡا وَ لَا مُسۡتَاۡنِسِیۡنَ لِحَدِیۡثٍ ؕ اِنَّ ذٰلِکُمۡ کَانَ یُؤۡذِی النَّبِیَّ فَیَسۡتَحۡیٖ مِنۡکُمۡ ۫

۵۳۔ اے ایمان والو! نبی کے گھروں میں داخل نہ ہونا مگر یہ کہ تمہیں کھانے کے لیے اجازت دی جائے اور نہ ہی پکنے کا انتظار کرو، لیکن جب دعوت دے دی جائے تو داخل ہو جاؤ اور جب کھانا کھا چکو تو منتشر ہو جاؤ اور باتوں میں لگے بیٹھے نہ رہو، یہ بات نبی کو تکلیف پہنچاتی ہے مگر وہ تمہارا لحاظ کرتے ہیں لیکن اللہ حق بات کرنے

وَ اللّٰہُ لَا یَسۡتَحۡیٖ مِنَ الۡحَقِّ ؕ وَ اِذَا سَاَلۡتُمُوۡہُنَّ مَتَاعًا فَسۡـَٔلُوۡہُنَّ مِنۡ وَّرَآءِ حِجَابٍ ؕ ذٰلِکُمۡ اَطۡہَرُ لِقُلُوۡبِکُمۡ وَ قُلُوۡبِہِنَّ ؕ وَ مَا کَانَ لَکُمۡ اَنۡ تُؤۡذُوۡا رَسُوۡلَ اللّٰہِ وَ لَاۤ اَنۡ تَنۡکِحُوۡۤا اَزۡوَاجَہٗ مِنۡۢ بَعۡدِہٖۤ اَبَدًا ؕ اِنَّ ذٰلِکُمۡ کَانَ عِنۡدَ اللّٰہِ عَظِیۡمًا ﴿۵۳﴾	سے نہیں شرماتا اور جب تمہیں نبی کی بیویوں سے کچھ مانگنا ہو تو پردے کے پیچھے سے مانگا کرو، یہ تمہارے اور ان کے دلوں کی پاکیزگی کے لیے زیادہ بہتر طریقہ ہے تمہیں یہ حق نہیں کہ اللہ کے رسول کو اذیت دو اور ان کی ازواج سے ان کے بعد کبھی بھی نکاح نہ کرو، بتحقیق یہ اللہ کے نزدیک بہت بڑا گناہ ہے۔

تشریح کلمات

نٰظِرِیۡنَ : (ن ظ ر) النظر یعنی انتظار۔

اِنٰىہُ : (ن ی) آنیٰ کسی چیز کی انتہا اور پختگی کے وقت کو پہنچ جانا۔

تفسیر آیات

۱۔ لَا تَدۡخُلُوۡا بُیُوۡتَ النَّبِیِّ: اسلامی آداب وتہذیب رائج ہونے سے پہلے عربوں میں گھروں میں بلا اجازت داخل ہونے کا رواج عام تھا۔ اس جاہلانہ رواج کی وجہ سے بڑی خرابیاں وجود میں آتی تھیں۔ اس آیت کے شروع میں یہ حکم آیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھروں میں اجازت کے بغیر داخل نہ ہوں۔ بعد میں سورہ نور میں تمام مسلمانوں کے گھروں میں جانے کے لیے اجازت لینا لازمی قرار دیا گیا۔ چار دیواری کے اندر انسان کو ایک آزاد ماحول کا حق دیا گیا اور اسلام نے چاردیواری کو حرمت دی، تقدس اور امن دیا۔ مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ النور آیت ۲۶۔

۲۔ اِلَّاۤ اَنۡ یُّؤۡذَنَ لَکُمۡ: مگر یہ کہ کھانے کی دعوت دی جائے تو ضرور داخل ہوں۔ یہ قید توضیحی ہے، احترازی نہیں ہے۔ یعنی اجازت ملنے کی صورت میں داخل ہونا جائز ہے خواہ کھانے کی دعوت ہو یا نہ ہو لیکن لفظ اِلٰی طَعَامٍ ہے، فی طعام نہیں ہے۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے کہ اگرچہ گھر میں داخل ہونے کی اجازت ہو تو بھی طعام کے لیے بغیر دعوت کے داخل نہ ہوں۔ گھر میں اجازت سے داخل ہونے والوں کو خیال رکھنا ہوگا کہ گھر میں داخل ہونے کی اجازت کا مطلب کھانے کی دعوت نہیں ہے۔

۳۔ اِلٰی طَعَامٍ غَیۡرَ نٰظِرِیۡنَ اِنٰىہُ: یعنی لا تدخلوھا الا غیر ناظرین اناہ۔ نبی کے گھروں میں داخل نہ ہوں مگر یہ کہ کھانا تیار ہونے تک بیٹھے نہ رہتے ہوں۔ یعنی نبی کے گھر میں داخل ہونا دو صورتوں میں

جائز ہے: ایک یہ کہ گھر میں داخل ہونے کی اجازت ہو۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اجازت سے داخل ہونے کی صورت میں کھانا تیار ہونے تک کے انتظار میں نہ رہیں تو داخل ہو سکتے ہو۔

یہ پابندی اس بے قاعدگی کی وجہ سے لگی جو اس وقت کے غیر مہذب عربوں میں پائی جاتی تھی کہ گھر میں بیٹھے رہنے والوں کے لیے کھانا تیار کرنا بھی ممکن نہیں ہوتا تھا اور انہیں اُٹھانا بھی مروت کے خلاف ہو جاتا۔

۴۔ وَلٰکِنۡ اِذَا دُعِیۡتُمۡ فَادۡخُلُوۡا: لیکن جب کھانے کی دعوت دی جائے تو کھانے کے وقت بھی گھر میں داخل ہو سکتے ہو۔ یہاں مطلق گھر میں داخل ہونے کا ذکر نہیں ہے۔ اس کے لیے دعوت نہیں، اجازت درکار ہوتی ہے بلکہ کھانے کے وقت گھر میں داخل ہونے یا کھانے کے وقت سے پہلے داخل ہو کر کھانے کے وقت تک بیٹھے رہنے کے بارے میں ہے۔

واضح رہے ہمارے نام نہاد مہذب دور میں بھی کسی کے ہاں جانے میں ان آداب کا خیال نہیں رکھا جاتا۔

۵۔ فَاِذَا طَعِمۡتُمۡ فَانۡتَشِرُوۡا: کھانا کھانے کے بعد منتشر ہو جائیں۔ اٹھ جائیں اور اپنے اپنے گھروں کو جائیں۔ مزید بیٹھے رہنے سے میزبان کو اپنے گھر کے امور کی انجام دہی میں دقت پیش آ سکتی ہے۔

۶۔ وَلَا مُسۡتَاۡنِسِیۡنَ لِحَدِیۡثٍ: نہ ہی بیٹھ کر اِدھر اُدھر کی باتوں کا سلسلہ شروع کرو اور گھر والوں کو اس انتظار کے عذاب میں نہ ڈالو کہ کب نکلیں گے۔

۷۔ اِنَّ ذٰلِکُمۡ کَانَ یُؤۡذِی النَّبِیَّ: اس قسم کی نامناسب حرکتوں کی وجہ سے نبی ﷺ کو اذیت ہوتی ہے۔ ان کے معمولات زندگی متاثر ہوتے ہیں اور چونکہ اس مسئلے میں خود رسول اللہ ﷺ کی ذاتی بات ہے اس لیے لوگوں کو ایسی ہدایات بھی جاری نہیں کر سکتے تھے جب کہ گھر بھی صرف ایک کمرے پر مشتمل ہے۔

۸۔ فَیَسۡتَحۡیٖ مِنۡکُمۡ: وہ شرم کی وجہ سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں روایت ہے: کان شدید الحیاء آپ نہایت باحیا تھے۔

۹۔ وَاللّٰہُ لَا یَسۡتَحۡیٖ مِنَ الۡحَقِّ: اللہ تعالیٰ نے خود رسول اللہ ﷺ کی اذیت کا دفاع فرمایا: اللہ حق بات کرنے سے نہیں شرماتا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ جن حالات سے دوچار تھے ان کا دفاع حق اور حقیقت تھا جسے اللہ ترک نہیں کر سکتا تھا۔

۱۰۔ وَاِذَا سَاَلۡتُمُوۡہُنَّ مَتَاعًا فَسۡـَٔلُوۡہُنَّ مِنۡ وَّرَآءِ حِجَابٍ: ابن سعد کے مطابق آیہ حجاب سنہ ۵ ہجری کو نازل ہوئی۔ اس آیت کے نزول کے بعد رسول اللہ ﷺ کی ازواج کے حجروں میں پردے آویزاں ہوئے۔ دیگر مسلمانوں نے بھی رسول اللہ ﷺ کی پیروی میں پردے آویزاں کیے۔

۱۱۔ وَاِذَا سَاَلۡتُمُوۡہُنَّ: اگر تم ازواج رسول سے کوئی چیز مانگو تو ان کے سامنے مت جایا کرو۔ پردے کے پیچھے رہ کر مانگا کرو۔ رسول اللہ ﷺ کے گھر میں لوگوں کا ہمیشہ آنا جانا رہتا تھا اور حجاب کا حکم

آنے سے پہلے رو بہ رو ہو کر چیزیں مانگا کرتے تھے۔ اس آیت کے ذریعے یہ بات ممنوع ہو گئی کہ ازواج، اجنبی مردوں کے سامنے آئیں اور مردوں کے لیے بھی منع آ گیا کہ وہ ازواج کے سامنے نہ آئیں۔

۱۲۔ ذٰلِكُمۡ اَطۡهَرُ لِقُلُوۡبِكُمۡ وَ قُلُوۡبِهِنَّ: حجاب، مرد اور عورت دونوں کے دلوں میں آنے والے ممکنہ شیطانی وسوسوں سے پاک رہنے کا ذریعہ ہے چونکہ نگاہ، فساد اخلاق کا پہلا زینہ ہے۔ آنکھوں کو وہ چیز بھلی لگتی ہے جو روح کو بری لگتی ہے۔

حدیث میں ہے:

اَلنَّظَرُ سَهْمٌ مِنْ سِهَامِ اِبْلِيسَ ....[1] نظر، ابلیس کے تیروں میں سے ایک تیر ہے۔

جس کی روح میں پاکیزگی ہوتی ہے اس کی نظر اس کی روح کی پیروی کرتی ہے۔ اس کی نظر پر روح کی حاکمیت ہوتی ہے۔ جو لوگ کہتے ہیں دل پاک ہونا چاہیے۔ پردہ دل میں نہ ہو تو ظاہری پردے کا کیا فائدہ؟ ان لوگوں کی خدمت میں عرض ہے: جسم کا پردہ دل کے تابع ہے۔ اس دل کی کوئی وقعت نہیں جس کا کردار پر کوئی اثر نہ ہو۔ قرآن فرماتا ہے: پردہ کرنا دل کی پاکیزگی ہے۔ اس کا مفہوم یہی ہے کہ پردہ نہ کرنے سے دل کا پاکیزہ نہ ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ آخر تمہارے دل ہی نے تو کہا ہے: پردہ نہ کرو۔ اپنے حسن و جمال کا مظاہرہ کرتی پھرو۔ اس ناپاک دل کا یہ تقاضا ہے کہ تم سب کے سامنے اپنی زیب و زینت کی نمائش کرو۔ اگر تمہارا دل پاک ہوتا تو اپنے جسم کے محاسن کو غیر مردوں پر ظاہر کرتے ہوئے شرم آتی۔ دل کو عمل اور کردار سے الگ کر دینا بدعملی کے لیے ایک طفلانہ بہانہ ہے۔

ایک روشن خیال کا ایک دیندار کے ساتھ مکالمہ قابل توجہ ہے۔

> روشن خیال نے جو اپنی بے حجاب بیوی کے ساتھ ہے، ایک دیندار کو دیکھا جو اپنی باحجاب زوجہ کے ساتھ ہے۔
>
> روشن خیال دیندار سے: یہ کیا دقیانوسیت ہے اس بیچاری کو پردے کے پیچھے بند کر رکھا ہے۔ کیا تمہاری عقلوں پر پردہ پڑا ہوا ہے جو اپنی زوجہ کو پردے میں بند رکھتے ہو؟
>
> دیندار: میں آپ سے معذرت چاہتا ہوں۔ یہ چونکہ میری پرائیویٹ بیوی ہے اس لیے میں اسے پردے میں رکھتا ہوں۔
>
> روشن خیال کی بیوی اپنے شوہر سے: منہ بند نہیں رکھتے۔ تمہارے ساتھ میری بھی بے عزتی ہو گئی۔

۱۳۔ وَ مَا كَانَ لَكُمۡ اَنۡ تُؤۡذُوۡا رَسُوۡلَ اللّٰهِ: رسول اللہ ﷺ کو اذیت دینے کے بارے میں مزید

---

[1] الکافی ۵: ۵۵۹

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سورہ توبہ آیت ۶۱۔

۱۴۔ وَلَاۤ اَنۡ تَنۡکِحُوۡۤا اَزۡوَاجَہٗ مِنۡۢ بَعۡدِہٖۤ اَبَدًا: روایت ہے کہ طلحہ بن عبید اللہ نے کہا تھا: محمد ہمارے بعد ہماری عورتوں سے شادی کرتے ہیں ہم بھی ان کے بعد ان کی زوجات سے شادی کریں گے۔ اس کے قول سے رسول اللہ ﷺ کو اذیت ہوئی۔

اگر رسول اللہ ﷺ کی ازواج کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے بعد شادی کرنا ممنوع نہ ہوتا تو لوگ رسول ﷺ کے بعد ازواج رسول سے شادی کر کے اپنا مقام بناتے اور سیاسی مقاصد حاصل کرتے جس سے اختلاف بڑھ جاتا اور رسول اللہ ﷺ کی اہانت ہوتی۔ چنانچہ قرآن میں صریح حکم موجود ہونے کے باوجود لوگوں نے زوجۂ رسول کو گھر سے نکالا اور ان سے اپنے سیاسی مفادات حاصل کرنے کی کوشش کی۔

۱۵۔ اِنَّ ذٰلِکُمۡ کَانَ عِنۡدَ اللّٰہِ عَظِیۡمًا: رسول صلی اللہ ﷺ کے بعد ان کی ازواج سے شادی کرنا اللہ کے نزدیک نہایت سنگین جرم ہے چونکہ ازواج رسول مومنین کی مائیں ہیں اور ماں سے ازدواج کا تصور حرام ہے۔

اہم نکات

۱۔ رسول اللہ ﷺ سے متعلق گھروں کی چار دیواری کا تقدس ہر مسلم پر واجب ہے۔

۲۔ کسی کے گھر میں بلا وجہ دیر تک نہیں بیٹھنا چاہیے۔

۳۔ کھانے کے وقت ہر کسی کے ہاں نہیں جانا چاہیے۔

۴۔ میزبان کو اذیت نہیں دینی چاہیے۔

۵۔ حجاب دل کی طہارت کی علامت ہے۔

۶۔ ہر اس عمل سے پرہیز کرنا چاہیے جس سے رسول اللہ ﷺ کو اذیت ہو۔

اِنۡ تُبۡدُوۡا شَیۡئًا اَوۡ تُخۡفُوۡہُ فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمًا ﴿۵۴﴾

۵۴۔ تم کسی بات کو خواہ چھپاؤ یا ظاہر کرو اللہ تو یقیناً ہر چیز کا خوب علم رکھتا ہے۔

تفسیر آیات

رسول اللہ ﷺ کو اذیت دینے والی باتوں اور حرکتوں کا اللہ تعالیٰ کو علم ہے خواہ تم اسے ظاہر کرو یا پوشیدہ رکھو۔ کسی جرم کو پوشیدہ رکھ کر یہ خیال کرنا کہ کسی کو اس کا علم نہیں ہوا، علم خدا پر کفر ہے۔

لَا جُنَاحَ عَلَیۡہِنَّ فِیۡۤ اٰبَآئِہِنَّ وَلَاۤ اَبۡنَآئِہِنَّ وَلَاۤ اِخۡوَانِہِنَّ وَلَاۤ اَبۡنَآءِ

۵۵۔ (رسول کی) ازواج پر کوئی مضائقہ نہیں اپنے باپوں، اپنے بیٹوں، اپنے بھائیوں، اپنے بھتیجوں

اِخۡوَانِہِنَّ وَ لَاۤ اَبۡنَآءِ اَخَوٰتِہِنَّ وَ لَا نِسَآئِہِنَّ وَ لَا مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُہُنَّ ۚ وَ اتَّقِیۡنَ اللّٰہَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ شَہِیۡدًا ﴿۵۵﴾

اپنے بھانجوں، اپنی مسلم خواتین اور کنیزوں سے (پردہ نہ کرنے میں) اور اللہ کا خوف کریں، اللہ یقیناً ہر چیز پر گواہ ہے۔

۱۔ لَا جُنَاحَ عَلَیۡہِنَّ: ازواج نبی پر درج آیت افراد کے لیے پردہ کرنا لازم نہیں۔ مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورہ نور آیت ۳۱

اِنَّ اللّٰہَ وَ مَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوۡنَ عَلَی النَّبِیِّ ؕ یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا صَلُّوۡا عَلَیۡہِ وَ سَلِّمُوۡا تَسۡلِیۡمًا ﴿۵۶﴾

۵۶۔ اللہ اور اس کے فرشتے یقیناً نبی پر درود بھیجتے ہیں، اے ایمان والو! تم بھی ان پر درود و سلام بھیجو جیسے سلام بھیجنے کا حق ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ سابقہ آیات میں رسول اللہ ﷺ کی زندگی سے مربوط احکام بیان فرمائے۔ امت کو وہ آداب بھی بیان کیے جو آپؐ کے ساتھ بجا لانا چاہئیں اور ان باتوں کی بھی نشاندہی فرمائی جن سے آپ ﷺ کو اذیت ہوتی ہے۔

اس کے بعد امت اسلام کو اس بات کی تعلیم دی جا رہی ہے کہ اپنے رسول ﷺ پر درود و سلام بھیجا کرو۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ امت کو درود کا حکم دینے سے پہلے فرمایا: اللہ اور فرشتے نبی پر درود بھیجتے ہیں۔ اس میں رسول اللہ ﷺ کی عظمت کا بیان ہے کہ اللہ کے ہاں ان کا کیا مقام ہے اور ساتھ اس میں درود کی اہمیت کا بھی بیان ہے کہ یہ وہ اہم کام ہے جسے خود اللہ تعالیٰ اور فرشتے انجام دیتے ہیں۔ یہ وَ رَفَعۡنَا لَکَ ذِکۡرَکَ [۱] ہم نے آپ کے ذکر کو بلند کیا، کا عملی مظاہرہ ہے۔

۲۔ صلوۃ: حضرت امام جعفر صادق اور حضرت امام موسیٰ کاظم علیہما السلام سے صلوۃ کے بارے سوال ہوا تو فرمایا:

الصلوۃ من اللّٰہ عز و جل رحمۃ و من الملائکۃ تزکیۃ و من الناس الدعاء۔ [۲]	صلوۃ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت اور فرشتوں کی طرف سے پاکیزگی کا اظہار اور لوگوں کی طرف سے دعا ہے۔

۱۔ ۹۴ الشرح: ۴	۲۔ تفسیر الصافی

مومن جب اللہ کی بارگاہ میں اپنے رسول ﷺ کے لیے دعا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے حبیب کے حق میں کی گئی دعا کو زیادہ پسند فرماتا ہے۔ حدیث نبوی ہے:

مَنْ صَلَّى عَلَيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ مَلَائِكَتُهُ وَ مَنْ شَاءَ فَلْيُقِلَّ وَ مَنْ شَاءَ فَلْيُكْثِرْ ۔[1]

جو مجھ پر درود بھیجتا ہے اس پر اللہ اور اس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں۔ پس جو چاہے کم درود بھیجے جو چاہے زیادہ۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ایک روایت میں اس حدیث نبوی کی تشریح موجود ہے۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا:

اِذَا ذُكِرَ النَّبِيُّ فَاَكْثِرُوا الصَّلَاةَ عَلَيْهِ فَاِنَّهُ مَنْ صَلَّى عَلَى النَّبِيِّ ص صَلَاةً وَاحِدَةً صَلَّى اللّٰهُ عَلَيهِ اَلْفَ صَلَاةٍ فِي اَلْفِ صَفٍّ مِنَ الْمَلَائِكَةِ وَ لَمْ يَبْقَ شَيْءٌ مِمَّا خَلَقَهُ اللّٰهُ اِلَّا صَلَّى عَلَى الْعَبْدِ لِصَلَاةِ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَ صَلَاةِ مَلَائِكَتِهِ ....۔[2]

جب نبی کا ذکر ہو تو کثرت سے ان پر درود بھیجو چونکہ جو شخص نبی پر ایک بار درود بھیجے گا تو اللہ تعالیٰ فرشتوں کی ایک ہزار صفوں میں اس پر ایک ہزار درود بھیجتا ہے اور اللہ اور اس کے فرشتوں کے درود بھیجنے پر تمام مخلوقات بھی درود بھیجیں گی۔

۳۔ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا: اپنے نبی پر درود کے ساتھ سلام بھی بھیجو۔ سلام کے دو معنی بیان ہوئے ہیں: ایک یہ کہ سلام بمعنی تسلیم و اطاعت ہے۔ یعنی ان پر درود بھیجو اور ہر حکم کو تسلیم کرو۔ دوسرا یہ کہ سلام بمعنی سلامتی ہو۔ یعنی اپنے رسول ﷺ پر درود بھیجو اور ہر نقص سے سلامتی کا اظہار کرو۔ اس میں شان رسالت کی عظمت و بلندی کا اظہار ہے۔ ان دونوں معنوں میں کوئی تصادم نہیں ہے بلکہ قابل جمع ہیں۔

ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: میں اپنی ایک تہائی صلوات، بلکہ آدھی بلکہ پوری آپ کے لیے مختص کرتا ہوں تو مجھے کیا اجر ملے گا؟ فرمایا:

اِذاً تُكْفَى مَئُونَةَ الدُّنْيَا وَ الْآخِرَةِ.[3]

پھر تیری دنیا و آخرت کی تمام ضرورتوں کے لیے یہی کافی ہے۔

یہی حدیث کچھ فرق کے ساتھ مسند احمد ۵: ۱۳۶ میں بھی مذکور ہے۔

دوسری حدیث میں آیا ہے۔

مَا فِي الْمِيْزَانِ شَيْءٌ اَثْقَلَ مِنَ الصَّلَاةِ عَلَى مُحَمَّدٍ وَ آلِ مُحَمَّدٍ۔[4]

(قیامت کے دن اعمال کے) ترازو میں محمد و آل محمد پر درود سے زیادہ کسی عمل کا وزن نہ ہوگا۔

رسول اللہ ﷺ سے روایت ہے:

---

۱ الکافی ۲: ۴۹۲　۲ الکافی ۲: ۴۹۲　۳ الکافی ۲: ۴۹۱　۴ الکافی ۲: ۴۹۴

الصَّلَاۃُ عَلَیَّ وَ عَلٰی اَہْلِ بَیْتِی تَذْہَبُ بِالنِّفَاقِ۔[1] مجھ پر اور میرے اہل بیت پر درود نفاق کو دور کر دیتا ہے۔

۴۔ **درود کے الفاظ:** جب اللہ تعالیٰ کی طرف کوئی حکم صادر ہوتا ہے تو اس پر عمل کرنے کا طریقہ بھی خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے بیان ہوتا ہے۔ نماز، زکوٰۃ، حج کا حکم آیا تو ان کا طریقہ بھی بیان ہوا۔ رسول اللہ ﷺ سے روایت ہے:

صلّوا کما رأیتمونی أصلی۔[2] نماز اس طرح پڑھو جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے دیکھا ہے۔

اسی طرح جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے حبیب پر درود بھیجنے کا حکم آیا تو یہ سوال ذہنوں میں پیدا ہونا قدرتی امر تھا کہ درود بھیجنے کا طریقہ کیا ہو گا؟ ہمیشہ کی طرح رسول اللہ ﷺ کے معاصر اصحاب نے سوال کیا۔ اس غرض سے سوال کیا جاتا رہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ان کے سوالوں کا جو جواب ارشاد فرمائیں، اس پر مخاطبین اولین بھی عمل کریں اور قیامت تک آنے امت کے والے افراد بھی عمل کریں۔ آیندہ صفحات میں رسول اللہ ﷺ کا جواب اور امت کا عمل آپ کے سامنے آئے گا۔

i۔ **کعب بن عجرۃ کی صحیح السند روایت:** یہ حدیث تین طرق سے روایت ہے:

الف۔ حدثنا قیس بن حفص و موسیٰ بن اسماعیل قالا حدثنا عبد الواحد بن زیاد حدثنا ابو فروۃ مسلم بن سالم الھمدانی قال حدثنی عبداللّٰہ بن عیسی سمع عبد الرحمن بن ابی لیلی قال لقینی کعب بن عجرۃ...الخ۔[3]

کہتے ہیں: ہم نے رسول اللہؐ سے پوچھا کہ ہم آپ کے اھل البیت پر کیسے درود بھیجیں؟ اللہ نے ہمیں یہ تعلیم تو دی ہے کہ ہم آپ پر کیسے سلام کریں۔ تو آپؐ نے فرمایا: کہو:

اللّٰھم صل علی محمد و علی آل محمد کما صلیت علی ابراھیم و علی آل ابراھیم انك حمید مجید، اللّٰھم بارك علی محمد و آل محمد کما بارکت علی ابراھیم و آل ابراھیم انك حمید مجید۔

ب: اس حدیث کو دوسرے طریق سے بخاری نے ابن ابی لیلیٰ سے روایت کیا ہے۔[4]

ج: تیسرے طریق میں انہی الفاظ کے ساتھ روایت ہے۔ ملاحظہ ہو صحیح بخاری ۷: ۱۵۶۔ اس طریق سے مسلم نے اپنی صحیح ۲: ۱۶ میں اور ابوداؤد نے اپنی سنن ۱: ۲۲۱ میں روایت کی ہے۔ اس حدیث کو نسائی نے اپنی سنن ۳: ۴۷۔ ۴۸ میں تین طرق سے روایت کیا ہے۔ اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

---

[1] الکافی ۲: ۴۹۲ [2] بحار الانوار ۸۲: ۲۷۹ [3] صحیح بخاری ۴: ۱۱۸ حدیث ۳۳۷۰ [4] صحیح بخاری ۶: ۲۷

اللّٰھم صل علی محمد وآل محمد کما صلیت علی ابراھیم و علی آل ابراھیم انك حمید مجید۔ اللّٰھم بارك علی محمد و آل محمد کما بارکت علی ابراھیم و علی آل ابراھیم انك حمید مجید۔[1]

ii۔ ابو مسعود عقبہ بن عمرو انصاری کی صحیح روایت۔ یہ حدیث بھی تین طرق سے روایت کی گئی ہے:

ابو مسعود کہتے ہیں:

ہم سعد بن عبادہ کی مجلس میں بیٹھے تھے تو رسول اللہؐ تشریف لے آئے تو بشیر بن سعد نے پوچھا: یا رسول اللہؐ! آپؐ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم آپؐ پر درود بھیجیں تو ہم آپؐ پر کیسے درود بھیجیں؟ رسول اللہؐ نے سکوت اختیار فرمایا یہاں تک کہ ہم نے سوچا کاش یہ سوال نہ کیا ہوتا۔ پھر رسول اللہؐ نے فرمایا: کہو:

اللّٰھم صل علیٰ محمد و علی آل محمد کما صلیت علیٰ ابراھیم و آل ابراھیم و بارك علیٰ محمد و علی آل محمد کما بارکت علی ابراھیم و آل ابراھیم فی العالمین انك حمید مجید و السلام کما علمتم۔

اس کی سند صحیح ہے۔ اس حدیث کو ابو داؤد نے اپنی سنن نمبر۹۸۰ میں عبد اللّٰہ بن مسلمۃ القعنبی سے روایت کیا ہے یہ روایت مؤطا امام مالك روایۃ یحیٰ ۱: ۱۶۵، ۱۶۶ میں موجود ہے۔ اس کی سند یہ ہے:

قرأت علی عبد الرحمن مالك و حدثنا اسحاق اخبرنی مالك عن نعیم بن عبد اللّٰہ المجمر ان محمد بن عبداللّٰہ بن زید الانصاری فی حدیث عبد الرحمن و عبد اللّٰہ بن زید ھو الذی کان أوی الفداء بالصلاۃ اخبرہ عن ابی مسعود الانصاری انہ قال...۔ الخ

(مسند احمد۔ صحیح علی شرط مسلم۔)

اس حدیث کو امام احمد بن حنبل نے تین طرق سے روایت کیا ہے۔ ملاحظ ہو مسند احمد بن حنبل ۴: ۱۱۸۔ ۱۱۹، ۵: ۲۷۳۔ ۲۷۴۔ اس کے علاوہ صحیح مسلم ۲: ۱۶، سنن دارمی ۱: ۳۰۹، سنن الترمذی۵: ۳۷، مستدرك حاکم ۱:۲۶۸، سنن دار قطنی ۱: ۳۵۵۔

حاکم اپنے مستدرك ۱: ۲۶۸ میں اس حدیث کو ان الفاظ میں ذکر کرتے ہیں:

ابو مسعود (عقبہ بن عمرو) کہتے ہیں کہ ایک شخص آیا اور رسول اللہؐ کے سامنے

---

[1] سنن نسائی ۳: ۴۸

بیٹھ گیا۔ ہم بھی آپؐ کے پاس بیٹھے تھے۔ اس نے پوچھا: یا رسول اللہؐ! ہم کو معلوم ہو گیا کہ آپؐ پر سلام کس طرح کرنا چاہیے لیکن یہ فرمائیے کہ جب ہم نماز پڑھتے ہیں تو آپ پر درود کس طرح بھیجیں؟ تو رسول اللہؐ خاموش ہو گئے حتیٰ کہ ہم نے یہ خواہش کی کہ سوال کرنے والے نے سوال ہی نہ کیا ہوتا۔ پھر آپؐ نے فرمایا:

جب تم مجھ پر درود پڑھو تو کہو:

اللّٰھم صل علی محمد النبی الامی و علی آل محمد کما صلیت علی ابراھیم و علی آل ابراھیم و بارك علی محمد النبی الامی و علی آل محمد کما بارکت علی ابراھیم و علی آل ابراھیم انك حمید مجید۔

اس حدیث مبارکہ کو حاکم نیشاپوری نے ا: ۲۶۸، ابوداؤد نے سنن حدیث ۹۸۱ میں محمد بن اسحاق بن یسار کی سند سے بیان کیا ہے۔ حاکم اور ذہبی نے اس حدیث کو صحیح علیٰ شرط مسلم قرار دیا ہے۔

iii۔ ابو سعید الخدریؓ کی صحیح روایت:

حدثنا عبداللّٰہ بن یوسف حدثنا اللیث قال حدثنی ابن الھاد عن عبد اللّٰہ بن خباب عن ابی سعید الخدری قال۔۔۔۔ الخ۔

کہتے ہیں: ہم نے رسول اللہؐ سے عرض کیا کہ آپؐ پر سلام کرنے کا طریقہ تو معلوم ہوا لیکن آپؐ پر ہم درود کیسے بھیجیں؟ آپؐ نے فرمایا: کہو:

اللّٰھم صل علیٰ محمد عبدك و رسولك کما صلیت علی ابراھیم و علیٰ آل ابراھیم و بارك علیٰ محمد و علیٰ آل محمد کما بارکت علی علی ابراھیم و آل ابراھیم۔

اس حدیث کو صحیح بخاری ۴: ۱۱۸ حدیث ۴۷۹۸ میں، مسند احمد ۳: ۴۷، سنن نسائی ۳: ۴۹ میں ذکر کیا ہے۔

اس روایت کے پہلے جملے میں دیگر روایتوں کے برخلاف آل کا ذکر نہیں ہے۔ چونکہ دوسرے جملے میں آل کا ذکر ہے لہٰذا قرین واقع یہ معلوم ہوتا ہے کہ لفظ آل راوی سے ساقط ہو گیا ہے۔ جیسا کہ ابن حجر نے فتح الباری ۱۱: ۱۳۲ میں یہی مؤقف اختیار کیا ہے۔

iv۔ ابوھریرہ کی صحیح روایت:

کہتے ہیں کہ ہم نے کہا یا رسول اللہؐ! ہم آپؐ پر کیسے درود بھیجیں؟ تو فرمایا: تم اس طرح کہو:

اللّٰھم صل علی محمد و بارك علیٰ محمد و علیٰ آل محمد کما صلیت

و بارکت علیٰ آل ابراهیم انك حمید مجید۔[1]

مجمع الزوائد میں هیثمی نے کہا ہے: اس حدیث کو البزار نے روایت کیا ہے اور اس کے راوی صحیح بخاری کے راوی ہیں۔ ملاحظہ ہو مجمع الزوائد ۲: ۱۴۴ باب الصلاۃ علیٰ النبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم۔

ابن القیم الجوزیة اس حدیث کو ابوهریره سے اس طرح روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ صلی الله علیه وآله وسلم سے پوچھا کہ ہم آپؐ پر کیسے درود بھیجیں؟ تو فرمایا کہو:

اللّٰهم صل علی محمد و علی آل محمد و بارك علی محمد و علی آل محمد کما صلیت و بارکت علی ابراهیم فی العالمین انك حمید مجید و السلام کما قد علمتم۔

ابن القیم نے اس حدیث کے ذیل میں لکھا ہے:

یہ سند بخاری و مسلم کی شرائط کے مطابق صحیح ہے۔

ملاحظہ ہو جلاء الافهام: ۱۳۔ طبع قاہرہ۔

v۔ طلحة بن عبید اللّٰہ کی صحیح روایت:

حدثنا محمد بن بشر حدثنا مجمع بن یحی الانصاری حدثنا عثمان بن موهب عن موسی بن طلحة عن ابیه۔۔۔۔ الخ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے سوال ہوا کہ آپؐ پر درود بھیجنے کا طریقہ کیا ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا کہو:

اللّٰهم صل علیٰ محمد و علیٰ آل محمد کما صلیت علیٰ ابراهیم انك حمید مجید و بارك علیٰ محمد و علیٰ آل محمد کما بارکت علی ابراهیم وعلی آل ابراهیم انك حمید مجید۔[2]

اسناده قوی علیٰ شرط مسلم۔ اس حدیث کی سند میں مجمع بن یحی صرف مسلم کا راوی ہے جو صدوق ہے۔ باقی تمام بخاری و مسلم کے راوی ہیں۔ البتہ حافظ ابن حجر نے التلخیص الحبیر ۱: ۲۶۸ میں اسے حسن کہا ہے۔ یہی حدیث المصنف لابن ابی شیبه ۲: ۵۰۷، مسند ابی یعلی الموصلی حدیث ۶۵۲۔۶۵۳ میں بھی موجود ہے۔

اس طریق سے روایت سنن نسائی ۳: ۴۸ میں ان الفاظ میں ہے:

اللّٰهم صل علی محمد و علی آل محمد کما صلیت علی ابراهیم و آل

---

[1] مجمع الزوائد ۱: ۱۴۴ [2] مسند احمد بن حنبل ۱: ۱۶۳

ابراهيم انك حميد مجيد و بارك على محمد و على آل محمد كما بارکت على ابراهيم و آل ابراهيم انك حميد مجيد۔

نیز کتاب عمل اليوم و الليلة للنسائی حدیث ۵۲ پر موجود ہے۔

vi۔زید بن خارجہ کی صحیح روایت:

حدثنا علی بن بحر حدثنا عيسى بن يونس حدثنا عثمان بن حكيم حدثنا خالد بن سلمة ان عبد الحميد بن عبدالرحمن....۔الخ

اس کی سند بالکل صحیح ہے۔

حضرت زید بن خارجہ بن زید انصاری کہتے ہیں:

میں نے خود رسول اللہؐ سے پوچھا: آپؐ پر درود کیسے بھیجا جائے؟ تو فرمایا:

صلوا و اجتهدوا ثم قولوا: اللّٰهم بارك على محمد و علىٰ آل محمد كما باركت علىٰ آل ابراهيم انك حميد مجيد۔[1]

حدثنا على بن عبد اللّٰه قال حدثنا مروان بن معاوية قال حدثنا عثمان بن حكيم عن خالد بن سلمة عن موسىٰ بن طلحة قال اخبرنى زيد بن خارجة اخو بنى الحارث بن الخزرج قال قلت....۔ الخ

حضرت زید بن خارجہ کہتے ہیں:

میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم نے آپؐ پر سلام کا طریقہ جان لیا ہے۔ لہٰذا درود کس طرح پڑھیں؟ آپؐ نے فرمایا: مجھ پر درود پڑھو اور کہو:

اللّٰهم بارك علىٰ محمد وعلىٰ آل محمد كما باركت علىٰ ابراهيم و آل ابراهيم انك حميد مجيد۔[2]

اس حدیث کی سند حسن ہے۔

اسے نسائی نے اپنی سنن ۳: ۴۹ حدیث ۱۲۹۳، احمد نے مسند ۱: ۱۹۹ میں عثمان بن حکیم کی سند سے اور طبرانی نے المعجم الكبير ۵: ۲۱۸ حدیث ۵۱۴۳ میں ابو خلیفه حدثنا علی بن المدینی...کی سند سے روایت کیا ہے۔

سنن نسائی ۳: ۴۸ میں یہ حدیث ان لفظوں میں آئی ہے:

صلوا على و اجتهدوا فى الدعاء و قولوا: اللّٰهم صل على محمد و آل محمد۔

سنن النسائی الکبری ۶: ۱۹ میں یہ حدیث ان الفاظ میں ہے:

---

[1] مسند احمد ۱: ۱۹۹۔ التاريخ الكبير للبخاری ۳: ۳۸۳۔ المعرفة و التاريخ للفسوی ۱: ۳۰۱

[2] فضل الصلوة على النبیؐ للحافظ اسماعيل بن اسحاق القاضی حدیث ۴۹

صلوا و اجتهدوا فی الدعاء و قولوا: اللّٰهم صل علی محمد و آل محمد۔

vii۔ بريدة الخزاعی کی معتبر روایت

کہتے ہیں: ہم نے کہا: یا رسول اللہؐ! ہمیں یہ تو معلوم ہو گیا آپؐ پر سلام کس طرح کرنا ہے۔ ہم آپ پر درود کیسے بھیجیں؟ تو فرمایا:

قولوا: اللّٰهم اجعل صلواتك و رحمتك و بركاتك على محمد و آل محمد كما جعلتها على ابراهيم و على آل ابراهيم انك حميد مجيد۔[1]

اس کی سند یہ ہے: حدثنا يزيد بن هارون اخبرنا اسماعيل عن ابی داؤد الاعمی عن بريدة الخزاعی قال... الخ۔

viii۔ عبدالرحمن بن بشر انصاری کی صحیح روایت:

حدثنا سليمان بن حرب قال حدثنا حماد بن زيد عن ايوب عن محمد عن عبد الرحمن بن بشر بن مسعود قال...۔ الخ

عبد الرحمٰن بن بشر بن مسعود انصاری نے کہا: اے اللہ کے رسولؐ! آپؐ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم آپ پر سلام کہیں اور آپ پر درود پڑھیں۔ ہم نے آپؐ پر سلام کہنا تو جان لیا ہے۔ پس درود کس طرح پڑھیں؟ آپؐ نے فرمایا:

کہو اللّٰهم صلی علیٰ آل محمد كما صليت علیٰ آل ابراهيم اللّٰهم بارك علیٰ آل محمد كما باركت علیٰ ابراهيم۔[2]

اس کی سند بالکل صحیح ہے۔

اسے حافظ ابن جرير طبری نے اپنی جامع البيان فی تفسير القرآن ۲۲: ۳۲ میں صحیح سند کے ساتھ، ايوب السجستانی سے نسائی نے عمل اليوم و الليلة صفحہ ۵۱ اور السنن الكبریٰ حدیث ۹۸۷۹ میں صحیح سند سے روایت کیا ہے۔

ix۔ عبداللہ بن جعفر کی صحیح روایت

حدثنی ابوالحسن اسماعيل بن محمد بن الفضل بن محمد الشعرانی حدثنا جدی حدثنا ابو بكر بن ابی شيبة الحزامی، حدثنا محمد بن اسماعيل بن ابی فديك حدثنی عبد الرحمن بن ابی بكر المليكی عن اسماعيل بن عبداللّٰه بن جعفر بن ابی طالب عن ابيه قال عن ابيه ....۔ الخ

عبد اللہ بن جعفر بن ابی طالب کہتے ہیں:

---

[1] مسند احمد ۵: ۳۵۳　[2] فضل الصلاة علی النبیؐ حدیث ۷۱

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رحمت کا نزول ہوتے دیکھا تو فرمایا:

ادعوا لی ادعوا لی۔ میرے پاس بلاؤ میرے پاس بلاؤ۔

جناب صفیہؓ نے کہا: یا رسول اللہ! کس کو بلائیں؟ فرمایا:

اهل بیتی علیا و فاطمة و الحسن و الحسین۔ فجیئی بهم فالقی علیهم النبی صلی اللّٰه علیه وآله وسلم کسائه ثم رفع یدیه ثم قال: اللّٰهم هؤلاء آلی فصل علی محمد و علی آل محمد و انزل اللّٰه عزوجل : اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیُذۡہِبَ عَنۡکُمُ الرِّجۡسَ اَہۡلَ الۡبَیۡتِ وَ یُطَہِّرَکُمۡ تَطۡہِیۡرًا۔

میرے اہل بیت علی، فاطمہ، حسن اور حسین کو بلائیں۔ جب ان کو بلا لایا تو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان پر ایک چادر ڈال دی۔ پھر دونوں ہاتھوں کو اٹھا کر فرمایا: بار الہا! یہ میری آل ہیں۔ پس محمد و آل محمد پر درود بھیج اور اللہ عزَّ و جلَّ نے یہ آیت نازل فرمائی: اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیُذۡہِبَ عَنۡکُمُ الرِّجۡسَ اَہۡلَ الۡبَیۡتِ وَ یُطَہِّرَکُمۡ تَطۡہِیۡرًا۔

حاکم نیشاپوری اس حدیث کے ذیل میں لکھتے ہیں:

هذا حدیث صحیح الاسناد و لم یخرجاه۔[1]

یہ حدیث صحیح السند ہے اگرچہ بخاری اور مسلم نے ذکر نہیں کیا ہے۔

ذھبی نے بھی موافقت کی ہے۔ بعد ازاں حاکم نے لکھا ہے:

وقد صحت الروایة علیٰ شرط الشیخین انه علمهم الصلاة علیٰ اهل بیته کما علمهم الصلاة علیٰ آله۔

رہی ابو حمید الساعدی کی روایت جو صحیح بخاری ۶: ۲۷ میں منقول ہے:

کہتے ہیں: کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا ہم آپؐ پر کیسے درود بھیجیں؟ تو آپؐ نے فرمایا کہو:

اللّٰهم صل علی محمد و ازواجه و ذریته کما صلیت علی آل ابراهیم و بارك علی محمد و ازواجه و ذریته کما بارکت علی آل ابراهیم انك حمید مجید۔

بعض لوگوں نے اس ایک حدیث سے استدلال کیا ہے کہ آل سے مراد زوجات اور ذریت دونوں ہیں لیکن امام شوکانی نے اس کا جواب نیل الاوطار ۲: ۳۲۷ باب ما یستدل به علیٰ تفسیر آله المصلی علیهم میں دیا ہے:

---

[1] مستدرک حاکم ۳: ۱۴۷۔ ۱۴۸

ولكنه يشكل على هذا امتناعه من ادخال ام سلمه تحت الكساء بعد سؤالها ذلك و قوله صلى الله عليه وآله وسلم عند نزول هذه الآية مشيرا الى على و فاطمة و الحسن و الحسين اللهم ان هو لاء اهل بيتى بعد ان جللهم بالكساء۔

اس حدیث پر اشکال یہ آتا ہے کہ آنحضرت نے ام سلمہؓ کے مطالبے پر بھی کساء کے نیچے داخل کرنے سے انکار فرمایا نیز آیہ تطہیر کے نزول کے موقع پر علی، فاطمہ، حسن اور حسین علیہم السلام پر کساء ڈالنے کے بعد ان کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: اے اللہ یہ ہیں میرے اہل بیت۔

دیگر قابل توجہ بات یہ ہے کہ یہ روایت دیگر تمام روایات کے برخلاف ہے۔ اس کی ابتدا اور آخر میں ربط کلام نہیں بنتا۔ اے اللہ! محمد پر درود بھیج اور اس کی ازواج و اولاد پر جیسے تو نے ابراہیم کی آل پر درود بھیجا ہے۔ ربط کلام اس طرح ہونا چاہیے: جیسے تو نے ابراہیم کی ازواج پر درود بھیجا ہے۔ ظاہر ہے ابراہیم علیہ السلام کی ازواج کا انبیاء کی مائیں ہونے کے باوجود ذکر نہیں آیا۔ ہم آیندہ بتائیں گے کہ آل ابراہیم سے مراد قرآن کی صراحت کی روشنی میں کون ہیں؟

پھر اس روایت کے طریق میں امام مالك بن انس ہیں۔ جن کا حضرت علی علیہ السلام اور اہل بیت علیہم السلام کے بارے میں منفی موقف واضح ہے۔

ابو بكر بيهقى کہتے ہیں:

امام مالک سے عثمان اور علی کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے جواب میں کہا: میں خون ریزی میں ملوث ہونے والے کو ملوث نہ ہونے والے کی طرح نہیں سمجھتا۔ ملاحظہ ہو: مناقب الشافعی ۱:۵۲۰۔

یعنی امام مالک کے نزدیک حضرت علی علیہ السلام (معاذ اللہ) ایک سفاک شخص ہیں جو حضرت عثمان کے برابر نہیں ہو سکتے۔

ناقص درود

آپ نے ملاحظہ فرمایا ان احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کامل درود کی تعلیم فرمائی اور پوری وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا نیز دیگر روایات سے اس کی مزید وضاحت ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

لا تصلوا على الصلوة البتراء — مجھ پر ناقص درود نہ بھیجو۔

تو لوگوں نے پوچھا: ناقص درود کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا

تقولون: اللّٰهم صل على محمد و تمسكون. بل قولوا اللّٰهم صل على

ناقصد درود یہ ہے کہ اللّٰھم صل علی محمد کہہ کر رک جاؤ بلکہ یوں کہو: اللّٰھم صل علی محمد و علی

محمد و علی آل محمد۔[1] آل محمد۔

نواب صدیق حسن خان هداية السائل الى ادلة المسائل صفحہ ۶۳ میں اس روایت کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

اخرجه ابن سعد فی شرف المصطفی۔ بلاشبہ یہ حدیث کتاب شرف المصطفیٰ للحافظ ابی سعید عبد الملك بن ابی عثمان الخرکوشی المتوفیٰ ۴۰۶ھ جلد ۵: ۱۰۷ حدیث ۲۰۴۷ طبع مكة المکرمہ میں موجود ہے۔

۵۔ آل محمد علیہم السلام کون ہیں؟:

صحرائے عرب کی تاریکی میں جب اسلام کی روشنی پھوٹی تو نہ صرف معاشرے کا حسن و قبیح بدلا، اقدار و پیمانے بدلے بلکہ اصطلاحیں بھی بدلیں، الفاظ کے معانی و مطالب بدلے۔ چنانچہ لغت میں الصلوۃ دعا کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔ اسلام نے اس لفظ کو استعمال کیا پھر اس کے شرعی معنی کا تعین کیا کہ اب کے بعد اس لفظ سے رکوع اور سجود پر مشتمل عبادت مراد لی جائے گی۔ الصوم ہر قسم کے امساک کو کہتے تھے۔ اسلام نے اس کے معنی کا تعین فرمایا۔ اب کے بعد اس لفظ سے مراد فجر سے لے کر مغرب تک چند چیزوں سے پرہیز کرنے کا عمل لیا جائے گا۔ حج قصد کو کہتے تھے۔ اسلام آنے کے بعد اس لفظ سے بیت اللہ کا قصد مراد لیا جانے لگا۔ ان معانی کے تعین کے لیے ہم عربی زبان کی ڈکشنری کی طرف رجوع نہیں کریں گے۔

اب اسلامی انقلاب کے بعد ظاہر ہونے والی چند اہم اصطلاحات کا مطالعہ فرمائیں۔ مثلاً:

مهاجر کسے کہتے ہیں؟ اس اسلامی اصطلاح کے حدود اربعہ کے تعین کے لیے ہم لغت کے مادہ (ہ ج ر) کی طرف رجوع کر کے ڈکشنری سے اس کے معنی و مراد کا تعین نہیں کر سکیں گے۔

انصار کسے کہتے ہیں؟ اس سے مراد کون ہیں؟ اس کے تعین کے لیے ہم مادہ (ن ص ر) کی طرف رجوع نہیں کریں گے کہ لغت سے اس آیت سے مراد معلوم کر لیا جائے: وَالسّٰبِقُوۡنَ الۡاَوَّلُوۡنَ مِنَ الۡمُهٰجِرِيۡنَ وَالۡاَنۡصَارِ ....[2] مہاجر و انصار سے مراد کون ہیں؟ ایک شخص فتح مکہ کے بعد کسی علاقے سے ہجرت کر کے آیا ہے اور دوسرے شخص نے مدینہ آ کر کچھ دن اسلام کی مدد کی ہو تو لغت کے اعتبار سے ان پر مہاجر و انصار صادق آئے گا لیکن آیت کے اطلاق میں کون لوگ شامل ہوں گے؟ اس کے لیے ہمیں جدید اسلامی اصطلاح کی طرف رجوع کرنا ہوگا، نہ لغت کی طرف۔

اسی طرح اسلامی اصطلاح میں آل اور اهل البيت سے کون لوگ مراد ہیں؟ اس کے تعین کے لیے لغت کی طرف رجوع کرنا درست نہ ہوگا بلکہ اسلامی مصادر کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ آل کے تعین کے لیے تین اہم اسلامی مصادر کی طرف رجوع کرنا کافی ہے:

---

[1] الصواعق المحرقة: ۲۳۴، کشف الغمة ۱: ۲۱۹۔ [2] ۹ توبة: ۱۰۰

i۔ پہلا مصدر آیۂ تطہیر کی تفسیر میں وارد احادیث ہیں جن میں اھل البیت علیہم السلام کا تعین ہوا ہے۔ اس کی تفصیل اسی سورہ کی آیت ۳۳ آیۂ تطہیر کے ذیل میں گزر چکی ہے۔

ii۔ دوسرا مصدر حدیث ثقلین ہے۔ جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

انی تارك فیکم الثقلین ما ان تمسکتم بھما لن تضلوا بعدی احدھما اعظم من الآخر کتاب اللّٰہ حبل ممدود من السماء الی الارض و عترتی اھل بیتی لن یفترقا حتی یردا علی الحوض فانظروا کیف تخلفونی فیھما۔

یہ حدیث تیس سے زائد اصحاب رسولؐ نے روایت کی ہے۔ اس متواتر حدیث میں اھل بیتی کے ساتھ عترتی کے لفظ سے آل کی مکمل وضاحت ہو جاتی ہے۔

iii۔ تیسرا مصدر: صلوۃ بھیجنے کا طریقہ بیان کرتے ہوئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آل محمد کو آل ابراہیم کے ساتھ تشبیہ دے کر فرمایا: اے اللہ محمد و آل محمد پر صلوۃ بھیج جس طرح تو نے ابراہیم اور آل ابراھیم پر صلوۃ بھیجی ہے۔

تحقیق اس بات پر ہونی چاہیے آل ابراھیم سے مراد کون ہیں۔ جو لوگ آل محمد سے مراد ہر مومن کو لیتے ہیں وہ یہ استدلال کرتے ہیں کہ قرآن میں آل فرعون اس کے ماننے والوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ نہیں معلوم ان کو آل فرعون کیوں یاد آتے ہیں کہ آل کو سمجھنے کے لیے انبیاء علیہم السلام کی طرف رجوع کرنے کی جگہ طاغوتوں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ جب کہ ان احادیث میں آل محمد کو آل ابراہیم کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ آیئے ہم قرآن سے پوچھتے ہیں کہ کیا آل ابراھیم میں ان کی اولاد کے علاوہ کوئی اور شامل ہے یا نہیں ہے۔ سورۃ النساء آیت ۵۴ میں فرمایا:

اَمۡ یَحۡسُدُوۡنَ النَّاسَ عَلٰی مَاۤ اٰتٰىہُمُ اللّٰہُ مِنۡ فَضۡلِہٖ ۚ فَقَدۡ اٰتَیۡنَاۤ اٰلَ اِبۡرٰہِیۡمَ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ وَ اٰتَیۡنٰہُمۡ مُّلۡکًا عَظِیۡمًا ﴿۵۴﴾

کیا یہ (دوسرے) لوگوں سے اس لیے حسد کرتے ہیں کہ اللہ نے انہیں اپنے فضل سے نوازا ہے؟ (اگر ایسا ہے) تو ہم نے آل ابراہیم کو کتاب و حکمت عطا کی اور انہیں عظیم سلطنت عنایت کی۔

چنانچہ یہ بات اپنی جگہ ہر ایک کے لیے مسلم ہے کہ کتاب، حکمت اور ملک عظیم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد کو دی گئی ہے اور آل ابراھیم، اولاد ابراہیم سے خارج نہیں ہے اگرچہ بعض اولاد، آل سے خارج ہے۔ یعنی آل، سب اولاد ابراہیم سے ہے لیکن سب اولاد، آل ابراھیم نہیں ہے۔

درود کے الفاظ میں یہ کہا گیا ہے:

اے اللہ محمد و آل محمد پر رحمت نازل فرما جس طرح تو نے ابراہیم اور آل ابراہیم پر رحمت نازل فرمائی ہے۔

رسول اللہ ﷺ اگرچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے افضل ہیں اور ان پر رحمتیں بھی زیادہ نازل ہوتی ہیں تاہم حضرت ابراہیم علیہ السلام رسول اللہ ﷺ کے آباء و اجداد میں شمار ہوتے ہیں۔ آل ابراھیم کے ساتھ تشبیہ کی اہم وجہ یہ بھی ہے کہ آل ابراھیم کا تعین متنازعہ نہیں ہے۔ رسول ﷺ چاہتے تھے کہ آل محمد کا تعین متنازعہ نہ رہے۔ چونکہ رسول اللہ ﷺ کے علم میں یہ بات یقیناً تھی کہ لوگ آل محمد کی شان گھٹانے کے لیے آل کا تعین متنازعہ بنا دیں گے اور آل محمد کے حسد میں لوگ بہت آگے نکل جائیں گے:

اَمۡ یَحۡسُدُوۡنَ النَّاسَ عَلٰی مَاۤ اٰتٰىہُمُ اللّٰہُ مِنۡ فَضۡلِہٖ ۔۔۔۔[1] — وہ حسد اس لیے کرتے ہیں کہ اللہ نے ان کو اپنے فضل سے نوازا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام ابوالانبیاء ہیں۔ افضل ہونا اپنی جگہ مگر آپ ﷺ کو اس بات پر فخر تھا کہ آپؐ اولاد ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ فرماتے تھے:

انا دعوۃ ابراھیم ۔۔۔۔[2] — میں دعائے ابراہیم ہوں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام پر اللہ کی رحمت یہ رہی ہے کہ ان کے اولاد کے ذریعے رشد و ہدایت کا ایک سلسلہ جاری ہوا اور وہ ابوالانبیاء ٹھہرے۔

رسول اللہ ﷺ سے جو سلسلہ ہدایت جاری ہوا ہے وہ ان کی اولاد کے ذریعے قیامت تک جاری رہے گا۔ آپ ﷺ کا سلسلہ ہدایت چونکہ قیامت تک جاری رہنا ہے لہٰذا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسبت آپ ﷺ کا سلسلہ ہدایت ابدی ہے۔

درود کا دوسرا حصہ یہ ہے: آل محمد پر رحمت کا نزول فرما، جیسے تو نے آل ابراھیم پر رحمتوں کا نزول فرمایا ہے۔

ہمارا واضح اور کھلا موقف یہ ہے کہ جس طرح خود خاتم الانبیاء ﷺ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے افضل ہیں اسی طرح آل محمد، آل ابراھیم سے افضل ہیں۔ چنانچہ جب آل ابراھیم، آل محمد دونوں ایک جگہ جمع ہو جائیں گے تو آل محمد کے مہدی آخر الزمان عج امامت کر رہے ہوں گے اور آل ابراھیم کے عیسیٰ علیہ السلام مقتدی ہوں گے۔

۱۱۳

آل ابراھیم میں نہ ازواج ابراہیم ہیں، اگرچہ ازواج ابراہیم میں انبیاء علیہم السلام کی مائیں بھی ہیں، نہ ہر وہ آل ابراھیم ہیں جو ان پر ایمان لے آئے ہیں۔

آل محمد کی شان گھٹانے کی ایک کوشش روایات کا گھڑنا ہے۔ اس بارے ایک روایت مشہور ہے:

رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا: آل محمد کون ہیں؟ تو آپؐ نے فرمایا:

کل تقی۔ ہر پرہیزگار۔

---

[1] ۴ نساء: ۵۴ [2] بحار الانوار ۳۸: ۶۲

اس روایت کی سند کو سندِ واہ، بے حقیقت سند کہا گیا ہے۔

دوسری روایت میں آیا ہے کہ فرمایا:

آل کل مومن تقی۔ میری آل ہر وہ شخص ہے جو مومن اور پرہیزگار ہو۔

اس روایت کی سند بھی قابل اعتبار نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو هدایة السائل صفحہ ۵۴۔ القول البدیع صفحہ ۶۳۔

آل ابراہیم میں آپ کی ذریت (اولاد) شامل ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

قَالَ اِنِّیۡ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ ؕ قَالَ لَا یَنَالُ عَہۡدِی الظّٰلِمِیۡنَ ﴿﴾[1]

ارشاد ہوا: میں تمہیں لوگوں کا امام بنانے والا ہوں، انہوں نے کہا: اور میری اولاد سے بھی؟ ارشاد ہوا: میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچے گا۔

اس آیت کے تحت امامت آل ابراہیم یعنی ذریت و اولاد ابراہیم میں رہی ہے۔

ظاہر ہے آل محمد پر بھی اس قسم کی رحمتیں نازل فرمانے کی دعا ہے اور چونکہ سلسلہ نبوت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ختم ہو گیا ہے لہٰذا یہ رحمتیں ان کی آل پر امامت و رہبری کی صورت میں نازل ہوں گی اور قرآن میں آل ابراهیم کے لیے کتاب، حکمت اور ملك عظیم کی صورت میں ان رحمتوں کا ذکر ہے۔ آل محمد کے لیے بھی یہ رحمت علم، کتاب، حکمت اور ملك عظیم کی صورت میں ہو گی۔

واضح رہے ملك عظیم سے مراد اطاعت و پیروی ہے۔ ایک معتدبہ مخلوق اگر ہر زمانے میں ان کی پیروی کرے تو یہ ملك عظیم ہو گا اور اس بات کے لیے کہ آل محمد کتاب و حکمت کے وارث ہیں۔ یہ امر کافی ہے کہ علم کے سلسلے میں سب لوگ آل محمد کی طرف رجوع کرتے تھے اور آل محمد نے بعد از رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی کی طرف رجوع نہیں کیا۔

اگر کسی کو اس بات پر اصرار ہے کہ ملك عظیم سے مراد داود و سلیمان علیہما السلام کی سلطنت ہے، وہ آل محمد میں دکھائی نہیں دیتی تو انہیں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے ظہور حضرت مہدی عجل اللہ فرجہ الشریف کے بعد یہ ساری بات کھل کر سامنے آئے گی کہ سلسلہ ہدایت، علم، کتاب و حکمت اور ملك عظیم آل محمد کے ساتھ مختص ہو گا۔

اس لیے ابن حجر نے شرح همزیه میں لکھا ہے:

اهل البیت وہی ہستیاں ہیں جن پر صدقہ حرام ہے اور اهل البیت، آل اور ذوی القربی کی فضیلت میں جو کچھ بھی وارد ہوا ہے سب میں مراد یہی ہستیاں ہیں اور مشہور یہی ہے کہ اللّٰھم صل علی محمد و علی آل محمد سے مراد بھی یہی ہستیاں ہیں۔

ملاحظہ ہو علامہ نواب صدیق حسن خان هدایة السائل صفحہ ۵۵۔

---

[1] ۲ بقرہ: ۱۲۴

اسی کتاب کے صفحہ ۵۴ پر آل کے بارے میں لکھا ہے:

ایک قول یہ ہے کہ آل صرف اولاد فاطمہ اور ان کی نسل الی الابد ہے۔ اس قول کو نووی نے شرح مہذب میں ذکر کیا ہے۔ یہی شیعہ امامیہ کا موقف ہے۔

تفھیم القرآن کے مؤلف اس جگہ لکھتے ہیں:

ہر درود جو حضورؐ نے سکھایا ہے اس میں یہ بات ضرور شامل ہے کہ آپؐ پر ایسی ہی مہربانی فرمائی جائے جیسی ابراہیم اور آل ابراہیم پر فرمائی گئی ہے۔ اس مضمون کو سمجھنے میں لوگوں کو بڑی مشکل پیش آئی ہے۔ اس کی مختلف تاویلیں علماء نے کی ہیں مگر کوئی تاویل دل کو نہیں لگتی۔[1]

اس کے بعد خود ایک تاویل پیش کرتے ہیں کہ اس میں آل محمد کا ذکر ہی نہیں ہے۔ ما عشت اراك الدهر عجباً۔

آل پر درود۔ نظریاتی موقف: مسلمانوں میں تو اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ آل پر درود بھیجنا حکم رسول ﷺ ہے۔ لہٰذا اس حکم پر عمل کرنا اقلاً مسنون اور محبوب عمل ہے۔

ابن القیم کہتے ہیں:

آل النبی یصلی علیهم بلاخلاف بین الامة۔[2]	امت میں اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ آل نبی علیہ السلام پر درود بھیجا جاتا ہے۔

ابن القیم لکھتے ہیں:

جو لوگ نبی پر درود بھیجنا واجب سمجھتے ہیں، آل پر درود بھیجنے کے بارے میں دو مشہور قول ہیں۔

امام احمد کے اصحاب میں اس بات پر اختلاف ہے کہ آل پر درود بھیجنا واجب ہے یا نہیں۔ بہرحال آل پر درود بھیجنا سنت اور اللہ اور رسول ﷺ کے نزدیک محبوب عمل ہونے میں کسی مسلمان کو نظریاتی طور پر اختلاف نہیں ہے۔[3]

بیہقی و دارقطنی نے ابومسعود انصاری سے رفعاً و وقفاً روایت کی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

من صلی صلوة لم یصل فیها علی اهل بیتی لم تقبل منه۔[4]	جو کوئی درود بھیجے جس میں میرے اہل بیت پر درود نہ ہو اس کا درود قبول نہ ہو گا۔

مفتاح حصن حصین میں آیا ہے:

---

[1] تفھیم القرآن ۴: ۱۲۶ [2] و [3] جلاء الافھام [4] ھدایة السائل: ۶۳

الاقتصار علی الصلوۃ علیه صلی اللّٰہ علیه وآله وسلم لا اعلم وردفی حدیث مرفوع الا فی سنن النسائی فی آخر دعاءالقنوت قال فیه: فصلی اللّٰہ علی النبی۔ ولم یقل فیه: وآله، وفی سائر صفة الصلوۃ علیه العطف بالآل۔[1]

میں ایسی مرفوع حدیث کونہیں جانتا جس میں صرف حضورؐ پر درود کا ذکر ہو سوائے سنن نسائی کی ایک حدیث کے جو دعائے قنوت کے آخر میں ہے صلی اللّٰہ علی النبی صرف اس میں وآله نہیں ہے۔ اس کے علاوہ باقی تمام درود کی کیفیت میں آل کا لفظ موجود ہے۔

ابن حجر نے کہا ہے جس روایت میں آل کا ذکر نہیں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ راوی سے یہ لفظ رہ گیا ہے۔ ملاحظہ ہو ھدایة السائل صفحہ ۶۳۔

آل پر درود۔ عملی موقف

قابل توجہ بات یہ ہے کہ جب درود ابراہیمی پر مشتمل احادیث کا ذکر کرنے کا موقع آتا ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت اور درود ابراہیم سے مشہور ہے، بادل ناخواستہ آل کا ذکر کرنا پڑتا ہے۔

لیکن خود جب درود بھیجتے ہیں تو آل کا ذکر ان کے لیے سنگین ہوتا ہے۔اور صلی اللّٰہ علیه وسلم کہتے اور لکھتے ہیں۔

اسی سنگینی کی بنا پر شربینی اپنی کتاب مغنی المحتاج صفحہ ۳۴۲ میں لکھتے ہیں:

والصحیح ان الصلوۃ علی الآل لاتجب فی الصلوۃ لبنائها علی التخفیف۔

صحیح یہ ہے کہ آل پر درود بھیجنا نماز میں واجب نہیں ہے چونکہ نماز میں تخفیف ہوتی ہے۔

آل پر درود شعار رافضہ

وان تعجب فعجب قولھم کہ درود ابراہیمی میں آل پر درود صحاح میں ثابت اور مستحب ہونے پر امت کا اجماع ہونے کے باوجود آل پر مستقل طور پر درود بھیجنا مکروہ سمجھتے ہیں۔

چنانچہ فتح الباری نے ۱۱: ۱۴۶ میں اور زمخشری نے الکشاف ۳: ۵۵۸ میں لکھا ہے کہ آل پر مستقل طور درود بھیجنا یعنی علیه الصلوۃ ، علیه السلام کہنا درست نہیں چونکہ اس سے رافضہ کے ساتھ تشبیہ لازم آتی ہے۔

فخر الدین رازی اپنی تفسیر رازی ۱: ۲۰۶ میں لکھتے ہیں:

حضرت علی (علیہ السلام) بسم اللّٰہ بڑے اہتمام کے ساتھ بلند آواز میں پڑھتے تھے۔جب بنی امیہ کی حکومت قائم ہوئی تو بڑے اہتمام کے ساتھ بسم اللّٰہ کو بلند آواز

---

[1] نواب صدیق حسن خان ھدایة السائل الی اداۃ المسائل صفحہ ۶۳ ط ھند

سے پڑھنا ممنوع کر دیا۔

اسی طرح بردسوی نے روح البیان ۴: ۱۴۲ میں لکھا ہے:

اصل تو یہ ہے انگوٹھی سیدھے ہاتھ میں پہنی جائے۔ جب یہ کام ظالموں کا شعار ہو گیا تو بائیں ہاتھ میں پہنی چاہیے۔

یہ ساری باتیں کور، کورانہ تعصب کی بنا پر ہیں۔ اس سلسلے میں اصل بات تو وہ تھی جو صاحب روح المعانی نے کہی ہے:

لا یخفی ان کراھة التشبه باھل البدع مقررة عندنا ایضا لا مطلقا بل فی المذموم و فیما قصد به التشبه بھم۔[1]	اہل بدعت کے ساتھ شباہت کا کام کرنا ہر صورت میں نہیں بلکہ اس صورت میں درست نہیں ہے کہ عمل خود قابل مذمت ہو اور قصد بھی شباہت قائم کرنے کا ہو۔

اس جگہ ایک عبادت اس بہانے ترک کرنا چاہتے ہیں کہ اس سے اہل بدعت کے ساتھ شباہت ہوتی ہے۔ یہ نظریہ خود ایک کھلی بدعت ہے چونکہ اس میں ایک مسلمہ عبادت کو اہل بدعت کا عمل قرر دیا جا رہا ہے۔

جب کہ سنت متواترہ کے ساتھ قرآنی آیت کی بھی صراحت موجود ہے کہ بطور استقلال غیر نبی پر صلوات بھیجنا سنت الٰہیہ ہے۔ ارشاد ہے:

وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِیۡنَ ۞ الَّذِیۡنَ اِذَاۤ اَصَابَتۡہُمۡ مُّصِیۡبَۃٌ ۙ قَالُوۡۤا اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّاۤ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ ۞ اُولٰٓئِکَ عَلَیۡہِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّہِمۡ وَ رَحۡمَۃٌ ۟ وَ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُہۡتَدُوۡنَ ۞ [2]	اور آپ ان صبر کرنے والوں کو خوشخبری سنا دیجیے۔ جو مصیبت میں مبتلا ہونے کی صورت میں کہتے ہیں: ہم تو اللہ ہی کے ہیں اور ہمیں اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی طرف سے درود ہیں اور رحمت بھی اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔

ایک ہمہ گیر آزمائش کے بعد جو لوگ مقام صبر و رضا پر فائز ہوتے ہیں ان پر ان کے رب کی طرف سے درود ہے۔ یہ لوگ عَلَیۡہِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّہِمۡ کے مصداق ہیں، ائمہ اہل بیت علیہم السلام کو کئی آزمائشوں سے دوچار ہونا پڑا۔ اس بارے میں امام شافعی کی تعبیر نہایت جامع ہے۔ وہ کہتے ہیں:

تزلزلت الدنیا لآل محمد و کادت لھم صم الجبال تذوب۔	آل محمد کے مصائب سے دنیا ہل کر رہ گئی ہے۔ جنہیں دیکھ کر سخت چٹانیں بھی پگھل جائیں۔

اس لیے یہ ہستیاں عَلَیۡہِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّہِمۡ کی اولین مصداق ہیں۔ اسی لیے ہم ان کے نام کے ساتھ عَلَیۡہِمۡ صَلَوٰتٌ کہتے ہیں۔ رغما لانف المعاندین۔

---

[1] روح المعانی ۱۱: ۱۶۱ [2] ۲ بقرہ: ۱۵۵ تا ۱۵۷

سخاوی، القول البدیع صفحہ۴۳ طبع ہند میں لکھتے ہیں:

علماء نے اس بات میں اختلاف کیا ہے کہ غیر نبی کے لیے علیه السلام کہنا درست ہے یا نہیں۔ بعض نے کہا ہے یہ عمل مکروہ ہے اور بعض علیه السلام اور علیه الصلوة میں فرق کے قائل ہو گئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: السلام کہنا ہر مومن زندہ اور مردہ، حاضر اور غائب کے لیے شرعاً درست ہے اور یہ اسلامی تحیت ہے۔ چنانچہ نمازی بھی کہتا ہے: السلام علینا و علی عباد اللّٰہ الصالحین اور الصلوة نہیں کہتے۔ اس سے فرق واضح ہو گیا۔

جب آیہ خُذۡ مِنۡ اَمۡوَالِہِمۡ صَدَقَۃً تُطَہِّرُہُمۡ وَ تُزَکِّیۡہِمۡ بِہَا وَ صَلِّ عَلَیۡہِمۡ ...[1] اور ہُوَ الَّذِیۡ یُصَلِّیۡ عَلَیۡکُمۡ وَ مَلٰٓئِکَتُہٗ ...[2] و دیگر آیات سے استقلالاً غیر نبی پر صلواۃ بھیجنا مستحسن عمل ہونے پر استدلال کیا جاتا ہے تو کہتے ہیں:

ایسا کرنا اللہ اور رسولؐ کے لیے تو درست تھا مگر ہمارے لیے درست نہیں ہے۔

جب سوال پیدا ہوتا ہے جو کام خود اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے انجام دیا ہے وہ ہمارے لیے کس دلیل کی بنیاد پر درست نہیں ہے؟ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا عمل سنت نہیں ہے اور اللہ کا عمل حجت نہیں ہے؟ تو کہتے ہیں:

اب اہل اسلام کا شعار بن چکا ہے کہ وہ صلوة و سلام کو انبیاء علیہم السلام کے لیے خاص کرتے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اولاً سنت رسول کے ترک کو اہل اسلام شعار نہیں بنا سکتے۔

ثانیاً یہ اہل اسلام کا شعار نہیں ہے بلکہ یہ بنی امیہ اور نبی عباس کا اپنایا ہوا شعار ہے۔ چنانچہ ہم ذیل میں اہل اسلام کے صف اول کے اہل عمل کا عمل دکھائیں گے جو غیر انبیاء کے لیے کثرت سے علیه السلام کا لفظ استعمال کرتے تھے اور کرتے ہیں۔

ہم یہاں صحیح بخاری کے ان مقامات کا ذکر کرتے ہیں جن میں امام بخاری نے ائمہ اہل بیت کے لیے علیه السلام، علیهما السلام، علیها السلام کے الفاظ کثرت سے استعمال کیے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

۱۔ علی بن ابی طالب علیه السلام۔ کتاب الجمعة باب یقصر اذا خرج من موضعه۔

۲۔ فاطمہ و علی علیهما السلام۔ کتاب الجمعة بابتحریض النبی۔

۳۔ ان علیا علیه السلام: کتاب البیوع باب ما قیل فی الصواع۔

---

[1] ۹ توبہ: ۱۰۳　[2] ۳۳ احزاب: ۴۳

۴۔ و وهب الحسن بن على عليهما السلام۔ كتاب الهبة باب اذا وهب دينا۔
۵۔ لفاطمة عليها السلام۔ كتاب الصلح باب كيف يكتب هذا۔
۶۔ ابنتى بفاطمة سلام الله عليها۔ كتاب البيوع۔
۷۔ و كانت فاطمة عليها السلام۔ تغسل الدم كتاب الجهاد باب لبس البيضة۔
۸۔ ان فاطمة عليها السلام اشتكت من الرحى۔ باب الدليل على ان الخمس۔
اسی طرح صحیح بخاری حدیث نمبر ۳۰۱۴، ۳۵۰۲، ۳۶۴۱، ۳۷۸۱، ۳۸۱۰، ۳۸۴۷، ۳۹۹۸، ۴۰۰۵، ۴۱۷۰، ۴۱۹۳، ۴۹۵۰، ۵۰۴۶، ۵۳۹۰، ۵۹۲۴ ملاحظہ ہوں۔
اس طرح ملاحظہ ہو: صحیح بخاری کتاب فرض الخمس میں یہ عبارت:
ان حسين بن على عليهما السلام۔
کتاب المناقب باب صفة النبى میں یہ حدیث:
الحسن بن على عليهما السلام۔
کتاب المناقب باب مناقب الحسن و الحسین میں یہ عبارت:
أُتِيَ عبيد الله بن زياد براس الحسين عليه السلام۔
اور دیگر بہت سے مقامات پر یہ لفظ ملاحظہ کر سکتے ہیں:
مسند احمد بن حنبل میں ملاحظہ فرمائیں:
جاء العباس و على عليهما السلام ۱۵: ۲۳۹۔
دعا عليا عليه السلام۔ حدیث خیبر۔
و على عليه السلام يمشى بجانبه۔ مسند احمد بن حنبل ۲: ۱۱۵۔
سنن ابی داؤد میں یہ عبارت ملاحظہ ہو:
و فاطمة عليها السلام حينئذ تطلب صدقة رسول الله۔ باب صفا يا رسول الله۔
امام فخر الدین رازی اپنی تفسیر میں سورة الانسان آیت ۸ وَ يُطۡعِمُوۡنَ الطَّعَامَ .... کے ذیل میں متعدد مقامات میں لکھتے ہیں:
ان هذه الاية نزلت فى حق على عليه السلام۔
نیز اسی آیت کے ذیل میں ہے:
ان الحسن و الحسين عليهما السلام مرضا
نیز یہ عبارت ملاحظہ ہو:
اخذ على عليه السلام بيد الحسن و الحسين۔

آگے لکھتے ہیں:

ولا ینکر دخول علی علیہ السلام فیہ۔

حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی اشعۃ اللمعات شرح مشکوۃ ا: ۴۰۵ میں لکھتے ہیں:

در متقدمین تسلیم بود بر اھل بیت رسول از ذریت و ازواج مطھرات و در کتب قدیمہ از مشائخ اھل سنت و جماعت کتابت آن یافتہ میشود۔ و در متاخرین ترک آن متعارف شدہ۔

اھل البیت کے لیے علیہ السلام لکھنا ہی شعار اہل اسلام تھا۔ چنانچہ علماء خود اپنی تصانیف میں آل محمد کے ساتھ بالاستقلال علیہ السلام لکھتے ہیں۔ چنانچہ امام اہل سنت حضرت سید سعید کاظمی اپنے ایک رسالہ میں حوالہ دیتے ہیں۔ جذب القلوب صفحہ ۷۸:

در سنہ سابعہ غزوۃ خیبر بود کہ امیر المومنین علی علیہ السلام چون سپر از دست مبارك او افتاد۔

اسی جذب القلوب کے صفحہ ۹۴ پر ہے:

درِ فاطمہ زھرا سلام اللّٰہ علیھا۔

نیز اسی صفحہ پر ہے:

بعلی و فاطمہ و حسن و حسین سلام اللّٰہ علیھم خطاب میکرد۔

درود بر اصحاب: قابل توجہ یہ ہے کہ سید محمد بن اسماعیل امیر اپنی کتاب جمع التشتیت میں لکھتے ہیں:

فان قلت: الصلوۃ علی الاصحاب ھل وردت فی احادیث التعلیم فی الروایۃ کما ثبتت فی الآل؟ قلت لا اعلم ذلک۔[1]

اگر یہ سوال ہو: کیا آل کی طرح اصحاب پر درود بھیجنے کی کوئی روایت احادیث تعلیم میں وارد ہوئی ہے؟ تو جواب یہ ہوگا مجھے کسی ایسی روایت کا علم نہیں ہے۔

آل پر درود کیوں ترک کیا گیا؟

صدر اسلام میں سب کے لیے اس بات میں کوئی ابہام موجود نہ تھا کہ آل سے مراد کون ہیں۔ سب کے ذہنوں میں یہ بات تھی کہ آل رسول کن کو کہتے ہیں۔ بعد میں بنی امیہ کے دور میں آل کا ذکر متروک کرنے کی وجہ وہ عناد اور دشمنی ہے جو لفظ آل کے ساتھ روا رکھی گئی۔ یعنی جنہیں اولاد فاطمہ و علی علیہم السلام سے

---

[1] ان حکومتوں کی کوشش تھی کہ خود کو بھی آل ثابت کریں۔ ناکامی کی وجہ سے آل کے ذکر پر پابندی لگا دی۔

دشمنی تھی، انہیں لفظ آل سے بھی دشمنی تھی۔

اس جگہ ہم سید محمد بن اسماعیل امیر کی پوری عبارت لکھ دیتے ہیں جو انہوں نے جمع التثیت میں لکھی ہے۔ جسے علامہ نواب صدیق حسن خان نے اپنی کتاب ھدایۃ السائل الی ادلۃ المسائل صفحہ۶۳ طبع ہند میں نقل کیا ہے۔ وہ عبارت یہ ہے:

مجھے تعجب ہے ان لوگوں پر جو تشہد میں حضورؐ پر درود کو واجب سمجھتے ہیں اور آل پر درود کو مستحب قرار دیتے ہیں۔

پھر لکھتے ہیں:

ائمہ حدیث قدیم زمانے سے لے کر آج تک اپنی کتابوں میں جب خاتم الانبیاءؐ پر درود لکھتے ہیں تو آل کا ذکر حذف کرنا اپنا شیوہ بنا رکھا ہے جب کہ انہیں علماء نے اپنی ان صحاح کتب میں ان احادیث کو بیان کیا جن میں درود کی تعلیم ہے۔ جن کتب کا احترام ہم پر واجب ہے۔ میں نے اس بارے میں سوال اٹھایا تو مجھے جو جواب دیا گیا اس کا خلاصہ یہ ہے:

ائمہ حدیث کے بارے میں جو چیز معلوم ہے وہ یہ ہے کہ جو روایت ان کے نزدیک صحیح ہے اس پر وہ اس وقت تک عمل کرتے ہیں جب تک ان کو علم نہ ہو جائے کہ اس حکم کو کسی اور حدیث یا آیت کے ذریعہ منسوخ کیا گیا ہے لیکن ائمہ حدیث کا اس بات پر اتفاق ہے کہ آل پر درود بھیجنے کا جو حکم ثابت ہے، منسوخ نہیں ہوا۔ لہٰذا آل پر درود نہ بھیجنے میں ان کا عذر یہ ہے کہ وہ ان اہل جفا و ضلال سے بچنا چاہتے ہیں جنہوں نے آل محمد سے دشمنی کی، ان کو خوفزدہ کیا اور انہیں جلا وطن کیا جیسا کہ بنی امیہ اور بنی عباس کی حکومتوں کے دور میں پیش آیا، باوجودیکہ یہ لوگ خود کو بھی آل میں شامل سمجھتے تھے۔[1] ان کے بارے میں یہ شعری زباں حال صادق آتی ہے:

اقتلونی و مالکا و اقتلوا مالکا معی

مجھے اور مالک کو قتل کرو مالک کو میرے ساتھ قتل کرو

یعنی مالک کے قتل کی خاطر مجھے بھی قتل کرو۔ لہٰذا ان زمانوں کے ائمہ حدیث کو اپنی بڑی چھوٹی تالیفات اور مجالس روایت کی املاء ات اور علوم درایہ میں گفتگو کے وقت آل پر درود کو حذف کرنا پڑا اور تقیہ کے طور پر ایسا عمل درست ہے۔

پھر لکھتے ہیں:

---

[1] تاریخ یعقوبی ۳: ۷۸۔ شرح نہج البلاغۃ ابن حدید۴: ۴۸۰

پھر تقیہ ختم ہو گیا اور اس گمراہ فرقہ کی حکومت بھی ختم ہو گئی لیکن جس شیوہ پر بڑے بوڑھے ہو گئے اور چھوٹے بڑے ہو گئے اس پر لوگ چلتے رہے۔ نادانی کی وجہ سے اپنے قول وتحریر میں اس بات کو جاری رکھا جب کہ وہ ان احادیث پر ایمان رکھتے تھے جن میں درود کی تعلیم دی گئی ہے۔

آگے لکھتے ہیں:

میں نے اس بات کو حواشی العمدة میں تفصیل سے بیان کیا ہے اور اپنے سے پہلے کسی کو نہیں دیکھا جس نے اس موضوع پر کچھ لکھا ہو۔

میں نے سوال اٹھایا کہ ائمہ حدیث نے مذکورہ عذر کی وجہ سے آل کا ذکر نہیں کیا لیکن اگر ہم ان کتابوں میں سے کسی کتاب کی املاء کریں مثلاً صحیح بخاری کی تو کیا ہم بھی آل کا ذکر کریں یا نہ کریں۔

جواب میں فقیہانہ مباحث کے بعد لکھا ہے:

بہتر یہ ہے کہ پہلے جیسے اس کتاب میں ہے لکھا دیا جائے پھر اپنی طرف سے مکمل درود بھیج دیا جائے تاکہ املاء میں کمی بیشی نہ ہو اور ساتھ یہ بات بھی ہو جائے کہ اس نے اسی طرح درود بھیجا ہے جیسا کہ رسول اللہؐ نے درود کی تعلیم دی ہے۔

ملا محمد برخوردار اپنی کتاب شرح نبراس علی العقائد النسفية صفحہ۱۰ کے حاشیہ پر لکھتے ہیں:

بعض اہل تحقیق نے کہا ہے کہ خاتم المرسلین پر درود بھیجتے ہوئے لفظ آل کو بنی امیہ اور بنی عباس کی حکومت کے دوران محدثین نے ترک کر دیا چونکہ وہ ان پر درود بھیجنے سے منع کرتے تھے بلکہ وہ تو ان پر سَب کرتے تھے۔

مکہ میں جب عبد اللہ بن زبیر کی حکومت قائم ہوئی تو اس نے چالیس جمعوں تک جمعہ نماز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر یہ کہہ کر درود بھیجنا ممنوع قرار دیا کہ اس سے بنی ہاشم کی ناک اونچی ہو جاتی ہے۔[1]

بعض نے آل پر درود واجب نہ ہونے پر ایسی دلیل کا سہارا لیا ہے جسے تسلیم کرنا تو دور کی بات ہے اصلاً شائستہ تحریر نہیں ہے۔ کہتے ہیں:

آل پر درود واجب نہ ہونا بہتر موقف ہے چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے درود بھیجنے کا حکم از خود بیان نہیں فرمایا بلکہ لوگوں کے سوال کے جواب میں یہ حکم صادر فرمایا ہے۔[2]

اس نامعقول دلیل کی رو سے قرآن میں جو احکام لوگوں کے سوال کرنے پر صادر ہوئے ہیں ان کا

---

[1] تاریخ یعقوبی ۲: ۷۸۔ شرح نہج البلاغة ابن ابی الحدید۴: ۴۸۰
[2] المغنی لابن قدامة ۱: ۵۸۱

واجب العمل نہ ہونا لازم آتا ہے:

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ....[1] اور وہ آپ سے حیض کے بارے میں پوچھتے ہیں۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ ....[2] لوگ آپ سے ماہ حرام میں لڑائی کے بارے میں پوچھتے ہیں۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ ....[3] لوگ آپ سے شراب کے بارے میں پوچھتے ہیں۔

کیا حیض، حرمت کے مہینوں کے احکام واجب العمل نہیں ہیں کیونکہ یہ لوگوں کے سوال کے جواب میں ارشاد فرمائے ہیں؟ کیا وہ تمام احکام واجب العمل نہیں ہیں جو رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کے سوال پر بیان فرمائے؟ کیا کوئی اس بات کا قائل ہے کہ احکام صرف وہ واجب ہیں جنہیں رسول اللہؐ نے از خود بیان کیا ہو۔ فَمَا لَكُمْ ۣ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ۔

اس جگہ شیخ عبدالمحسن صوری لبنانی کے اشعار کا ذکر مناسب ہو گا۔ وہ آل محمدؑ سے خطاب کر کے کہتے ہیں:

و عجیب ان حقابکم
قام فی الناس و فیکم لم یقم
یہ بات عجیب ہے جو حقوق لوگوں کو
تمہاری وجہ سے ملے وہ خود تمہیں نہیں ملے

رکبوا بحر ضلال سلموا
فیه والاسلام فیه ما سلم
وہ گمراہی کے سمندر میں سوار ہوئے تو خود بچ گئے
مگر اسلام نہیں بچا

ثم صارت سنة جارية
کل من امکنه الظلم ظلم
اس کے بعد یہ بات لوگوں میں رائج ہوگئی
جس سے بھی ظلم ممکن ہوا اس نے ظلم کیا

چنانچہ اس ظلم میں اہل اقتدار سے اہل قلم کم نہیں ہیں۔

تشہد میں درود واجب ہے

فقہ جعفریہ کے مطابق نماز کے دونوں تشہد میں محمد و آل پر صلوات بھیجنا واجب ہے۔ فقہ جعفریہ

---

[1] ۲ بقرہ: ۲۲۲　[2] ۲ بقرہ: ۲۱۷　[3] ۲ بقرہ: ۲۱۹

کے ساتھ امام شافعی نماز کے دوسرے تشہد میں صلوۃ پڑھنا واجب قرار دیتے ہیں۔
نووی شافعی اپنی کتاب المجموع ۳: ۴۶۷ میں لکھتے ہیں:
ہمارے مذہب میں یہ ہے کہ صلواۃ پڑھنا تشہد میں واجب ہے۔ ہمارے علماء نے یہ بات حضرت عمر بن خطاب اوران کے بیٹے سے نقل کی ہے اور اس بات کو الشیخ ابو حامد نے ابن مسعود اور ابو مسعود بدری سے نقل کیا ہے اور بیہقی وغیرہ نے شعبی سے روایت کیا ہے۔ یہی بات امام احمد سے دو روایات میں سے ایک ہے۔ امام مالك اور امام ابو حنیفه کے نزدیک صلوات پڑھنا مستحب ہے، واجب نہیں ہے.... اسحاق نے کہا ہے کہ اگر صلوات کو جان بوجھ کر ترک کر دیا نماز صحیح نہیں ہے اور اگر بھول جانے کی وجہ سے ترک ہو گئی تو امید ہے نماز کافی ہو۔ ہمارے شافعی علماء نے وجوب پر آیۂ صَلُّوْا عَلَیْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا سے استدلال کیا ہے۔ شافعی نے کہا: اللہ نے اس آیت میں صلوات کو واجب کر دیا ہے اور حالات میں بہتر حالت نماز کی ہے۔ ہمارے علماء کا موقف یہ ہے کہ اس آیت سے صلوۃ کا واجب ہونا ثابت ہو جاتا ہے۔
علامه دمیاطی اپنی کتاب اعانة الطالبین ا: ۲۰۰ میں لکھتے ہیں:
بعض کا یہ موقف ہے آل پر درود بھیجنا تشہد میں واجب ہے اور یہی امام شافعی کا قدیم قول ہے، اس بات پر اس حدیث سے استدلال کیا ہے قولوا اللّٰھم صلی علی محمد و آل محمد اور یہ امر وجوب پر دلالت کرتا ہے۔
امام شافعی کے یہ اشعار بھی معروف ہیں:

یا اهل بیت رسول الله حبکم فرض من الله فی القرآن انزله
کفاکم من عظیم القدر انکم من لم یصل علیکم لا صلوة له

اے اہل بیت رسول! تمہاری محبت اللہ کی طرف سے فرض ہے جسے قرآن میں نازل کیا ہے۔
تمہاری منزلت کی عظمت کے لیے اتنا کافی ہے کہ جس نے تم پر درود نہ بھیجا اس کی نماز نہیں ہوتی ہے۔
شوکانی نیل الاوطار ۲: ۳۲۴ میں لکھتے ہیں:
نماز میں رسول اللہؐ پر درود بھیجنا واجب ہے لیکن آل پر بھی نماز میں درود بھیجنا واجب ہے یا نہیں، اس میں اختلاف ہے۔ چنانچہ هادی، قاسم ، مؤید باللّٰه، احمد بن حنبل بعض شافعی علماء واجب ہونے کے قائل ہیں۔ ان حضرات نے اس حدیث سے وجوب پر استدلال کیا ہے جس میں آل کے ساتھ درود بھیجنے کا حکم ہے۔

تفہیم القرآن میں لکھا ہے:

تشہد میں درود پڑھنا واجب ہونے کے قائل اصحاب میں سے ابن مسعود، ابو سعود انصاری، ابن عمر اور جابر بن عبد اللہ، تابعین میں سے شعبی، امام محمد باقر، محمد بن کعب قرظی اور مقاتل بن حیان اور فقہاء میں سے اسحاق بن راھویہ کا بھی یہی مسلک تھا اور آخر میں امام احمد بن حنبل نے بھی اسی کو اختیار کر لیا تھا۔

الجامع لاحکام القرآن ۱۴: ۲۳۷ میں آیا ہے:

مالک اور سفیان سے منقول ہے کہ آخری تشہد میں درود پڑھنا مستحب ہے لیکن اس کا ترک کرنے والا گنہگار ہے اور اسحاق اس بات کے قائل ہیں کہ اگر جان بوجھ کر درود کو ترک کرے تو نماز دوبارہ پڑھے، بھولنے کی صورت میں نہیں۔

قرطبی کہتے ہیں:

ہمارے علماء میں سے محمد بن المواز وجوب کے قائل ہیں اور ابن العربی حدیث کے صحیح ہونے کی وجہ سے وجوب کے قائل ہیں۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ یُؤۡذُوۡنَ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ لَعَنَہُمُ اللّٰہُ فِی الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَۃِ وَ اَعَدَّ لَہُمۡ عَذَابًا مُّہِیۡنًا ﴿۵۷﴾

۵۷۔ جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کو اذیت دیتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں اللہ نے لعنت کی ہے اور اس نے ان کے لیے ذلت آمیز عذاب تیار کر رکھا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ یُؤۡذُوۡنَ اللّٰہَ: اللہ کو اذیت دینے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی طرف ایسی چیزوں کی نسبت دینا جو شان الٰہی میں گستاخی ہے جیسے اللہ کے لیے فرزند کا قائل ہونا۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ کو اذیت نہیں ہوتی تاہم شان الٰہی کے منافی ہونے کی وجہ سے اسے اذیت سے تعبیر فرمایا ہے۔

بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ اللہ کی شان اس بات سے اعلیٰ و ارفع ہے کہ کوئی اسے اذیت پہنچا سکے۔ یہاں اللہ کو اذیت کا ذکر اپنے رسول ﷺ کی عظمت بیان کرنے کے لیے ہوا ہے کہ رسول ﷺ کی اذیت اللہ کی اذیت ہے۔

۲۔ وَ رَسُوۡلَہٗ: رسول ﷺ کی اذیت کے بارے میں تفصیل سورۂ توبہ آیت ۶۱ میں ملاحظہ

فرمائیں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی اذیت کے بارے میں وضاحت فرمائی ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے روایت ہے:

انّما فاطمة بضعة منّی یوذینی ما آذاھا۔[1]
فاطمہ میرا ٹکڑا ہے جو فاطمہ کو اذیت دے اس نے مجھے اذیت دی ہے۔

۳۔ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ: لعنت رحمت خدا سے دور ہونے کے معنوں میں ہے۔ دنیا میں حق کا راستہ نہ پانا لعنت ہے۔ جیسے فرمایا:

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فَاَصَمَّهُمْ وَاَعْمٰٓى اَبْصَارَهُمْ ۝[2]
یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے لہٰذا انہیں بہرا کر دیا اور ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا ہے۔

اور آخرت میں لعنت کا مطلب عذاب میں مبتلا ہو جانا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ۝۵۸

۵۸۔ اور جو لوگ مومن مردوں اور مومنہ عورتوں کو ناکردہ (گناہ) پر اذیت دیتے ہیں پس انہوں نے بہتان اور صریح گناہ کا بوجھ اٹھایا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ: مومن کو اذیت دینا خواہ زبان سے ہو یا عمل سے گناہ کبیرہ ہے۔

۲۔ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا: ناکردہ گناہ کی نسبت دے کر اذیت دینا۔ بہتان تراشی کرنا ایسے گناہ ہے جس کے گناہ ہونے میں کسی قسم کا ابہام نہیں بلکہ مُبین واضح اور صریح گناہ ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بڑے اہتمام سے مؤمن کی حرمت بیان فرمائی ہے کہ مؤمن کا وقار مجروح کرنا اور اس پر ناکردہ گناہ کا جھوٹا الزام لگانا کتنا بڑا جرم ہے۔ اس میں ایک جھوٹ، دوسرا افتراء اور بہتان ہے جن کا مرتکب حرمت مؤمن کو مجروح کرنے کا عند اللہ مجرم ہے۔

تقریباً ہر معاشرے میں ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو نیک لوگوں پر بہتان لگانے میں تامل نہیں کرتے اور اس کو گناہ نہیں سمجھتے۔

رسول اللہ ﷺ سے ایک حدیث منقول ہے:

مَنْ بَهَتَ مُؤْمِناً اَوْ مُؤْمِنَةً اَوْ قَالَ فِيهِ مَا لَيْسَ فِيهِ اَقَامَهُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ
اگر کوئی مومن یا مومنہ پر بہتان باندھے یا کوئی ایسی بات کرے جو اس میں نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن

[1] صحیح مسلم۔ بحار ۲۹: ۳۳۶
[2] ۴۷ محمد: ۲۳

عَلَى تِلٍّ مِنْ نَارٍ حَتَّى يَخْرُجَ مِمَّا قَالَ فِيهِ۔ [1]
اسے آتش کے ایک ٹیلے پر اس گناہ سے نکلنے تک کھڑا رکھے گا۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے:

لِلّٰهِ عَزَّ وَ جَلَّ فِي بِلَادِهِ خَمْسُ حُرَمٍ حُرْمَةُ رَسُولِ اللّٰهِ ص وَ حُرْمَةُ آلِ رَسُولِ اللّٰهِ ص وَ حُرْمَةُ كِتَابِ اللّٰهِ عَزَّ وَ جَلَّ وَ حُرْمَةُ كَعْبَةِ اللّٰهِ وَ حُرْمَةُ الْمُؤْمِنِ۔ [2]
اللہ عَزَّ وَ جَلّ کی مملکت میں پانچ حرمتیں ہیں: رسول اللہؐ کی حرمت، آل رسولؐ کی حرمت کتاب اللہ عَزَّ وَ جَلّ کی حرمت، کعبہ کی حرمت اور مومن کی حرمت۔

اہم نکات

۱۔ مؤمن کی حرمت اللہ تعالیٰ کے نزدیک اہمیت رکھتی ہے۔

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلۡ لِّاَزۡوَاجِکَ وَ بَنٰتِکَ وَ نِسَآءِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ یُدۡنِیۡنَ عَلَیۡهِنَّ مِنۡ جَلَابِیۡبِهِنَّ ؕ ذٰلِکَ اَدۡنٰۤی اَنۡ یُّعۡرَفۡنَ فَلَا یُؤۡذَیۡنَ ؕ وَ کَانَ اللّٰهُ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا ﴿۵۹﴾

۵۹۔ اے نبی! اپنی ازواج اور اپنی بیٹیوں اور مومنین کی عورتوں سے کہدیجیے: وہ اپنی چادریں تھوڑی نیچی کر لیا کریں، یہ امر ان کی شناخت کے لیے (احتیاط کے) قریب تر ہو گا پھر کوئی انہیں اذیت نہ دے گا اور اللہ بڑا معاف کرنے والا، مہربان ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ قُلۡ لِّاَزۡوَاجِکَ وَ بَنٰتِکَ: اس جگہ بنات (بیٹیاں) سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ایک سے زیادہ بیٹیاں تھیں چونکہ اولاد فاطمہ سلام اللہ علیہا میں سے بیٹوں کو ابناء رسول اور بیٹیوں کو بنات رسول کہتے ہیں۔ چنانچہ آیہ مباہلہ میں حسنین علیہما السلام کو ابنائنا کہا گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپؐ نے حضرت حسن علیہ السلام سے فرمایا:

ان ابنی هذا سید۔ [3] میرا یہ بیٹا سردار ہیں

نیز یہ فرمان بھی ثابت ہے کہ آپؐ نے امام حسن، امام حسین علیہما السلام سے فرمایا:

ابنای هذان امامان قاما او قعدا۔ [4] میرے یہ دونوں بیٹے امام ہیں خواہ قیام کریں یا نہ کریں۔

۲۔ یُدۡنِیۡنَ عَلَیۡهِنَّ مِنۡ جَلَابِیۡبِهِنَّ: جلباب اس بڑی چادر کو کہتے ہیں جس سے سارا بدن چھپ

---

[1] الوسائل الشیعۃ ۱۲: ۲۸۷ [2] الکافی ۸: ۱۰۷ [3] بحار ۱۶: ۳۰۶ [4] بحار ۱۱: ۳۰۶

جاتا ہے۔

یُدۡنِیۡنَ: اس لفظ کے بعد الیٰ آ جائے تو قریب کے معنی بنتے ہیں اور اگر اس کے بعد علیٰ آ جائے ارخاء لٹکانے کے معنی بنتے ہیں۔ جیسے اس آیت میں ہے: وَدَانِیَۃً عَلَیۡہِمۡ ظِلٰلُہَا ...[1] لہٰذا آیت کا مفہوم یہ بنتا ہے چادر کا ایک حصہ لٹکا دیا کرو۔ مِنۡ جَلَابِیۡبِہِنَّ میں من تبعیض کے لیے ہے۔ یہاں سے ہم چادر کا ایک حصہ سمجھ لیتے ہیں۔

سورہ نور میں فرمایا:

وَلۡیَضۡرِبۡنَ بِخُمُرِہِنَّ عَلٰی جُیُوۡبِہِنَّ ...[2] اور اپنے گریبانوں پر اپنی اوڑھنیاں ڈالے رکھیں۔

ان دونوں آیات سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ نہ گریباں کھلے رکھیں، نہ سر کے بال کھلے رکھیں بلکہ چادروں کو نیچے رکھیں کہ کنیزوں کی طرح مبتذل نہ ہوں بلکہ باوقار نظر آئیں۔

چادر نیچی کرنے کے حکم کا مطلب کیا چہرہ چھپانا ہے؟ یا سر، گردن اور سینہ چھپانا ہے؟ اس میں اختلاف ہے۔

۳۔ ذٰلِکَ اَدۡنٰۤی اَنۡ یُّعۡرَفۡنَ: بہرحال اس حجاب سے جو نتیجہ مطلوب ہے وہ یہ ہے کہ اس حجاب سے ان خواتین کی شناخت ہو جائے جو وقار و شرافت اور عفت و پاکیزگی کی مالک ہیں اور مدینے کے اوباش ان کے بارے میں جسارت نہ کریں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پردے سے عورت کے وقار میں اضافہ ہوتا ہے اور ان کی طرف بری نگاہیں نہیں اٹھتیں۔ حجاب عفت کی پہچان اور عورت کا وقار ہے۔

اہم نکات

۱۔ تبلیغ احکام کی ابتدا قریبی رشتہ داروں سے ہونی چاہیے: قُلۡ لِّاَزۡوَاجِکَ وَبَنٰتِکَ ....

۲۔ خواتین کے وقار کی پہچان حجاب ہے۔

۳۔ لباس کی نوعیت خاتون کی شخصیت کا آئینہ ہے۔

۴۔ بری نگاہوں کو جذب کرنے میں لباس کو بڑا دخل ہے۔

لَئِنۡ لَّمۡ یَنۡتَہِ الۡمُنٰفِقُوۡنَ وَالَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ مَّرَضٌ وَّالۡمُرۡجِفُوۡنَ فِی الۡمَدِیۡنَۃِ لَنُغۡرِیَنَّکَ بِہِمۡ ثُمَّ

۶۰۔ اگر منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری ہے اور جو مدینہ میں افواہیں پھیلاتے ہیں اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے تو ہم آپ کو ان کے خلاف اٹھائیں گے پھر وہ اس شہر میں آپ کے

---

[1] ۷۶ الانسان: ۱۴ [2] ۲۴ نور: ۳۱

لَا یُجَاوِرُوۡنَکَ فِیۡہَاۤ اِلَّا قَلِیۡلًا ﴿۶۰﴾ مَّلۡعُوۡنِیۡنَ ۚۛ اَیۡنَمَا ثُقِفُوۡۤا اُخِذُوۡا وَ قُتِّلُوۡا تَقۡتِیۡلًا ﴿۶۱﴾

جوار میں تھوڑے دن ہی رہ پائیں گے۔

۶۱۔ یہ لعنت کے سزاوار ہوں گے، وہ جہاں پائے جائیں گے پکڑے جائیں گے اور بری طرح سے مارے جائیں گے۔

تشریح کلمات

الۡمُرۡجِفُوۡنَ: (ر ج ف) الارجاف: جھوٹی افواہ یا اضطراب پھیلانے کے معنوں میں ہے۔
لَنُغۡرِیَنَّکَ: (غ ر و) الاغراء اکسانا کے معنی میں ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ لَئِنۡ لَّمۡ یَنۡتَہِ الۡمُنٰفِقُوۡنَ: اگر منافقین، مریض دل والے اور افواہیں پھیلانے والے یہ تین گروہ اپنی اسلام دشمن حرکتوں سے باز نہ آئے تو ان کو ملک بدر کیا جائے گا۔

الف: ان تین گروہوں میں سے پہلا گروہ منافقین کا ہے۔ ان کے نفاق کا لازمی نتیجہ اسلام اور مسلمان کے خلاف سوچنا اور ان کے خلاف ہر ممکن قدم اُٹھانا ہے۔

ب: دوسرا گروہ بیمار دل والے مسلمان ہیں۔ یہ لوگ اگرچہ اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے ہیں تاہم ان کے منفی رجحانات اسلام اور مسلمانوں کے لیے اسی طرح مضرت رساں ہیں جس طرح منافقوں کی حرکتیں۔ بیمار دل والے قرآنی اصطلاح میں ہمیشہ ایسے لوگوں کو کہا جاتا ہے جن میں ایمان نہایت کمزور ہوتا ہے اور وہ کمزور ایمان بھی مفادات سے وابستہ ہوتا ہے۔ جب بھی امتحان کا مرحلہ آیا ان کے ایمان کے قدم اکھڑ جاتے ہیں:

اِذۡ یَقُوۡلُ الۡمُنٰفِقُوۡنَ وَ الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ مَّرَضٌ غَرَّ ہٰۤؤُلَآءِ دِیۡنُہُمۡ ...[1] جب (ادھر) منافقین اور جن کے دلوں میں بیماری تھی کہ رہے تھے: انہیں تو ان کے دین نے دھوکہ دے رکھا ہے.

یہاں بھی اس بات میں منافقین اور بیمار دل دونوں کا موقف ایک تھا کہ ان مسلمانوں کو ان کے دین نے دھوکہ دے رکھا ہے۔

ج: وَّ الۡمُرۡجِفُوۡنَ فِی الۡمَدِیۡنَۃِ: جھوٹی افواہوں کے ذریعہ مسلمانوں میں بے چینی پھیلانے والے لوگ غیر مسلم یہودی ہو سکتے ہیں جو افواہ پھیلاتے تھے کہ مدینے پر حملہ ہونے والا ہے وغیرہ۔

۲۔ لَنُغۡرِیَنَّکَ بِہِمۡ: اگر یہ لوگ باز نہ آئیں تو آپ کو ان کے خلاف اٹھائیں گے۔ یعنی آپ ﷺ

----

[1] ۸ انفال: ۴۹

کو ان کے خلاف ایسا قدم اٹھانے کا حکم دیں گے جس کے بعد،

۳۔ لَا یُجَاوِرُوۡنَکَ فِیۡہَاۤ اِلَّا قَلِیۡلًا: وہ آپ کے شہر میں نہیں رہ سکیں گے۔ اِلَّا قَلِیۡلًا کچھ دن، جتنی مدت تخلیہ ٔ مکان کے لیے درکار ہوتی ہے۔ اِلَّا قَلِیۡلًا سے مراد اِلَّا ''چند لوگوں کے'' بھی ہو سکتی ہے۔

۴۔ مَّلۡعُوۡنِیۡنَ: یہ چند جو شہر میں ٹھہریں گے اس حال میں ہوں گے کہ مستحق لعنت ہوں گے اور رحمت خدا سے دور یعنی راہ حق کی ہدایت سے محروم ہوں گے۔

۵۔ وَ قُتِّلُوۡا تَقۡتِیۡلًا: اور اپنی زندگی سے بھی محروم ہونا پڑے گا۔

اہم نکات

۱۔ ضعیف الایمان، بیمار دل ہمیشہ منافقوں کے ساتھ ہوتے ہیں۔

۲۔ معاشرے کے سکون کے غارت گروں کو ملک بدر کرنا چاہیے: لَا یُجَاوِرُوۡنَکَ....

سُنَّۃَ اللّٰہِ فِی الَّذِیۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلُ ۚ وَ لَنۡ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبۡدِیۡلًا ﴿۶۲﴾

۶۲۔ جو پہلے گزر چکے ہیں ان کے لیے بھی اللہ کا یہی دستور رہا ہے اور اللہ کے دستور میں آپ کوئی تبدیلی نہیں پائیں گے۔

تفسیر آیات

۱۔ معاشرے میں اس قسم کے فساد پھیلانے والوں کے ساتھ جو سلوک ہو گا وہ ہمیشہ ایک ہی قسم کا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی سنت تکوینی میں یہی ہے کہ معاشرے میں فساد پھیلانے والے زیادہ دیر نہیں چل سکتے:

فَاَمَّا الزَّبَدُ فَیَذۡہَبُ جُفَآءً ۚ وَ اَمَّا مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ فَیَمۡکُثُ فِی الۡاَرۡضِ... [1] پھر جو جھاگ ہے وہ تو ناکارہ ہو کر ناپید ہو جاتا ہے اور جو چیز لوگوں کے فائدے کی ہے وہ زمین میں ٹھہر جاتی ہے.

۲۔ وَ لَنۡ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبۡدِیۡلًا: اللہ تعالیٰ کی تکوینی سنت میں تبدیلی ناممکن ہے۔

اہم نکات

۱۔ مفسدوں کی وقتی اچھل کود سے مسلمانوں کو پریشان نہیں ہونا چاہیے۔

یَسۡـَٔلُکَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَۃِ ؕ قُلۡ اِنَّمَا عِلۡمُہَا عِنۡدَ اللّٰہِ ؕ وَ مَا یُدۡرِیۡکَ لَعَلَّ السَّاعَۃَ تَکُوۡنُ قَرِیۡبًا ﴿۶۳﴾

۶۳۔ لوگ آپ سے قیامت کے بارے میں پوچھتے ہیں، کہد یجیے: اس کا علم صرف اللہ کے پاس ہے اور تجھے کیا خبر شاید قیامت قریب ہو؟

---

[1] ۱۳ رعد: ۱۷

تفسیر آیات

قیامت کا علم صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اور آیت کا یہ حصہ وَمَا یُدۡرِیۡکَ آپ کو کیا علم شاید قیامت قریب ہو۔ مزید اس بات کی وضاحت کے لیے ہے کہ اس کا علم کسی بھی غیر اللہ کے پاس نہیں ہے:

اِنَّ السَّاعَۃَ اٰتِیَۃٌ اَکَادُ اُخۡفِیۡہَا ....[1] قیامت یقیناً آنے والی ہے، میں اسے پوشیدہ رکھوں گا۔

مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ الاعراف آیت ۱۸۷۔

اِنَّ اللّٰہَ لَعَنَ الۡکٰفِرِیۡنَ وَ اَعَدَّ لَہُمۡ سَعِیۡرًا ﴿۶۴﴾ — ۶۴۔ بلاشبہ اللہ نے کافروں پر لعنت کی ہے اور ان کے لیے بھڑکتی آگ تیار کر رکھی ہے،

خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَاۤ اَبَدًا ۚ لَا یَجِدُوۡنَ وَلِیًّا وَّ لَا نَصِیۡرًا ﴿۶۵﴾ — ۶۵۔ جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے، وہ نہ کوئی حامی پائیں گے اور نہ مددگار۔

تفسیر آیات

۱۔ الۡکٰفِرِیۡنَ: وہ لوگ جو قیامت کے منکر ہیں، وہ رحمت خدا سے دور ہیں۔ یعنی ملعون ہیں۔

۲۔ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَاۤ: وہ جہنم میں ہمیشہ رہیں گے جہاں نہ کوئی ایسا ولی میسر آئے گا جو ان کے امور کی ذمہ داری اُٹھائے۔ جیسے باپ ہے جو اپنے چھوٹے اور بے بس بچوں کی دیکھ بال کرتا ہے۔ نہ کوئی مددگار ملے گا جو بھائی کی طرح اس کی فریاد کو پہنچے۔

یَوۡمَ تُقَلَّبُ وُجُوۡہُہُمۡ فِی النَّارِ یَقُوۡلُوۡنَ یٰلَیۡتَنَاۤ اَطَعۡنَا اللّٰہَ وَ اَطَعۡنَا الرَّسُوۡلَا ﴿۶۶﴾ — ۶۶۔ اس دن ان کے چہرے آگ میں الٹائے پلٹائے جائیں گے، وہ کہیں گے: اے کاش! ہم نے اللہ کی اطاعت اور اس کے رسول کی اطاعت کی ہوتی۔

وَ قَالُوۡا رَبَّنَاۤ اِنَّاۤ اَطَعۡنَا سَادَتَنَا وَ کُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوۡنَا السَّبِیۡلَا ﴿۶۷﴾ — ۶۷۔ اور وہ کہیں گے: ہمارے پروردگار! ہم نے اپنے سرداروں اور بڑوں کی اطاعت کی تھی پس انہوں نے ہمیں گمراہ کر دیا۔

رَبَّنَاۤ اٰتِہِمۡ ضِعۡفَیۡنِ مِنَ الۡعَذَابِ وَ الۡعَنۡہُمۡ لَعۡنًا کَبِیۡرًا ﴿۶۸﴾ — ۶۸۔ ہمارے پروردگار! تو انہیں دگنا عذاب دے اور ان پر بڑی لعنت بھیج۔

---

[1] ۲۰ طہ: ۱۵

تفسیر آیات

۱۔ جب قیامت کے دن ان کے چہرے آتش جہنم میں دائیں بائیں طرف الٹائے پلٹائے جائیں گے تو اس وقت انہیں اپنی دنیاوی زندگی یاد آئے گی اور حسرت سے کہیں گے: کاش! اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کرتے۔ یہ دن دیکھنے کو نہ ملتا۔

۲۔ وَ قَالُوۡا رَبَّنَاۤ اِنَّاۤ اَطَعۡنَا سَادَتَنَا: دنیا میں طفیلی سوچ رکھنے والے ہمیشہ ذہنی طور پر غلام ہوتے ہیں۔ وہ اپنے دماغ سے نہیں، اپنے سرداروں کے استحصالی دماغ سے سوچتے ہیں۔ انہیں استحصال کا حق دیتے ہیں۔ یہ اطاعت طبقاتی بنیادوں پر ہوتی ہے۔ چونکہ سردار صاحب مال و ثروت ہیں، حکومت و اقتدار میں اونچے درجے کے لوگ ہیں، لہٰذا ان کی بات درست، ان کا موقف صحیح ہوتا ہے۔

۳۔ فَاَضَلُّوۡنَا السَّبِیۡلَا: سرداروں نے ہمیں گمراہ کر دیا۔ سرداروں نے تو گمراہ ہی کرنا تھا چونکہ ان کی اطاعت کی بنیاد گمراہی پر تھی۔ بنیاد مال و ثروت کرسی و اقتدار تھی تو اس بنیاد کے پاس سوائے گمراہی کے اور کیا ہو سکتا ہے۔

۴۔ رَبَّنَاۤ اٰتِہِمۡ ضِعۡفَیۡنِ مِنَ الۡعَذَابِ: ایک عذاب اپنی گمراہی کا اور ایک عذاب دوسروں کو گمراہ کرنے کا۔

۵۔ وَ الۡعَنۡہُمۡ لَعۡنًا کَبِیۡرًا: ان پر بڑی لعنت کی درخواست کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ ان کو تیری رحمت سے اس قدر دور کر دیا جائے کہ ان تک تیری رحمت کا شائبہ تک نہ پہنچ سکے۔

اہم نکات

۱۔ طفیلی سوچ رکھنے والے استحصال کا شکار ہوتے ہیں۔

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَکُوۡنُوۡا کَالَّذِیۡنَ اٰذَوۡا مُوۡسٰی فَبَرَّاَہُ اللّٰہُ مِمَّا قَالُوۡا ؕ وَ کَانَ عِنۡدَ اللّٰہِ وَجِیۡہًا ﴿۶۹﴾

۶۹۔ اے ایمان والو! ان لوگوں کی طرح نہ ہونا جنہوں نے موسیٰ کو اذیت دی تھی پھر اللہ نے ان کے الزام سے انہیں بری ثابت کیا اور وہ اللہ کے نزدیک آبرو والے تھے۔

تفسیر آیات

۱۔ رسول اللہ ﷺ کو اذیت دینے والوں کو ایمان والے کہنے سے یہ بات واضح ہو گئی کہ کبھی یہ خطاب مسلمانوں کے لیے مجموعی حیثیت میں ہوتا ہے۔ اس میں منافقین اور ضعیف الایمان لوگ شامل ہیں۔

البتہ صرف منافقین کے لیے یہ خطاب نہیں ہوتا۔ اگر ان میں کمزور ایمان والے شامل ہوں تو اس خطاب سے انہیں متوجہ کرنا مقصود ہے کہ اپنے ایمان کے تقاضے پورے کرو۔

۲۔ لحن کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے رسول اللہ ﷺ پر تہمتیں لگانا شروع کر دی تھیں۔ چنانچہ حضرت زینب کے ساتھ شادی کے بارے میں اور مال کی تقسیم میں منافقین نے تہمت لگائی اور کچھ ضعیف الایمان لوگ منافقوں کے ہمنوا بن گئے تھے۔

۳۔ فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوۡا: حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ نے اس تہمت سے بری کر دکھایا جو یہودیوں نے ان پر لگائی تھی۔ اس سے بھی معلوم ہوا یہودیوں نے ایسی نازیبا تہمتیں لگائی تھیں کہ جن سے اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کو بری دکھایا۔ چنانچہ بائیبل میں ان تہمتوں کا ذکر ملتا ہے۔

۴۔ وَكَانَ عِنۡدَ اللّٰهِ وَجِيۡهًا: چنانچہ اللہ تعالیٰ نے خود ان کی آبرومندی کا تحفظ فرمایا اور ایسا سامان فراہم فرمایا جن سے ان کی حرمت بحال ہو گئی۔

اہم نکات

۱۔ بدزبانوں سے نہ کوئی معاشرہ خالی ہے، نہ کوئی شخصیت محفوظ۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوۡلُوۡا قَوۡلًا سَدِيۡدًا ۝

۷۰۔ اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سیدھی (مبنی برحق) باتیں کیا کرو۔

تفسیر آیات

۱۔ اتَّقُوا اللّٰهَ: تقویٰ اختیار کرو۔ ان باتوں سے اپنے آپ کو بچاؤ جن سے حدود اللہ سے تجاوز لازم آتا ہے اور سزا کا مستحق ہو جاتا ہے۔ اتَّقُوا اللّٰهَ کا عام ترجمہ یہی اللہ سے ڈرو ہے۔ تقویٰ کا معنی ڈر نہیں ہے بلکہ تقویٰ کا لازمہ ڈر ہے۔ تقویٰ، وقایہ سے بچانے کو کہتے ہیں۔ پس جو شخص اپنے آپ کو خطرات سے بچانے کی حالت میں ہوتا ہے تو وہ خطرات سے ڈرتا ہے۔ لہٰذا اتَّقُوا اللّٰهَ کا اصل ترجمہ یہ ہے: اللہ (کے عدل) سے بچو یا اللہ (کے عذاب) سے بچو۔

۲۔ وَقُوۡلُوۡا قَوۡلًا سَدِيۡدًا: اور سیدھی باتیں کیا کرو۔ اس جملے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ تقویٰ کا قول اور زبان کے ساتھ اہم تعلق ہے۔ چونکہ جھوٹ بولنے، جھوٹی گواہی دینے سے بہت سے حقوق ضائع ہو جاتے ہیں۔ غیبت، تہمت اور بدکلامی سے مؤمن کا وقار مجروح ہوتا ہے اور زبان کا زخم مندمل نہیں ہوتا۔

حدیث نبوی ہے:

اَذَلُّ النَّاسِ مَنْ اَهَانَ النَّاسَ۔[1]　　لوگوں میں سب سے زیادہ ذلیل وہ ہے جو لوگوں کی اہانت کرتا ہے۔

حضرت ابی عبد اللہ علیہ السلام سے روایت ہے کہ جبرائیل حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئے اور کہا:

یَا مُحمَّدِ ! اِنَّ رَبَّكَ یَقُولُ مَنْ اَهَانَ عَبْدِیَ الْمُؤْمِنَ فَقَدِ اسْتَقْبَلَنِی بِالْمُحَارَبَةِ۔[2]　　اے محمد! آپ کا پروردگار فرماتا ہے: جو میرے مومن بندے کی اہانت کرتا ہے وہ مجھ سے جنگ کے لیے میرے سامنے کھڑا ہوا ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

مَا مِن یَوْمٍ اِلَّا وَ كُلُّ عُضْوٍ مِنْ اَعْضَاءِ الْجَسَدِ یُكَفِّرُ اللِّسَانَ یَقُولُ نَشَدْتُكَ اللّٰهَ اَنْ نُعَذَّبَ فِیكَ۔[3]　　کوئی دن ایسا نہیں کہ جسم کے دوسرے اعضاء زبان کا کفارہ ادا کرنے پر مجبور نہ ہوں۔ وہ زبان سے کہتے ہیں: ہم اللہ کا واسطہ دیتے ہیں کہ ہمیں عذاب میں نہ ڈالو۔

اہم نکات

۱۔ زبان کو لگام دینا تقویٰ کا اہم ترین ستون ہے۔

یُّصۡلِحۡ لَکُمۡ اَعۡمَالَکُمۡ وَ یَغۡفِرۡ لَکُمۡ ذُنُوۡبَکُمۡ ؕ وَ مَنۡ یُّطِعِ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ فَقَدۡ فَازَ فَوۡزًا عَظِیۡمًا ﴿۷۱﴾

۷۱۔ اللہ تمہارے اعمال کی اصلاح فرمائے گا اور تمہارے گناہ معاف فرمائے گا اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی پس اس نے عظیم کامیابی حاصل کی۔

تفسیر آیات

۱۔ یُّصۡلِحۡ لَکُمۡ اَعۡمَالَکُمۡ: قول سدید اور گفتار کی سلامتی کا نتیجہ اعمال کی اصلاح ہے بہت سے اعمال کی اصلاح گفتار کی سلامتی پر موقوف ہے۔ جب زبان گرفت میں رہے تو بہتان، جھوٹ، بہت سے فحشاء ومنکرات سے انسان محفوظ رہ سکتا ہے۔

۲۔ وَ یَغۡفِرۡ لَکُمۡ ذُنُوۡبَکُمۡ: جب زبان کے کبیرہ گناہوں سے انسان اجتناب کرتا ہے تو دوسرے گناہوں کو اللہ معاف فرماتا ہے:

اِنۡ تَجۡتَنِبُوۡا کَبَآئِرَ مَا تُنۡہَوۡنَ عَنۡہُ نُکَفِّرۡ　　اگر تم ان بڑے بڑے گناہوں سے اجتناب کرو جن سے تمہیں منع کیا گیا ہے تو ہم تمہارے (چھوٹے

---

[1] الفقیہ ۴: ۳۹۴　　[2] مستدرک الوسائل ۹: ۱۰۱　　[3] الکافی ۲: ۱۱۴

عَنۡکُمۡ سَیِّاٰتِکُمۡ ۔۔۔[1] چھوٹے) گناہ معاف کر دیں گے۔

۳۔ وَ مَنۡ یُّطِعِ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ: انسان کی دائمی سعادت اور ابدی کامیابی اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت میں مضمر ہے۔ ایسے اطاعت گزار کے لیے اس آیت کے یہ الفاظ فَقَدۡ فَازَ فَوۡزًا عَظِیۡمًا اس نے عظیم کامیابی حاصل کی، بہت بڑی خوش خبری ہے۔

اِنَّا عَرَضۡنَا الۡاَمَانَۃَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ الۡجِبَالِ فَاَبَیۡنَ اَنۡ یَّحۡمِلۡنَہَا وَ اَشۡفَقۡنَ مِنۡہَا وَ حَمَلَہَا الۡاِنۡسَانُ ؕ اِنَّہٗ کَانَ ظَلُوۡمًا جَہُوۡلًا ﴿۷۲﴾

۷۲۔ ہم نے اس امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو ان سب نے اسے اٹھانے سے انکار کیا اور وہ اس سے ڈر گئے لیکن انسان نے اسے اٹھا لیا، انسان یقیناً بڑا ظالم اور نادان ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّا عَرَضۡنَا الۡاَمَانَۃَ عَلَی: اس آیت کے ذیل میں چند نکات قابل توجہ ہیں:

الف: امانت سے مراد کیا ہے؟ اس بارے میں مختلف نظریات ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ امانت معرفت حق کے حصول کے نتیجے میں آنے والی ذمہ داری ہے۔ دوسرے لفظوں میں: معرفت کے نتیجے میں مکلّف ہونا ہے۔ اس پر دلیل اگلی آیت ہے۔ ایمان اور عمل صالح۔ چنانچہ اس امانت کے اُٹھانے والے انسان تین گروہوں میں ہوں گے: منافق، مشرک اور مومن۔

ب: پیش کرنے سے کیا مراد ہے؟ ہمارے نزدیک پیش کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس امانت اور دیگر موجودات کا تقابل ہے۔ اس تقابل میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ آسمان اور زمین میں اس بار امانت کے اُٹھانے کی اہلیت نہیں ہے۔ اگرچہ لَخَلۡقُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ اَکۡبَرُ مِنۡ خَلۡقِ النَّاسِ ۔۔۔[2] تاہم جو صلاحیت اس چھوٹی مخلوق میں ہے وہ آسمانوں اور زمین میں نہیں ہے۔ وہ صلاحیت ارادہ و اختیار ہے۔ آسمان و زمین کو خالق نے جس کام پر لگایا ہے اس پر شعور و اختیار کے بغیر گامزن ہیں۔ چنانچہ اپنی گردش لیل و نہار میں اربوں سال میں ایک سیکنڈ کی بھی خلاف ورزی نہیں کرتے لیکن یہ عدم خلاف ورزی اختیار و انتخاب پر مبنی نہیں ہے کہ خلاف ورزی پر اختیار ہونے کے باوجود عدم خلاف ورزی کو منتخب کیا ہو۔

---

[1] ۴ نساء: ۳۱ [2] ۴۰ مومن: ۵۷ (ترجمہ) آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا انسانوں کے خلق کرنے سے زیادہ بڑا کام ہے۔

ج: آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کی طرف سے انکار، ان کی عدم صلاحیت کی زبان حال ہے اور ساتھ یہ بتانا بھی مقصود ہو سکتا ہے کہ یہ امانت اس قدر سنگین ہے کہ آسمان و زمین بھی اسے اُٹھانے کی تاب نہیں رکھتے۔

د: البتہ انسان نے اس میدان میں قدم رکھا اور اس بار سنگین کو اٹھا ہی لیا چونکہ انسان ارادہ، اختیار اور انتخاب پر قدرت رکھتا ہے۔ وہ اپنے ارادے کا مالک ہے اور جو ارادے کا مالک ہے اس ارادے کے تحت وہ دو میں سے ایک کا انتخاب کر سکتا ہے اور جو ارادہ و انتخاب کا مالک ہے وہی امتحان کے میدان میں قدم رکھ سکتا ہے اور جو امتحان میں قدم رکھ سکتا ہے اس کے لیے کامیابی و ناکامی کا تصور ہوتا ہے۔

ھ: اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوۡمًا جَهُوۡلًا: چنانچہ یہ امانت وہ چیز ہے جس کا اٹھانے والا ظالم اور جاہل بھی ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جو علم کی اہلیت رکھتا ہے لیکن علم نہ ہو اسے جاہل کہتے ہیں اور جو عدل و انصاف پر قائم رہنے کی اہلیت رکھتا ہے پھر عدل پر قائم نہ رہے اسے ظالم کہا جا سکتا ہے۔ مسلوب الارادہ پہاڑ کو نہ جاہل کہا جا سکتا ہے، نہ ظالم۔ انسان چونکہ اپنے ارادے کا خود مالک ہے لہٰذا وہ اس ارادے کو مثبت سمت کی طرف لے جا سکتا ہے اور منفی سمت کی طرف بھی۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس امانت سے کیا مراد ہے۔ یہ امانت وہ چیز ہے جس کے اٹھانے کے نتیجے میں انسان ظالم اور جاہل ہو سکتا ہے اور انسان کے ظالم اور جاہل کے وصف سے متصف ہونے پر یہ بات از خود سامنے آتی ہے کہ یہ وہ مخلوق ہے جو صفت علم کے ساتھ متصف ہے۔ جیسا کہ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمۡ عَلَى الۡمَلٰٓئِكَةِ ....[1] سے واضح ہے کہ علم اس کائنات میں انسان کی شناخت ہے اور صفت عدل کے ساتھ متصف ہے کہ وہ حکم خدا کی خلاف ورزی نہ کر کے ظلم سے اپنے آپ کو بچانے کی اہلیت رکھتا ہے جب کہ اس میں خلاف ورزی کے رجحانات بھی پائے جاتے ہیں۔ تاہم یہ امین اپنی امانت کو پورا کرنے کے لیے منفی رجحانات کا مقابلہ کرتا ہے۔

لِّيُعَذِّبَ اللّٰهُ الۡمُنٰفِقِيۡنَ وَالۡمُنٰفِقٰتِ وَالۡمُشۡرِكِيۡنَ وَالۡمُشۡرِكٰتِ وَ يَتُوۡبَ اللّٰهُ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا ﴿٧٣﴾

٧٣۔ تاکہ (نتیجے میں) اللہ منافق مردوں اور منافق عورتوں کو اور مشرک مردوں اور مشرکہ عورتوں کو عذاب دے اور اللہ مومن مردوں اور مومنہ عورتوں کو معاف کرے اور اللہ بڑا بخشنے والا، رحیم ہے۔

---

[1] ۲ بقرہ: ۳۱ (ترجمہ) اور (اللہ نے) آدم کو تمام نام سکھا دیے، پھر انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا۔

تفسیر آیات

اس امانت کے اٹھانے کا نتیجہ یہ سامنے آیا کہ منافقین اور مشرکین کو عذاب میں ڈال دیا جائے چونکہ انہوں نے اس بار امانت کے اٹھانے کی اہلیت رکھتے ہوئے اس میں خیانت کی۔

اور ساتھ یہ نتیجہ بھی سامنے آیا کہ جن مومنین نے اس امانت میں کسی قسم کی خیانت نہیں کی ان پر اللہ تعالیٰ نے عنایت فرمائی اور وہ غفور و رحیم ہونے کے اعتبار سے ان مومنین کی لغزشوں سے درگزر فرماتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ انسان، اس پوری ہستی میں اللہ کا امین ہے۔

خالی

سُورۃ سبا

خالی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اس سورہ کی آیت ۱۵ میں لِسَبَاٍ کے ذکر کی وجہ سے اس سورہ کا نام سبا ہو گیا۔

یہ سورہ آپ ﷺ کی مکی زندگی میں نازل ہوا۔ چنانچہ اس کے مطالب مکی ماحول و معاشرے سے مربوط ہیں۔ لوگ رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کے بنیادی اصولوں: وحدانیت، نبوت اور معاد کے منکر تھے اور حضور ﷺ کا تمسخر اڑاتے تھے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ وَ لَہُ الۡحَمۡدُ فِی الۡاٰخِرَۃِ ؕ وَ ہُوَ الۡحَکِیۡمُ الۡخَبِیۡرُ ﴿۱﴾

بنام خدائے رحمن رحیم

۱۔ ثنائے کامل اس اللہ کے لیے ہے جو آسمانوں اور زمین کی ہر چیز کا مالک ہے اور آخرت میں بھی ثنائے کامل اسی کے لیے ہے اور وہ بڑا حکمت والا، خوب باخبر ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ: لائق حمد و ثنا صرف وہ ذات ہے جس کی ملکیت اور اختیار میں آسمانوں اور زمین میں موجود ساری چیزیں ہے۔ مشرکین چونکہ آسمانوں اور زمین میں موجود بہت سے نظام ہائے کائنات میں غیر اللہ کو مؤثر سمجھتے تھے، اس مشرکانہ سوچ کے رد میں فرمایا: کائنات کی تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں۔ کسی غیر اللہ کو ان چیزوں میں کوئی حق تصرف نہیں ہے۔ نہ آسمان میں موجود سورج اور ستاروں میں، نہ ان کی گردش میں، نہ آسمان سے نازل ہونے والی شعاعوں میں، نہ نازل ہونے والی بارش میں اور نہ

زمین میں موجود پانی، خاک، درخت، سبزہ وغیرہ میں تو پھر تم غیر اللہ کے پاس کیا لینے جاتے ہو جو کسی چیز کا مالک نہیں ہے۔ تمہیں صرف اسی ذات کی حمد و ثنا اور اسی کی بندگی کرنی چاہیے جس کے قبضہ قدرت میں ساری کائنات ہے۔

۲۔ وَلَہُ الۡحَمۡدُ فِی الۡاٰخِرَۃِ: آخرت میں تو حقائق سے پردہ اٹھ جائے گا اور اللہ کی جن نعمتوں سے انسان، دنیا و آخرت دونوں سے مالا مال رہا ہے اس کا ادراک براہ راست ہو جائے گا۔ خصوصاً اہل جنت جب وہاں کی نعمتوں کا مشاہدہ کریں گے تو از خود اللہ کی حمد و ثنا ان کی زبانوں سے جاری ہوگی:

وَقَالُوا الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ صَدَقَنَا وَعۡدَہٗ وَ اَوۡرَثَنَا الۡاَرۡضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الۡجَنَّۃِ حَیۡثُ نَشَآءُ ... [۱]

اور وہ کہیں گے: ثنائے کامل ہے اس اللہ کے لیے جس نے ہمارے ساتھ اپنا وعدہ سچ کر دکھایا اور ہمیں اس سرزمین کا وارث بنایا کہ جنت میں ہم جہاں چاہیں جگہ بنا سکیں۔

۳۔ وَہُوَ الۡحَکِیۡمُ الۡخَبِیۡرُ: اللہ کی ذات ہی حکیم ہے جو ہر چیز کو حکمت کے تقاضوں کے مطابق چلاتا ہے، غلطی کا امکان نہیں ہے۔ خبیر ہے۔ ہر چیز کے تقاضوں سے باخبر ہے۔ نادانی کا یہاں کوئی امکان نہیں۔ لہٰذا اس اللہ کے علاوہ دوسرے معبودوں کے پاس کیا لینے جاتے ہو۔

اہم نکات

۱۔ موجودات کا نظام صرف اللہ کے اختیار میں ہے۔

۲۔ حمد و ستائش اور بندگی، کائنات کے حقیقی مالک کی کرنی چاہیے۔

یَعۡلَمُ مَا یَلِجُ فِی الۡاَرۡضِ وَ مَا یَخۡرُجُ مِنۡہَا وَ مَا یَنۡزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَ مَا یَعۡرُجُ فِیۡہَا ؕ وَ ہُوَ الرَّحِیۡمُ الۡغَفُوۡرُ ﴿۲﴾

۲۔ جو کچھ زمین کے اندر جاتا ہے اور جو کچھ اس سے نکلتا ہے اور جو کچھ آسمان سے اترتا ہے اور جو کچھ اس میں چڑھتا ہے سب کو اللہ جانتا ہے اور وہی رحیم غفور ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ یَعۡلَمُ مَا یَلِجُ فِی الۡاَرۡضِ: زمین کے اندر جو چیزیں جاتی ہیں ان میں سے کچھ تو عام مشاہدے، کچھ سائنسی مشاہدے میں آتی ہیں۔ یہی حال زمین سے نکلنے والی چیزوں کا ہے لیکن یہ چیزیں غیر اللہ کے علم میں بھی ہیں۔ انسان کو علم ہے کہ دانے زیر خاک جا کر انسان کے لیے کام کی چیزیں لے کر نکلتے ہیں۔ جڑیں

---

[۱] ۳۹ زمر: ۷۴

زیر زمین جا کر درختوں کو سہارا دیتی ہیں۔ پانی زمین کی تہوں میں جا کر زمین کو زندہ کر دیتا ہے۔ مختلف قسم کی گیسز اور آفتابی شعاعیں زمین کے اندر جا کر انسان کے لیے سامان زیست فراہم کرتی ہیں۔

لیکن یہ صرف اللہ جانتا ہے کہ زمین کے اندر جانے والے دانے، جڑیں، پانی و دیگر چیزیں اللہ کی طرف سے کیا حکم لے کر جاتی ہیں۔ پانی کو اللہ نے کیا حکم دیا ہے اور پانی زمین کے اندر جا کر کون سی ذمے داریوں کو ادا کرتا ہے۔ دانہ زمین میں کس ترکیب عناصر کا حکم لے کر جاتا ہے۔ انسان کو تو عناصر کی ترکیب وجود میں آنے کے بعد علم ہوتا ہے کہ اس دانے نے زمین سے کون کون سے عناصر کا انتخاب کر کے یہ پھل نکالا ہے لیکن یہ صرف اللہ جانتا ہے کہ زمین کے اندر جانے والے لاتعداد دانوں میں سے ہر ایک دانہ کس خاصیت کے عناصر کو ترکیب دینے والا ہے۔

واضح رہے کہ دانے کو علم ہے کہ اس نے زمین سے کس قسم کے عناصر کو ترکیب دینا ہے تاکہ مطلوبہ خاصیت کا پودا وجود میں آئے۔ یہ اس ہدایت کے تحت ہے جو اللہ نے اس دانے میں ودیعت فرمائی ہے۔

۲۔ وَمَا يَخۡرُجُ مِنۡهَا: اور جو کچھ اس زمین سے نکلتا ہے وہ صرف اللہ جانتا ہے۔ جو چیزیں بشر کے علم میں ہیں وہ نہایت ناچیز ہیں اس علم الٰہی کے مقابلے میں جو زمین سے خارج ہونے والی حیات آفریں چیزوں کے بارے میں ہے۔

۳۔ وَمَا يَنۡزِلُ مِنَ السَّمَآءِ: یہ بات بھی صرف اللہ جانتا ہے کہ آسمان سے کون سا حکم کون سا فیصلہ اور کون سی تقدیر نازل ہوتی ہے۔ مَاۤ اَنۡزَلۡنَا مِنَ الۡبَیِّنٰتِ وَ الۡهُدٰی ....[1] اور کس قسم کی رحمتیں اہل ارض پر نازل ہوتی ہیں۔ اس سلسلے میں بشر صرف محسوسات اور مادیات کو جان سکتے ہیں۔ جیسے بارش کا پانی۔ سورج کی شعاعیں وغیرہ۔

۴۔ وَمَا يَعۡرُجُ فِيۡهَا: بشر کو کیا معلوم کون سی آہ، کون سی دعا، کون سی عبادت اور کون سی روح آسمان کی طرف عروج کرتی ہے۔ بشر صرف آسمان کی طرف بلند ہونے والی محسوسات و مادیات کو جانتا۔

۵۔ وَهُوَ الرَّحِيۡمُ الۡغَفُوۡرُ: اس جملے میں باقی مقامات کے برخلاف مقام رحیمیت کا ذکر پہلے آیا۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ زمین میں داخل اور خارج ہونے والی اشیاء اور آسمان سے نزول و عروج کرنے والی چیزیں اللہ کی طرف سے رحمتوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ ان نعمتوں کا حق ادا نہ کرنے کی صورت میں عفو اور درگزر سے کام لیتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ کائنات کا نظام اسی دخول و خروج اور نزول و عروج پر قائم ہے۔

۲۔ اسی رفت و آمد سے نظام کائنات باہم مربوط ہے۔

---

[1] ۲ بقرہ: ۱۵۹

وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَاْتِيْنَا السَّاعَةُ ؕ قُلْ بَلٰى وَ رَبِّيْ لَتَاْتِيَنَّكُمْ ۙ عٰلِمِ الْغَيْبِ ۚ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِي الْاَرْضِ وَ لَاۤ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَ لَاۤ اَكْبَرُ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝

۳۔ اور کفار کہتے ہیں: قیامت ہم پر نہیں آئے گی، کہدیجیے: میرے عالم الغیب رب کی قسم وہ تم پر ضرور آ کر رہے گی، آسمانوں اور زمین میں ذرہ برابر بھی (کوئی چیز) اس سے پوشیدہ نہیں ہے اور نہ ذرے سے چھوٹی چیز اور نہ اس سے بڑی مگر یہ کہ سب کچھ کتاب مبین میں ثبت ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ لَا تَاْتِيْنَا السَّاعَةُ: لوگ حیات اخروی اور اعادۂ حیات کے اس لیے منکر تھے کہ جب انسان کے بدن کے اجزا بکھر جائیں گے اور بعض اوقات دوسرے اجسام کا حصہ بن جائیں گے تو ان کو دوبارہ کیسے جمع کرے گا؟:

مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَ هِيَ رَمِيْمٌ ...[۱] ان ہڈیوں کو خاک ہونے کے بعد کون زندہ کرے گا؟

جواب میں فرمایا: خواہ ذرات سے چھوٹے اجزا میں بکھر جائیں اللہ کے علم سے پوشیدہ نہیں ہیں۔

سورہ واقعہ میں فرمایا: وَ لَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَةَ الْاُوْلٰى ...[۲] تمہیں نشأۃ اولی کا تو علم ہے کہ تمہاری تخلیق کے لیے جن ارضی عناصر کو بروئے کار لایا گیا ہے وہ بھی دنیا کے اطراف میں منتشر اجزا تھے جو تمہارے دسترخوان پر جمع ہوئے، جن سے تمہارا خون بنا، نطفہ بنا پھر تمہاری تخلیق ہوئی۔

اَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ ؕ بَلْ هُمْ فِيْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۝[۳] کیا ہم پہلی بار کی تخلیق سے عاجز آ گئے تھے؟ بلکہ یہ لوگ نئی تخلیق کے بارے میں شک میں پڑے ہوئے ہیں۔

۲۔ وَ لَاۤ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَ لَاۤ اَكْبَرُ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ: کتاب مبین کے بارے میں تشریح سورہ انعام آیت ۵۹ میں ہو چکی ہے۔

وَ مَا مِنْ غَآئِبَةٍ فِي السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝[۴] اور آسمان اور زمین میں کوئی ایسی پوشیدہ بات نہیں ہے جو کتاب مبین میں نہ ہو۔

لہٰذا کوئی ذرہ ایسا نہیں ہے جو اللہ کی کتاب مبین میں ثبت نہ ہو۔ ان ذرات کو جمع کرنا اللہ کے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ علم خدا سے کوئی شے پوشیدہ نہیں ہو سکتی۔

---

[۱] ۳۶ یس: ۷۸ [۲] ۵۶ واقعۃ: ۶۲ [۳] ۵۰ ق: ۱۵ [۴] ۲۷ نمل: ۷۵

۲۔ اللہ کی کتاب مبین میں ہر چیز ثبت ہے۔

لِّيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ۚ أُولَٰئِكَ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ④

۴۔ تاکہ اللہ ایمان لانے والوں اور نیک عمل انجام دینے والوں کو جزا دے، یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے مغفرت اور رزق کریم ہے۔

وَالَّذِينَ سَعَوْ فِي آيَاتِنَا مُعَاجِزِينَ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مِّن رِّجْزٍ أَلِيمٌ ⑤

۵۔ اور جنھوں نے ہماری آیات کے بارے میں کوشش کی کہ (ہم کو) مغلوب کریں ان کے لیے بلا کا دردناک عذاب ہے۔

تفسیر آیات

قیامت کی حقانیت عقل و فطرت کے مطابق ہے۔ ہر شخص کا ضمیر یہ چاہتا ہے کہ ظالم کو اس کے ظلم اور نیکی کرنے والے کو اس کی نیکی کا بدلہ ملے۔ یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ انسانی ضمیر ایک غیر موجود چیز کی خواہش نہیں کرتا، جیسا کہ انسانی مزاج بھی غیر موجود چیز کی خواہش نہیں کرتا۔ چنانچہ پیاس دلیل ہے کہ اسے بجھانے کے لیے پانی کی شکل میں کوئی چیز موجود ہے اور یہ بات بھی معلوم ہے کہ دنیا میں نیکی اور بدی کا بدلہ نہیں ملتا۔ یہاں تو بدی کا ارتکاب کرنے والے پھلتے پھولتے ہیں۔ لہٰذا قیامت کے وجود پر خود انسان کا ضمیر اور وجدان گواہی دیتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ قیامت کے برحق ہونے پر انسان کا ضمیر گواہی دیتا ہے۔

وَيَرَى الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ الَّذِي أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ هُوَ الْحَقَّ ۙ وَيَهْدِي إِلَىٰ صِرَاطِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ ⑥

۶۔ اور جنہیں علم دیا گیا ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ آپ کے رب کی طرف سے آپ پر جو کچھ نازل کیا گیا ہے وہ حق ہے اور وہ بڑے غالب آنے والے اور قابل ستائش (اللہ) کی راہ کی طرف ہدایت کرتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَيَرَى الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ: قیامت کے بارے میں آپؐ کے موقف کو دانشمند لوگ خوب جانتے

ہیں کہ مبنی برحق ہے۔ قیامت کا وقوع عملی و عقلی اعتبار سے ضروری ہے۔ تمام ادیان نے بالاتفاق قیامت کے بارے میں ایک ہی موقف اختیار کیا ہے۔ چنانچہ سائنسی اعتبار سے بھی حیات بعدالموت کی تائید ہوتی ہے۔

۲۔ وَیَهۡدِیۡۤ اِلٰی صِرَاطِ الۡعَزِیۡزِ الۡحَمِیۡدِ: وَیَهۡدِیۡۤ اور قرآن راہ نمائی بھی کرتا ہے اس خدا کی راہ کی طرف جو بالا دست ہے کہ قیامت برپا کرنے پر قادر ہے اور وہ حمید قابل حمد و ستائش ہے۔

اہم نکات

۱۔ اس آیت سے علماء کی فضیلت اور مقام کا اندازہ ہوتا ہے۔

۲۔ علم رکھنے والے قیامت پر یقین رکھتے ہیں۔

وَقَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا هَلۡ نَدُلُّکُمۡ عَلٰی رَجُلٍ یُّنَبِّئُکُمۡ اِذَا مُزِّقۡتُمۡ کُلَّ مُمَزَّقٍ ۙ اِنَّکُمۡ لَفِیۡ خَلۡقٍ جَدِیۡدٍ ۚ﴿۷﴾

۷۔ اور کفار کہتے ہیں: کیا ہم تمہیں ایک ایسے آدمی کا پتہ بتائیں جو تمہیں یہ خبر دیتا ہے کہ جب تم مکمل طور پر پارہ پارہ ہو جاؤ گے تو بلاشبہ تم نئی خلقت پاؤ گے؟

اَفۡتَرٰی عَلَی اللّٰهِ کَذِبًا اَمۡ بِهٖ جِنَّةٌ ؕ بَلِ الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَةِ فِی الۡعَذَابِ وَالضَّلٰلِ الۡبَعِیۡدِ ﴿۸﴾

۸۔ اس نے اللہ پر جھوٹ بہتان باندھا ہے یا اسے جنون لاحق ہے؟ (نہیں) بلکہ (بات یہ ہے کہ) جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے وہ لوگ عذاب میں اور گہری گمراہی میں مبتلا ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَقَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا: کافر لوگ تصور قیامت کو ناممکن تصور کر کے آپس میں یا ان کے بڑے لوگ اپنے زیر اثر لوگوں سے کہتے تھے: کیا ہم تمہیں ایسے آدمی کا پتہ بتائیں جو ایک عجیب بات کرتا ہے کہ جب تم مرنے کے بعد مکمل طور پر خاک کے ذروں میں گم ہو جاؤ گے تو تم پھر زندہ ہو جاؤ گے:

وَقَالُوۡۤا ءَاِذَا ضَلَلۡنَا فِی الۡاَرۡضِ ءَاِنَّا لَفِیۡ خَلۡقٍ جَدِیۡدٍ ... [1]

وہ کہتے ہیں کہ جب ہم زمین میں ناپید ہو جائیں گے تو کیا ہم نئی خلقت میں آئیں گے؟

۲۔ اَفۡتَرٰی عَلَی اللّٰهِ کَذِبًا اَمۡ بِهٖ جِنَّةٌ: وہ کہتے تھے کہ اس شخص کا قول دو حال سے خالی نہیں ہے: یا تو یہ شخص اللہ پر بہتان باندھتا ہے اور اس بات کی نسبت اللہ کی طرف سے دیتا ہے کہ اللہ ایک محال

---

[1] ۳۲ سجدہ: ۱۰

ناممکن کام انجام دے گا اور مرنے کے بعد لوگوں کو دوبارہ زندہ کرے گا۔ مشرکین اللہ کے وجود کے قائل ہیں، آخرت کے قائل نہیں ہیں۔ مشرکین بھی اس بات کو برا سمجھتے تھے کہ اللہ کی طرف جھوٹی نسبت دی جائے۔

یا یہ شخص دیوانہ ہے اس وجہ سے یہ اس قسم کی نامعقول باتیں کرتا ہے۔ اہل مکہ بخوبی جانتے تھے کہ دیوانہ والی بات درست نہیں ہے لہٰذا وہ بہتان والی بات پر زور دیتے تھے اگرچہ اہل مکہ کو معلوم تھا کہ آپؐ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔

۳۔ بَلِ الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ: جواب میں فرمایا: ہمارے رسول میں یہ دونوں باتیں نہیں ہیں۔ البتہ تم میں دو باتیں موجود ہیں: ایک عذاب اور دوسری گمراہی چونکہ تم میں ایمان کی روشنی نہیں ہے۔ وہ تاریکی میں ہونے کی وجہ سے گمراہ تو ہیں ہی، ساتھ عذاب میں بھی ہیں۔ ممکن ہے اس عذاب کا اشارہ دنیا کے عذاب کی طرف ہو جس میں قیامت پر ایمان نہ رکھنے والے لوگ مبتلا رہتے ہیں۔ ایمان بہ آخرت نہ ہونے کی وجہ سے ان کے پاس دنیا میں پیش آنے والی تلخیوں کی کوئی توجیہ نہیں ہے اس لیے وہ آخرت کے عذاب سے پہلے دنیا کے عذاب میں مبتلا رہتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کی طرف جھوٹی نسبت دینے کو مشرکین بھی برا سمجھتے تھے۔

۲۔ عدم ایمان بہ آخرت، دنیا میں بھی عذاب کا موجب ہے۔

اَفَلَمۡ یَرَوۡا اِلٰی مَا بَیۡنَ اَیۡدِیۡہِمۡ وَ مَا خَلۡفَہُمۡ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ اِنۡ نَّشَاۡ نَخۡسِفۡ بِہِمُ الۡاَرۡضَ اَوۡ نُسۡقِطۡ عَلَیۡہِمۡ کِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّکُلِّ عَبۡدٍ مُّنِیۡبٍ ﴿۹﴾

۹۔ کیا انہوں نے اپنے آگے اور پیچھے محیط آسمان اور زمین کو نہیں دیکھا؟ اگر ہم چاہیں تو انہیں زمین میں دھنسا دیں یا آسمان سے ان پر ٹکڑے برسا دیں یقیناً اس میں اللہ کی طرف رجوع کرنے والے ہر بندے کے لیے نشانی ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اَفَلَمۡ یَرَوۡا اِلٰی مَا بَیۡنَ اَیۡدِیۡہِمۡ: کیا منکرین قیامت نے نہیں دیکھا کہ وہ آسمان و زمین کے احاطے کے اندر ہیں۔ ان کے لیے اللہ کی سلطنت سے فرار کا کوئی راستہ نہیں ہے کہ اگر ہم ان منکروں کو زمین میں دھنسا دیں یا ان پر آسمان سے پتھروں کی بارش برسائیں تو یہ لوگ بھاگ کر کہاں جائیں گے؟

۲۔ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً: اللہ کی اس سلطنت میں، جو ہر طرف سے محیط ہے اور جس میں کوئی راہ فرار نہیں ہے، اللہ کی قدرت و سلطنت کی نشانی ہے جس کی طرف وہ شخص متوجہ ہو سکتا ہے جو بارگاہ الٰہی کی طرف رجوع کرنے والا ہو۔ نور خدا کی روشنی رکھتا ہو، اسے یہ نشانی نظر آئے گی۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کی سلطنت میں معاد کی دلیل پوشیدہ ہے۔
۲۔ اللہ کی طرف توجہ کرنے والے حقائق بین ہوتے ہیں۔

وَ لَقَدۡ اٰتَیۡنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضۡلًا ؕ یٰجِبَالُ اَوِّبِیۡ مَعَہٗ وَ الطَّیۡرَ ۚ وَ اَلَنَّا لَہُ الۡحَدِیۡدَ ﴿۱۰﴾

اَنِ اعۡمَلۡ سٰبِغٰتٍ وَّ قَدِّرۡ فِی السَّرۡدِ وَ اعۡمَلُوۡا صَالِحًا ؕ اِنِّیۡ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ ﴿۱۱﴾

۱۰۔ اور بتحقیق ہم نے داؤد کو اپنی طرف سے فضیلت دی، (اور ہم نے کہا) اے پہاڑو! اس کے ساتھ (تسبیح پڑھتے ہوئے) خوش الحانی کرو اور پرندوں کو بھی (یہی حکم دیا) اور ہم نے لوہے کو ان کے لیے نرم کر دیا۔

۱۱۔ کہ تم زرہیں بناؤ اور ان کے حلقوں کو باہم مناسب رکھو اور تم سب نیک عمل کرو بتحقیق جو کچھ تم کرتے ہو میں اسے دیکھتا ہوں۔

تشریح کلمات

اَوِّبِیۡ: (ا و ب) اَوِّبِیۡ مَعَہٗ خوش الحانی کے ساتھ تسبیح پڑھو۔ لسان العرب میں آیا ہے: سبحی معه و رجّعی۔

اَلَنَّا: (ل ی ن) لین نرم کے معنوں میں ہے۔

سٰبِغٰتٍ: (س ب غ) سابغ پوری اور وسیع زرہ کو کہتے ہیں۔

السَّرۡدِ: (س ر د) السرد کے اصل معنی کسی سخت چیز کو سینے کے ہیں پھر بطور استعارہ لوہے کی کڑیوں کو مسلسل جوڑنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ لَقَدۡ اٰتَیۡنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضۡلًا: ہم نے داؤد کو اپنے پاس سے یہ فضل و کرم عطا کیا۔ ان میں سے چند کا ذکر اس آیت میں ہے۔

الف: یٰجِبَالُ اَوِّبِیۡ: ایک فضل یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کو حکم دیا کہ جب وہ حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ تسبیح پڑھتے تھے، خوش الحانی کریں۔ یعنی حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ خوش الحانی میں پہاڑ بھی تسبیح پڑھتے تھے چونکہ ہر چیز اللہ کی تسبیح کرتی ہے:

وَ اِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمۡدِہٖ وَ لٰکِنۡ لَّا تَفۡقَہُوۡنَ تَسۡبِیۡحَہُمۡ ...[1] کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی ثنا میں تسبیح نہ کرتی ہو لیکن تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو۔

پہاڑوں کے لیے حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ خوش الحانی کرنے کا حکم بھی صریحاً یہ بتاتا ہے کہ پہاڑ اور پرندے بھی ایک قسم کا شعور رکھتے ہیں اور شعور ہر چیز میں موجود ہے۔ البتہ یہ حضرت داؤد علیہ السلام کا معجزہ ہے کہ ان کی خوش الحانی اس قدر مؤثر تھی کہ پہاڑوں میں موجود شعور تک ان کی رسائی تھی چونکہ ہر چیز میں شعور ہے تاہم ہر چیز کا شعور اس چیز کے مطابق ہے۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معجزہ ہے کہ آپؐ کی تسبیح بھی سنگریزوں کے شعور تک پہنچ جاتی تھی۔

ب۔ الطَّیۡرَ: اور پرندے بھی آپ علیہ السلام کے ساتھ خوش الحانی کرتے تھے۔ جب آپ علیہ السلام کی تسبیح پہاڑ جیسے جمادات کے خفیف شعور تک پہنچ جاتی تھی تو پرندوں کے شعور تک پہنچ جانا تعجب کی بات نہیں ہے چونکہ پرندوں کا شعور جاندار ہونے کی وجہ سے نسبتاً ہوتا قوی ہے۔

ج۔ وَ اَلَنَّا لَہُ الۡحَدِیۡدَ: اور اللہ نے ان کے لیے لوہے کو نرم کر دیا۔ یہ بات آثار قدیمہ کی تحقیقات سے بھی ثابت ہوگئی ہے کہ زرہ سازی کی صنعت حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے میں رائج ہوگئی تھی۔

د۔ اس آیت میں بہت سے فضل و کرم کا ذکر نہیں ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ انہیں نبوت رسالت سے نوازا۔

ھ۔ جالوت کو قتل کر کے حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنی قوم میں اونچا مقام پایا۔

و۔ طالوت بادشاہ کی وفات کے بعد آپ علیہ السلام ایک وسیع مملکت کے بادشاہ بن گئے۔

۲۔ اَنِ اعۡمَلۡ سٰبِغٰتٍ: زرہیں بنانے کا حکم جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے تو اس کی تعلیم بھی اللہ ہی کی طرف سے ہوئی۔ چونکہ اس الٰہی تعلیم سے پہلے دشمن کے حملے سے بچنے کے لیے لوہے کے ٹکڑے جسم پر رکھے جاتے تھے جن میں لچک نہ تھی اور سنگینی بھی تھی۔

۳۔ وَّ قَدِّرۡ فِی السَّرۡدِ: اور حلقے باہم مناسب رکھو۔ حلقوں میں فاصلہ اتنا کم نہ ہو کہ زرہ سنگین ہو جائے اور اتنا زیادہ نہ ہو کہ نیزے کی نوک جسم تک پہنچ پائے۔ قدر کا مطلب یہی ہے حلقوں کو باہم مناسب رکھیں۔

---

[1] ۱۷ بنی اسرائیل: ۴۴

اہم نکات

۱۔ اپنے دفاع اور تحفظ کے لیے عسکری صنعت میں مہارت حاصل کرنی چاہیے: اَنِ اعۡمَلۡ سٰبِغٰتٍ ...۔

وَ لِسُلَیۡمٰنَ الرِّیۡحَ غُدُوُّہَا شَہۡرٌ وَّ رَوَاحُہَا شَہۡرٌ ۚ وَ اَسَلۡنَا لَہٗ عَیۡنَ الۡقِطۡرِ ؕ وَ مِنَ الۡجِنِّ مَنۡ یَّعۡمَلُ بَیۡنَ یَدَیۡہِ بِاِذۡنِ رَبِّہٖ ؕ وَ مَنۡ یَّزِغۡ مِنۡہُمۡ عَنۡ اَمۡرِنَا نُذِقۡہُ مِنۡ عَذَابِ السَّعِیۡرِ ﴿۱۲﴾

۱۲۔ اور سلیمان کے لیے (ہم نے) ہوا (کو مسخر کر دیا)، صبح کے وقت اس کا چلنا ایک ماہ کا راستہ اور شام کے وقت کا چلنا بھی ایک ماہ کا راستہ (ہوتا) اور ہم نے اس کے لیے تانبے کا چشمہ بہا دیا اور جنوں میں سے بعض ایسے تھے جو اپنے رب کی اجازت سے سلیمان کے آگے کام کرتے تھے اور ان میں سے جو ہمارے حکم سے انحراف کرتا ہم اسے بھڑکتی ہوئی آگ کے عذاب کا ذائقہ چکھاتے۔

تشریح کلمات

رَوَاحُہَا: رواح شام کے وقت کا سفر۔

اَسَلۡنَا: (س ی ل) سمیل، بہ جانا

الۡقِطۡرِ: (ق ط ر) تانبہ

تفسیر آیات

۱۔ وَ لِسُلَیۡمٰنَ الرِّیۡحَ: سورۂ انبیاء آیت ۸۱ میں بھی اس بات کا ذکر آ گیا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے ہوا مسخر تھی۔ بعض روایات میں بھی آیا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام صبح ایک ماہ کی مسافت اور شام ایک ماہ کی مسافت ہوا کے ذریعے طے کرتے تھے۔ کیا ان کی کرسی کو ہوا اٹھاتی یا بحری جہاز کے ذریعے یہ مسافت طے ہوتی تھی؟ کیونکہ اس زمانے میں جہاز رانی کا انحصار ہوا پر تھا۔ اس بارے میں کوئی واضح جواب اور دلیل ہمارے پاس نہیں ہے۔

۲۔ غُدُوُّہَا شَہۡرٌ وَّ رَوَاحُہَا شَہۡرٌ: ارباب لغت کے مطابق غدو فجر سے لے کر سورج کے نکلنے تک کو کہتے ہیں اور رواح دن کے آخری حصے کو کہتے ہیں۔ بعض کے نزدیک غدو صبح سے لے کر زوال تک اور رواح زوال کے بعد سے غروب آفتاب تک کے لیے کہا جاتا ہے۔ سورۃ الانبیاء آیت ۸۱ میں فرمایا:

وَ لِسُلَیۡمٰنَ الرِّیۡحَ عَاصِفَۃً ... اور سلیمان کے لیے تیز ہوا کو (مسخر کیا)۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہوا کی رفتار بھی سلیمان علیہ السلام کے اختیار میں تھی۔ تَجۡرِیۡ بِاَمۡرِہٖۤ جو سلیمان کے حکم کے مطابق چلتی تھی۔

۳۔ وَاَسَلۡنَا لَہٗ عَیۡنَ الۡقِطۡرِ: ہم نے سلیمان کے لیے تانبے کا چشمہ بہا دیا۔ جو بات یقینی طور پر کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے عہد حکومت میں تانبے پگھلانے کی صنعت اس قدر بڑے پیمانے پر رائج ہو گئی تھی گویا تانبے کے چشمے بہ رہے ہوں۔ بعض روایات میں ہے صرف دو دن کے لیے یہ چشمہ پھوٹا تھا۔

۳۔ وَمِنَ الۡجِنِّ مَنۡ یَّعۡمَلُ بَیۡنَ یَدَیۡہِ: اور جنوں میں سے بعض ایسے تھے جو اپنے رب کی اجازت سے سلیمان علیہ السلام کے آگے کام کرتے تھے۔ قرآن کی یہ صراحت قابل تاویل نہیں ہے کہ اس سے مراد کوہستانی انسان لیا جائے بلکہ وہ جن ہی تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے مسخر فرمایا تھا۔ مزید تشریح الانبیاء آیت ۸۲ میں گزری ہے۔

۴۔ وَمَنۡ یَّزِغۡ مِنۡہُمۡ: جو ان جنوں میں سے ہمارے حکم سے انحراف کرتا ہے ہم اسے بھڑکتی آگ کے عذاب کا ذائقہ چکھاتے ہیں۔ بھڑکتی آگ کا عذاب اگرچہ قیامت کا عذاب ہوسکتا ہے تاہم دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے ان سرکش جنوں کو دنیا میں بھی عذاب دیا جاتا۔ فرمایا:

وَّاٰخَرِیۡنَ مُقَرَّنِیۡنَ فِی الۡاَصۡفَادِ ۝ [1] اور دوسروں کو بھی جو زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کے خاص بندوں کے ارادے نافذ ہوتے ہیں: وَلِسُلَیۡمٰنَ الرِّیۡحَ ....

یَعۡمَلُوۡنَ لَہٗ مَا یَشَآءُ مِنۡ مَّحَارِیۡبَ وَتَمَاثِیۡلَ وَ جِفَانٍ کَالۡجَوَابِ وَقُدُوۡرٍ رّٰسِیٰتٍ ؕ اِعۡمَلُوۡۤا اٰلَ دَاوٗدَ شُکۡرًا ؕ وَقَلِیۡلٌ مِّنۡ عِبَادِیَ الشَّکُوۡرُ ﴿۱۳﴾

۱۳۔ سلیمان جو چاہتے یہ جنات ان کے لیے بنا دیتے تھے، بڑی مقدس عمارات، مجسمے، حوض جیسے پیالے اور زمین میں گڑی ہوئی دیگیں، اے آل داؤد! شکر ادا کرو اور میرے بندوں میں شکر کرنے والے کم ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ یَعۡمَلُوۡنَ لَہٗ مَا یَشَآءُ: حضرت سلیمان علیہ السلام جو چاہتے یہ جنات ان کے لیے بنا دیتے تھے۔ یہاں

---

[1] ۳۸ ص: ۳۸

حضرت سلیمان علیہ السلام جنات سے جو کام لیتے تھے ان کا ذکر ہے:

الف: مِنۡ مَّحَارِیۡبَ: محراب کی جمع ہے۔ محراب، صدر مجلس کو کہتے ہیں۔ اسی سے مسجد میں صدر مقام (امام کی جگہ) کو محراب کہتے ہیں۔ اگرچہ عرب، قصر کو بھی محراب کہتے ہیں تاہم قرآن نے یہ لفظ جائے عبادت کے لیے استعمال کیا ہے:

قَآئِمٌ یُّصَلِّیۡ فِی الۡمِحۡرَابِ ...[1] جب وہ حجرۂ عبادت میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔

لہٰذا ہم اس سے عبادت گاہیں مراد لیں گے۔

ب: وَ تَمَاثِیۡلَ: مجسمے یا تصویریں بھی بناتے تھے۔ ان تصویروں سے مراد غیر جاندار چیزوں کی تصویریں تھیں۔ جیسا کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

وَ اللّٰہِ مَا ھِیَ تَمَاثِیلَ الرِّجَالَ وَ النِّسَآء وَ لٰکِنَّھَا الشَّجَرُ وَ شِبْھُہُ۔[2] قسم بخدا یہ مردوں اور عورتوں کی تصویریں نہیں تھیں بلکہ یہ درخت اور ان جیسے چیزوں کی تصاویر تھیں۔

شیخ انصاری مکاسب محرمہ میں فرماتے ہیں: جانداروں کا مجسمہ بنانا بلا اختلاف حرام ہے۔

ج۔ وَ جِفَانٍ کَالۡجَوَابِ: حوض جیسے پیالے۔ بڑے بڑے حوض کی مانند پیالے بناتے تھے۔ لوگ اس کے گرد بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔ قدیم زمانے اور بعض علاقوں میں آج بھی ایک ہی برتن سے کئی لوگ کھانا کھاتے ہیں جیسے آج کل ایک دسترخوان کے گرد بیٹھ کر کھاتے ہیں۔ ممکن ہے افواج ان پیالوں میں کھاتی ہوں۔

د۔ وَ قُدُوۡرٍ رّٰسِیٰتٍ: اور زمین میں گڑھی ہوئی دیگیں بناتے تھے۔ یہ دیگیں اتنی بڑی ہوتی تھیں کہ انہیں منتقل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ممکن ہے ان میں افواج کے لیے کھانا پکتا ہو چونکہ حضرت سلیمان علیہ السلام اپنی وسیع سلطنت کے لیے طاقتور افواج بھی رکھتے تھے۔

فَلَنَاۡتِیَنَّہُمۡ بِجُنُوۡدٍ لَّا قِبَلَ لَہُمۡ بِہَا ...[3] ہم ان کے پاس ایسے لشکر لے کر ضرور آئیں گے جن کا وہ مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔

۲۔ اِعۡمَلُوۡۤا اٰلَ دَاوٗدَ شُکۡرًا: اے آل داؤد شکر ادا کرو۔ جو سلطنت اور عزت اولاد داؤد کو عنایت ہوئی ہے اس کا حق ادا کرو۔ سلطنت عطا ہوئی ہے، عدل و انصاف قائم کر کے دولت عطا ہوئی ہے، ہر ایک کو اس کا حق ادا کر کے اثر و نفوذ عطا ہوا ہے تو احکام خدا نافذ و رائج کر کے شکر کرو۔

۳۔ وَ قَلِیۡلٌ مِّنۡ عِبَادِیَ الشَّکُوۡرُ: اللہ کے شکر کا حق ادا کرنا آسان کام ہوتا تو بندگان خدا میں شکر گزاروں کی کمی نہ ہوتی۔ سورۂ آل عمران آیت ۱۴۴ سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے وصال کے بعد آپؐ کے دین پر قائم رہنا اور آپؐ کی تعلیمات میں تبدیلی نہ لانا مقام شکر ہے۔ فرمایا:

---

[1] ۳ آل عمران: ۳۹ [2] الکافی ۶: ۵۲۷ [3] ۲۷ نمل: ۳۷

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَا۟ئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ۝ [1]

اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تو بس رسول ہی ہیں، ان سے پہلے اور بھی رسول گزر چکے ہیں، بھلا اگر یہ وفات پا جائیں یا قتل کر دیے جائیں تو کیا تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ اور جو الٹے پاؤں پھر جائے گا وہ اللہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا اور اللہ عنقریب شکر گزاروں کو جزا دے گا۔

اہم نکات

۱۔ ملکی تعمیر و ترقی کے لیے ممکنہ قوتوں سے کام لینا چاہیے: يَعْمَلُوْنَ لَهٗ....

۲۔ شکر ایک کردار کا نام ہے: اِعْمَلُوْۤا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا....

۳۔ کردار کی شکل میں شکر گزار بندے تھوڑے ہوتے ہیں۔

فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلٰى مَوْتِهٖۤ اِلَّا دَآبَّةُ الْاَرْضِ تَاْكُلُ مِنْسَاَتَهٗ ۚ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ اَنْ لَّوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوْا فِى الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ ۝۱۴

۱۴۔ پھر جب ہم نے سلیمان کی موت کا فیصلہ کیا تو ان جنات کو سلیمان کی موت کی بات کسی نے نہ بتائی سوائے زمین پر چلنے والی (دیمک) کے جو ان کے عصا کو کھا رہی تھی، پھر جب سلیمان زمین پر گرے تو جنوں پر بات واضح ہو گئی کہ اگر وہ غیب جانتے ہوتے تو ذلت کے اس عذاب میں مبتلا نہ رہتے۔

تشریح کلمات

مِنْسَاَتَهٗ: عصا کے معنوں میں ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ: جب اللہ تعالیٰ نے سلیمان علیہ السلام کی موت کا فیصلہ کیا تو ممکن ہے حضرت سلیمان علیہ السلام کی موت کو خفیہ رکھا گیا ہو اور ایسے لگتا ہے کہ جنات سے کام لینے کے لیے ان کے جسد کو ایک عصا پر تکیہ دے کر قائم رکھا گیا۔ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ جنات پر سلیمان علیہ السلام کی موت واضح ہو گئی،

---

[1] آل عمران: ۱۴۴

سے ایسا معلوم ہوتا ہے حضرت سلیمان علیہ السلام کی موت جنوں پر پوشیدہ تھی ورنہ یہ بات ممکن نہیں کہ ایک عظیم فرمانروا کا انتقال ہوتا ہے اور ان کے قریبی لوگوں، وزرا اور مشیروں سے پوشیدہ رہے جب کہ سیاق آیت سے یہ بھی معلوم ہے کہ آپؑ کا جسد کسی ایسی جگہ پر تھا جو لوگوں کو نظر آئے تبھی تو گرنے پر جنات کو پتہ چلا۔

مجمع البیان میں ایک روایت میں آیا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے وصیت کی تھی:

لا تخبروا الجن بموتی حتی یفرغوا من بنائه...[1] جنوں کو میری موت کی خبر نہ دو جب تک بیت المقدس کی تعمیر مکمل نہ ہو جائے۔

ایک روایت میں ہے کہ اپنے ایک قصر کی تکمیل تک۔

۲۔ مَا دَلَّهُمْ عَلٰى مَوْتِهٖٓ اِلَّا دَآبَّةُ الْاَرْضِ: ان کی موت کی نشاندہی کسی اور نے نہیں کی۔ اس تعبیر سے بھی یہ عندیہ ملتا ہے کہ دیگر لوگوں سے بھی موت کو پوشیدہ رکھا گیا تھا۔ نشاندہی صرف دیمک نے کی۔ وہ ان کا عصا کھا رہی تھی۔

۳۔ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ: جب حضرت سلیمان علیہ السلام گر پڑے تو جنات کو ان کی موت کا پتہ چلا۔ اس جملے کا ایک ترجمہ تو وہی جو ہم نے متن میں اختیار کیا ہے۔ دوسرا ترجمہ یہ ہوسکتا ہے: تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ جنوں کا حال معلوم ہوا کہ وہ غیب نہیں جانتے۔ چونکہ مشرکین جنات کو اللہ کا شریک قرار دیتے اور انہیں اللہ کی بیٹیاں سمجھتے تھے:

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ ...[2] اور ان لوگوں نے جنات کو اللہ کا شریک بنایا حالانکہ اس نے انہیں پیدا کیا ہے۔

اہم نکات

۱۔ ایک عظیم فرمانروا کو ایک دیمک گرا دیتی ہے۔

۲۔ اس میں انسان کے لیے عبرت اور جنوں کا راز فاش ہے کہ وہ علم میں انسان سے بہتر نہیں ہیں۔

لَقَدْ كَانَ لِسَبَاٍ فِيْ مَسْكَنِهِمْ اٰيَةٌ ۚ جَنَّتٰنِ عَنْ يَّمِيْنٍ وَّشِمَالٍ ۬ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ۭ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّرَبٌّ غَفُوْرٌ ۝۱۵

۱۵۔ بتحقیق (اہل) سبا کے لیے ان کی آبادی میں ایک نشانی تھی، (یعنی) دو باغ دائیں اور بائیں تھے اپنے رب کے رزق سے کھاؤ اور اس کا شکر ادا کرو ایک پاکیزہ شہر (ہے) اور بڑا بخشنے والا پروردگار۔

۱۔ بحار ۱۴: ۱۴۲ ۲۔ انعام: ۱۰۰

تفسیر آیات

۱۔ لَقَدۡ کَانَ لِسَبَاٍ فِیۡ مَسۡکَنِہِمۡ اٰیَۃٌ: سبا ایک قوم کا نام ہے جو یمن کے جنوبی علاقے میں آباد تھی۔ یہ علاقہ نہایت سرسبز تھا۔ آج بھی کچھ سرسبزی باقی ہے۔ یہ قوم اس زمانے کی ایک ترقی یافتہ قوم تھی۔ چنانچہ اس نے جنوب سے آنے والا پانی ذخیرہ کرنے کے لیے دو پہاڑیوں کے درمیان ایک بند باندھا تھا۔ یہ بند سد مآرب کے نام سے مشہور تھا۔ کتاب وصف جزیرۃ العرب کے مطابق بند صرف چھ سو ہاتھ چوڑا تھا۔ ان دونوں پہاڑیوں کا نام بلن تھا۔ بارشوں کے وقت سیلاب سے تباہی ہوتی، دوسرے دنوں میں پانی کی شدید قلت ہوتی تھی۔ س بند کی جگہ اور مآرب کے شہر کے درمیان تین ہزار مربع میل زمین بنجر، غیر آباد تھی۔ اس بند کے بعد پورا علاقہ سرسبز باغات میں بدل گیا تھا۔

اس بند کے کھنڈرات سے دستیاب ہونے والے قدیم کتبوں کے مطابق سنہ ۵۴۳ عیسوی کو ابرھہ نے اس بند کی مرمت کی ہے لہٰذا اس بند کی تباہی کی تاریخ میں یاقوت کی روایت قرین قیاس معلوم ہوتی ہے جو کہتی ہے کہ چھٹی صدی عیسوی میں بند تباہ ہو گیا تھا۔

۲۔ اٰیَۃٌ: اللہ کی وحدانیت اور اس کی ربوبیت ہر ایک میں دلیل موجود تھی۔ اس دلیل کی تفصیل یہ ہے: جَنَّتٰنِ عَنۡ یَّمِیۡنٍ وَّ شِمَالٍ اس علاقے انسان جہاں بھی جاتا دائیں اور بائیں طرف باغات ہی نظر آتے تھے۔ نعمت کی فراوانی تھی۔ اللہ کی ربوبیت کی علامتیں آشکار تھیں۔

۳۔ کُلُوۡا مِنۡ رِّزۡقِ رَبِّکُمۡ وَ اشۡکُرُوۡا لَہٗ: اللہ کی عطا کردہ نعمتوں سے فائدہ اٹھاؤ۔ یہ نعمتیں تمہارے لیے پیدا کی گئی ہیں۔ البتہ ان نعمتوں کے دوام کے لیے وَ اشۡکُرُوۡا لَہٗ شکر ادا کرنا ضروری ہے ورنہ یہ نعمتیں تم سے چھن جائیں گی۔

۴۔ بَلۡدَۃٌ طَیِّبَۃٌ وَّ رَبٌّ غَفُوۡرٌ: آبادی پاکیزہ ہے۔ یہاں موذی چیزیں نہیں ہیں۔ بعض مفسرین کے مطابق طَیِّبَۃٌ کا مطلب یہ ہے کہ زمین زرخیز، ہوا پاکیزہ اور پانی شیریں ہے۔ سردی گرمی بھی شدید نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کی ربوبیت کی ایک نشانی سرزمین کی شادابی ہے۔

۲۔ شکرگزاری کے لیے نعمتیں حلال ہیں: کُلُوۡا مِنۡ رِّزۡقِ رَبِّکُمۡ وَ اشۡکُرُوۡا لَہٗ ....

فَاَعۡرَضُوۡا فَاَرۡسَلۡنَا عَلَیۡہِمۡ سَیۡلَ الۡعَرِمِ وَ بَدَّلۡنٰہُمۡ بِجَنَّتَیۡہِمۡ

۱۶۔ پس انہوں نے منہ پھیر لیا تو ہم نے ان پر بند کا سیلاب بھیج دیا اور ان دو باغوں کے عوض ہم

جَنَّتَيۡنِ ذَوَاتَىۡ اُكُلٍ خَمۡطٍ وَّاَثۡلٍ وَّشَیۡءٍ مِّنۡ سِدۡرٍ قَلِيۡلٍ ﴿۱۶﴾

نے انہیں دو ایسے باغات دیے جن میں بدمزہ پھل اور کچھ جھاؤ کے درخت اور تھوڑے سے بیر تھے۔

تشریح کلمات

الۡعَرِمِ : (ع ر م) عرمن سے ہے۔ بند کے معنی میں ہے۔

خَمۡطٍ : (خ م ط) بدمزہ، بے خار درخت۔

اَثۡلٍ : (ا ث ل) جھاؤ کے درخت۔

تفسیر آیات

۱۔ فَاَعۡرَضُوۡا فَاَرۡسَلۡنَا عَلَيۡهِمۡ سَيۡلَ الۡعَرِمِ: ان لوگوں نے جب ان نعمتوں کا شکر ادا کرنے سے گریز کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر اس بند کا سیلاب روانہ کر دیا۔ العرم یہاں بند کے معنوں میں لیا جا سکے گا چونکہ اگر العرم شدت وقوت کے معنوں میں لیا جائے العرم، سیل کا وصف ہو گا۔ اس صورت میں ترکیب کلام اس طرح ہوتی: فَاَرۡسَلۡنَا عَلَيۡهِمۡ سیلاً عرماً۔ ہم نے ان پر ایک شدید سیلاب روانہ کیا۔

کہتے ہیں یہ بند سنہ ۴۵۰ عیسوی میں ٹوٹ گیا اور ایک عظیم سیلاب آیا جس سے سارے ملک کی آبادی اجڑ گئی۔

۲۔ وَبَدَّلۡنٰهُمۡ بِجَنَّتَيۡهِمۡ جَنَّتَيۡنِ: ان دو باغوں کے بدلے میں اللہ نے انہیں دو اور باغات دیے اور یہ جدید باغات بدمزہ پھل، کچھ جھاؤ اور تھوڑے سے بیر کے درختوں پر مشتمل تھے۔ ان دونوں کو باغات اس لیے کہا ہے چونکہ کلام باغات پر ہو رہا تھا۔ اس سیلاب نے ہر چیز کو بہا دیا۔ اب ان کی جگہ خودرو قسم کی مختلف جھاڑیاں اور درخت اُگنے شروع ہو گئے جو ان کے کام کے نہیں تھے۔

ذٰلِكَ جَزَيۡنٰهُمۡ بِمَا كَفَرُوۡا ؕ وَهَلۡ نُجٰزِیۡۤ اِلَّا الۡكَفُوۡرَ ﴿۱۷﴾

۱۷۔ ان کی ناشکری کے سبب ہم نے انہیں یہ سزا دی اور کیا (ایسی) سزا ناشکروں کے علاوہ ہم کسی اور کو دیتے ہیں؟

تفسیر آیات

ان کی ناشکری کے سبب ہم نے انہیں یہ سزا دی اور کیا (ایسی) سزا ناشکروں کے علاوہ ہم کسی اور کو دیتے ہیں؟

کفران نعمت کی سزا کبھی دنیا میں سلب نعمت اور آخرت میں عذاب کی صورت میں ملتی ہے چونکہ

نعمت کی ناقدری اور ناشکری نہایت منفی خصلت ہے۔ ایسا آدمی قدر شناس نہیں ہوتا۔ وہ تمام قدروں سے عاری ہوتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ ناشکری سے نعمت، نقمت میں بدل جاتی ہے۔

۲۔ ناشکری بہت بری خصلت ہے۔

وَ جَعَلۡنَا بَیۡنَہُمۡ وَ بَیۡنَ الۡقُرَی الَّتِیۡ بٰرَکۡنَا فِیۡہَا قُرًی ظَاہِرَۃً وَّ قَدَّرۡنَا فِیۡہَا السَّیۡرَ ؕ سِیۡرُوۡا فِیۡہَا لَیَالِیَ وَ اَیَّامًا اٰمِنِیۡنَ ﴿۱۸﴾

۱۸۔ اور ہم نے ان کے اور جن بستیوں کو ہم نے برکت سے نوازا تھا، کے درمیان چند کھلی بستیاں بسا دیں اور ان میں سفر کی منزلیں متعین کیں، ان میں راتوں اور دنوں میں امن کے ساتھ سفر کیا کرو۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ جَعَلۡنَا بَیۡنَہُمۡ وَ بَیۡنَ الۡقُرَی الَّتِیۡ بٰرَکۡنَا فِیۡہَا: ہم نے اہل یمن اور برکت والی بستیوں کے درمیان ایسی کھلی یا شاہراہ پر واقع بستیاں بسائیں اور سفر کی ایسی منزلیں مقرر کیں کہ پورا سفر امن کا سفر رہے۔

وہ کون سی بستیاں تھیں جنہیں اللہ نے برکت سے نوازا ہے؟ اکثر مفسرین کا یہ خیال ہے کہ بابرکت بستیوں سے مراد بلاد شام (فلسطین، اردن، سوریا) ہیں چونکہ قرآن کی متعدد آیات میں بلاد شام کو برکت والی بستیاں کہا ہے لیکن یہ بہت بعید ہے کہ یمن سے لے کر بلاد شام تک سرسبز بستیاں آباد ہوں، چونکہ یمن اور بلاد شام کے درمیان ایک وسیع اور طویل علاقہ، خشک اور بے آب و گیاہ ہے۔ یہ پورا علاقہ تاریخ کے کسی دور میں بھی سرسبز رہا ہو، ثابت نہیں ہے۔ یہ روایت نامعقول ہے جو کہتی ہے یمن اور شام کے درمیان چار ہزار سات سو سرسبز بستیاں تھیں۔ اگر بستیاں آباد تھیں تو اس بند کے ٹوٹنے کے بعد کی تباہی چھٹی صدی عیسوی سے پہلے موجود ہونا چاہیے تھی۔ ان تاریخوں میں ان آبادیوں کا کوئی نام و نشان نہیں ہے۔

بعض کہتے ہیں بابرکت بستیوں سے مراد مکہ کی سرزمین ہے۔ یہ بھی بہت بعید ہے کہ یمن سے مکہ تک کا پورا علاقہ سرسبز ہو۔

ایک نظریہ یہ ہے کہ بابرکت بستیوں سے مراد صنعاء یا مآرب ہے کہ یہ دونوں یمن ہی کے علاقوں میں واقع ہیں۔ تباہی سے پہلے یہ علاقے نہایت بابرکت تھے۔ سرسبز باغات پر مشتمل تھے۔ چنانچہ

اس علاقے کو بَلۡدَۃٌ طَیِّبَۃٌ پاکیزہ شہر کہا ہے۔

پھر قابل مطالعہ بات یہ ہے کہ قرآن نے یہ نہیں کہا: یمن اور بابرکت بستیوں کے درمیان بلکہ اہل یمن اور بابرکت بستیوں کے درمیان بَیۡنَہُمۡ وَ بَیۡنَ الۡقُرَی فرمایا ہے۔ اس سے یہ بات زیادہ قرین واقع معلوم ہوتی ہے کہ بابرکت بستیوں سے یمن ہی کی بستیوں کا ذکر مراد ہے جیسا کہ ابن جبیر نے لکھا ہے۔

۲۔ قُرًی ظَاہِرَۃً: نمایاں بستیاں جو مسافروں کے راستوں پر واقع تھیں۔ ایسا نہیں تھا کہ ان بستیوں میں ٹھہرنے کے لیے راستے سے نکل کر دور جانا پڑتا ہو بلکہ یہ ساری بستیاں راستے پر واقع تھیں۔ شاید مسافروں کے لیے ایک سہولت کا ذکر ہے۔

بعض اہل تحقیق کے مطابق قُرًی ظَاہِرَۃً سے مراد شہروں سے دور واقع بستیاں ہیں جو بیابانوں میں واقع ہیں۔ چنانچہ صحرا کی بستیوں کو بادیہ بھی کہتے ہیں جو ظَاہِرَۃً کے معنوں میں ہے۔ اس صورت میں آیت کے معنی یہ ہوں گے: ہم نے اہل یمن اور بابرکت بستیوں کے درمیاں صحرائی بستیاں بنائیں۔

۳۔ قَدَّرۡنَا فِیۡہَا السَّیۡرَ: ان علاقوں میں سفر کی مسافت اور فاصلہ متعین تھا اور اس سے منزلیں بھی متعین ہوتی ہیں۔ سفر کے لیے یہ بھی بہت بڑی سہولت ہے کہ اگلی منزل کس جگہ ہو گی چونکہ آبادیاں متصل ہونے کی وجہ سے مسافر کو علم ہوتا تھا کہ اگلی منزل کون سی بستی ہو گی ورنہ خشک بیاباں میں منزل کا تعین نہیں ہو سکتا۔

۴۔ سِیۡرُوۡا فِیۡہَا لَیَالِیَ وَ اَیَّامًا اٰمِنِیۡنَ: ان بستیوں میں سفر کرو۔ یہ حکم بزبان حال ہے کہ اللہ نے سفر کے لیے اس طرح پرامن ماحول فراہم فرمایا ہے کہ اب دن کو سفر کرو یا رات کو کسی قسم کا خطرہ نہیں ہے۔ نہ پیاس بھوک کا، نہ درندوں کا، نہ راہزنوں کا۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت پرامن سفر ہے۔

۲۔ سفر میں منزل کا تعین ایک اہم سہولت ہے۔

فَقَالُوۡا رَبَّنَا بٰعِدۡ بَیۡنَ اَسۡفَارِنَا وَ ظَلَمُوۡۤا اَنۡفُسَہُمۡ فَجَعَلۡنٰہُمۡ اَحَادِیۡثَ وَ مَزَّقۡنٰہُمۡ کُلَّ مُمَزَّقٍ ؕ

اَحَادِیۡثَ وَ مَزَّقۡنٰہُمۡ کُلَّ مُمَزَّقٍ ؕ

۱۹۔ پس انہوں نے کہا: ہمارے پروردگار! ہمارے سفر کی منزلوں کو لمبا کر دے اور انہوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا چنانچہ ہم نے بھی انہیں افسانے بنا دیا اور انہیں مکمل طور پر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، یقیناً اس (واقعہ) میں ہر صبر اور شکر کرنے والے کے

شَكُوۡرٍ ﴿١٩﴾ لیے نشانیاں ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ فَقَالُوۡا رَبَّنَا بٰعِدۡ بَیۡنَ اَسۡفَارِنَا : ان لوگوں نے کہا: ہمارے رب ہمارے سفر کی مسافتیں طویل کر دے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ناشکری کا زباں حال ہے کہ وہ ان سفری سہولتوں کی وجہ سے طغیانی میں آئے تھے۔ اس کا واحد علاج مسافتیں دور کرنے میں تھا۔ اگرچہ بعض بزرگ مفسر فرماتے ہیں کہ ان کا یہ شعوری مطالبہ تھا جس طرح بنی اسرائیل نے من و سلویٰ کی جگہ تھوم اور پیاز مانگا تھا۔

۲۔ وَ ظَلَمُوۡۤا اَنۡفُسَہُمۡ : ان لوگوں نے کفران نعمت کر کے اپنے اوپر ظلم کیا اور ان نعمتوں سے اپنے آپ کو محروم کر لیا۔

۳۔ فَجَعَلۡنٰہُمۡ اَحَادِیۡثَ : پس ہم نے انہیں افسانہ بنا دیا کہ آنے والی نسلیں ان کی افسوسناک داستانیں بیان کیا کریں۔ یہاں تک کہ ان کی تباہی ایک ضرب المثل بن گئی۔ کہتے ہیں: تفرقوا ایادی سبا۔ وہ قوم سبا کی نعمتوں کی طرح پراگندہ ہو گئے۔

۴۔ وَ مَزَّقۡنٰہُمۡ کُلَّ مُمَزَّقٍ : اور انہیں مکمل ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اپنے علاقے کی بربادی کے بعد یمن والے دیگر علاقوں میں منتشر ہو گئے اور یہ ترقی یافتہ قوم تتر بتر ہو کر رہ گئی۔

۵۔ تفہیم القرآن میں آیا ہے:

> اسٹرابو لکھتا ہے: یہ لوگ سونے اور چاندی کے برتن استعمال کرتے تھے اور ان کے مکانوں کی چھتوں، دیواروں اور دروازوں تک میں ہاتھی کے دانت، سونے، چاندی اور جواہر کا کام بنا ہوا ہوتا ہے.... آر ٹی میڈورس کہتا ہے: یہ لوگ عیش میں مست ہو رہے ہیں اور جلانے کی لکڑی کے بجائے دارچینی، صندل اور دوسری خوشبودار لکڑیاں جلاتے ہیں۔ اسی طرح دوسرے یونانی مورخین روایت کرتے ہیں کہ ان کے علاقے کے قریب سواحل سے گزرتے تجارتی جہازوں تک خوشبو کی لپٹیں پہنچتی ہیں۔ انہوں نے تاریخ میں پہلی مرتبہ صنعا کے بلند پہاڑی مقام پر وہ فلک شگاف عمارت تعمیر کی جو قصر غمدان کے نام سے صدیوں تک مشہور رہی۔ عرب مورخین کا بیان ہے اس کی ۲۰ منزلیں تھیں اور ہر منزل ۳۶ فٹ بلند تھی۔ (ہمارے زمانے کے مطابق ستر منزلیں)۔ (العهدة على الراوى)

۵۔ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّکُلِّ صَبَّارٍ شَکُوۡرٍ : جو لوگ مقام صبر اور شکر پر فائز ہیں وہ ان واقعات سے درس لیتے ہیں۔ جو بے صبر، ناشکرے ہوتے ہیں وہ ان واقعات سے عبرت نہیں لیتے۔

اہم نکات

۱۔ نعمتوں کی فراوانی کی صورت میں ناشکری، عذاب الٰہی کے لیے دعوت ہے۔

۲۔ سب سے زیادہ متنعم قوم تباہی کے لیے ضرب المثل بن گئی۔ فَجَعَلۡنٰہُمۡ اَحَادِیۡثَ ....

۳۔ مقام صبر وشکر پر فائز لوگ اللہ کی نشانیوں سے درس لیتے ہیں۔

وَ لَقَدۡ صَدَّقَ عَلَیۡہِمۡ اِبۡلِیۡسُ ظَنَّہٗ فَاتَّبَعُوۡہُ اِلَّا فَرِیۡقًا مِّنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۲۰﴾

۲۰۔ اور بتحقیق ابلیس نے ان کے بارے میں اپنا گمان درست پایا اور انہوں نے اس کی پیروی کی سوائے مومنوں کی ایک جماعت کے۔

تفسیر آیات

ان مشرکین کے بارے میں ابلیس کا ظن و گمان درست پایا کہ اس نے کہا تھا کہ میں اولاد آدم کو گمراہ کروں گا سوائے مخلص بندوں کے۔ چنانچہ چند ایک مؤمن بندوں کے علاوہ سب نے ابلیس کی پیروی کی۔

وَ مَا کَانَ لَہٗ عَلَیۡہِمۡ مِّنۡ سُلۡطٰنٍ اِلَّا لِنَعۡلَمَ مَنۡ یُّؤۡمِنُ بِالۡاٰخِرَۃِ مِمَّنۡ ہُوَ مِنۡہَا فِیۡ شَکٍّ ؕ وَ رَبُّکَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ حَفِیۡظٌ ﴿۲۱﴾

۲۱۔ اور ابلیس کو ان پر کوئی بالادستی حاصل نہ تھی مگر ہم یہ جاننا چاہتے تھے کہ آخرت کا ماننے والا کون ہے اور ان میں سے کون اس بارے میں شک میں ہے اور آپ کا رب ہر چیز پر نگہبان ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ مَا کَانَ لَہٗ عَلَیۡہِمۡ مِّنۡ سُلۡطٰنٍ: ابلیس کا بنی آدم پر ایسا تسلط قائم نہیں ہے کہ اپنی پیروی کرنے پر جبر کرے۔ وہ صرف وسوسہ پیدا کر سکتا ہے:

اِنَّ عِبَادِیۡ لَیۡسَ لَکَ عَلَیۡہِمۡ سُلۡطٰنٌ ....[۱] جو میرے بندے ہیں ان پر یقیناً تیری بالادستی نہ ہوگی۔

۲۔ اِلَّا لِنَعۡلَمَ مَنۡ یُّؤۡمِنُ بِالۡاٰخِرَۃِ: ایک ممکنہ سوال کا جواب۔ سوال یہ ہے کہ وہ مسلط نہ سہی، اسے گمراہ کرنے کی آزادی کیوں دے رکھی ہے؟ جواب میں فرمایا: اسے آزادی صرف اس لیے دے رکھی ہے تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ مؤمن بالآخرۃ کون ہے اور اس پر ایمان نہ رکھنے والے کون ہیں؟

---

[۱] ۱۵ حجر: ۴۲

جہاں اللہ تعالیٰ نے ہدایت کے لیے بہت سے اسباب فراہم فرمائے ہیں، جیسے ضمیر، عقل، فرشتے اور انبیاء علیہم السلام، وہاں گمراہی کی طرف دعوت دینے والوں کو بھی نہیں روکا۔ جیسے خواہشات، شیاطین وغیرہ۔ ان دونوں راستوں کے درمیان انسان کو کھڑا کیا گیا تا کہ ایمان اور شک والوں میں عملی امتیاز آ جائے۔

اہم نکات

۱۔ شیطان انسان کو مجبور نہیں کرتا۔ وہ صرف دعوت دیتا ہے: وَمَا كَانَ لَهٗ عَلَيۡهِمۡ مِّنۡ سُلۡطٰنٍ ...۔

۲۔ شیطان کو آزادی اس لیے دی ہے کہ انسان کا امتحان ہو سکے: اِلَّا لِنَعۡلَمَ ....۔

قُلِ ادۡعُوا الَّذِيۡنَ زَعَمۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ ۚ لَا يَمۡلِكُوۡنَ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ فِى السَّمٰوٰتِ وَلَا فِى الۡاَرۡضِ وَمَا لَهُمۡ فِيۡهِمَا مِنۡ شِرۡكٍ وَّمَا لَهٗ مِنۡهُمۡ مِّنۡ ظَهِيۡرٍ ﴿۲۲﴾

۲۲۔ کہد یجیے: جنہیں تم اللہ کے سوا (معبود) سمجھتے ہو انہیں پکارو، وہ ذرہ بھر چیز کے مالک نہیں ہیں نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں اور نہ ہی ان دونوں میں ان کی شرکت ہے اور نہ ان میں سے اس کا کوئی مددگار ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ جو لوگ اللہ کے علاوہ دوسروں کو اپنا معبود بناتے ہیں ان سے کہد یجیے: انہیں پکار کر دیکھ لو وہ اس کائنات میں سے ذرہ بھر کسی چیز کے مالک نہیں ہیں۔ وہ ان کی کوئی حاجت کیسے پوری کریں گے؟ جب وہ کسی کی حاجت روائی کرنے پر قادر نہیں ہیں تو تم ان کی پوجا کیوں کرتے ہو؟ اگر وہ تمہاری حاجت روائی کرتے تو اس کا شکر اور اس کی بندگی کرتے۔

۲۔ وَمَا لَهُمۡ فِيۡهِمَا مِنۡ شِرۡكٍ : نہ آسمانوں اور زمین میں ان کی کوئی شرکت ہے۔ اگر وہ مستقل کسی چیز کے مالک نہیں ہیں تو کسی کے ساتھ مالکیت میں شریک بھی نہیں ہیں۔

۳۔ وَّمَا لَهٗ مِنۡهُمۡ مِّنۡ ظَهِيۡرٍ : نہ ہی اللہ کو ان شریکوں سے کسی مدد اور کمک کی ضرورت ہے۔ یہ شریک جب ایک محتاج انسان کی کوئی کمک نہیں کر سکتے تو اللہ کی کیا کمک کر سکیں گے جب کہ اللہ کسی کمک کا محتاج نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کے علاوہ اس کائنات میں کوئی ایک ذرے کا بھی مالک حقیقی نہیں ہے۔

وَ لَا تَنۡفَعُ الشَّفَاعَۃُ عِنۡدَہٗۤ اِلَّا لِمَنۡ اَذِنَ لَہٗ ؕ حَتّٰۤی اِذَا فُزِّعَ عَنۡ قُلُوۡبِہِمۡ قَالُوۡا مَاذَا ۙ قَالَ رَبُّکُمۡ ؕ قَالُوا الۡحَقَّ ۚ وَ ہُوَ الۡعَلِیُّ الۡکَبِیۡرُ ﴿۲۳﴾

۲۳۔ اور اللہ کے نزدیک کسی کے لیے شفاعت فائدہ مند نہیں سوائے اس کے جس کے حق میں اللہ نے اجازت دی ہو، یہاں تک کہ جب ان کے دلوں سے پریشانی دور ہو گی تو وہ کہیں گے: تمہارے رب نے کیا فرمایا؟ وہ کہیں گے: حق فرمایا ہے اور وہی برتر، بزرگ ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ لَا تَنۡفَعُ الشَّفَاعَۃُ عِنۡدَہٗۤ: مشرکین اپنے معبودوں، ملائکۃ کو اللہ کے ہاں شفاعت کنندہ سمجھتے تھے:

ہٰۤؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنۡدَ اللّٰہِ ...[1] یہ اللہ کے پاس ہماری شفاعت کرنے والے ہیں۔

مشرکین کے ہاں شفاعت سے مراد دنیاوی معاملات میں سفارش ہے، آخرت کے وہ منکر تھے۔ لہٰذا آیت کا موضوع دنیا میں شفاعت ہے۔ اس سلسلے میں فرمایا: دنیا میں بھی کوئی ذات بذات خود شفاعت کی حقدار نہیں ہے جب تک مالک حقیقی کی طرف سے اجازت نہ ہو۔ یعنی فرشتے سفارش ضرور کر سکتے ہیں لیکن ہر بات اور ہر کسی کے لیے نہیں بلکہ اس کے حق میں شفاعت کر سکتے ہیں جس کے لیے اذن مل جائے۔

۲۔ اِلَّا لِمَنۡ اَذِنَ لَہٗ: اس جملے کے دو معنی ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ اس شخص کی شفاعت مفید ہو سکتی ہے جسے شفاعت کا کردار ادا کرنے کا اذن مل جائے۔ دوسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں: شفاعت اس شخص کے حق میں مؤثر ہے جسے شفاعت ملنے کا اذن ہو۔ دوسرے معنی زیادہ قرین واقع معلوم ہوتے ہیں۔

۳۔ حَتّٰۤی اِذَا فُزِّعَ عَنۡ قُلُوۡبِہِمۡ: التفزیع پریشانی کا دور ہونا۔ فرشتوں کو بذات خود شفاعت کا حق ہونا دور کی بات ہے بلکہ یہ خود امر خدا کے انتظار میں پریشان رہتے ہیں کہ کیا حکم ملنے والا ہے۔ حکم خدا کے آنے پر ان کی پریشانی دور ہو جاتی ہے اور ایک دوسرے سے اس حکم کی نوعیت پوچھتے ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ فرشتے کس بات پر پریشان ہوتے ہیں؟ جواب یہ ہے کہ ان کو اجمالاً علم ہوتا ہے کہ انہیں شفاعت کا حق ملنے کا امکان ہے۔ پریشانی اس بات کی ہوتی ہے کہ یہ حق ملنے والا ہے یا نہیں؟ جب یہ حق مل جاتا ہے تو پریشانی دور ہو جاتی ہے۔

۴۔ مَاذَا ۙ قَالَ رَبُّکُمۡ: تمہارے پروردگار نے کیا فرمایا ہے؟ اس سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں میں بھی مراتب ہیں۔ ادنی مرتبہ والے اعلیٰ مرتبہ والوں سے سوال کرتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کی طرف سے شفاعت کا اذن ملنے کے لیے اس کا اہل ہونا چاہیے۔

---

[1] ۱۰ یونس: ۱۸

قُلۡ مَنۡ یَّرۡزُقُکُمۡ مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ قُلِ اللّٰہُ ۙ وَ اِنَّاۤ اَوۡ اِیَّاکُمۡ لَعَلٰی ہُدًی اَوۡ فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۲۴﴾	۲۴۔ان سے پوچھیے: تمہیں آسمانوں اور زمین سے رزق کون دیتا ہے؟ کہدیجیے: اللہ، تو ہم اور تم میں سے کوئی ایک ہدایت پر یا صریح گمراہی میں ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ قُلۡ مَنۡ یَّرۡزُقُکُمۡ: سوال کشف حقیقت اور مدمقابل کے نظریے کو رد کرنے کا ایک مؤثر طریقہ ہے۔ ان مشرکین سے پوچھ لیجیے کہ آسمانوں اور زمین سے تمہیں کون روزی دیتا ہے؟ قُلِ اللّٰہُ آپ خود کہدیجیے: اللہ ہی رازق ہے۔

۲۔ مَنۡ یَّرۡزُقُکُمۡ مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ: آسمانوں اور زمین سے کون رزق دیتا ہے؟ اس سے معلوم ہوا کہ اہل ارض کو رزق دینے میں تمام آسمانوں کا عمل دخل ہے۔ یعنی کل کائنات پر حاکم نظام کو دخل ہے۔ چنانچہ اہل ارض کے لیے ارزاق کی فراہمی میں زمین سے آسمانوں کا عمل زیادہ مؤثر ہے۔

واضح رہے مشرکین اپنے معبودوں کو رازق سمجھتے تھے۔ اس عنوان سے کہ یہ معبود اللہ کی بارگاہ میں سفارش کرتے ہیں۔ ان کی سفارش پر ہمیں رزق ملتا ہے۔ مشرکین مانتے تھے کہ رازق خود اللہ تعالیٰ ہے۔ سابقہ آیت میں سفارش اور شفاعت کی نفی فرمائی۔ جب ان معبودوں کی سفارش کی نفی ہو گئی تو رازق صرف اللہ تعالیٰ ہی رہ جاتا ہے۔

۳۔ وَ اِنَّاۤ اَوۡ اِیَّاکُمۡ لَعَلٰی ہُدًی اَوۡ فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ: واضح دلیل پیش کرنے کے بعد رسول اللہؐ کی زبان سے فرماتا ہے: ہمارا اور تمہارا موقف باہم متضاد ہیں۔ یہ دونوں صحیح نہیں ہو سکتے اور دونوں باطل بھی نہیں ہو سکتے۔ رازق اللہ ہے یا تمہارے معبود، یہ دونوں نظریے باطل نہیں ہو سکتے۔

مشرکین کا نظریہ باطل ہونے پر دلیل موجود ہے کہ خود مشرکین اللہ کو خالق حقیقی مانتے ہیں پس انہیں اللہ کو رازق بھی ماننا پڑے گا چونکہ رزق دینا بھی تخلیق ہے۔

دعوت فکر کا ایک انمول طریقہ یہ ہے کہ مدمقابل کی سطح پر اُتر آئیں کہ ہم دونوں میں ایک ہدایت پر یا گمراہی میں ہے۔ سوچو! ہم دونوں میں سے کون ہدایت پر اور کون گمراہی میں ہوسکتا ہے؟ کس کی دلیل منطقی ہے اور کون اندھی تقلید پر ہے؟ کس کے موقف پر کوئی سند ہے اور کون سا موقف بے سند ہے؟

اہم نکات

۱۔ بندگی رَب کی ہوتی ہے۔ رَب وہ ہے جو رازق ہے۔

۲۔ ہمیں روزی ملنے میں تمام آسمان موثر ہیں: مِّنَ السَّمٰوٰتِ ....۔

۳۔ دلیل قائم کرنے کے لیے مدمقابل کی سطح پر آنا مؤثر ہے۔

قُلۡ لَّا تُسۡـَٔلُوۡنَ عَمَّاۤ اَجۡرَمۡنَا وَ لَا نُسۡـَٔلُ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۲۵﴾

۲۵۔ کہد یجیے: ہمارے گناہوں کی تم سے پرسش نہیں ہوگی اور نہ ہی تمہارے اعمال کے بارے میں ہم سے سوال ہوگا۔

قُلۡ یَجۡمَعُ بَیۡنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ یَفۡتَحُ بَیۡنَنَا بِالۡحَقِّ ؕ وَ ہُوَ الۡفَتَّاحُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۲۶﴾

۲۶۔ کہد یجیے: ہمارا رب ہمیں جمع کرے گا پھر ہمارے درمیان حق پر مبنی فیصلہ فرمائے گا اور وہ بڑا فیصلہ کرنے والا، دانا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ قُلۡ لَّا تُسۡـَٔلُوۡنَ عَمَّاۤ اَجۡرَمۡنَا: اگر تم کسی دلیل و منطق کو تسلیم نہیں کرتے ہو اور اپنے عمل کا نتیجہ بھگتنے کے لیے آمادہ ہو، تمہیں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ہم تمہارے اعمال کے ذمے دار نہیں جیسا کہ تم ہمارے اعمال کے ذمے دار نہیں ہو۔

۲۔ اگر اعمال کے نتیجے کا انتظار کرنے کے لیے آمادہ ہو تو اس دن کا انتظار کرو جس دن رب ہمیں جمع کرے گا پھر ہمارے درمیاں فیصلہ کرے گا۔

۳۔ وَ ہُوَ الۡفَتَّاحُ الۡعَلِیۡمُ: فتاح جدا کرنے، کھولنے والے کو کہتے ہیں۔ فیصلہ میں چونکہ دو چیزوں میں امتیاز کرنا ہے اس لیے فیصلہ کرنے والے کو فتاح کہتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ دعوت انبیاء علیہم السلام لوگوں کی نجات کے لیے ہے، کسی مفاد کے لیے نہیں: وَ لَا نُسۡـَٔلُ ....۔

۲۔ تصور قیامت انسان کو استقامت دیتا ہے: یَفۡتَحُ بَیۡنَنَا ....۔

قُلۡ اَرُوۡنِیَ الَّذِیۡنَ اَلۡحَقۡتُمۡ بِہٖ شُرَکَآءَ کَلَّا ؕ بَلۡ ہُوَ اللّٰہُ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ﴿۲۷﴾

۲۷۔ کہد یجیے: مجھے وہ تو دکھاؤ جنہیں تم نے شریک بنا کر اللہ کے ساتھ ملا رکھا ہے، ہرگز نہیں، بلکہ بڑا غالب آنے والا، حکمت والا صرف اللہ ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ قُلۡ اَرُوۡنِیَ الَّذِیۡنَ اَلۡحَقۡتُمۡ بِہٖ: تم ان شریکوں کا حدود اربعہ تو بیان کرو کہ ان میں میری ربوبیت میں شریک ہونے کی صلاحیت کہاں آ گئی۔ ان بے جان بتوں میں یہ صلاحیت ہے یا ان کے تابع فرمان فرشتوں میں؟ بے جان اور تابع دونوں میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وہ اس کی حاکمیت میں حصہ دار بن جائیں۔

۲۔ کَلَّا: ہرگز نہیں۔ نہ بے جان اللہ کا شریک ہو سکتا ہے، نہ اللہ کے تابع فرمان فرشتے۔

۳۔ بَلۡ ہُوَ اللّٰہُ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ: بلکہ اللہ ہی بالا دست ہے، کسی شریک کا محتاج نہیں ہے۔ حکیم ہے۔ اس کی حکمت میں کسی کی مداخلت نہیں ہو سکتی۔

اہم نکات

۱۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت اور حاکمیت میں کسی شریک کا تصور نہیں ہو سکتا۔

وَ مَاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیۡرًا وَّ نَذِیۡرًا وَّ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۸﴾

۲۸۔ اور ہم نے آپ کو تمام انسانوں کے لیے فقط بشارت دینے والا اور تنبیہ کرنے والا بنا کر بھیجا ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ مَاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ: مکہ میں نازل ہونے والی یہ آیت مستشرقین کے اس اعتراض کا دندان شکن جواب ہے جو کہتے ہیں: محمدؐ کا شروع میں خیال یہ تھا کہ وہ صرف اہل مکہ اور اس کے گرد و پیش کی چند بستیوں کی طرف مبعوث ہوئے ہیں، بعد میں غیر متوقع کامیابی دیکھ کر یہ دعویٰ شروع کیا کہ میں پورے جزیرۃ العرب کی طرف مبعوث ہوا ہوں اور بعد میں دعویٰ کیا کہ پورے عالم کی طرف مبعوث ہوا ہوں۔

کَآفَّۃً: کے ایک یہ معنی بھی کیے جاتے ہیں کہ یہ کف سے ہے جو روکنے کے معنوں میں ہے اور کَآفَّۃً میں تاء مبالغہ کے لیے ہے جیسے علامۃ میں اور مطلب یہ ہے کہ آپؐ کو لوگوں کو کفر سے روکنے کے لیے مبعوث کیا ہے۔ یہ معنی اس ترکیب کلام میں ہرگز درست نہیں ہے چونکہ قرآنی استعمالات میں اس قسم کی کوئی نظیر نہیں ملتی کہ آپؐ کو کفر سے روکنے والا کہا ہو۔ قرآن کف کا لفظ استعمال نہیں کرتا جو طاقت کے ذریعے روکنے کے معنوں میں ہے۔ جیسے فَکَفَّ اَیۡدِیَہُمۡ عَنۡکُمۡ ....[1] بلکہ نَذِیۡرًا کا لفظ استعمال کرتا ہے جو تنبیہ کے ساتھ تبلیغ کے معنوں میں ہے۔ لسان العرب میں آیا ہے: الانذار الابلاغ ولا یکون الا فی التخویف: انذار ابلاغ کو کہتے ہیں جو صرف اس ابلاغ کے لیے ہوتا ہے جس میں عاقبت بد سے ڈرانا مقصود ہو۔

---

[1] ۵ مائدۃ: ۱۱

قرآن لفظ کَآفَّۃً، عامۃ کے معنوں میں استعمال کرتا ہے۔ جیسے:

ادۡخُلُوۡا فِی السِّلۡمِ کَآفَّۃً ...[1]	تم سب کے سب (دائرہ) امن و آشتی میں آ جاؤ۔
وَ قَاتِلُوا الۡمُشۡرِکِیۡنَ کَآفَّۃً کَمَا یُقَاتِلُوۡنَکُمۡ کَآفَّۃً ...[2]	اور تم، سب مشرکین سے لڑو جیسا کہ وہ تم سب سے لڑتے ہیں۔
وَ مَا کَانَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ لِیَنۡفِرُوۡا کَآفَّۃً ۔[3]	اور یہ تو ہو نہیں سکتا کہ سب کے سب مومنین نکل کھڑے ہوں۔

ان تمام آیات میں لفظ کَآفَّۃً عامۃ "سب کے سب" کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

نیز مکہ میں نازل ہونے والی دیگر متعدد آیات سے اس معنی کی تائید ہوتی ہے کہ آپؐ کی رسالت عالمی ہے۔

قُلۡ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیۡ رَسُوۡلُ اللّٰهِ اِلَیۡکُمۡ جَمِیۡعَۨا ...[4]	کہہ دیجیے: اے لوگو! میں تم سب کی طرف اس اللہ کا (بھیجا ہوا) رسول ہوں۔
تَبٰرَکَ الَّذِیۡ نَزَّلَ الۡفُرۡقَانَ عَلٰی عَبۡدِہٖ لِیَکُوۡنَ لِلۡعٰلَمِیۡنَ نَذِیۡرَا ...[5]	بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر فرقان نازل فرمایا تاکہ وہ سارے جہاں والوں کے لیے انتباہ کرنے والا ہو۔
وَ اُوۡحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الۡقُرۡاٰنُ لِاُنۡذِرَکُمۡ بِهٖ وَ مَنۡۢ بَلَغَ ...[6]	اور یہ قرآن میری طرف بذریعہ وحی نازل کیا گیا ہے تاکہ میں تمہیں اور جس تک یہ پیغام پہنچے سب کو تنبیہ کروں.
وَ مَاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا رَحۡمَۃً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ...[7]	اور (اے رسول) ہم نے آپ کو بس عالمین کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

یہ تمام آیات، مکہ میں نازل ہونے والی سورہ ہائے قرآن میں ہیں لہٰذا رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی رسالت کے عالمی ہونے کی تصریحات مکہ کے ابتدائی دنوں کی بات ہے، بعد کی نہیں۔

رہا یہ سوال کہ کَآفَّۃً حال نہیں ہو سکتا لِّلنَّاسِ کا، جو کہ مجرور ہے اور مجرور کا حال مقدم نہیں ہو سکتا؟

جواب: نحوی قواعد، استعمالات عرب کی روشنی میں ترتیب دیے گئے ہیں لہٰذا قرآنی استعمالات، نحوی قواعد کے لیے شاہد بنتے ہیں۔ اس طرح نحوی قواعد، استعمالات عرب کے تابع ہیں۔

دوسری قابل توجہ بات یہ ہے کہ کَآفَّۃً حال ہے اَرۡسَلۡنٰکَ میں کاف خطاب کا، نہ للناس کا۔ (بیضاوی)

---

[1] ۲ بقرۃ: ۲۰۸ [2] ۹ توبۃ: ۳۶ [3] ۹ توبۃ: ۱۲۲ [4] ۷ اعراف: ۱۵۸
[5] ۲۵ فرقان: ۱ [6] ۶ انعام: ۱۹ [7] ۲۱ انبیاء: ۱۰۷

تیسری بات مجرور کا حال مقدم ہونا محققین کے ہاں جائز ہے۔ جیسا کہ ابو علی الفارسی۔ ابن کیسان، ابن عطیہ اور سید رضی جواز کے قائل ہیں۔ (التحریر و التنویر)۔

اہم نکات

۱۔ رسول اسلام صلى الله عليه وآله وسلم کی رسالت عالمی ہے۔

۲۔ رسالت دو بنیادوں: بشارت و نذارت پر قائم ہے۔

وَیَقُوۡلُوۡنَ مَتٰی ہٰذَا الۡوَعۡدُ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۲۹﴾	۲۹۔ اور یہ کہتے ہیں: اگر تم لوگ سچے ہو (تو بتاؤ قیامت کے) وعدے کا دن کب آنے والا ہے؟
قُلۡ لَّکُمۡ مِّیۡعَادُ یَوۡمٍ لَّا تَسۡتَاۡخِرُوۡنَ عَنۡہُ سَاعَۃً وَّ لَا تَسۡتَقۡدِمُوۡنَ ﴿۳۰﴾	۳۰۔ کہدیجیے: تم سے ایک دن کا وعدہ ہے جس سے تم نہ ایک گھڑی پیچھے ہٹ سکو گے اور نہ آگے بڑھ سکو گے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَیَقُوۡلُوۡنَ مَتٰی ہٰذَا الۡوَعۡدُ: منکرین قیامت اپنے انکاری لہجے میں بطور استہزا کہتے تھے کہ جس قیامت سے ہمیں ڈراتے ہو وہ کب آنے والی ہے۔

۲۔ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ: اگر دعوائے قیامت میں سچے ہو تو اس کی تاریخ کا تعین کرو۔ اس جملے میں جمع کا صیغہ اس لیے استعمال ہوا ہے کہ اس کے مخاطبین میں رسول صلى الله عليه وآله وسلم اور قیامت پر ایمان لانے والے سب شامل ہیں۔

۳۔ قُلۡ لَّکُمۡ مِّیۡعَادُ: یوم قیامت کے لیے اس نظام کائنات کے تحت ایک وقت مقرر ہے۔ اس مقررہ وقت کو اللہ تعالیٰ نے پوشیدہ رکھا ہے۔

اِنَّ السَّاعَۃَ اٰتِیَۃٌ اَکَادُ اُخۡفِیۡہَا لِتُجۡزٰی کُلُّ نَفۡسٍۭ بِمَا تَسۡعٰی ﴿﴾ [1]	قیامت یقیناً آنے والی ہے، میں اسے پوشیدہ رکھوں گا تاکہ ہر فرد کو اس کی سعی کے مطابق جزا ملے۔

چنانچہ یہ علم صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے۔

وَ عِنۡدَہٗ عِلۡمُ السَّاعَۃِ ۚ وَ اِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿﴾ [2]	اور اسی کے پاس قیامت کا علم ہے اور تم سب اسی کی طرف پلٹائے جاؤ گے۔

---

[1] ۲۰ طہ: ۱۵ [2] ۴۳ زخرف: ۸۵

۴۔ لَا تَسۡتَاۡخِرُوۡنَ عَنۡہُ سَاعَۃً: قیامت کا دن مقرر اور معین ہے۔ اس مقررہ وقت سے ایک لحہ کے لیے تقدیم تاخیر نہیں ہو سکتی۔ یہ بات ہم سب کے مشاہدے میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وضع کردہ مقررہ نظام میں تبدیلی نہیں آتی۔ مثلاً جس لمحے میں سورج نے طلوع کرنا ہے اسی مقررہ وقت پر اربوں سال سے طلوع کر رہا ہے۔

البتہ یہ علم صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے کہ اس نظام کی عمر کیا ہے اور کس لمحے یہ عمر ختم ہونے والی ہے۔

ہَلۡ یَنۡظُرُوۡنَ اِلَّا السَّاعَۃَ اَنۡ تَاۡتِیَہُمۡ بَغۡتَۃً ...[1] | کیا یہ لوگ صرف قیامت کے منتظر ہیں کہ وہ ان پر اچانک آپڑے...

جب نظام کائنات کی عمر ختم ہو جائے گی، قیامت اچانک آ جائے گی۔

اہم نکات

۱۔ نظام کائنات کا وہ راز صرف اللہ کے پاس ہے جس کے تحت دفعتاً قیامت آنے والی ہے۔

۲۔ اللہ کے وضع کردہ نظام میں تقدیم و تاخیر نہیں ہے۔

وَ قَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لَنۡ نُّؤۡمِنَ بِہٰذَا الۡقُرۡاٰنِ وَ لَا بِالَّذِیۡ بَیۡنَ یَدَیۡہِ ؕ وَ لَوۡ تَرٰۤی اِذِ الظّٰلِمُوۡنَ مَوۡقُوۡفُوۡنَ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ ۚۖ یَرۡجِعُ بَعۡضُہُمۡ اِلٰی بَعۡضِۣ الۡقَوۡلَ ۚ یَقُوۡلُ الَّذِیۡنَ اسۡتُضۡعِفُوۡا لِلَّذِیۡنَ اسۡتَکۡبَرُوۡا لَوۡ لَاۤ اَنۡتُمۡ لَکُنَّا مُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۳۱﴾

۳۱۔ اور کفار کہتے ہیں: ہم اس قرآن پر ہرگز ایمان نہ لائیں گے اور نہ (ان کتابوں پر) جو اس سے پہلے ہیں اور کاش آپ ان کا وہ حال دیکھ لیتے جب یہ ظالم اپنے رب کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے اور ایک دوسرے پر الزام عائد کر رہے ہوں گے، (چنانچہ) جو لوگ دبے ہوئے ہوتے تھے وہ بڑا بننے والوں سے کہیں گے: اگر تم نہ ہوتے تو ہم مومن ہوتے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ قَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لَنۡ نُّؤۡمِنَ: مشرکین کسی نبوت کو نہیں مانتے تھے لہٰذا جہاں وہ قرآن کو نہیں مانتے تھے وَ لَا بِالَّذِیۡ، توریت و انجیل کو بھی نہیں مانتے تھے۔ جب وہ توریت و انجیل کو نہیں مانتے تھے تو ان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی آمد کی بشارت کو بھی نہیں مانتے تھے۔ وہ کہتے تھے:

مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ عَلٰی بَشَرٍ مِّنۡ شَیۡءٍ ...[1]		اللہ نے کسی بشر پر کچھ نازل نہیں کیا۔

۲۔ وَلَوۡ تَرٰۤی اِذِ الظّٰلِمُوۡنَ: اے رسول! اگر آپ اس منظر کو دیکھ لیتے کہ مشرکین اپنے جرائم کا جواب دینے کے لیے اللہ کی بارگاہ میں کھڑے ہیں تو یہ منظر نہایت خوفناک منظر ہوتا۔

۳۔ یَرۡجِعُ بَعۡضُہُمۡ اِلٰی بَعۡضِۣ الۡقَوۡلَ: یہ ظالمین ایک دوسرے پر الزام لگا رہے ہوں گے۔ یہ افسوسناک دن دیکھنے کی ذمہ داری ایک دوسرے پر ڈال رہے ہوں گے۔ اگلے جملے میں اس الزام کا مضمون مذکور ہے۔

۴۔ یَقُوۡلُ الَّذِیۡنَ اسۡتُضۡعِفُوۡا: جن لیڈروں، سرداروں اور مذہبی رہزنوں کی باتیں یہ لوگ دنیا میں آنکھیں بند کر کے مان لیتے تھے، آخرت میں حقیقت کا مشاہدہ کرنے پر ان کے خلاف بولیں گے۔ دنیا میں تو وہ ان کے سامنے لب کشائی نہیں کرتے تھے لیکن آخرت میں ساری ذمہ داری ان پر ڈالیں گے۔

۵۔ لَوۡلَاۤ اَنۡتُمۡ لَکُنَّا مُؤۡمِنِیۡنَ: اگر تم نہ ہوتے تو ہم مؤمن ہوتے۔ اگر تم ہمارے ذہن غلط فہمیوں سے پُر نہ کرتے تو ہم حرف حق سننے کے قابل ہو جاتے اور ایمان لے آتے۔

قَالَ الَّذِیۡنَ اسۡتَکۡبَرُوۡا لِلَّذِیۡنَ اسۡتُضۡعِفُوۡۤا اَنَحۡنُ صَدَدۡنٰکُمۡ عَنِ الۡہُدٰی بَعۡدَ اِذۡ جَآءَکُمۡ بَلۡ کُنۡتُمۡ مُّجۡرِمِیۡنَ ﴿۳۲﴾	۳۲۔ اور بڑا بننے والے دبے رہنے والوں سے کہیں گے: ہدایت تمہارے پاس آ جانے کے بعد کیا ہم نے تمہیں اس سے روکا تھا؟ (نہیں) بلکہ تم خود ہی مجرم ہو۔

تفسیر آیات

دنیا میں اپنے زیر اثر لوگوں سے سرداران کہیں گے: تم نے خود اپنی آزادی کو فروخت کیا تھا۔ تم ذہنی طور پر غلام تھے اور اپنی مرضی سے گمراہی میں چلے گئے۔ ورنہ تم تک حق کی دعوت پہنچ گئی تھی۔

بَلۡ کُنۡتُمۡ مُّجۡرِمِیۡنَ: بلکہ تم خود ہی مجرم ہو۔ مستکبرین کے جواب میں ہدایت کی دعوت پہنچنے اور حجت پوری ہونے کا اقرار موجود ہے جب کہ یہ لوگ دنیا میں اس دعوت کو حقارت کے ساتھ ٹھکراتے رہے۔ ۱۶۹
اگر دنیا میں ہوتے، یہ غلام ذہن رکھنے والے مستکبرین کے سامنے لب کشائی نہیں کر سکتے تھے لیکن قیامت کے دن مستکبرین کے مقابلے میں برابری کی بنیاد پر بات کرتے ہیں۔

وَقَالَ الَّذِیۡنَ اسۡتُضۡعِفُوۡا لِلَّذِیۡنَ اسۡتَکۡبَرُوۡا بَلۡ مَکۡرُ الَّیۡلِ وَالنَّہَارِ	۳۳۔ اور کمزور لوگ بڑا بننے والوں سے کہیں گے: بلکہ یہ رات دن کی چالیں تھیں جب تم ہمیں اللہ

----

[1] ۶ انعام: ۹۱

اِذۡ تَاۡمُرُوۡنَنَاۤ اَنۡ نَّکۡفُرَ بِاللّٰہِ وَ نَجۡعَلَ لَہٗۤ اَنۡدَادًا ؕ وَ اَسَرُّوا النَّدَامَۃَ لَمَّا رَاَوُا الۡعَذَابَ ؕ وَ جَعَلۡنَا الۡاَغۡلٰلَ فِیۡۤ اَعۡنَاقِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا ؕ ہَلۡ یُجۡزَوۡنَ اِلَّا مَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۳۳﴾

سے کفر کرنے اور اس کے لیے ہمسر بنانے کے لیے کہتے تھے، جب وہ عذاب کو دیکھ لیں گے تو دل میں ندامت لیے بیٹھیں گے اور ہم کفار کی گردنوں میں طوق ڈالیں گے، کیا ان کو اس کے سوا کوئی بدلہ ملے گا جس کے یہ مرتکب ہوا کرتے تھے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ قَالَ الَّذِیۡنَ اسۡتُضۡعِفُوۡا: کمزور طبقے کا یہ جواب ہوگا: درست ہے ہم تک ہدایت پہنچ گئی تھی، حجت پوری ہوگئی تھی اس وجہ سے ہم مجرم ضرور ہیں مگر اس میں تمہارا کردار بنیادی تھا۔

۲۔ بَلۡ مَکۡرُ الَّیۡلِ وَ النَّہَارِ: وہ بنیادی کردار تمہاری دن رات کی چالیں اور تمہارے شب و روز کی فریب کاریاں تھیں۔

۳۔ اِذۡ تَاۡمُرُوۡنَنَاۤ اَنۡ نَّکۡفُرَ بِاللّٰہِ: تم نے ہمارے کفر اختیار کرنے کے لیے اپنا اثر و رسوخ استعمال اور اللہ کے لیے شریک بنانے میں تم نے جو کردار ادا کیا، وہ بھی معلوم ہے۔

۴۔ وَ اَسَرُّوا النَّدَامَۃَ: اس گفتگو کے مکمل ہونے کے بعد جب عذاب کا فیصلہ ہوتا ہے اور عذاب سامنے آجاتا ہے تو اس وقت دونوں فریق دل میں ندامت لیے بیٹھیں گے۔

۵۔ وَ جَعَلۡنَا الۡاَغۡلٰلَ: عذاب کے مشاہدے کے بعد اب عذاب شروع ہو جاتا ہے اور ان کی گردنوں کو زنجیروں میں جکڑ دیا جاتا ہے۔

۶۔ ہَلۡ یُجۡزَوۡنَ اِلَّا مَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ: دنیا میں جو ان کا عمل ہوگا، وہی عمل سزا بن کر ان کی گردن کا طوق بن جائے گا۔ عمل انرجی ہے۔ انرجی دائمی چیز ہے کہ یہ عمل اگر اچھا ہے تو انسان کا ساتھ نہیں چھوڑتا اور اگر برا ہے تو انسان کی جان نہیں چھوڑتا مگر یہ کہ اللہ عفو اور مغفرت کے طور پر اس عمل کے اثر کو زائل فرما دے۔ برے عمل کا اثر زائل کرنے کو مغفرت کہتے ہیں اور اچھے عمل کا اثر زائل کرنے کو حبط کہتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ طفلی سوچ رکھنے والے فکری استحصال کا شکار ہوتے ہیں۔

۲۔ انسان کا برا عمل انسان کی جان نہیں چھوڑتا: مَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ۔

وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا فِیۡ قَرۡیَۃٍ مِّنۡ نَّذِیۡرٍ اِلَّا قَالَ مُتۡرَفُوۡہَاۤ ۙ اِنَّا بِمَاۤ اُرۡسِلۡتُمۡ بِہٖ کٰفِرُوۡنَ ﴿۳۴﴾

۳۴۔اور ہم نے کسی بستی کی طرف کسی تنبیہ کرنے والے کو نہیں بھیجا مگر یہ کہ وہاں کے مراعات یافتہ لوگ کہتے تھے: جو پیغام تم لے کر آئے ہو ہم اسے نہیں مانتے۔

وَ قَالُوۡا نَحۡنُ اَکۡثَرُ اَمۡوَالًا وَّ اَوۡلَادًا ۙ وَّ مَا نَحۡنُ بِمُعَذَّبِیۡنَ ﴿۳۵﴾

۳۵۔اور کہتے تھے: ہم اموال اور اولاد میں بڑھ کر ہیں، ہم پر عذاب نہیں ہوگا۔

تشریح کلمات

مترف: (ت ر ف) التُّرفۃ عیش و عشرت میں فراخی اور وسعت کو کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا فِیۡ قَرۡیَۃٍ مِّنۡ نَّذِیۡرٍ: خوشحالی اور ناز و نعمت کی فراوانی سے قدریں بدل جاتی ہیں اور دلوں کو زنگ لگ جاتا ہے۔ دولت انسان کو بے نیازی کے غلط احساس میں مبتلا کر دیتی ہے:

کَلَّاۤ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَیَطۡغٰۤی ۙ اَنۡ رَّاٰہُ اسۡتَغۡنٰی ؕ [1]	ہرگز نہیں! انسان تو یقیناً سرکشی کرتا ہے۔ اس بنا پر کہ وہ اپنے آپ کو بے نیاز خیال کرتا ہے۔

پھر انبیاء علیہم السلام کی دعوت اور اس مراعات یافتہ طبقے کے مفادات میں ٹکراؤ ہے۔ انبیاء علیہم السلام مال کو وسیلہ سمجھتے ہیں اور یہ لوگ مال کو منزل سمجھتے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام عدل و انصاف کی دعوت دیتے ہیں۔ یہ لوگ استحصال کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ پھر مال کے سیاہ پردوں کے پیچھے دل تک حق کی آواز نہیں پہنچ پاتی۔

قرآن نے اس بات کو ایک کلی امر کے طور پر بیان فرمایا ہے کہ جب بھی اور جہاں بھی ہم نے کسی بستی میں رسول بھیجا، وہاں مراعات یافتہ اور ناز پروروں نے اس رسول کو قبول کرنے سے انکار کیا۔ سورۂ زخرف کی آیت ۲۳ میں بھی اسی مطلب کو ایک کلیہ کے طور پر بیان فرمایا ہے:

وَکَذٰلِکَ مَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِکَ فِیۡ قَرۡیَۃٍ مِّنۡ نَّذِیۡرٍ اِلَّا قَالَ مُتۡرَفُوۡہَاۤ ۙ اِنَّا وَجَدۡنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤی اُمَّۃٍ وَّ اِنَّا عَلٰۤی اٰثٰرِہِمۡ مُّقۡتَدُوۡنَ ○	اور اسی طرح ہم نے آپ سے پہلے کسی بستی کی طرف کوئی تنبیہ کرنے والا نہیں بھیجا مگر یہ کہ وہاں کے عیش پرستوں نے کہا: ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک رسم پر پایا اور ہم انہی کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔

۲۔ وَ قَالُوۡا نَحۡنُ اَکۡثَرُ اَمۡوَالًا: دولت کے نشے میں مدہوش یہ لوگ کہتے ہیں: ہمارے پاس

---

[1] ۹۶ علق: ۶۔۷

چونکہ مال و اولاد کی فراوانی ہے، یہ اس بات کی علامت ہے کہ اللہ ہم سے راضی ہے اور جب اللہ کی خوشنودی ہمارے ساتھ ہے تو اللہ ہمیں عذاب نہیں دے گا۔

وَّمَاۤ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّلَئِنۡ رُّدِدۡتُّ اِلٰی رَبِّیۡ لَاَجِدَنَّ خَیۡرًا مِّنۡهَا مُنۡقَلَبًا ۝ [1]

اور میں خیال نہیں کرتا کہ قیامت آنے والی ہے اور اگر مجھے میرے رب کے حضور پلٹا دیا گیا تو میں ضرور اس سے بھی اچھی جگہ پاؤں گا۔

اہم نکات

۱۔ دولت کے سیاہ پردوں کے پیچھے موجود دل تک حق کی آواز نہیں پہنچتی۔

۲۔ دولت مند ہمیشہ داعیان حق کے مخالف ہوتے ہیں۔

قُلۡ اِنَّ رَبِّیۡ یَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَ یَقۡدِرُ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۳۶﴾

۳۶۔ کہد یجیے: میرا رب جس کے لیے چاہتا ہے رزق فراوان اور تنگ کر دیتا ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

تفسیر آیات

۱۔ قُلۡ اِنَّ رَبِّیۡ: رزق کی فروانی مؤمن کے لیے نعمت اور کافر کے لیے عذاب کا باعث ہے۔ لہٰذا اللہ اس مؤمن کے لیے رزق کی فروانی چاہے گا جو فزونی نعمت کے امتحان میں کامیابی حاصل کرے گا اور اگر کامیابی کی امید نہ ہو تو اللہ اس پر رحم فرماتا ہے اور اسے نعمت کی فزونی سے محروم رکھتا ہے۔ البتہ وہ کافر پر یہ رحم نہیں کرے گا اور اسے نعمتوں سے مالا مال کرے گا تا کہ اس کے عذاب میں اضافہ ہو:

فَلَا تُعۡجِبۡكَ اَمۡوَالُهُمۡ وَ لَاۤ اَوۡلَادُهُمۡ ؕ اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰهُ لِیُعَذِّبَهُمۡ ... [2]

لہٰذا ان کے اموال اور اولاد کہیں آپ کو فریفتہ نہ کر دیں، اللہ تو بس یہ چاہتا ہے کہ ان چیزوں سے انہیں دنیاوی زندگی میں بھی عذاب دے

۲۔ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ: اکثر لوگ اس راز کو نہیں سمجھتے بلکہ اس کے برعکس یہ خیال کرتے ہیں کہ اللہ جس سے راضی ہے اسے دولت دیتا ہے۔ جس سے اللہ راضی نہیں اسے غریب رکھتا ہے۔

وَ مَاۤ اَمۡوَالُکُمۡ وَ لَاۤ اَوۡلَادُکُمۡ

۳۷۔ اور تمہارے اموال و اولاد ایسے نہیں جو تمہیں

---

[1] ۱۸ کہف: ۳۶   [2] ۹ توبۃ: ۵۵

بِالَّتِیۡ تُقَرِّبُکُمۡ عِنۡدَنَا زُلۡفٰۤی اِلَّا مَنۡ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا ۫ فَاُولٰٓئِکَ لَہُمۡ جَزَآءُ الضِّعۡفِ بِمَا عَمِلُوۡا وَ ہُمۡ فِی الۡغُرُفٰتِ اٰمِنُوۡنَ ﴿۳۷﴾

ہماری قربت میں درجہ دلائیں سوائے اس کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرے، پس ان کے اعمال کا دگنا ثواب ہے اور وہ سکون کے ساتھ بالا خانوں میں ہوں گے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَمَاۤ اَمۡوَالُکُمۡ وَلَاۤ اَوۡلَادُکُمۡ: غیر مؤمن مال، برائے مال چاہتا ہے اور مال غیر مؤمن کے نزدیک بذات خود منزل ہے۔ اسی طرح اولاد کا محض وجود غیر مؤمن کا مقصد ہے۔ اس آیۂ شریفہ میں فرمایا: مال و اولاد کا صرف وجود باعث قرب الٰہی نہیں ہے۔

۲۔ اِلَّا مَنۡ اٰمَنَ: مال، مؤمن کی نظر میں کسی مقدس مقصد کے حصول کا ذریعہ اور وسیلہ ہے۔ اس صورت میں مال کی وہی قیمت ہے جو مقصد کی ہے۔ جب مال کسی مقدس مقصد میں فنا ہو جاتا ہے تو مال و اولاد کو بھی تقدس حاصل ہو جاتا ہے۔ اِلَّا مَنۡ اٰمَنَ سے معلوم ہوا مؤمن ایمان کے سائے میں مال و اولاد کے ذریعے قرب الٰہی حاصل کر لیتا ہے۔

فی سبیل اللہ مال خرچ کر کے نیکی کے اعلیٰ مقام پر فائز ہو جاتا ہے:

لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰی تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ ...[1] جب تک تم اپنی پسند کی چیزوں میں سے خرچ نہ کرو تب تک کبھی نیکی کو نہیں پہنچ سکتے۔

مؤمن اولاد کو نیک تربیت دے کر باقیات الصالحات میں شمار ہونے کے قابل بناتا ہے تو اولاد کے اعمال صالحہ میں سے والدین کو بھی حصہ ملتا رہے گا۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ قیامت کے دن مؤمن کی صالح اولاد کام آئے گی۔ جیسا کہ سورۂ الرعد آیت ۲۳ اور سورۂ غافر آیت ۸ میں فرمایا:

جَنّٰتُ عَدۡنٍ یَّدۡخُلُوۡنَہَا وَ مَنۡ صَلَحَ مِنۡ اٰبَآئِہِمۡ ... ایسی دائمی جنتیں ہیں جن میں وہ خود بھی داخل ہوں گے اور ان کے آباء بھی۔

اگر کسی کے باپ دادا صالح مؤمن تو ہیں لیکن اولاد کے درجے پر فائز نہیں ہیں لہٰذا وہ جنت عدن میں داخل ہونے کے درجہ پر نہ ہوں گے، اس کی اولاد کی خاطر اس والد کو بھی جنت عدن میں داخل کیا جائے گا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں قیامت میں اولاد بھی کام آتی ہے۔

---

[1] ۳ آل عمران: ۹۲

۳۔ فَاُولٰٓئِكَ لَهُمۡ جَزَآءُ الضِّعۡفِ: ان لوگوں کے لیے ان کے اعمال کا ثواب کئی گنا ہوگا۔ مال کے ذریعے تو سورۂ بقرہ آیت ۲۶۱ کے تحت ایک کے مقابلے میں سات سو گنا اور خاص بندوں کے لیے ۱۴ سو گنا ثواب مل جائے گا۔

اولاد صالح کے ذریعے ان کے نیک اعمال میں سے والدین کو بھی حصہ ملتا رہے گا۔

۴۔ وَهُمۡ فِی الۡغُرُفٰتِ اٰمِنُوۡنَ: وہ جنت کے بالا خانوں میں امن سے رہیں گے۔ وہاں انہیں کسی ایسی چیز کا خوف لاحق نہیں رہے گا جو دنیا میں رہا کرتا تھا۔ فقر، بیماری، بڑھاپا، موت وغیرہ کا کوئی خوف نہ ہوگا۔

اہم نکات

۱۔ مؤمن کے لیے مال و اولاد وسیلۂ قرب الٰہی بن سکتے ہیں۔

۲۔ صالح اولاد دنیا و آخرت دونوں میں کام آتی ہے۔

وَالَّذِیۡنَ یَسۡعَوۡنَ فِیۡۤ اٰیٰتِنَا مُعٰجِزِیۡنَ اُولٰٓئِكَ فِی الۡعَذَابِ مُحۡضَرُوۡنَ ﴿۳۸﴾

۳۸۔ اور جو لوگ ہماری آیات کے بارے میں سعی کرتے ہیں کہ (ہم کو) مغلوب کریں یہ لوگ عذاب میں حاضر کیے جائیں گے۔

تفسیر آیات

جنت عدن کے بالا خانوں میں رہنے والوں کے مقابلے وہ لوگ جو ہماری آیتوں کی تکذیب کرتے اور ہمارے انبیاء علیہم السلام کو ناکام بنانے کی سعی میں مشغول رہتے ہیں، عذاب میں مبتلا رہیں گے۔

قُلۡ اِنَّ رَبِّیۡ یَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِهٖ وَ یَقۡدِرُ لَهٗ ؕ وَ مَاۤ اَنۡفَقۡتُمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ فَهُوَ یُخۡلِفُهٗ ۚ وَ هُوَ خَیۡرُ الرّٰزِقِیۡنَ ﴿۳۹﴾

۳۹۔ کہدیجیے: میرا رب اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے فراوانی اور تنگی سے رزق دیتا ہے اور جو کچھ تم خرچ کرتے ہو اس کی جگہ وہ اور دیتا ہے اور وہ سب سے بہتر رزق دینے والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ قُلۡ اِنَّ رَبِّیۡ یَبۡسُطُ الرِّزۡقَ: اس جملے کی تشریح اسی سورہ کی آیت ۳۶ میں ہو چکی ہے۔

۲۔ وَ مَاۤ اَنۡفَقۡتُمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ فَهُوَ یُخۡلِفُهٗ: جو تم راہ خدا میں خرچ کرتے ہو اس کی جگہ وہ اور دیتا ہے۔ دنیا میں نعمت کی فراوانی اور آخرت میں ثواب کی صورت میں۔

رسول اللہ ﷺ سے روایت ہے:

اَنْفِقْ اَنْفِقُ عَلَيْكَ۔[1] تو دے دو میں تجھے دے دوں گا۔

دوسری حدیث میں آیا ہے کہ ایک فرشتہ ہر رات ندا دیتا ہے:

اللّٰهم هب للمنفق خلفا۔[2] اے اللہ! خرچ کرنے والوں کو اس کی جگہ اور دے دے۔

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

اِذَااَمْلَقْتُمْ فَتَاجِرُوا اللّٰهَ بِالصَّدَقَةِ۔[3] اگر تنگدست ہو جاؤ تو صدقہ دے کر اللہ سے سودا کرو۔

رسول کریم ﷺ سے حدیث ہے:

مَنْ اَيْقَنَ بِالْخَلَفِ سَخَتْ نَفْسُهُ بِالنَّفَقَةِ۔[4] جو مزید ملنے پر یقین رکھتا ہے وہ خرچ کرنے میں سخاوت سے کام لیتا ہے۔

رسول کریم ﷺ سے روایت ہے:

وَ مَا اَنْفَقَ الرَّجُلُ مِنْ نَفَقَةٍ فَعَلَى اللّٰهِ خَلْفُهَا ضَمَاناً...۔[5] مرد جو بھی خرچ کرتا ہے تو اللہ ضامن ہے اس کی جگہ اور دینے کا۔

رسول کریم ﷺ کی ایک حدیث قابل توجہ ہے:

كل معروف صدقة و ما انفق الرجل على نفسه واهله كتب له صدقة وما وقى به الرجل عرضه فهو صدقة و ما انفق الرجل من نفقة فعلى الله خلفها الا ما كان من نفقة فى بنيان او معصية۔[6] ہر نیکی صدقہ ہے۔ انسان اپنی ذات، اپنے اہل و عیال پر جو خرچ کرتا ہے وہ صدقہ ہے اور جس مال سے انسان اپنی عزت، وقار محفوظ کر لیتا ہے وہ بھی صدقہ ہے۔ انسان جو بھی خرچ کرتا ہے اللہ کے ذمے ہے اس کی جگہ اور دینا مگر یہ کہ (غیر ضروری) عمارت پر یا گناہ پر خرچ کیا ہو۔

توجہ رہے کہ اگر کوئی شخص نیکی کی راہ میں مال خرچ کرتا ہے مگر اس سے اس کے مال میں اضافہ نہیں ہوتا ہے تو سمجھ لے اس کے مال کے حلال ہونے میں شبہ ہے ورنہ اللہ نے اس کی جگہ مزید دینے کی ضمانت دی ہے۔

اہم نکات

۱۔ بہترین سودا وہ ہے جو صدقہ کی صورت میں اللہ کے ساتھ ہو۔

---

۱ تفسیر قرطبی ذیل آیت۔ تفسیر مجمع البیان ذیل آیت۔ ۲ مجمع البیان ذیل آیت۔
۳ نہج البلاغۃ کلمات قصار: ۲۵۸ ۴ الکافی ۴: ۴۳
۵ مستدرك الوسائل ۱۵: ۲۶۷۔ مجمع البیان ذیل آیہ ۶ تفسیر قرطبی ذیل آیت

وَ یَوۡمَ یَحۡشُرُہُمۡ جَمِیۡعًا ثُمَّ یَقُوۡلُ لِلۡمَلٰٓئِکَۃِ اَہٰۤؤُلَآءِ اِیَّاکُمۡ کَانُوۡا یَعۡبُدُوۡنَ﴿۴۰﴾	۴۰۔ اور جس دن وہ ان سب لوگوں کو جمع کرے گا پھر فرشتوں سے پوچھے گا: کیا یہ لوگ تمہاری پرستش کرتے تھے؟
قَالُوۡا سُبۡحٰنَکَ اَنۡتَ وَلِیُّنَا مِنۡ دُوۡنِہِمۡ ۚ بَلۡ کَانُوۡا یَعۡبُدُوۡنَ الۡجِنَّ ۚ اَکۡثَرُہُمۡ بِہِمۡ مُّؤۡمِنُوۡنَ﴿۴۱﴾	۴۱۔ وہ کہیں گے: پاک ہے تیری ذات، تو ہی ہمارا آقا ہے نہ کہ وہ، بلکہ وہ تو جنات کی پرستش کرتے تھے اور ان کی اکثریت انہی کو مانتی ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ یَوۡمَ یَحۡشُرُہُمۡ جَمِیۡعًا: قیامت کے دن جب سب کو جمع کیا جائے گا تو یہ مشرکین جن لوگوں کی پوجا کرتے تھے ان معبودوں سے بھی سوال ہوگا: کیا تم نے ان مشرکین کو اپنی پوجا کرنے دعوت یا اجازت دی تھی؟ چنانچہ فرشتوں سے پوچھا جائے گا کیا یہ لوگ تمہاری عبادت کرتے تھے؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بھی پوچھا جائے گا:

ءَاَنۡتَ قُلۡتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوۡنِیۡ وَ اُمِّیَ اِلٰہَیۡنِ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ ۔۔۔[1]	کیا آپ نے لوگوں سے کہا تھا کہ اللہ کے سوا مجھے اور میری والدہ کو خدا بناؤ؟

اس سوال کا اصل مقصد ان مشرکین کو حقیقت حال سے آگاہ کرنا ہے کہ تم دنیا میں جن کی پوجا کرتے رہے ہو وہ خود اپنے آپ کو تمہارا معبود قبول نہیں کرتے۔

ممکن ہے اس کا مطلب یہ ہو کہ فرشتے مشرکین کی عبادت کو قبول نہیں کرتے تھے لیکن جنات قبول کرتے ہوں۔

واضح رہے مشرکین تین قسم کے لوگوں کی عبادت کرتے تھے: فرشتوں، جنات اور مقدس انسانوں کی۔ فرشتوں سے مفادات کی طمع کے لیے اور جنات کے شر سے بچنے کے لیے ان کی عبادت کرتے تھے۔ ممکن ہے "ہماری نہیں، جنات کی عبادت کرتے تھے" سے مراد یہ ہو کہ بظاہر وہ ہماری عبادت کرتے تھے لیکن اس گمراہی پر انہیں جنات نے اُکسایا تھا تو عبادت جنات کی ہوگئی۔

۲۔ قَالُوۡا سُبۡحٰنَکَ اَنۡتَ وَلِیُّنَا: تو پاک و پاکیزہ ہے۔ ہمارا رشتۂ ولائیت تیری ذات کے ساتھ مربوط ہے۔ ان مشرکین کے ساتھ ہمارا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ عبد اور معبود کا رشتہ، ولائیت اور محبت کا رشتہ ہے

---
[1] ۵ مائدہ: ۱۱۶

جیسا کہ حدیث میں آیا ہے:

هَلِ الدِّيْنُ اِلَّا الْحُبُّ؟[1]　　کیا دین محبت کے علاوہ کسی اور چیز کا نام ہے؟

جب یہ رشتہ قائم نہیں ہے تو اس بات کی از خود نفی ہو گئی کہ ہم ان کی پرستش چاہتے تھے۔

۳۔ بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ: البتہ ان کا یہ رشتہ جنات کے ساتھ قائم ہے۔ یہ مشرکین جنات جنات کی فرمانبرداری کرتے اور جنات کے اکسانے پر وہ ہماری عبادت کرتے تھے لہٰذا ان کے اور جنات کے درمیان رشتۂ اطاعت موجود ہے۔

فَالْيَوْمَ لَا يَمْلِكُ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ نَّفْعًا وَّلَا ضَرًّا ۭ وَنَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ﴿۴۲﴾

۴۲۔ لہٰذا آج تم میں سے کوئی ایک دوسرے کو نفع اور نقصان پہنچانے کا اختیار نہیں رکھتا اور ظالموں سے ہم کہدیں گے: اب چکھو اس جہنم کا عذاب جس کی تم تکذیب کرتے تھے۔

تفسیر آیات

۱۔ فَالْيَوْمَ لَا يَمْلِكُ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ: آج قیامت کے دن تم میں سے کوئی ایک دوسرے کے لیے سفارش وغیرہ کے ذریعے نفع پہنچانے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ جن کی تم نے پرستش کی ہے وہ تمہیں کوئی فائدہ نہیں دے سکیں گے اور تم ان معبودوں کے خلاف بھی کچھ نہیں کر سکتے۔ مثلاً جنات کی تم پرستش کرتے رہے۔ آج پتہ چلا جنات نے تمہیں گمراہ کیا تھا تو تم ان جنات سے کوئی انتقام بھی نہیں لے سکتے۔

۲۔ وَنَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا: آج صرف ہمارا حکم چلے گا اور ہم ہی یہ حکم جاری کریں گے کہ کفر و شرک اختیار کر کے جن لوگوں نے ظلم کا ارتکاب کیا ہے وہ عذاب کا مزہ چکھیں۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّا رَجُلٌ يُّرِيْدُ اَنْ يَّصُدَّكُمْ عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُكُمْ ۚ وَقَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّآ اِفْكٌ مُّفْتَرًى ۭ وَقَالَ الَّذِيْنَ

۴۳۔ اور جب ان پر ہماری واضح آیات کی تلاوت کی جاتی ہے تو کہتے ہیں: یہ شخص تو تمہیں تمہارے باپ دادا کے معبودوں سے روکنا چاہتا ہے اور کہتے ہیں: یہ (قرآن) تو محض ایک خود ساختہ جھوٹ ہے اور کفار (کا یہ وطیرہ رہا ہے کہ ان)

---

[1] الکافی ۸: ۷۹

كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۴۳﴾

کے پاس جب بھی حق آیا تو کہنے لگے: بے شک یہ تو کھلا جادو ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اِذَا تُتْلٰی عَلَیۡہِمۡ : مشرکین کے سرداروں نے رسول کریم ﷺ کے خلاف جو مہم چلائی وہ قومی روایات کو پامال کرنے کی بنا پر تھی چونکہ اللہ کی طرف سے جو آیات اور دلائل پیش ہوئے تھے وہ بینات، نہایت واضح تھے۔ ان کے مقابلے میں آبائی تقلید اور قومی روایات کو اٹھانے کے علاوہ کوئی اور حربہ ان کے پاس موجود نہ تھا۔

۲۔ وَقَالُوۡا مَا ھٰذَاۤ اِلَّاۤ اِفۡکٌ مُّفۡتَرًی : وہ ان آیات بینات کو اِفۡکٌ، جھوٹ قرار دیتے تھے جب کہ انہوں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ نے زندگی میں کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ مفتری اللہ کی طرف جھوٹی نسبت دینے والے کو کہتے ہیں۔ مشرکین اس بات کا بھی اعتراف کرتے تھے: محمد ﷺ نے اپنی زندگی میں کسی انسان پر افتراء نہیں باندھا۔

۳۔ وَقَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا: کفار کا حق کے مقابلے میں ہمیشہ یہی وتیرہ رہا ہے کہ وہ اسے کھلا جادو کہتے رہے ہیں۔ جادو کہنے میں ایک ضمنی اعتراف بھی ہے کہ جو ان رسولوں علیہم السلام نے پیش کیا وہ غیر معمولی امر ہے جو دلوں میں دگرگونی اور انسانی وجدان میں تزلزل پیدا کرتا ہے۔ اسے جھوٹ کہنا کافی نہیں ہے۔

وَمَآ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ كُتُبٍ يَّدْرُسُوْنَهَا وَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ قَبْلَكَ مِنْ نَّذِيْرٍ ﴿۴۴﴾

۴۴۔ اور نہ تو ہم نے پہلے انہیں کتابیں دی تھیں جنہیں یہ پڑھتے ہوں اور نہ ہی آپ سے پہلے ہم نے ان کی طرف کوئی تنبیہ کرنے والا بھیجا ہے۔

تفسیر آیات

ان کا انکار کسی علم اور سندی بنیاد پر نہیں ہے کیونکہ منکرین، ناخواندہ لوگ ہیں۔ انہیں کوئی کتاب ملی ہے نہ ان کی طرف کوئی رسول بھیجا گیا۔ یہ جو بھی موقف بناتے ہیں ان کا اپنا ساختہ و بافتہ ہے۔

وَكَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۙ وَمَا بَلَغُوْا مِعْشَارَ مَآ اٰتَيْنٰهُمْ فَكَذَّبُوْا

۴۵۔ اور ان سے پہلے لوگوں نے بھی تکذیب کی تھی اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا تھا یہ اس کے دسویں حصے کو

رُسُلِیۡ ۟ فَکَیۡفَ کَانَ نَکِیۡرِ ﴿۴۵﴾ بھی نہیں پہنچے مگر جب انہوں نے میرے رسولوں کی تکذیب کی تو (دیکھ لیا) میرا عذاب کتنا سخت تھا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَکَذَّبَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ: پچھلی قوموں کو جو ثروت و سلطنت دی گئی تھی اہل مکہ کے پاس تو اس کا عشر عشیر بھی نہیں ہے۔ چنانچہ مروی ہے کہ امیر المؤمنین علی علیہ السلام نے بعثت رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے پہلے عربوں کی پست ترین سطح زندگی کے بارے میں فرمایا:

اِنَّ اللّٰہَ بَعَثَ مُحَمَّداً صلی اللّٰہ علیہ و آلہ و سلم نَذِیراً لِلْعالَمِینَ وَ اَمِیناً عَلَی التَّنْزِیلِ وَ اَنْتُمْ مَعْشَرَ الْعَرَبِ عَلَی شَرِّ دِینٍ وَ فِی شَرِّ دَارٍ مُنِیخُونَ بَیْنَ حِجَارَۃٍ خُشْنٍ وَحَیَّاتٍ صُمٍّ تَشْرَبُونَ الْکَدِرَ وَ تَاْکُلُونَ الْجَشِبَ وَتَسْفِکُونَ دِمَائَکُمْ وَ تَقْطَعُونَ اَرْحَامَکُمْ الاصنام فیکم منصوبۃ و الْاَصْنَامُ فِیکُمْ مَنْصُوبَۃٌ وَالْآثَامُ بِکُمْ مَعْصُوبَۃٌ۔

اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تمام جہانوں کو تنبیہ کرنے والا اور اپنی وحی کا امین بنا کر بھیجا۔ اے گروہ عرب! اس وقت تم بد ترین دین پر اور بدترین گھروں میں تھے۔ کھردرے پتھروں اور زہریلے سانپوں میں تم بود باش رکھتے تھے۔ گدلا پانی پیتے اور بد ترین غذا کھاتے تھے۔ اپنا خون بہایا کرتے تھے اور قطع رحمی کرتے تھے۔ بت تمہارے درمیان گڑے ہوئے تھے اور گناہ تم سے چمٹے ہوئے تھے۔

قُلۡ اِنَّمَاۤ اَعِظُکُمۡ بِوَاحِدَۃٍ ۚ اَنۡ تَقُوۡمُوۡا لِلّٰہِ مَثۡنٰی وَ فُرَادٰی ثُمَّ تَتَفَکَّرُوۡا ۟ مَا بِصَاحِبِکُمۡ مِّنۡ جِنَّۃٍ ؕ اِنۡ ہُوَ اِلَّا نَذِیۡرٌ لَّکُمۡ بَیۡنَ یَدَیۡ عَذَابٍ شَدِیۡدٍ ﴿۴۶﴾

۴۶۔ کہہ دیجیے: میں تمہیں ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں کہ تم اللہ کے لیے اٹھ کھڑے ہو ایک ایک اور دو دو کر کے پھر سوچو کہ تمہارے ساتھی میں جنون کی کوئی بات نہیں ہے، وہ تو تمہیں ایک شدید عذاب سے پہلے خبردار کرنے والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ قُلۡ اِنَّمَاۤ اَعِظُکُمۡ بِوَاحِدَۃٍ: جو لوگ رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو مجنون کہتے ہیں انہیں اللہ صرف ایک بات کی نصیحت کرتا ہے۔ طویل مباحث کی جگہ صرف ایک نکتے کی طرف توجہ مبذول کراتا ہے جس میں تمام

مسائل کا حل ہے:

۲۔ اَنۡ تَقُوۡمُوۡا لِلّٰہِ: وہ نکتہ یہ ہے کہ پوری استقامت کے ساتھ برائے خدا قدم اٹھائے: اَنۡ تَقُوۡمُوۡا... عزم و ارادے پختہ ہوں، توجہ میں یکسوئی ہو، قصد میں انحراف نہ ہو۔ لِلّٰہِ، یہ عزم، یہ ارادہ صرف اور صرف اللہ کی خاطر ہو۔ ذاتی خواہشات اور مصلحتوں سے دور، معاشرے کے دباؤ سے آزاد ہو کر صرف اللہ کے لیے قدم اٹھائے۔

۳۔ مَثۡنٰی وَ فُرَادٰی: یہ کام انفرادی طور پر بھی ہو سکتا ہے کہ انسان اپنی فطرت، اپنے وجدان کے ساتھ سرگوشی کرے۔ کسی قسم کے ہنگامے سے دور، صرف اپنی جبلت پر تکیہ کیا جائے۔ معاشرتی، ذہنی اور دیگر عوامل سے الگ ہو کر تنہائی میں سوچ لو۔

یہ کام باہمی تبادلہ افکار سے بھی ہو سکتا ہے کہ انسان درست سمت کی طرف جانے کے لیے دوسروں کی عقول و افکار سے فائدہ اٹھائے۔

۴۔ ثُمَّ تَتَفَکَّرُوۡا: پھر اپنی فکر سے کام لو۔ اپنی عقل و خرد کو استعمال کرو۔ صرف عقل کو استعمال کر کے سوچو۔ غیر عقلی امور سے آزاد ہو کر صرف اپنی انسانی سوچ سے کام لو۔

۵۔ مَا بِصَاحِبِکُمۡ مِّنۡ جِنَّۃٍ: فکر و تعقل کا مضمون یہ ہو کہ جس نے زندگی کا ایک معتد بہ حصہ تمہارے ساتھ گزارا ہے، کسی مرحلے پر تم نے انہیں عقل و خرد میں نہ صرف خفیف نہیں پایا بلکہ مشکل حالات میں ان کی عقل و خرد سے فائدہ اٹھایا ہے۔

۶۔ اِنۡ ہُوَ اِلَّا نَذِیۡرٌ لَّکُمۡ: نہ صرف یہ کہ دیوانہ نہیں ہے بلکہ تمہارا خیر خواہ ہے۔ تمہیں ابدی عذاب سے نجات دلانا چاہتا ہے۔ عاقل ہی نہیں، عقل ساز بھی ہے۔

اہم نکات

۱۔ فکر سے راہ نجات ہموار ہو جاتی ہے۔

۲۔ فکر اپنے وجدان کے ساتھ تنہائی میں اور دوسرے مفکرین کے ساتھ ہو سکتی ہے۔

قُلۡ مَا سَاَلۡتُکُمۡ مِّنۡ اَجۡرٍ فَہُوَ لَکُمۡ ؕ اِنۡ اَجۡرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ ۚ وَ ہُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ شَہِیۡدٌ ﴿۴۷﴾	۴۷۔ کہدیجیے: جو اجر (رسالت) میں نے تم سے مانگا ہے وہ خود تمہارے ہی لیے ہے، میرا اجر تو اللہ کے ذمے ہے اور وہ ہر چیز پر گواہ ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ قُلۡ مَا سَاَلۡتُکُمۡ مِّنۡ اَجۡرٍ: اس آیت کی ترکیب واضح ہے مَا موصولہ ہے۔ مِّنۡ بیانیہ

ہے اور فَھُوَ میں ضمیر ماء موصولہ کی طرف جاتی ہے۔ واضح معنی یہ ہوئے: جو اجر میں نے تم سے مانگا ہے وہ خود تمہارے ہی لیے ہے۔

اس سے یہ مطلب واضح ہوا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اجر رسالت طلب فرمایا ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

قُلۡ لَّاۤ اَسۡـَٔلُکُمۡ عَلَیۡہِ اَجۡرًا اِلَّا الۡمَوَدَّۃَ فِی الۡقُرۡبٰی.... [1]

کہد یجیے: میں اس (تبلیغ رسالت) پر تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتا سوائے قریب ترین رشتہ داروں کی محبت کے۔

۲۔ فَھُوَ لَکُمۡ: دوسرا یہ کہ اس اجر رسالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ذاتی مفاد نہیں ہے بلکہ خود امت کا مفاد ہے۔ جب کہ جو اجر رسالت رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے لیے ہے وہ صرف اللہ کے پاس ہے۔ اِنۡ اَجۡرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ ۔یعنی جو اجر رسالت خود ذات رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے متعلق ہے وہ صرف اللہ کے پاس ہے۔

یہ بات کہ محبت اہل البیت علیہم السلام امت ہی کے حق میں ہے، ہر اس شخص پر واضح ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی رسالت پر ایمان رکھتا ہے۔ بطور مثال چند ایک احادیث پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ حدیث رسولؐ ہے:

مثل اهل بیتی کمثل سفینة نوح من رکبها نجی و من تخلف عنها غرق۔ [2]

میرے اہل بیت کی مثال کشتی نوح کی طرح ہے جو اس پر سوار ہوا نجات پا گیا جو پیچھے رہ گیا غرق ہو گیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے روایت ہے:

من مات علی حب آل محمد مات شهیدا...۔

یہ ایک طویل حدیث ہے جس کا ذکر زمخشری اور رازی نے اپنی تفاسیر میں کیا ہے۔

حدیث ہے:

انی تارك فیکم الثقلین کتاب اللّٰه وعترتی ما ان تمسکتم بما لن تضلوا بعدی۔

اس حدیث کو تیس سے زیادہ اصحاب نے روایت کیا ہے اور عبقات الانوار کی دو ضخیم جلدیں اس حدیث کی سند پر مشتمل ہیں۔ لہٰذا محبت اہل البیت علیہم السلام وسیلۂ نجات اور گمراہی و ضلالت سے امان ہے۔ چنانچہ اس بات کی طرف اشارہ ہے اس آیت میں:

قُلۡ مَاۤ اَسۡـَٔلُکُمۡ عَلَیۡہِ مِنۡ اَجۡرٍ اِلَّا مَنۡ شَآءَ اَنۡ یَّتَّخِذَ اِلٰی رَبِّہٖ سَبِیۡلًا ﴿۵۷﴾ [3]

کہد یجیے: اس کام پر میں تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتا مگر یہ (چاہتا ہوں) کہ جو شخص چاہے وہ اپنے رب کا راستہ اختیار کر لے۔

---

[1] ۴۲ شوری: ۲۳   [2] بحار ۲۳: ۱۲۴   [3] ۲۵ فرقان: ۵۷

اہم نکات

۱۔ اجر رسالت مانگا گیا تو یہ امت ہی کے حق میں ہے۔

قُلۡ اِنَّ رَبِّیۡ یَقۡذِفُ بِالۡحَقِّ ۚ عَلَّامُ الۡغُیُوۡبِ ﴿۴۸﴾

۴۸۔ کہد یجیے: میرا رب یقیناً حق نازل فرماتا ہے وہ غیب کی باتوں کا خوب جاننے والا ہے۔

قُلۡ جَآءَ الۡحَقُّ وَ مَا یُبۡدِئُ الۡبَاطِلُ وَ مَا یُعِیۡدُ ﴿۴۹﴾

۴۹۔ کہد یجیے: حق آ گیا اور باطل نہ تو پہلی بار ایجاد کر سکتا ہے اور نہ ہی دوبارہ پلٹا سکتا ہے۔

تشریح کلمات

یَقۡذِفُ: (ق ذ ف) اصل میں قذف دور پھینکنے کو کہتے ہیں۔ یہاں اوپر سے نیچے نازل کرنے کے معنوں میں ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ یَقۡذِفُ بِالۡحَقِّ: اللہ تعالیٰ اہل حق اور حق کی اہلیت رکھنے والوں کے دل میں پورے اہتمام کے ساتھ حق القاء کرتا ہے۔ بقول بعض الحق سے مراد قرآن ہے۔ اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا: اللہ تعالیٰ حق اور قرآن، رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دل پر پوری قوت کے ساتھ نازل فرماتا ہے جس میں کسی قسم کی کمزوری کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ اگلی آیت اس مطلب کے لیے مؤید بن سکتی ہے۔

۲۔ قُلۡ جَآءَ الۡحَقُّ: حق آنے کے بعد باطل بے اثر ہو گیا۔ نہ کرنے کا رہا، نہ دھرنے کا۔ کرنا دھرنا زندگی کی علامت ہے۔ باطل عدم محض ہے۔ عدم منشاء آثار نہیں ہوتا۔ اس آیت میں بظاہر حق سے مراد قرآن اور باطل سے مراد کفر و شرک ہے۔ قرآن، جو حق ہے، کے مقابلے میں شرک کا اب کوئی کردار نہیں رہے گا۔ چنانچہ روایت میں آیا ہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فتح مکہ کے موقع پر دیکھا کعبہ میں تین سو ساٹھ بت آویزاں ہیں تو اپنے ہاتھ میں ایک لاٹھی لے کر ان بتوں پر مارتے جاتے اور فرماتے تھے:

وَ قُلۡ جَآءَ الۡحَقُّ وَ زَهَقَ الۡبَاطِلُ ؕ اِنَّ الۡبَاطِلَ کَانَ زَهُوۡقًا ۝ [1]

اور کہد یجیے: حق آ گیا اور باطل مٹ گیا، باطل کو تو یقیناً مٹنا ہی تھا۔

قُلۡ جَآءَ الۡحَقُّ وَ مَا یُبۡدِئُ الۡبَاطِلُ وَ مَا یُعِیۡدُ ۝

کہد یجیے: حق آ گیا اور باطل نہ تو پہلی بار ایجاد کر سکتا ہے اور نہ ہی دوبارہ پلٹا سکتا ہے۔

---

[1] ۱۷ اسراء: ۸۱

اہم نکات

۱۔ قرآن آنے کے بعد شرک کا کوئی کردار باقی نہیں رہا۔

۲۔ باطل نہ کسی کردار کا آغاز کر سکتا ہے، نہ اعادہ۔

قُلۡ اِنۡ ضَلَلۡتُ فَاِنَّمَاۤ اَضِلُّ عَلٰی نَفۡسِیۡ ۚ وَ اِنِ اهۡتَدَیۡتُ فَبِمَا یُوۡحِیۡۤ اِلَیَّ رَبِّیۡ ؕ اِنَّهٗ سَمِیۡعٌ قَرِیۡبٌ ﴿۵۰﴾

۵۰۔ کہد یجیے: اگر میں گمراہ ہو گیا ہوں تو اس گمراہی کا نقصان خود مجھے ہی ہے اور اگر میں ہدایت یافتہ ہوں تو یہ اس وحی کی بنا پر ہے جو میرے رب کی طرف سے مجھ پر ہوتی ہے، اللہ یقیناً بڑا سننے والا قریب ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ قُلۡ اِنۡ ضَلَلۡتُ: کہد یجیے: فرض کر لیتے ہیں کہ جیسا تم کہتے ہو میں گمراہ ہوں تو میں اس صورت میں گمراہ ہو سکتا ہوں جب میرا سارا تکیہ اپنے نفس پر ہو: اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَۃٌۢ بِالسُّوۡٓءِ ...۔[1]

۲۔ وَ اِنِ اهۡتَدَیۡتُ: اور اگر میں ہدایت پر ہوں تو اس ہدایت کا واحد مصدر وحی ہے۔ وحی کی صورت میں گمراہی ممکن نہیں ہے۔ میرا موقف یہ ہے کہ میں جو بات بھی کرتا ہوں اپنے نفس کی خواہش کی بنیاد پر نہیں کرتا کہ گمراہی کا شائبہ ہو بلکہ وحی کے ذریعے بات کرتا ہوں۔ یہ وحی اس رب کی طرف سے ہے جو ہر بات کا سننے والا سمیع ہے اور ہر عمل سے کسی فاصلے پر نہیں ہوتا، قریب ہے۔

اہم نکات

۱۔ گمراہی نفس امارہ کی طرف سے آ سکتی ہے۔

۲۔ ہدایت کا واحد مصدر وحی ہے۔

وَ لَوۡ تَرٰۤی اِذۡ فَزِعُوۡا فَلَا فَوۡتَ وَ اُخِذُوۡا مِنۡ مَّکَانٍ قَرِیۡبٍ ﴿۵۱﴾

۵۱۔ اور کاش! آپ دیکھ لیتے کہ جب یہ پریشان حال ہوں گے تو بچ نہ سکیں گے اور نزدیک ہی سے پکڑ لیے جائیں گے۔

---

[1] ۱۲ یوسف: ۵۳

تفسیر آیات

۱۔ وَلَوۡ تَرٰۤی اِذۡ فَزِعُوۡا: یہ لوگ موت کے وقت حالت نزع میں جب پریشان حال ہوں گے تو ان کے لیے کوئی راہ فرار نہ ہوگی: فَلَا فَوۡتَ....

۲۔ وَ اُخِذُوۡا مِنۡ مَّکَانٍ قَرِیۡبٍ: یہ نزدیک سے پکڑ لیے جائیں گے۔

روایت ہے کہ اس آیت کا اشارہ اس سفیانی لشکر کی طرف ہے جو مختلف علاقوں میں قتل عام کے بعد ایک میدان میں زمین میں دھنس جائے گا اور اس میں سے صرف دو اشخاص بچیں گے کہ دوسروں کو یہ ماجرا سنائیں۔

اس مضمون کی روایت اہل سنت کے مصادر میں مختصر اور مفصل لفظوں میں مذکور ہے۔ اس کے راوی ابن عباس، ابن مسعود، حذیفه، ابوهریره، ام سلمه، عائشه، حفصه وغیرهم ہیں۔ ملاحظہ ہو المیزان۔ مجمع البیان وغیرها۔

شیعہ روایات میں ہے کہ یہ سفیانی لشکر ظہور قائم آل محمد عج کے موقع پر ظہور کرے گا۔ ملاحظہ ہو تفسیر قمی ذیل آیت۔

وَّ قَالُوۡۤا اٰمَنَّا بِہٖ ۚ وَ اَنّٰی لَہُمُ التَّنَاوُشُ مِنۡ مَّکَانٍۭ بَعِیۡدٍ ﴿ۚۖ۵۲﴾ وَّ قَدۡ کَفَرُوۡا بِہٖ مِنۡ قَبۡلُ ۚ وَ یَقۡذِفُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ مِنۡ مَّکَانٍۭ بَعِیۡدٍ ﴿۵۳﴾

۵۲۔ (اب) وہ کہیں گے: ہم قیامت پر ایمان لے آئے لیکن اب وہ اتنی دور نکلی ہوئی چیز کو کہاں پا سکیں گے؟

۵۳۔ اور اس سے پہلے بھی وہ اس کا انکار کر چکے تھے اور انہوں نے بن دیکھے دور ہی دور سے (گمان کے) تیر چلائے تھے۔

تشریح کلمات

التَّنَاوُشُ: (ن و ل) تناول۔

تفسیر آیات

۱۔ وَّ قَالُوۡۤا اٰمَنَّا: جب موت اور عذاب سامنے آ جاتا ہے تو ایمان کا اظہار کرنے لگ جاتے ہیں لیکن انہوں نے فرصت ہاتھ سے دے دی اور بہت دور نکل گئے کہ واپسی ناممکن ہے۔

۲۔ وَّ قَدۡ کَفَرُوۡا: جب فرصت ہاتھ میں تھی اس وقت کفر اختیار کیا قرآن کی دعوت ٹھکرا دی۔ اب جبری ایمان قبول نہیں ہے۔

۳۔ وَيَقْذِفُوْنَ بِالْغَيْبِ: دنیا کے دار التکلیف میں تو ان لوگوں نے ظن و گمان کی بنیاد پر ایسے الزام عائد کئے کہ نعوذ باللّٰہ محمد ﷺ ساحر، کذاب اور مفتری ہیں حالانکہ انہوں نے ان میں نہ سحر دیکھا، نہ جھوٹ بولتے سنا، نہ کسی انسان پر افتراء باندھتے دیکھا تھا۔

۴۔ مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ: وہ گمان کے تیر ایسے دور مقامات سے چلاتے ہیں جو ہدف سے بہت دور ہیں۔ اب وہ دار التکلیف سے بہت دور نکل چکے ہیں۔ ان کا یہ دعوائے ایمان ہدف تک پہنچنا ناممکن ہے۔

وَحِيْلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ كَمَا فُعِلَ بِاَشْيَاعِهِمْ مِّنْ قَبْلُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا فِيْ شَكٍّ مُّرِيْبٍ ﴿۵۴﴾

۵۴۔ اور اب ان کے اور ان کی مطلوبہ اشیاء کے درمیان پردے حائل کر دیے گئے ہیں جیسا کہ پہلے بھی ان کے ہم خیال لوگوں کے ساتھ (یہی) کیا گیا تھا، یقیناً وہ شبہ انگیز شک میں مبتلا تھے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَحِيْلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ: اب ان کی خواہش یہ تھی کہ کسی طرح نجات مل جائے اور ان کا ایمان قبول کیا جائے۔ فرمایا ان کی اس خواہش اور ان کے درمیان پردہ حائل ہو گیا ہے۔ اب وہ مایوسی کی تاریکیوں میں ڈوب جائیں گے۔

۲۔ كَمَا فُعِلَ بِاَشْيَاعِهِمْ: جیسا کہ اس سے پہلے ان کے ہم خیال لوگوں کے ساتھ یہی کیا گیا کہ وقت گزرنے کے بعد عذاب سامنے آنے کی صورت میں ان کا ایمان مسترد کیا گیا اور ان کی طرف سے نجات اور عذاب سے آزادی کی خواہش مایوسیوں میں بدل گئی تھی۔

اہم نکات

۱۔ ایمان دار التکلیف میں فائدہ دیتا ہے۔

۲۔ موت کے بعد کافر کی نجات کی کوئی خواہش پوری نہیں ہو سکتی۔

خالی

سُورۃ فاطر

خالی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نام سورۃ: اس سورۃ المبارکہ کے شروع میں الفاظ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ آئے ہیں اس لیے اس سورۃ المبارکہ کا نام فاطر ہو گیا نیز اس سورۃ المبارکہ کو سورۃ الملائکۃ بھی کہتے ہیں چونکہ شروع کی آیت میں الفاظ جَاعِلِ الۡمَلٰٓئِکَۃِ آئے ہیں۔

یہ سورۃ المبارکہ چونکہ مکی ہے اس لیے اس سورۃ کے مضامین میں مکی فضا دکھائی دیتی ہے۔ یعنی بیشتر آیات اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، ربوبیت اور تدبیری آیات کے بیان پر مشتمل ہیں۔ سورہ فاطر اور سورہ سبا کو حمدین کہتے ہیں چونکہ دونوں سورتوں کی ابتداء اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ سے ہوئی ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ	بنام خدائے رحمن رحیم
اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ جَاعِلِ الۡمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا اُولِیۡۤ اَجۡنِحَۃٍ مَّثۡنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ؕ یَزِیۡدُ فِی الۡخَلۡقِ مَا یَشَآءُ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ①	۱۔ ثنائے کامل اللہ کے لیے ہے جو آسمانوں اور زمین کا ایجاد کرنے والا نیز فرشتوں کو پیام رساں بنانے والا ہے جن کے دو دو، تین تین اور چار چار پر ہیں، وہ جیسے چاہتا ہے مخلوقات میں اضافہ فرماتا ہے، یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ: حمد وثنا کے لائق وہی ذات ہے جس نے بطن عدم کو چیر کر اس سے آسمانوں اور زمین پر مشتمل ایک کائنات کو وجود دیا۔

فطر کے لغوی معنی شگافتہ کرنے کے ہیں۔ اس سے ایک نکتہ کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے کہ اس کائنات کی تخلیق سے پہلے کوئی ایسی چیز موجود تھی جس کی شگافتگی سے یہ کائنات وجود میں آئی۔ وہ آیہ: وَّ کَانَ عَرۡشُہٗ عَلَی الۡمَآءِ ...[1] اس کائنات کی تخلیق سے پہلے اللہ کی سلطنت پانی پر تھی، کے مطابق پانی ہو سکتا ہے۔

---

[1] ۱۱ ھود: ۷

پانی مایۂ حیات اور تمام زندہ موجودات کا مادۂ مشترکہ ہے لیکن پانی کی تفصیل میں اس سے زیادہ نہیں جا سکتے کہ پانی سے مراد مائع مذاب ہے یا گیس یا انسوڈیم یا ہوا ہے۔ ایسے غیبی موضوعات میں صریح نص کے بغیر اظہار خیال کرنا درست نہیں۔

۲۔ جَاعِلِ الۡمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا: فرشتوں کو پیام رساں بنانے والا۔ فرشتے اللہ کے کارندے ہیں۔ فرشتوں کو اللہ تعالیٰ نے امور تکوینی و تشریعی دونوں میں رسل بنایا ہے:

اِنَّ رُسُلَنَا یَکۡتُبُوۡنَ مَا تَمۡکُرُوۡنَ ۝[1]	بیشک ہمارے فرشتے تمہاری حیلے بازیاں لکھ رہے ہیں۔
حَتّٰۤی اِذَا جَآءَ اَحَدَکُمُ الۡمَوۡتُ تَوَفَّتۡہُ رُسُلُنَا...[2]	یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی ایک کو موت آ جائے تو ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) اس کی روح قبض کر لیتے ہیں۔
قَالُوۡۤا اِنَّاۤ اُرۡسِلۡنَاۤ اِلٰی قَوۡمٍ مُّجۡرِمِیۡنَ ۙ لِنُرۡسِلَ عَلَیۡہِمۡ حِجَارَۃً مِّنۡ طِیۡنٍ ۝[3]	انہوں نے کہا: ہم ایک مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ تاکہ ہم ان پر مٹی کے کنکر برسائیں۔

ان تمام آیات میں فرشتوں کو امور تکوینی کی انجام دہی کے لیے بھیجے جانے کا ذکر ہے اور فرشتے اللہ کے احکام تشریعی لے کر انبیاء علیہم السلام پر نازل ہوتے تھے جو ایک مسلمہ امر ہے۔

۳۔ اُولِیۡۤ اَجۡنِحَۃٍ: یہ فرشتے پروں والے ہوتے ہیں۔ دو دو، تین تین اور چار چار پروں والے ہوتے ہیں۔ فرشتے غیر مادی مخلوقات ہیں جنہیں پروں کی ضرورت نہیں ہوتی تو یہاں پروں سے کیا مراد ہے؟ ایک نظریہ یہ ہے کہ یہ سرعت انتقال کو سمجھانے کے لیے ایک تصور ہے۔

دوسرا نظریہ یہ ہے کہ پروں سے مراد فرشتوں کے مراتب ہیں کچھ فرشتوں کا مرتبہ دیگر فرشتوں سے زیادہ بلند ہے۔ چنانچہ جبرئیل امین کے بارے میں فرمایا:

مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِیۡنٍ ۝[4]	وہاں ان کی اطاعت کی جاتی ہے اور وہ امین ہیں۔
وَ مَا مِنَّاۤ اِلَّا لَہٗ مَقَامٌ مَّعۡلُوۡمٌ ۝[5]	اور (ملائکہ کہتے ہیں) ہم میں سے ہر ایک کے لیے مقام مقرر ہے۔

اس طرح بعض فرشتے دوسرے فرشتوں کے لیے حکم صادر کرتے ہیں اور دوسرے فرشتے ان کی اطاعت کرتے ہیں۔

۴۔ یَزِیۡدُ فِی الۡخَلۡقِ مَا یَشَآءُ: عالم ملائکہ میں تخلیق کا سلسلہ جاری ہے۔ آناً فآناً فرشتے خلق ہو رہے ہیں۔ تخلیق کا سلسلہ ختم نہیں ہوا کیونکہ سرچشمۂ فیض سے فیض منقطع نہیں ہوسکتا:

کُلَّ یَوۡمٍ ہُوَ فِیۡ شَاۡنٍ ۝[6]	وہ ہر روز ایک (نئی) کرشمہ سازی میں ہے۔

---

[1] ۱۰یونس: ۲۱ [2] ۶الانعام: ۶۱ [3] ۵۱ ذاریات: ۳۲-۳۳
[4] ۸۱تکویر: ۲۱ [5] ۳۷صافات: ۱۶۴ [6] ۵۵ رحمن: ۲۹

حدیث میں آیا ہے:

ما من شیء مما خلق اللّٰہ عز و جل اکثر من الملائکۃ۔[1]	اللہ عز و جل کی مخلوقات میں فرشتوں سے زیادہ کوئی مخلوق نہیں ہے۔

نیز حدیث میں آیا ہے:

لوگوں میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جس کے فرشتوں میں سے محافظین نہ ہوں جو اسے کسی کنویں میں گرنے یا اس پر کوئی دیوار گرنے اور کسی برائی میں مبتلا ہونے سے بچاتے ہیں۔ جب اس کی موت آ جاتی ہے تو فرشتے اسے اپنے حال پر چھوڑ دیتے ہیں۔[2]

لہٰذا فرشتے اللہ کے کارندے ہیں۔ حکم خدا سے انحراف نہیں کر سکتے۔ تدبیر کائنات میں فرشتے دھوپ، پانی اور مٹی کی طرح ہیں کہ جس کام پر اللہ نے لگایا ہے اسی میں لگے رہتے ہیں۔ ذرہ برابر خلاف ورزی نہیں کرتے۔

اہم نکات

۱۔ فرشتے تدبیر کائنات کے کارندے ہیں۔

۲۔ کائنات اسباب و علل کی بنیاد پر قائم ہے۔

۳۔ فرشتوں کے بھی مراتب ہوتے ہیں۔

مَا یَفۡتَحِ اللّٰہُ لِلنَّاسِ مِنۡ رَّحۡمَۃٍ فَلَا مُمۡسِکَ لَہَا ۚ وَ مَا یُمۡسِکۡ ۙ فَلَا مُرۡسِلَ لَہٗ مِنۡۢ بَعۡدِہٖ ؕ وَ ہُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ۲	۲۔ لوگوں کے لیے جو رحمت (کا دروازہ) اللہ کھولے اسے کوئی روکنے والا نہیں اور جسے وہ بند کر دے اسے اللہ کے بعد کوئی کھولنے والا نہیں اور وہ بڑا غالب آنے والا، حکمت والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ مَا یَفۡتَحِ اللّٰہُ لِلنَّاسِ مِنۡ رَّحۡمَۃٍ: اللہ تعالیٰ کے پاس ہی تمام رحمتوں کا خزانے موجود ہیں:

وَ لِلّٰہِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ...[3]	حالانکہ آسمانوں اور زمین کے خزانوں کا مالک اللہ ہی ہے۔

دوسری آیت میں فرمایا:

وَ اِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا عِنۡدَنَا خَزَآئِنُہٗ ...[4]	اور کوئی چیز ایسی نہیں جس کے خزانے ہمارے پاس نہ ہوں۔

---

[1] بحار ۹۷: ۱۱۷۔ المیزان ذیل آیہ [2] المیزان ذیل آیت [3] ۶۳ منافقون: ۷ [4] ۱۵ حجر: ۲۱

اور یہ بات معقول اور ممکن بھی نہیں کہ اللہ سے ہٹ کر کسی کے پاس کوئی خزانہ موجود ہو۔ جب تمام خزانوں کا مالک صرف اللہ ہے تو ان خزانوں کا کھولنے والا بھی صرف اللہ ہی ہو سکتا ہے۔ مِنۡ رَّحۡمَۃٍ کی تعبیر میں اطلاق و شمول ہے جس میں تمام قسم کی رحمتیں شامل ہیں۔

۲۔ فَلَا مُمۡسِکَ لَہَا: اللہ کی طرف سے جب رحمتوں کا دروازہ کھول دیا جائے گا تو اللہ کے مقابلے میں کون آ سکتا ہے جو اسے بند کر دے۔

۳۔ وَ مَا یُمۡسِکۡ ۙ فَلَا مُرۡسِلَ لَہٗ مِنۡۢ بَعۡدِہٖ: کون سی طاقت ہے جو اللہ کے مقابلے آ کر اس کے بند کیے ہوئے کو کھول دے۔ اسی لیے مؤمن صرف اسی سے امید رکھتا ہے، اسی کے در پر دستک دیتا ہے اور اسی سے خوف کھاتا ہے۔ چنانچہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی دعائے عرفہ میں مذکور ہے:

ماذا وجد من فقدك وما الذی فقد من وجدك۔ — جس نے تجھے پایا اس نے کیا کھویا اور جس نے تجھے کھویا اس نے کیا پایا؟

۴۔ وَ ہُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ: وہ بالادست ہے۔ اس کے قبضۂ قدرت میں ہر چیز ہے۔ وہ غالب آنے والا ہے۔ کسی سے مغلوب نہیں ہو گا۔ وہ حکیم ہے۔ اپنی حکمت کے تحت اہل کو دیتا ہے۔ نا اہل سے روکتا ہے۔

یہ آیات مشرکین کے ان عقائد کی رد میں ہیں جن کے تحت وہ غیر اللہ سے روزگار، اولاد، دولت، شفا وغیرہ کی توقع رکھتے تھے۔

اہم نکات

۱۔ غیر اللہ سے امیدیں وابستہ کرنا ایک واہمہ ہے۔

۲۔ تمام خزانوں کا کھولنا بند کرنا صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ ؕ ہَلۡ مِنۡ خَالِقٍ غَیۡرُ اللّٰہِ یَرۡزُقُکُمۡ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۫ۖ فَاَنّٰی تُؤۡفَکُوۡنَ ﴿۳﴾

۳۔ اے لوگو! اللہ کے تم پر جو احسانات ہیں انہیں یاد کرو، کیا اللہ کے سوا کوئی اور خالق ہے جو آسمان اور زمین سے تمہیں رزق دے؟ اس کے سوا کوئی معبود نہیں پس تم کہاں الٹے پھرے جا رہے ہو؟

تفسیر آیات

۱۔ یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ: خطاب عامة الناس سے ہے جو اللہ کی طرف

سے ملنے والی نعمتوں کی نسبت غیر اللہ کی طرف دیتے ہیں۔ جس کے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے اس کے دروازے پر جاتے ہیں۔ نعمتیں اللہ دیتا ہے پوجا دوسروں کی کرتے ہیں۔

۲۔ هَلۡ مِنۡ خَالِقٍ غَیۡرُ اللّٰهِ یَرۡزُقُکُمۡ: ہے کوئی خالق سوائے اللہ کے جو تمہیں روزی دے؟ مشرکین اللہ کو خالق مانتے تھے مگر یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ رزق دینے کا کام دوسروں کو سونپا گیا ہے۔ اب اللہ رزق نہیں دیتا دوسرے رزق دیتے ہیں۔ اس آیت میں یہ بات واضح فرما دی کہ خالق ہی رازق ہے: هَلۡ مِنۡ خَالِقٍ غَیۡرُ اللّٰهِ یَرۡزُقُکُمۡ کیا اللہ کے علاوہ کوئی خالق ہے جو تمہیں رزق دے؟ اس سے واضح ہو گیا خالق ہی رازق ہو سکتا ہے اور خالقیت اور رازقیت میں تفریق ممکن نہیں ہے۔ رازقیت تخلیق مسلسل سے عبارت ہے۔ خالق ہی دانے کا سینہ چاک کر کے روزی دیتا ہے۔

۳۔ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ: پس معبود وہی ہوتا ہے جو خالق اور رازق ہو۔ اس کے علاوہ دوسروں کے پاس خالقیت کا اختیار نہیں ہے تو رزق دینے کا بھی اختیار نہیں ہے۔ ان کی پوجا کر کے کیا حاصل کر سکو گے۔

۴۔ فَاَنّٰی تُؤۡفَکُوۡنَ: پھر تم کہاں الٹے پھرے جا رہے ہو۔ جس کے پاس سب کچھ ہے اس کا دروازہ چھوڑ کر ایسوں کے دروازے پر جاتے ہو جن کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔　خالق ہی رازق ہوتا ہے۔ خالقیت اور رازقیت قابل تفریق نہیں ہے۔

وَ اِنۡ یُّکَذِّبُوۡکَ فَقَدۡ کُذِّبَتۡ رُسُلٌ مِّنۡ قَبۡلِکَ ؕ وَ اِلَی اللّٰهِ تُرۡجَعُ الۡاُمُوۡرُ ﴿۴﴾

۴۔ اور اگر یہ لوگ آپ کی تکذیب کرتے ہیں تو آپ سے پہلے بھی رسولوں کی تکذیب ہوئی ہے اور تمام امور کی بازگشت اللہ ہی کی طرف ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اگر یہ لوگ آپ کو جھٹلاتے ہیں تو آپ پہلے رسول نہیں ہیں جو جھٹلائے گئے۔ جو لوگ حق کو بار گراں سمجھتے ہیں وہ حق والوں کو جھٹلایا کرتے ہیں۔

۲۔ وَ اِلَی اللّٰهِ تُرۡجَعُ الۡاُمُوۡرُ: تمام امور کی بازگشت جب اللہ کی طرف ہے تو وہ دن دور نہیں ان کے انہی تکذیبی جرائم کا محاسبہ ہو گا۔ اس میں رسالتمآب ﷺ کے لیے تسلی و خوشخبری ہے۔

اہم نکات

۱۔　حق کے داعیوں کو نادانوں کی تکذیب و توہین کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الۡحَيٰوةُ الدُّنۡيَا ۥ وَلَا يَغُرَّنَّكُمۡ بِاللّٰهِ الۡغَرُوۡرُ ۝۵

۵۔ اے لوگو! اللہ کا وعدہ یقیناً سچا ہے لہٰذا دنیا کی زندگی تمہیں دھوکے میں نہ ڈالے اور نہ ہی وہ دغاباز (شیطان) اللہ کے بارے میں تمہیں فریب دینے پائے۔

تفسیر آیات

۱۔ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقٌّ: اللہ کی طرف سے جو وعدۂ ثواب و عتاب، روز حساب اور اس عارضی زندگی کے بعد ایک ابدی زندگی کا وعدہ ہے، وہ برحق ہے۔ اس کے مقابلے میں دنیوی زندگی ایک سراب سے زیادہ نہیں ہے۔ اس عارضی چند روزہ زندگی کے دھوکے میں نہ آنا۔

۲۔ وَلَا يَغُرَّنَّكُمۡ بِاللّٰهِ الۡغَرُوۡرُ: نہ ہی دھوکے باز شیطان تمہیں دھوکہ دینے پائے جو تمہیں چند روزہ زندگی کو ابدی زندگی پر ترجیح دینے کے لیے آمادہ کرتا ہے۔ وہ بڑا دھوکے باز ہے۔ شیطان تمہیں دھوکہ اس طرح دے گا کہ اللہ کو تمہاری عبادت کی کیا ضرورت ہے۔ اللہ معاف کرنے والا ہے۔ جب کسی اسلامی قانون کی پابندی کی بات ثابت ہوتی ہے تو یہ شیطانی آواز آتی ہے، اللہ اس قدر سختی نہیں کرتا۔

اِنَّ الشَّيۡطٰنَ لَكُمۡ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوۡهُ عَدُوًّا ؕ اِنَّمَا يَدۡعُوۡا حِزۡبَهٗ لِيَكُوۡنُوۡا مِنۡ اَصۡحٰبِ السَّعِيۡرِ ۝۶

۶۔ شیطان یقیناً تمہارا دشمن ہے پس تم اسے دشمن سمجھو، بے شک وہ اپنے گروہ کو صرف اس لیے دعوت دیتا ہے تاکہ وہ لوگ اہل جہنم میں شامل ہو جائیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّ الشَّيۡطٰنَ لَكُمۡ عَدُوٌّ: شیطان کی عداوت کوئی ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ اس دشمن نے تمہارے باپ آدم کو دھوکہ دیا ہے اور نسل آدم کو گمراہ کرنا اس کی سرشت میں ہے۔

۲۔ فَاتَّخِذُوۡهُ عَدُوًّا: اس دشمن کو دشمن سمجھو۔ اتنی نادانی نہیں ہونی چاہیے کہ دوست اور دشمن کی پہچان نہ ہو۔ حیوانات بھی اپنے دشمن کو خوب پہچان لیتے ہیں اور اس سے بھاگ جاتے ہیں۔

۳۔ اِنَّمَا يَدۡعُوۡا حِزۡبَهٗ: شیطان اللہ کے خاص بندوں کو گمراہ نہیں کر سکتا۔ شیطان کا اپنا ایک حزب ہے۔ جو شخص اس کے حزب میں داخل ہوتا ہے اسے جہنم کی دعوت دیتا ہے۔ اسے ہوس پرستی کی

دعوت دیتا ہے جس کا نتیجہ آتش جہنم ہے۔

اہم نکات

۱۔ احکام خداوندی کی پابندی کو غیر ضروری سمجھنا شیطانی سوچ ہے۔

۲۔ شیطان کے دھوکے میں آنے کی علامت ذاتی خواہشات کو آخرت پر ترجیح دینا ہے۔

۳۔ شیطان صرف اپنے حزب کے ممبران کو گمراہ کر سکتا ہے۔

اَلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لَہُمۡ عَذَابٌ شَدِیۡدٌ ۬ؕ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَہُمۡ مَّغۡفِرَۃٌ وَّ اَجۡرٌ کَبِیۡرٌ ﴿۷﴾

۷۔ جنہوں نے کفر کیا ان کے لیے شدید عذاب ہے اور جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے ان کے لیے مغفرت اور بڑا اجر ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اَلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا: جو لوگ شیطان کی دعوت قبول اور کفر اختیار کرتے ہیں ان کے لیے عذاب ہو گا چونکہ وہ حزب اللہ سے نکل کر حزب شیطان میں داخل ہو گئے۔

۲۔ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا: اور جو لوگ حزب رحمٰن میں رہیں گے ان کے لیے مغفرت اور اجر کبیر دونوں ہیں۔ایمان اور عمل صالح کے دو اثرات ہیں:

ایک یہ کہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ ایمان بہت سے گناہوں کا کفارہ ہے۔ اگر زندگی بھر شرک کا ارتکاب کرتا رہا اور آخر عمر میں ایمان لے آیا تو تمام زندگی کا شرک معاف ہو جائے گا۔اسی طرح عمل صالح کی وجہ سے بھی بہت سے گناہ ڈھل جاتے ہیں جس کا اس سے پہلے مختلف مقامات پر ذکر ہو چکا ہے۔

دوسرا اثر یہ ہے کہ اس کا عمل وثواب ہے۔

اَفَمَنۡ زُیِّنَ لَہٗ سُوۡٓءُ عَمَلِہٖ فَرَاٰہُ حَسَنًا ؕ فَاِنَّ اللّٰہَ یُضِلُّ مَنۡ یَّشَآءُ وَ یَہۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ ۫ۖ فَلَا تَذۡہَبۡ نَفۡسُکَ عَلَیۡہِمۡ حَسَرٰتٍ ؕ اِنَّ اللّٰہَ

۸۔ بھلا وہ شخص جس کے لیے اس کا برا عمل خوشنما بنا دیا گیا ہو اور وہ اسے اچھا سمجھنے لگا ہو (ہدایت یافتہ شخص کی طرح ہو سکتا ہے؟) بے شک اللہ جسے چاہتا ہے گمراہی میں ڈال دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے لہٰذا ان لوگوں پر افسوس میں آپ کی جان نہ چلی جائے، یہ جو کچھ کر رہے

عَلِيۡمٌۢ بِمَا يَصۡنَعُوۡنَ ۞ ہیں یقیناً اللہ کو اس کا خوب علم ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اَفَمَنۡ زُيِّنَ لَهٗ سُوۡٓءُ عَمَلِهٖ: کیا وہ شخص جس کی عقل پر خواہشات غالب آ جائیں، اس کی نادانی دانائی پر چھا جائے کہ اس کی نگاہ میں قدریں بدل جائیں، برائی خوشنما بن جائے اور گناہوں کے ارتکاب پر فخر کرنا شروع کر دے، جرائم پر عمل کرنے میں لذت محسوس کرے، حق باطل اور باطل حق نظر آئے، اس طرح سب سے بڑے گناہ، احساس گناہ کے فقدان کا کوئی مرتکب ہو جائے تو کیا ایسا شخص ہدایت یافتہ شخص کی طرح ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔

۲۔ فَاِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنۡ يَّشَآءُ: اللہ ایسی قدروں کے مالک افراد کو ہدایت نہیں دیتا بلکہ انہیں اپنے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔ اللہ کی طرف سے ہدایت نہ ملنے کی صورت میں ضلالت کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے۔

۳۔ وَيَهۡدِيۡ مَنۡ يَّشَآءُ: اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے۔ اللہ کی چاہت اور مشیت اندھی بانٹ نہیں ہے۔ وہ اہل کو ہدایت دیتا ہے۔ نااہل کو جو ہدایت قبول نہیں کرتا، نہ ہدایت قبول کرنے کی اہلیت رکھتا ہے، اس پر حجت پوری کرنے کے بعد جب وہ راہ راست پر نہیں آتا اسے اس کے حال پر چھوڑ دیتا اور ہدایت کا ہاتھ روک لیتا ہے۔ اس ہاتھ روکنے کو يُضِلُّ کے ساتھ تعبیر فرمایا ہے۔ ورنہ ابتداء میں اللہ بلاوجہ کسی کو گمراہی میں نہیں ڈالتا۔ گمراہی و ضلالت اللہ کی ناپسندیدہ ہے۔ خود اللہ ناپسندیدہ چیز اختیار نہیں کرتا۔

۴۔ فَلَا تَذۡهَبۡ نَفۡسُكَ عَلَيۡهِمۡ حَسَرٰتٍ: ان کی گمراہی پر اپنی جان گھلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان میں ہدایت کی اہلیت نہیں ہے ورنہ ان پر اللہ تعالیٰ آپؐ سے زیادہ مہربان ہے۔ اگرچہ ابدی سعادت کا موقع ہاتھ سے دینا بہت حسرت و افسوس ناک بات ہے تاہم یہ لوگ اپنے اختیار سے کفر پر قائم رہنے پر مصر ہیں تو ہم ان پر ہدایت جبراً مسلط نہیں کر سکتے۔ لہٰذا انہیں ان کے عمل کے ساتھ چھوڑ دینا پڑتا ہے۔

۵۔ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيۡمٌۢ بِمَا يَصۡنَعُوۡنَ: چونکہ اللہ کو ان کی کرتوتوں کا بخوبی علم ہے۔ اس علم کے مطابق اللہ ان کے ساتھ سلوک کرتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ سب سے بڑا گناہ، احساس گناہ کا نہ ہونا ہے۔

۲۔ ناقابل ہدایت کو اللہ اس کے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔

۳۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مہربان جان لوگوں کے گمراہ ہونے پر افسوس سے گھل جاتی ہے۔

وَاللّٰهُ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ الرِّیٰحَ فَتُثِیۡرُ سَحَابًا فَسُقۡنٰهُ اِلٰی بَلَدٍ مَّیِّتٍ فَاَحۡیَیۡنَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا ؕ کَذٰلِکَ النُّشُوۡرُ ﴿۹﴾

۹۔ اور اللہ ہی ہواؤں کو بھیجتا ہے تو وہ بادل کو اٹھاتی ہیں پھر ہم اسے ایک اجاڑ شہر کی طرف لے جاتے ہیں پھر ہم اس سے زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کر دیتے ہیں، اسی طرح (روز قیامت) اٹھنا ہو گا۔

اس مضمون کی آیت کی تشریح سورۃ الاعراف آیت ۵۷ سورہ روم آیت ۴۸۔۵۰ میں ہو چکی ہے۔

مَنۡ کَانَ یُرِیۡدُ الۡعِزَّۃَ فَلِلّٰهِ الۡعِزَّۃُ جَمِیۡعًا ؕ اِلَیۡهِ یَصۡعَدُ الۡکَلِمُ الطَّیِّبُ وَ الۡعَمَلُ الصَّالِحُ یَرۡفَعُهٗ ؕ وَ الَّذِیۡنَ یَمۡکُرُوۡنَ السَّیِّاٰتِ لَهُمۡ عَذَابٌ شَدِیۡدٌ ؕ وَ مَکۡرُ اُولٰٓئِکَ هُوَ یَبُوۡرُ ﴿۱۰﴾

۱۰۔ جو شخص عزت کا خواہاں ہے تو (وہ جان لے کہ) عزت ساری اللہ کے لیے ہے، پاکیزہ کلمات اسی کی طرف اوپر چلے جاتے ہیں اور نیک عمل اسے بلند کر دیتا ہے اور جو لوگ بری مکاریاں کرتے ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہے اور ایسے لوگوں کا مکر نابود ہو جائے گا۔

تفسیر آیات

۱۔ مَنۡ کَانَ یُرِیۡدُ الۡعِزَّۃَ فَلِلّٰهِ الۡعِزَّۃُ جَمِیۡعًا: کفار قریش کے بڑوں کو یہ خطرہ لاحق تھا کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بات بن گئی تو ہماری عزت وقار خاک میں مل جائے گی۔ دیگر لوگوں کو یہ خطرہ لاحق تھا کہ اگر ہم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لے آئے تو معاشرے میں ذلیل ہو جائیں گے۔

اس آیت میں فرمایا: پوری کی پوری عزت اللہ کی ہے۔ عزت کا سرچشمہ اللہ کی ذات ہے: مَنۡ کَانَ یُرِیۡدُ الۡعِزَّۃَ اگر کسی کو عزت چاہیے تو عزت کے سرچشمے سے ہی مل سکتی ہے۔ یہاں سے جو عزت ملے گی وہ حقیقی عزت ہو گی۔ دنیا و آخرت میں کبھی ذلت کا سامنا نہیں ہو گا۔

آج چشم جہاں دیکھ رہی ہے کہ جن ہستیوں نے شعب ابی طالب کے کربناک حالات میں وقت گزارا انہیں عزت حاصل ہے یا ان لوگوں کو عزت مل گئی جو اس وقت مکے میں دندناتے پھرتے تھے؟

۲۔ اِلَیۡهِ یَصۡعَدُ الۡکَلِمُ الطَّیِّبُ: ان باتوں کا ذکر ہے جن سے عزت حاصل ہو سکتی ہے۔ پاکیزہ کلمات اللہ کی طرف صعود کرتے ہیں۔ روایات کے مطابق پاکیزہ سے مراد وہ کلمات ہیں جو برحق

عقائد و نظریات کا اقرار کے لیے ادا کیے جاتے ہیں۔ جیسے کلمہ توحید لا الٰہ الا اللّٰہ اور اقرار برسالت محمد رسول اللہ ﷺ اور ولایت علی علیہ السلام کی گواہی دی جاتی ہے: علی ولی اللّٰہ و دیگر اصول و فروع کے اقرار پر مشتمل کلمات اللہ تعالیٰ کی طرف پرواز کرتے ہیں۔ صعود سے مراد اللہ کی بارگاہ میں پیش ہوتے ہیں۔

۳۔ وَ الۡعَمَلُ الصَّالِحُ یَرۡفَعُہٗ: اور عمل صالح کو یہ پاکیزہ کلمات قبولیت کے درجہ تک پہنچا دیتے ہیں۔ میرے نزدیک ترتیب کلام اس طرح ہے: والعمل الصالح یرفعہ الکلم الطیب۔ چونکہ اصول عقائد کے بغیر عمل قبول نہیں ہوتا۔ لہٰذا عمل صالح کو اللہ کی بارگاہ قبولیت پر فائز کرنے کے لیے اصول عقائد کی درستگی شرط ہے۔ جیسا کہ عمل کے بغیر عقائد بے نتیجہ ہیں کیونکہ ان عقائد کی کوئی قیمت نہیں جن کا کردار پر کوئی اثر نہ ہو۔

۴۔ وَ الَّذِیۡنَ یَمۡکُرُوۡنَ السَّیِّاٰتِ: جو لوگ رسول اللہ ﷺ کے خلاف بری سازشیں کر رہے ہیں انہیں شدید عذاب کا سامنا کرنا ہوگا۔

۵۔ وَ مَکۡرُ اُولٰٓئِکَ ہُوَ یَبُوۡرُ: اور ساتھ ان کی مکاریاں بے اثر ہو جائیں گی۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے خلاف ان کی ساری سازشیں ناکام ہوگئیں جیسا کہ اس آیت میں میں فرمایا:

وَ اِذۡ یَمۡکُرُ بِکَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لِیُثۡبِتُوۡکَ اَوۡ یَقۡتُلُوۡکَ اَوۡ یُخۡرِجُوۡکَ ؕ وَ یَمۡکُرُوۡنَ وَ یَمۡکُرُ اللّٰہُ ؕ وَ اللّٰہُ خَیۡرُ الۡمٰکِرِیۡنَ ۝ [1]	اور (وہ وقت یاد کریں) جب یہ کفار آپ کے خلاف تدبیر سوچ رہے تھے کہ آپ کو قید کر دیں یا آپ کو قتل کر دیں یا آپ کو نکال دیں وہ اپنی چال سوچ رہے تھے اور اللہ اپنی تدبیر کر رہا تھا اور اللہ سب سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔

اہم نکات

۱۔ عزت کا سرچشمہ اللہ کی ذات ہے: فَلِلّٰہِ الۡعِزَّۃُ جَمِیۡعًا....

۲۔ حقیقی عزت ایمان و عمل صالح میں ہے: وَ الۡعَمَلُ الصَّالِحُ یَرۡفَعُہٗ....

۳۔ ایمان اور عمل صالح میں ایک مضبوط رشتہ ہے: الۡکَلِمُ الطَّیِّبُ وَ الۡعَمَلُ الصَّالِحُ....

وَ اللّٰہُ خَلَقَکُمۡ مِّنۡ تُرَابٍ ثُمَّ مِنۡ نُّطۡفَۃٍ ثُمَّ جَعَلَکُمۡ اَزۡوَاجًا ؕ وَ مَا تَحۡمِلُ مِنۡ اُنۡثٰی وَ لَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلۡمِہٖ ؕ وَ مَا یُعَمَّرُ مِنۡ مُّعَمَّرٍ وَّ لَا یُنۡقَصُ مِنۡ عُمُرِہٖۤ اِلَّا فِیۡ	۱۱۔ اور اللہ نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا پھر نطفے سے پھر تمہیں جوڑا بنا دیا اور کوئی عورت نہ حاملہ ہوتی ہے اور نہ بچہ جنتی ہے مگر اللہ کے علم کے ساتھ اور نہ کسی زیادہ عمر والے کو عمر دی جاتی ہے اور نہ ہی اس کی عمر میں کمی کی جاتی ہے مگر یہ کہ کتاب میں (ثبت) ہے،

----

[1] ۸ انفال: ۳۰

کِتٰبٍ ؕ اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیۡرٌ ﴿۱۱﴾ یقیناً یہ سب کچھ اللہ کے لیے آسان ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَاللّٰہُ خَلَقَکُمۡ مِّنۡ تُرَابٍ: انسان کی تخلیق ارضی عناصر سے ہوئی ہے اور انسانی جسم میں موجود تمام عناصر ارضی ہیں۔

۲۔ ثُمَّ مِنۡ نُّطۡفَۃٍ: پھر اس خاک کو نطفہ بنا دیا: ثُمَّ جَعَلۡنٰہُ نُطۡفَۃً فِیۡ قَرَارٍ مَّکِیۡنٍ ۔[1] اس وقت تک کی معلومات کے مطابق نطفہ کی تشکیل دو نصف سیلز (cells) کی ترکیب سے ہوتی ہے۔ ایک نصف پدر اور دوسرا نصف مادر کی طرف سے فراہم ہوتا ہے۔ یعنی جرثومہ پدر اور تخم مادر۔ اس کی بحث سورۂ نساء ۱۱۹ میں کلوننگ کی بحث میں ہو چکی ہے۔

۳۔ ثُمَّ جَعَلَکُمۡ اَزۡوَاجًا: پھر تمہیں جوڑا بنا دیا۔ بعض نے ازواج سے اقسام مراد لیا ہے اور بعض مرد و زن مراد لیتے ہیں۔ دوسرا نظریہ زیادہ قرین واقع ہے۔

۴۔ مَا تَحۡمِلُ مِنۡ اُنۡثٰی وَ لَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلۡمِہٖ: اس جملے میں لفظ اُنۡثٰی میں انسان، حیوانات اور پرندے سب شامل ہیں۔ پرندوں کا انڈے دینا بچہ جننے کی طرح ہے۔ کسی ماں کے شکم میں جو حمل ٹھہرتا ہے اور بچہ جنتی ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔

ہم نے سورۂ رعد آیت ۸ کے ذیل میں لکھا ہے:

مرد کے ایک مکعب سینٹی میٹر نطفہ میں ایک سوملین جرثومے ہوتے ہیں۔

یہ بات صرف اللہ جانتا ہے کہ ان سوملین جرثوموں میں سے کون سا جرثومہ تخم مادر کے ساتھ جفت ہونے میں کامیاب ہونے والا ہے۔ اللہ ہی کے علم میں ہے آنے والا بچہ ان ایک سوملین خاصیتوں میں سے کس خاصیت کا حامل ہے، چونکہ ان ایک سوملین جرثوموں میں سے ہر ایک کی خاصیت جدا ہے۔ وہ کون سا محرک ہے جس کے تحت یہ جرثومے تخم مادر کی طرف دوڑتے ہیں اور اس میں داخل ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ انسان تو جانداروں کی کائنات میں ہر مادہ کو جاننے سے قاصر ہے۔ یہ کیسے جان سکتا ہے کہ ہر مادہ کیا اُٹھانے والی ہے۔

اگر رحم میں تخلیق کی تکمیل کے بعد انسان کو کچھ علم حاصل ہوا ہے تو یہ اعتراض وارد نہیں ہوتا کہ رحم کا حال تو انسان بھی جاننے لگا ہے۔

۵۔ وَ مَا یُعَمَّرُ مِنۡ مُّعَمَّرٍ وَّ لَا یُنۡقَصُ مِنۡ عُمُرِہٖۤ اِلَّا فِیۡ کِتٰبٍ: نہ کسی زیادہ عمر والے کو عمر دی جاتی ہے نہ ہی اس کی عمر میں کمی کی جاتی ہے مگر یہ کہ کتاب میں ثبت ہے۔

---

[1] ۲۳ مومنون: ۱۳۔ (ترجمہ) پھر ہم نے اسے ایک محفوظ جگہ پر نطفہ بنا دیا۔

اسے تقدیر کہتے ہیں۔ واضح رہے تقدیر کا مطلب نظام اور قانون تکوینی ہے۔ اللہ کے ہاں ہر کام ایک نظام کے تحت انجام پاتا ہے۔ اگر تقدیر نہ ہوتی تو بدنظمی اور اندھیر نگری ہوتی۔ تقدیر کا مطلب جبر نہیں بلکہ تقدیر کا مطلب اللہ کی طرف سے تقنین و تنظیم ہے اور بندوں کی طرف سے اختیار و انتخاب ہے۔ اگر کسی کے لیے ایک تقدیر ہوتی تو جبر ہوتا جب کہ ایسا نہیں بلکہ ہر شخص کے بہت سے مقدرات میں سے ایک انتخاب کرنا ہے۔ چنانچہ حضرت علی علیہ السلام ایک ایسی دیوار سے ہٹ گئے جو گرنے والی تھی تو لوگوں نے کہا: کیا آپ تقدیر خدا سے بھاگ رہے ہیں؟ فرمایا:

افرّ من قدر اللّٰه بقدر اللّٰه...۔[1]	میں اللہ کی تقدیر سے اللہ کی تقدیر کی طرف بھاگ رہا ہوں۔

البتہ اللہ کی کتاب، لوح محفوظ میں یہ بات درج ہے کہ انسان اپنے ارادہ و اختیار سے کون سا راستہ اختیار کرنے والا ہے، کن حالات سے دوچار رہے گا اور کون سے علل و اسباب کے تحت کیا عمر پانے والا ہے۔

چنانچہ حدیث رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم میں آیا ہے:

ان الصدقة و صلة الرحم تعمران الديار و تزيدان فی الاعمار۔[2]	صدقہ اور صلۂ رحم سے ملک آباد اور عمر میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

حدیث رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہے:

مَنْ اَرَادَ الْبَقَاءَ وَلَا بَقَاءَ فَلْيُبَاكِرِ الْغَدَاءَ وَ لْيُجَوِّدِ الْحِذَاءَ وَ لْيُخَفِّفِ الرِّدَاءَ وَ لْيُقِلَّ مُجَامَعَةَ النِّسَآءِ قِيلَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ: وَمَا خِفَّةُ الرِّدَاءِ؟ ، قَالَ : قِلَّةُ الدَّيْنِ ۔[3]	جو بقا چاہتا ہے اگرچہ بقا ہے نہیں تو اسے چاہیے کہ کھانا سویرے کھائے، جوتے بہتر طریقے سے پہنے اور ہلکی چادر اوڑھے اور عورتوں کے پاس کم جائے۔ رسول اللہؐ سے سوال کیا گیا: یا رسول اللہؐ! ہلکی چادر سے کیا مراد ہے؟ آپؐ نے فرمایا: کم قرض لینا۔

۶۔ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ : کائنات ایک نظام و قانون کے تحت چلانا اللہ کے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ مشکل اور آسان کا سوال وہاں آتا ہے جہاں کسی کام کو انجام دینے کے لیے علل و اسباب کو ذریعہ بنانا پڑتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ علل و اسباب کے ذریعے نہیں اپنے ارادے کے ذریعے انجام دیتا ہے۔

اِنَّمَاۤ اَمۡرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَيۡـــًٔا اَنۡ يَّقُوۡلَ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ ○ [4]	جب وہ کسی چیز کا ارادہ کر لیتا ہے تو بس اس کا امر یہ ہوتا ہے کہ اسے یہ کہے: ہو جا پس وہ ہو جاتی ہے

اہم نکات

۱۔ انسان خاکی مخلوق ہے۔ انسان میں موجود تمام عناصر ارضی ہیں۔

۲۔ مخلوقات کے وجود میں آنے سے پہلے خدا ان سب کو جانتا ہے۔

---

[1] شرح نهج البلاغة ۸: ۲۹۸ [2] مكارم الاخلاق ص ۳۸۸ [3] الفقيه ۳: ۵۵۵۔ باب النوادر ، حديث ۴۹۰۲ [4] یٰسٓ: ۸۲

۳۔ اللہ کے وضع کردہ فیزیکل قوانین کے تحت عمریں بڑھتی گھٹتی ہیں۔

وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرٰنِ ۖ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ سَآئِغٌ شَرَابُهٗ وَهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ۖ وَمِنْ كُلٍّ تَاْكُلُوْنَ لَحْمًا طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْنَ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَتَرَى الْفُلْكَ فِيْهِ مَوَاخِرَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲﴾

۱۲۔ اور دو سمندر برابر نہیں ہوتے: ایک شیریں، پیاس بجھانے والا، پینے میں خوشگوار اور دوسرا کھارا کڑوا اور ہر ایک سے تم تازہ گوشت کھاتے کھاتے ہو اور زیورات نکال کر پہنتے ہو اور تم ان کشتیوں کو دیکھتے ہو جو پانی کو چیرتی چلی جاتی ہیں تاکہ تم اللہ کا فضل تلاش کرو اور شاید تم شکرگزار بن جاؤ۔

تشریح کلمات

فُرَاتٌ: (ف ر ت) الفرات کے معنی نہایت شیریں پانی کے ہیں۔

سَآئِغٌ: (س و غ) ساغ آسانی سے حلق سے نیچے اترنے کے معنوں میں ہے۔ یعنی گوارا۔

اُجَاجٌ: (ا ج ج) الاجاج کے معنی سخت کھاری اور گرم پانی کے ہیں۔

طَرِيًّا: (ط ر ی) تروتازہ۔

مَوَاخِرَ: (م خ ر) مخر کے معنی کشتی کا اپنے سینہ سے پانی چیرنے کے ہیں۔ جمع مواخر ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرٰنِ: دو سمندر ہیں۔ ایک کا پانی شیرین، خوشگوار ہے اور دوسرا کھارا کڑوا ہے۔ یہ دو سمندر برابر نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح مومن اور کافر بھی برابر نہیں ہو سکتے۔ مومن آب شیرین کی طرح ہے۔ دوسروں کے کام آنے والے معاشرے کو امن و خوشگوار بنانے والے ہوں گے۔

جب کہ کافر نامناسب خلق و خو اور معاشرے کی خوشگواری کو تلخی میں بدلنے والے ہوتے ہیں۔

۲۔ وَمِنْ كُلٍّ تَاْكُلُوْنَ لَحْمًا طَرِيًّا: دونوں میں اس فرق کے باوجود ایسا ہوتا ہے کہ بعض فائدے دونوں سے یکساں طریقے سے اٹھائے جاتے ہیں۔ اس میں مچھلی کا تازہ گوشت، موتی، مونگے، کشتی رانی قابل ذکر ہیں۔

اس آیت کی ایک تفسیر یہ ہے کہ اس میں مومن و کافر کا موازنہ نہیں ہے بلکہ قدرت کے تدبیری

امور پر مشتمل حکمت آمیز امور کا ذکر ہے۔ ایک طرف شیرین پانی ہے جو مایۂ حیات ہے، مختلف نہروں اور زیر زمین آبی ذخائر کے ذریعے حیات آفرین کردار ادا کر رہا ہے۔ دوسری طرف سمندر کا کھارا پانی ہے جس نے سطح زمین کے اکثر حصوں کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے جس کا کردار شیرین پانی سے کم نہیں ہے اور شیرین پانی فراہم کرنے کا بھی سرچشمہ یہی بحر بیکراں ہے جس نے ابھی تک کرۂ ارض کو ہوا کی آلودگی سے پاک رکھا ہے۔ البتہ کرۂ ارض سے اٹھنے والی زہریلی گیسیز سے اوزون متاثر ہو رہا ہے۔ یہ اس ظلوم و جھول انسان کی اپنی کارستانی ہے۔

تَاۡکُلُوۡنَ لَحۡمًا طَرِیًّا تازہ گوشت، شیرین پانی اور کھارا پانی، دونوں سے حاصل کیا جاتا ہے۔ مچھلی کے گوشت کے ذکر کے ساتھ طری تازہ کی شرط سے معلوم ہوا کہ اس گوشت سے استفادہ کرنے کے لیے تازگی شرط ہے۔ اگر تازہ نہ ہو تو گوشت قابل استفادہ نہیں ہوتا۔

دوسری قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن نے کھانے کے گوشت کا جب صریحاً ذکر کیا تو صرف دو قسم کے گوشت کا ذکر کیا ہے: ایک مچھلی کا گوشت جس کا تازہ ہونا ضروری ہے، دوسرا پرندوں کا گوشت:

وَ لَحۡمِ طَیۡرٍ مِّمَّا یَشۡتَہُوۡنَ ؕ[1] اور پرندوں کا گوشت لیے جس کی وہ خواہش کریں۔

اگرچہ دوسری آیت میں جنت کی نعمتوں میں مطلق گوشت کا بھی ذکر ہے:

وَ اَمۡدَدۡنٰہُمۡ بِفَاکِہَۃٍ وَّ لَحۡمٍ مِّمَّا یَشۡتَہُوۡنَ ؕ[2] اور ہم انہیں پھل اور گوشت جو ان کا جی چاہے فراہم کریں گے۔

تاہم اس مطلق سے وہی مقید یعنی پرندوں کا گوشت مراد ہو سکتا ہے۔

۳۔ وَ تَرَی الۡفُلۡکَ فِیۡہِ مَوَاخِرَ: اس جملے کی تشریح سورۃ النحل آیت ۱۴ میں ہو چکی ہے۔

اہم نکات

۱۔ پانی خواہ شیریں ہو یا کھارا، نظام حیات کے لیے دونوں مد ہیں۔

۲۔ جائز طریقے سے زیورات کا حصول و استعمال ممنوع نہیں ہے۔

۳۔ سمندری گوشت تازہ ہونا چاہیے۔

یُوۡلِجُ الَّیۡلَ فِی النَّہَارِ وَ یُوۡلِجُ النَّہَارَ فِی الَّیۡلِ ۙ وَ سَخَّرَ الشَّمۡسَ وَ الۡقَمَرَ ۫ۖ کُلٌّ یَّجۡرِیۡ لِاَجَلٍ

۱۳۔ وہ رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور سورج اور چاند کو مسخر کیا ہے، ان میں سے ہر ایک مقررہ وقت تک

---

[1] ۵۶ واقعہ: ۲۱ [2] ۵۲ طور: ۲۲

مُّسَمًّى ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمۡ لَهُ الۡمُلۡكُ وَالَّذِيۡنَ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِهٖ مَا يَمۡلِكُوۡنَ مِنۡ قِطۡمِيۡرٍ ﴿۱۳﴾

چلتا رہے گا، یہی اللہ تمہارا رب ہے، سلطنت اسی کی ہے اور اس کے علاوہ جنہیں تم پکارتے ہو وہ کھجور کی گٹھلی کے چھلکے (کے برابر کسی چیز) کے مالک نہیں ہیں۔

تشریح کلمات

قِطۡمِيۡرٍ: (ق ط م ر) قطمیر کے معنی اس ہلکے سے سپید نقطہ کے ہیں جو گٹھلی پر ہوتا ہے۔ یہ حقیر اور بے قدر چیز کے لیے ضرب المثل ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ يُوۡلِجُ الَّيۡلَ فِي النَّهَارِ: آیت کے ابتدائی حصے کی تشریح سورۂ لقمان ۲۹ میں ہو چکی ہے۔

۲۔ كُلٌّ يَّجۡرِيۡ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى: اس آیت اور دیگر آیات سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس نظام شمسی کے لیے ایک عمر متعین ہے۔ یہ نظام ابدی نہیں ہے۔ کہتے ہیں: سورج سے ہر سیکنڈ میں چار ملین ٹن انرجی خرچ ہو کر کم ہو رہی ہے اور ایک وقت ایسا آئے گا جب اس کی تمام انرجی ختم ہو جائے گی۔

۳۔ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمۡ لَهُ الۡمُلۡكُ: جو ذات رات اور دن کو چلاتی ہے، سورج چاند کو مسخر کرتی ہے اور ان کے لیے ایک مدت معین کرتی ہے، وہی تمہارا رب ہے۔ لَهُ الۡمُلۡكُ تدبیر کائنات اسی کے ہاتھ میں ہے اور اللہ کے علاوہ جنہیں تم پکارتے ہو ان کے ہاتھ میں ایک حقیر شے بھی نہیں ہے تو تم اسے چھوڑ رہے ہو جس کے ہاتھ میں سب کچھ ہے اور ایسوں کو پکارتے ہو جن کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔

اِنۡ تَدۡعُوۡهُمۡ لَا يَسۡمَعُوۡا دُعَآءَكُمۡ ۚ وَلَوۡ سَمِعُوۡا مَا اسۡتَجَابُوۡا لَكُمۡ ؕ وَيَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ يَكۡفُرُوۡنَ بِشِرۡكِكُمۡ ؕ وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثۡلُ خَبِيۡرٍ ﴿۱۴﴾

۱۴۔ اگر تم انہیں پکارو تو وہ تمہاری پکار سن نہیں سکتے اور اگر سن بھی لیں تو تمہیں جواب نہیں دے سکتے اور قیامت کے دن وہ تمہارے اس شرک کا انکار کریں گے اور (خدائے) باخبر کی طرح تجھے کوئی خبر نہیں دے سکتا۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنۡ تَدۡعُوۡهُمۡ لَا يَسۡمَعُوۡا دُعَآءَكُمۡ: وہ جامد، بے جان اصنام تمہاری آواز سننے کے قابل ہی نہیں ہیں۔

۲۔ وَلَوۡ سَمِعُوۡا مَا اسۡتَجَابُوۡا لَكُمۡ: اور اگر اللہ کے علاوہ تمہارے معبود تمہاری آواز سننے کے

قابل ہیں تو وہ تم مشرکین کی دعا قبول نہیں کر سکتے۔ مثلاً اگر یہ مشرکین ملائکہ کو پکارتے ہیں تو ملائکہ ان کی پکار کا نہ دنیا میں جواب دیں گے، نہ آخرت میں اور اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پوجا کرتے ہیں تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان مشرکین کو نہ دنیا میں جواب دیں گے، نہ آخرت میں۔ مَامِنۡ شَفِیۡعٍ اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ اِذۡنِہٖ ....[1] اللہ تعالیٰ مشرکین کی شفاعت کا اذن کیسے دے گا؟

وَکَمۡ مِّنۡ مَّلَکٍ فِی السَّمٰوٰتِ لَا تُغۡنِیۡ شَفَاعَتُہُمۡ شَیۡـًٔا اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ اَنۡ یَّاۡذَنَ اللّٰہُ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَ یَرۡضٰی ○ [2]

اور آسمانوں میں کتنے ہی ایسے فرشتے ہیں جن کی شفاعت کچھ بھی فائدہ نہیں دیتی مگر اللہ کی اجازت کے بعد جس کے لیے وہ چاہے اور پسند کرے۔

مشرکین کی شفاعت کی نہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت ملے گی، نہ ان مشرکین کے لیے کسی قسم کی شفاعت فائدہ مند ثابت ہو گی۔

فَمَا تَنۡفَعُہُمۡ شَفَاعَۃُ الشّٰفِعِیۡنَ ....[3]

اب سفارش کرنے والوں کی سفارش انہیں کچھ فائدہ نہ دے گی۔

اس آیت کا ان مومنین کے ساتھ ربط نہیں بنتا جنہیں شفاعت ملنے کی اللہ کی طرف سے اجازت ہو گی۔ نہ ان مومنین کے ساتھ اس کا ربط بنتا ہے جو اللہ کو چھوڑ کر نہیں بلکہ اللہ کو نہ چھوڑنے کے لیے بعض ما ذون من اللّٰہ ذوات مقدسہ کو وسیلہ بناتے ہیں۔

۳۔ وَلَا یُنَبِّئُکَ مِثۡلُ خَبِیۡرٍ: اس امر واقع پر اللہ کی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کوئی خبر نہیں دے گا کہ دنیا اور آخرت میں ان غیر اللہ کو پکارنے والوں کے ساتھ کیا کچھ ہونے والا ہے۔

اہم نکات

قیامت کے احوال کا واحد ذریعہ وحی ہے: وَلَا یُنَبِّئُکَ مِثۡلُ خَبِیۡرٍ۔

یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ اَنۡتُمُ الۡفُقَرَآءُ اِلَی اللّٰہِ ۚ وَ اللّٰہُ ہُوَ الۡغَنِیُّ الۡحَمِیۡدُ ﴿۱۵﴾

۱۵۔ اے لوگو! تم اللہ کے محتاج ہو اور اللہ تو بے نیاز، لائق ستائش ہے۔

اِنۡ یَّشَاۡ یُذۡہِبۡکُمۡ وَ یَاۡتِ بِخَلۡقٍ جَدِیۡدٍ ﴿ۚ۱۶﴾

۱۶۔ اگر وہ چاہے تو تمہیں نابود کر دے اور نئی خلقت لے آئے۔

وَ مَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیۡزٍ ﴿۱۷﴾

۱۷۔ اور ایسا کرنا اللہ کے لیے مشکل تو نہیں۔

---

[1] ۱۰ یونس: ۳ (ترجمہ) اس کی اجازت کے بغیر کوئی شفاعت کرنے والا نہیں ہے۔
[2] ۵۳ نجم: ۲۶　[3] ۷۴ مدثر: ۴۸

تفسیر آیات

۱۔ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اَنۡتُمُ الۡفُقَرَآءُ اِلَی اللّٰهِ: انسان اپنے وجود، اپنی بقاء میں اللہ کا محتاج ہے۔ اللہ سے ہٹ کر یہ انسان اپنا ایک سانس نہیں لے سکتا کہ اگر ایک لمحے کے لیے اللہ انسان سے ہاتھ اٹھا لے تو نیستی اور عدم کی تاریکیوں میں گم ہو جائے۔

روئے سخن ان لوگوں کی طرف ہے جو غیر اللہ کے دروازے پر دستک دیتے ہیں کہ تم صرف اور صرف اللہ کے محتاج ہو۔ اسی کے در پر جاؤ۔

۲۔ وَاللّٰهُ هُوَ الۡغَنِیُّ: اللہ بے نیاز ہے۔ کسی اور کا سہارا لینے کی اسے ضرورت نہیں ہے۔ وہ تمام کائنات سے بے نیاز ہے۔ وہ بندوں کی عبادت سے بے نیاز ہے۔ عبادت بندوں کی ضرورت ہے، اللہ کی نہیں۔ بندے کی ارتقا اور سرچشمۂ فیض سے اتصال عبادت میں ہے۔

۳۔ اِنۡ یَّشَاۡ یُذۡهِبۡکُمۡ: اللہ تمہارے وجود کا محتاج نہیں ہے۔ تمہیں نابود کر کے اللہ دوسری مخلوق پیدا کر سکتا ہے۔ وہ اس دوسری مخلوق سے بھی بے نیاز ہے۔ تاہم بے نیازی کے باوجود مخلوقات کو زندہ رکھتا ہے صرف اپنے فیض کو جاری رکھنے کے لیے۔

۴۔ وَمَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰهِ بِعَزِیۡزٍ: یہ کام اللہ کے لیے مشکل نہیں ہے چونکہ اللہ تعالیٰ کا ہر کام صرف ارادے سے ہوتا ہے۔ ارادہ کرنا اللہ کے لیے مشکل نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ تعالیٰ ذات و صفات میں بے نیاز اور بندے مجسم نیازمند ہیں۔

وَلَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰی ؕ وَ اِنۡ تَدۡعُ مُثۡقَلَۃٌ اِلٰی حِمۡلِهَا لَا یُحۡمَلۡ مِنۡهُ شَیۡءٌ وَّلَوۡ کَانَ ذَا قُرۡبٰی ؕ اِنَّمَا تُنۡذِرُ الَّذِیۡنَ یَخۡشَوۡنَ رَبَّهُمۡ بِالۡغَیۡبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ ؕ وَمَنۡ تَزَکّٰی فَاِنَّمَا یَتَزَکّٰی لِنَفۡسِهٖ ؕ وَاِلَی اللّٰهِ الۡمَصِیۡرُ ﴿۱۸﴾

۱۸۔ اور کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور اگر کوئی (گناہوں کے) بھاری بوجھ والا اپنا بوجھ اٹھانے کے لیے کسی کو پکارے گا تو اس سے کچھ بھی نہیں اٹھایا جائے گا خواہ وہ قرابتدار ہی کیوں نہ ہو، آپ تو صرف انہیں ڈرا سکتے ہیں جو بن دیکھے اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو پاکیزگی اختیار کرتا ہے تو وہ صرف اپنے لیے ہی پاکیزگی اختیار کرتا ہے اور اللہ ہی کی طرف پلٹنا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰی: یہ نظام عدل الٰہی کا مسلمہ اصول ہے کہ ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے اور اپنے کیے کا خود جواب دہ ہے:

مَنۡ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفۡسِہٖ وَ مَنۡ اَسَآءَ فَعَلَیۡہَا ؕ وَ مَا رَبُّکَ بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِیۡدِ ۝ [1]

جو نیک عمل کرتا ہے وہ اپنے لیے ہی کرتا ہے اور جو برا کام کرتا ہے خود اپنے ہی خلاف کرتا ہے اور آپ کا پروردگار تو بندوں پر قطعاً ظلم کرنے والا نہیں ہے۔

لہٰذا جرم کوئی کرے، سزا کسی اور کو نہیں دی جائے گی۔ آج کل کی مہذب حکومتوں کا شیوہ ہے کہ ایک فرد کے جرم پر پورے ملک کو سزا دی جاتی ہے۔ مجرم نہ ملنے پر اس کے ہمسایوں، رشتہ داروں پر زیادتی کی جاتی ہے۔

۲۔ اِنۡ تَدۡعُ مُثۡقَلَۃٌ: اگر کسی گناہ کے بھاری بوجھ والا کسی اور کو اپنا بوجھ اٹھانے کے لیے پکارے تو وہ اس کا بوجھ نہیں اٹھائے گا بلکہ اگر وہ اٹھانا بھی چاہے تو کسی کے گناہ کا بوجھ نہیں اٹھا پائے گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایسے غلط دعویٰ کو جھوٹ کہا ہے:

وَ قَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوۡا سَبِیۡلَنَا وَ لۡنَحۡمِلۡ خَطٰیٰکُمۡ ؕ وَ مَا ہُمۡ بِحٰمِلِیۡنَ مِنۡ خَطٰیٰہُمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ ؕ اِنَّہُمۡ لَکٰذِبُوۡنَ ۝ [2]

اور کفار اہل ایمان سے کہتے ہیں: ہمارے طریقے پر چلو تو تمہارے گناہ ہم اٹھا لیں گے حالانکہ وہ ان گناہوں میں سے کچھ بھی اٹھانے والے نہیں ہیں یہ لوگ جھوٹے ہیں۔

۳۔ وَّ لَوۡ کَانَ ذَا قُرۡبٰی: خواہ قریب ترین رشتہ دار کیوں نہ ہو۔ کوئی بھی اپنے قریبی رشتے دار کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ نہ باپ بیٹے کا، نہ بیٹا باپ کے گناہوں کا بوجھ اٹھا سکتا ہے۔

۴۔ اِنَّمَا تُنۡذِرُ: آپ کی تنبیہ سے استفادہ کرنے والے وہی لوگ ہوں گے جن کے دلوں میں اس خدا کا خوف ہے جو ان کے مشاہدے سے غائب ہے یا اس کا عذاب ابھی غائب ہے یا وہ یوم حساب جو ابھی نظروں سے غائب ہے۔

۵۔ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ: وہ لوگ آپ کی ملکوتی آواز پہچانیں گے جو اللہ کی بارگاہ میں عبادت کے لیے حاضر ہوتے ہیں اور اللہ کی بندگی کر کے گوش شنوا حاصل کرتے ہیں۔

۶۔ وَ مَنۡ تَزَکّٰی فَاِنَّمَا یَتَزَکّٰی لِنَفۡسِہٖ: جو اللہ کی اطاعت کر کے اپنے نفس کو گناہ کی پلیدی سے پاک کر دیتا ہے، اس کا فائدہ خود اسی کو پہنچتا ہے۔ اگر کوئی ہستی انسان کو پاکیزگی کی دعوت دیتی ہے تو یہ دعوت اس انسان کے حق میں ہوتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ ہر شخص اپنا بوجھ خود اٹھائے گا: وَلَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰی....

---

[1] ۴۱ حٰمٓ سجدہ: ۴۶ [2] ۲۹ عنکبوت: ۱۲

۲۔ قیامت کے دن عمل کام آتا ہے رشتہ دار نہیں: وَّلَوۡ کَانَ ذَا قُرۡبٰی....

۳۔ خوف خدا اور نماز انسان کو ہدایت کا اہل بنا دیتے ہیں۔

وَ مَا یَسۡتَوِی الۡاَعۡمٰی وَ الۡبَصِیۡرُ ﴿۱۹﴾	۱۹۔ اور نابینا اور بینا برابر نہیں ہو سکتے،
وَ لَا الظُّلُمٰتُ وَ لَا النُّوۡرُ ﴿۲۰﴾	۲۰۔ اور نہ ہی اندھیرا اور نہ روشنی،
وَ لَا الظِّلُّ وَ لَا الۡحَرُوۡرُ ﴿۲۱﴾	۲۱۔ اور نہ سایہ اور نہ دھوپ،
وَ مَا یَسۡتَوِی الۡاَحۡیَآءُ وَ لَا الۡاَمۡوَاتُ ؕ اِنَّ اللّٰہَ یُسۡمِعُ مَنۡ یَّشَآءُ ۚ وَ مَاۤ اَنۡتَ بِمُسۡمِعٍ مَّنۡ فِی الۡقُبُوۡرِ ﴿۲۲﴾	۲۲۔ اور نہ ہی زندے اور نہ ہی مردے یکساں ہو سکتے ہیں، بے شک اللہ جسے چاہتا ہے سنواتا ہے اور آپ قبروں میں مدفون لوگوں کو تو نہیں سنا سکتے۔
اِنۡ اَنۡتَ اِلَّا نَذِیۡرٌ ﴿۲۳﴾	۲۳۔ آپ تو صرف تنبیہ کرنے والے ہیں۔

تشریح کلمات

الۡحَرُوۡرُ: (ح ر ر) گرم دھوپ۔ گرم ہوا، زہریلی ہوا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ مَا یَسۡتَوِی الۡاَعۡمٰی وَ الۡبَصِیۡرُ: کفر و ایمان، مومن اور کافر، اللہ تعالیٰ اور اصنام میں ایک محسوساتی موازنہ پیش کیا جا رہا ہے چونکہ انسان محسوسات بہتر طور پر سمجھ سکتا ہے۔ فرمایا: وہ شخص جس میں بینائی نہ ہو، جس نے روشنی دیکھی ہی نہ ہو اور روشنی سے آشنا ہی نہ ہو، روشنی سے استفادہ کرنے کی صلاحیت نہ ہو، کیا وہ اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو چشم بصارت و بصیرت رکھتا ہے۔ روشنی سے فائدہ اُٹھانے کی صلاحیت رکھتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ جس قلب میں ایمان ہے وہ چشم بینا رکھتا ہے، جب کہ ایمان نہ رکھنے والا اپنے نفع و نقصان کی چیزیں نہیں دیکھ پاتا۔

۲۔ وَ لَا الظُّلُمٰتُ وَ لَا النُّوۡرُ: نہ ہی اندھیرا اور روشنی برابر ہو سکتے ہیں۔ تاریکی میں تمام تر ارتقائی پیشرفت رک جاتی ہے، فعالیات مفلوج ہو جاتی ہیں۔ زندگی کا پہیہ رک جاتا ہے۔ موت کی سی خاموشی چھا جاتی ہے۔ جب کہ نور، سرچشمۂ حیات، مایۂ زندگی ہے۔ ایمان نور ہے، ایک بینش ہے۔ اس نور کے ذریعے انسان اپنی دنیاوی و اخروی زندگی کے لوازمات جمع کر سکتا ہے۔ جب کہ ایمان نہ رکھنے والا دارین کی مفید اور

مضر چیزوں کی شناخت نہیں رکھتا۔

۴۔ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الۡحَرُوۡرُ: اسی طرح سائے کی ٹھنڈک اور دھوپ کی تپش برابر نہیں ہو سکتی۔ سائے میں سکون ہے۔ حرور، بادسموم میں زندگی مفلوج ہو جاتی ہے۔

۵۔ وَمَا یَسۡتَوِی الۡاَحۡیَآءُ وَلَا الۡاَمۡوَاتُ: نہ ہی زندے اور مردے برابر ہو سکتے ہیں۔ ایک زندہ شخص سے آپ بہت توقعات رکھ سکتے ہیں۔ ایک مردہ لاش میں تعفن کے علاوہ کوئی خیر نہیں ہوتی۔ مؤمن زندگی رکھتا ہے۔ زندگی میں نشو و نما ہے۔ اس کے وجود کے ثمرات ہیں۔

۶۔ اِنَّ اللّٰہَ یُسۡمِعُ مَنۡ یَّشَآءُ: اللہ جسے چاہتا ہے سنواتا ہے۔ یہ بات اللہ کی مشیت کے تابع ہے کہ اللہ کس تک اپنی دعوت پہنچاتا اور ہدایت دیتا ہے اور کون اس کا اہل ہے۔

۷۔ وَمَاۤ اَنۡتَ بِمُسۡمِعٍ مَّنۡ فِی الۡقُبُوۡرِ: آپ ایسے لوگوں تک اپنی آواز نہیں پہنچا سکتے جو قبر میں مدفون شخص کی طرح ہیں۔ ان میں شنوائی کی اہلیت نہیں ہے۔

واضح رہے جب کوئی اہل نہیں ہوتا تو دعوت کا مؤثر ہونا کافی نہیں ہے۔ جیسا کہ کوئی اللہ کی رحمت کا اہل نہیں ہے تو اللہ کا ارحم الرحمین ہونا کافی نہیں ہے۔

۸۔ اِنۡ اَنۡتَ اِلَّا نَذِیۡرٌ: آپؐ کے ذمے دعوت پہنچانا، حجت پوری کرنا ہے۔ اس دعوت پر لوگوں کا ایمان لے آنا اور اسے قبول کرانا آپؐ کی ذمہ داری نہیں ہے۔

فضیلت: ابو صالح، ابن عباس سے روایت کرتے ہیں:

> مَا یَسۡتَوِی الۡاَعۡمٰی ابوجہل ہے۔ الۡبَصِیۡرُ علی بن ابی طالبؑ ہیں۔ وَلَا الظُّلُمٰتُ ابو جہل ہے جس کا دل شرک کی تاریکی میں ہے۔ وَلَا النُّوۡرُ علیؑ کا قلب ہے جو نور سے پُر ہے۔ وَلَا الظِّلُّ علیؑ ہیں جو جنت میں ہوں گے۔ لَا الۡحَرُوۡرُ ابوجہل ہے جو جہنم میں ہو گا۔ وَمَا یَسۡتَوِی الۡاَحۡیَآءُ علی، حمزہ، جعفر، حسن و حسین فاطمہ، خدیجہ علیہم السلام ہیں۔ وَلَا الۡاَمۡوَاتُ کفار مکہ ہیں۔[1]

اہم نکات

۱۔ ایمان سے بینائی، روشنی، سکون اور زندگی ملتی ہے۔

۲۔ جو اہل نہیں اس تک ہدایت کی صدا نہیں پہنچ پاتی۔

اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ بِالۡحَقِّ بَشِیۡرًا وَّ　　۲۴۔ ہم نے آپ کو حق کے ساتھ بشارت دینے والا

---

[1] شواهد التنزيل ذیل آیت

نَذِیۡرًا ؕ وَ اِنۡ مِّنۡ اُمَّۃٍ اِلَّا خَلَا فِیۡہَا نَذِیۡرٌ ﴿۲۴﴾
اور تنبیہ کرنے والا بنا کر بھیجا ہے اور کوئی امت ایسی نہیں گزری جس میں کوئی متنبہ کرنے والا نہ آیا ہو۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ بِالۡحَقِّ بَشِیۡرًا وَّ نَذِیۡرًا: اس جملے کی تشریح سورہ بقرہ آیت ۱۱۹ میں ہو گئی ہے۔

۲۔ وَ اِنۡ مِّنۡ اُمَّۃٍ اِلَّا خَلَا فِیۡہَا نَذِیۡرٌ: کوئی امت ایسی نہیں گزری جس میں کوئی تنبیہ کرنے والا نہ آیا ہو۔ کسی نبی کا پیغام جس تک پہنچے اس کی تنبیہ ہو گئی۔ اس پر یہ آیت شاہد ہے:

وَ اُوۡحِیَ اِلَیَّ ہٰذَا الۡقُرۡاٰنُ لِاُنۡذِرَکُمۡ بِہٖ وَ مَنۡۢ بَلَغَ ...[1]
اور یہ قرآن میری طرف بذریعہ وحی نازل کیا گیا ہے تاکہ میں تمہیں اور جس تک یہ پیغام پہنچے سب کو تنبیہ کروں۔

اس آیت کے تحت نذیر وہ ہے جس کا پیغام ہے، وہ نبی ہیں۔ وَ مَنۡۢ بَلَغَ کے تحت مبلغ کو نذیر کہتے ہیں۔ لہٰذا کسی نبی کا پیغام جس جس قوم تک پہنچا ہے، اس قوم کے وہ نبی نذیر ہیں۔

لہٰذا یہ نظریہ بھی درست ہے عالم اور مبلغ کو بھی نذیر کہتے ہیں۔ چونکہ قرآن نے نبی کا پیغام پہنچانے والے کو بھی نذیر کہا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

وَ لِیُنۡذِرُوۡا قَوۡمَہُمۡ اِذَا رَجَعُوۡۤا اِلَیۡہِمۡ لَعَلَّہُمۡ یَحۡذَرُوۡنَ ﴿۰﴾[2]
اور جب اپنی قوم کی طرف واپس آئیں تو انہیں تنبیہ کریں تاکہ وہ (ہلاکت خیز باتوں سے) بچے رہیں۔

اس آیت میں مبلغ کے لیے بھی "انذار کرنے والے" کا لفظ استعمال کیا ہے۔

اس تشریح سے یہ بات سمجھنے میں آسانی ہو گی کہ ہر امت کی من حیث القوم تنبیہ ہو گئی ہے۔ اس کے لیے ہر قوم میں الگ الگ انبیاء نہیں بھیجے گئے: وَ لَوۡ شِئۡنَا لَبَعَثۡنَا فِیۡ کُلِّ قَرۡیَۃٍ نَّذِیۡرًا۔[3] ہر بستی کے لیے نبی نہیں بھیجا گیا بلکہ ہر قوم کی تنبیہ ہو گئی۔

مثلاً حضرت نوح علیہ السلام کی رسالت کے آثار نسلوں تک باقی رہے ہیں تو ان تمام نسلوں کی تنبیہ ہو گئی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رسالت کے آثار صدیوں تک باقی رہے تو ان سب اقوام کی تنبیہ ہو گئی۔ البتہ ممکن ہے ہر فرد تک یہ پیغام نہ پہنچے۔ اس شخص کو قرآنی اصطلاح میں مستضعف کہتے ہیں۔ اس کا مؤاخذہ نہیں ہو گا چونکہ اس پر حجت پوری نہ ہوئی۔

البتہ کسی نبی کی رسالت کے آثار مٹنے لگیں تو اس وقت نئے نبی کا مبعوث ہونا ضروری ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بت پرستی، توحید پرستی کا انحرافی مسلک ہے لہٰذا جہاں بت پرستی ہے وہاں توحید پرستی

---

[1] ۶ انعام: ۱۹ [2] ۹ توبۃ: ۱۲۲ [3] ۲۵ فرقان: ۵۱ (ترجمہ) اگر ہم چاہتے تو ہر بستی میں ایک تنبیہ کرنے والا مبعوث کرتے۔

تھی اور وہاں کوئی نبی مبعوث تھا۔ چنانچہ امریکہ کا انکشاف کرنے والے کہتے ہیں کہ وہاں آفتاب پرستی کے لیے عبادت خانہ تھا۔ نئے آنے والوں کو شروع میں وہ آفتاب کی اولاد سمجھتے تھے۔[1]

اہم نکات

۱۔ ہر قوم و ملت تک اللہ کا پیغام پہنچا ہے۔

۲۔ زمین کبھی حجت خدا سے خالی نہیں رہی۔

وَ اِنۡ یُّکَذِّبُوۡکَ فَقَدۡ کَذَّبَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ ۚ جَآءَتۡہُمۡ رُسُلُہُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ وَ بِالزُّبُرِ وَ بِالۡکِتٰبِ الۡمُنِیۡرِ ﴿۲۵﴾

۲۵۔ اور اگر یہ لوگ آپ کی تکذیب کرتے ہیں تو ان سے پہلے والوں نے بھی تکذیب کی ہے، ان کے پاس ان کے رسول واضح دلائل اور صحیفے اور روشن کتاب لے کر آئے تھے۔

ثُمَّ اَخَذۡتُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فَکَیۡفَ کَانَ نَکِیۡرِ ﴿۲۶﴾

۲۶۔ پھر جنہوں نے کفر کیا میں نے انہیں گرفت میں لے لیا پھر (دیکھا) میرا عذاب کیسا سخت تھا؟

تفسیر آیات

۱۔ وَ اِنۡ یُّکَذِّبُوۡکَ: اگر یہ لوگ آپ کی تکذیب کرتے ہیں تو یہ پہلی بار نہیں ہے۔ جو لوگ کلمہ حق قبول کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے وہ ہمیشہ انبیاء کی تکذیب کرتے رہے ہیں۔

۲۔ جَآءَتۡہُمۡ رُسُلُہُمۡ: ان تکذیبی عناصر کے پاس انبیاء علیہم السلام درج ذیل ثبوت لے کر آئے تھے:

الف: بِالۡبَیِّنٰتِ: معجزے لے کر آئے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نو عظیم معجزات قائم کیے۔ پھر لوگوں نے انہیں ساحر کہہ کر جھٹلا دیا۔

ب: بِالزُّبُرِ: ایسے صحیفے لے کر جن میں انسانیت ساز مواعظ اور نصیحتیں تھیں۔

ج: وَ بِالۡکِتٰبِ الۡمُنِیۡرِ: ایک جامع شریعت پر مشتمل کتاب اور دستور حیات لے کر آئے۔

۳۔ ثُمَّ اَخَذۡتُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا: ان شواہد کے باوجود جب ان کافروں نے تکذیب کی تو ہم نے انہیں عذاب شدید میں پکڑ لیا۔ اس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے لیے تسلی اور کامیابی کی خوش خبری ہے۔

اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ

۲۷۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمان سے

---

[1] قاموس قرآن

مَآءً ۚ فَاَخۡرَجۡنَا بِہٖ ثَمَرٰتٍ مُّخۡتَلِفًا اَلۡوَانُہَا ؕ وَ مِنَ الۡجِبَالِ جُدَدٌۢ بِیۡضٌ وَّ حُمۡرٌ مُّخۡتَلِفٌ اَلۡوَانُہَا وَ غَرَابِیۡبُ سُوۡدٌ ﴿۲۷﴾

پانی برسایا پھر ہم نے اس سے مختلف رنگوں کے پھل نکالے؟ اور پہاڑوں میں مختلف رنگوں کی سفید سرخ گھاٹیاں پائی جاتی ہیں اور کچھ گہری سیاہ ہیں۔

وَ مِنَ النَّاسِ وَ الدَّوَآبِّ وَ الۡاَنۡعَامِ مُخۡتَلِفٌ اَلۡوَانُہٗ کَذٰلِکَ ؕ اِنَّمَا یَخۡشَی اللّٰہَ مِنۡ عِبَادِہِ الۡعُلَمٰٓؤُا ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَزِیۡزٌ غَفُوۡرٌ ﴿۲۸﴾

۲۸۔ اور اسی طرح انسانوں اور جانوروں اور مویشیوں میں بھی رنگ پائے جاتے ہیں، اللہ کے بندوں میں سے صرف اہل علم ہی اس سے ڈرتے ہیں، بے شک اللہ بڑا غالب آنے والا، معاف کرنے والا ہے۔

تشریح کلمات

جُدَدٌ: (ج دد) یہ جُدۃٌ کی جمع ہے جس کے معنی کھلے راستہ کے ہیں۔ اسی سے شاہراہ کو جادۃ کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً: اس بات پر ایک شاھد کا ذکر ہے کہ اس کائنات کی تدبیر صرف ایک ہی ذات کے ہاتھ میں ہے جس نے آسمان سے ایک قسم کا پانی نازل کیا لیکن اس ایک پانی سے مختلف رنگوں کے پھل نکالے۔ رنگوں کے مختلف ہونے سے پھلوں کا ذائقہ، طبیعت اور مزاج بھی مختلف ہو جاتے ہیں۔

زمین پر پانی پڑنے سے زمین میں موجود مختلف عناصر میں موجود خاصیتیں فعال ہوجاتی ہیں اور جو دانہ زمین میں جاتا ہے اسے اس بات کا شعور ہے کہ کن عناصر کو جذب کرنا ہے تاکہ مطلوبہ پھل وجود میں آئے۔ اس دانے کو کس نے سمجھایا کہ مخصوص عناصر کو جذب کر کے ترکیب دینا ہے تاکہ مطلوبہ پھل وجود میں آئے۔ کیا یہ تمہارے معبودوں نے سمجھایا ہے یا خدائے واحد نے؟ یہ عدم یکسانیت اللہ کی خلاقیت اور صناعیت کی دلیل ہے۔

۲۔ وَ مِنَ الۡجِبَالِ جُدَدٌۢ بِیۡضٌ وَّ حُمۡرٌ: اور پہاڑوں میں مختلف رنگوں کی گھاٹیاں پائی جاتی ہیں۔ ان گھاٹیوں اور راستوں کا رنگ مختلف ہے۔ رنگ، نوع اور کیفیت میں اختلاف سے شناخت اور اختیار کرنے میں مدد ملتی ہے۔ یہ اختلاف تدبیر امور کا حصہ ہے ورنہ سب ایک رنگ، ایک نوع اور ایک کیفیت کی ہوتیں تو مختلف ضرورتیں پوری نہ ہوتیں۔ ممکن ہے کہ جُدَدٌ کا ترجمہ دھاریوں سے کیا جائے تو یہ بھی قدرت

کی صناعیت ہے کہ مختلف رنگوں سے خالق کے ارادے کا پتہ چلتا ہے ورنہ اگر تمام چیزیں یکساں ہوتیں تو کوئی کہہ سکتا تھا کہ اتفاق سے وجود میں آئی ہیں۔ کسی شعور و ارادے کی کرشمہ سازی نہیں ہے۔

۳۔ وَ مِنَ النَّاسِ وَ الدَّوَآبِّ وَ الۡاَنۡعَامِ: اسی طرح تنوع اور عدم یکسانی انسانوں میں بھی ہے۔ دو انسانوں کی شکل، مزاج، رنگ، آواز، چال اور ترجیحات ایک طرح کی نہیں ہیں۔ اسی طرح حیوانات میں بھی اگر ایک ماں، باپ سے ہوں تو بھی یکسانیت نہیں پائی جاتی۔ اَلۡوَانُہٗ میں الوان سے مراد اقسام و انواع بھی لیا جا سکتے ہیں۔ ضمیر وحدت اس لیے ہے کہ یہ ضمیر ما ھو، مُخۡتَلِفٌ اَلۡوَانُہٗ میں ھو کی طرف ہے یا جنس مقدر ہے۔ (مجمع البیان)

۴۔ اِنَّمَا یَخۡشَی اللّٰہَ مِنۡ عِبَادِہِ الۡعُلَمٰٓؤُا: اللہ کے بندوں میں صرف علم رکھنے والے ہی اللہ سے ڈرتے ہیں۔ علم سے جمالیاتی ذوق بیدار ہوتا ہے۔ کائنات کی رنگارنگ رعنائیوں کو دیکھ کر عالم اس کے خالق کی خلاقیت اور صنعت گری کی معرفت سے سرشار ہوتا ہے۔ علم کی وجہ سے پردے ہٹ جاتے ہیں۔ پردے ہٹ جانے سے بہت سے حقائق جو جاہل سے پوشیدہ ہیں، عالم کے سامنے آجاتے ہیں۔ حقائق کے منکشف ہونے کے بعد عالم خطرات کو بھانپ لیتا ہے، بالکل اس شخص کی طرح جو قانون اور جرم و سزا سے آشنا ہو۔ وہ قانون کے عدل سے خوف کھاتا ہے اور جو شخص صحت کے اصولوں سے واقف ہو وہ مضر صحت چیزوں سے خوف کھاتا ہے۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے:

> مدینہ منورہ کے شیعہ عالم دین آیۃ اللہ محمد علی العمریؒ کے صاحبزادے لاہور میں زیر تعلیم تھے۔ ان کے ہمراہ ہم شہر کے اندر کہیں جا رہے تھے۔ راستے میں انہوں نے مجھ سے سوال کیا کہ اس کا کیا مطلب ہے کہ اللہ سے صرف علم رکھنے والے ہی ڈرتے ہیں۔ ان کا سوال ابھی ختم ہوا ہی تھا کہ ٹریفک کی بھیڑ کے درمیان میں ایک بھینس بلاخوف و خطر آرام سے کھڑی نظر آئی میں نے ان سے کہا: دیکھو! یہ بھینس چونکہ علم نہیں رکھتی اس لیے اس خطرناک ٹریفک کے درمیان بلاخوف کھڑی ہے۔

اللہ سے ڈرنے کا مطلب اس کے عدل سے ڈرنا ہے ورنہ وہ خود ارحم الراحمین ہے۔

آیت میں علماء سے مراد صرف وہ لوگ نہیں ہیں جنہیں اصطلاح میں علماء کہا جاتا ہے۔ عالم وہ ہے جس کا علم اسے خوف خدا سے آشنا کرے۔ حدیث میں آیا ہے:

یَعۡنِی بِالۡعُلَمَاءِ مَنۡ صَدَّقَ فِعۡلُهُ قَوۡلَهُ وَ مَنۡ لَمۡ یُصَدِّقۡ فِعۡلُهُ قَوۡلَهُ فَلَیۡسَ بِعَالِمٍ۔[1]	علماء سے مراد وہ ہیں جن کا عمل ان کے قول کی تصدیق کرے، جن کا عمل ان کے قول تصدیق نہ کرے وہ عالم نہیں ہیں۔

---
[1] الکافی ۱: ۳۶

دوسری حدیث میں آیا ہے:

علم لا یصلحك ضلال ومال لا ینفعك وبال.[1]

وہ علم جو تیری اصلاح نہ کرے ضلالت ہے اور وہ مال جو تجھے فائدہ نہ دے وبال ہے۔

نیز حدیث ہے:

اعلمکم باللّٰہ اخوفکم للّٰہ۔[2]

تم میں سے زیادہ عالم باللہ وہ ہے جو اللہ سے زیادہ خوف رکھتا ہو۔

اہم نکات

۱۔ مخلوقات میں تنوع اللہ تعالیٰ کی صناعیت کی نشانی ہے۔

۲۔ عالم وہ ہے جس کا علم خوف خدا کا باعث بنے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ یَتۡلُوۡنَ کِتٰبَ اللّٰہِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اَنۡفَقُوۡا مِمَّا رَزَقۡنٰہُمۡ سِرًّا وَّ عَلَانِیَۃً یَّرۡجُوۡنَ تِجَارَۃً لَّنۡ تَبُوۡرَ ﴿۲۹﴾

۲۹۔ بے شک جو لوگ اللہ کی کتاب کی تلاوت کرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور ہم نے جو رزق انہیں دیا ہے اس میں سے پوشیدہ اور علانیہ خرچ کرتے ہیں، وہ ایسی تجارت کے ساتھ امید لگائے ہوئے ہیں جس میں ہرگز خسارہ نہ ہوگا۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ یَتۡلُوۡنَ کِتٰبَ اللّٰہِ: تلاوت کتاب اللّٰہ سے مراد تلاوت قرآن ہے۔ قرآن کی تلاوت اس صورت میں تمام اعمال سے بہتر ہے جب معانی قرآن میں غور و فکر اور اس پر عمل کیا جائے۔ اس کی تفصیل مقدمہ میں مذکور ہے۔

۲۔ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ: تلاوت کا ایک نتیجہ اقامہ نماز ہے۔ نماز قائم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اسے ضائع نہ کیا جائے۔ اس کا پوری طرح تحفظ کیا جائے۔ کوئی نماز ترک نہ ہو اور نماز کو اس کی شرائط کے ساتھ ادا کیا جائے تو یہ نماز قائم کرنے والا کہلائے گا۔

۳۔ وَ اَنۡفَقُوۡا مِمَّا رَزَقۡنٰہُمۡ: زرق خدا کو راہ خدا میں خرچ کرنے کی فضیلت تو خود قرآن میں جا بجا بیان ہوئی ہے کہ حب المال انسان کی بہت بڑی کمزوری ہے۔ مال سے ہاتھ اُٹھانے اور اسے راہ خدا میں دینے کی بہت فضیلت ہے۔ اس انفاق سے مراد زکوۃ کے علاوہ ہے چونکہ یہ آیت مکی ہے۔ مکہ میں زکوۃ فرض

---

[1] غرر الحکم حکمت: ۱۹۲　[2] بحار ۶۷: ۳۴۴

نہیں ہوئی تھی۔

۴۔ سِرًّا وَّ عَلَانِیَۃً: راہ خدا میں اگر پوشیدہ طور پر مال خرچ کرتے ہیں تو اس میں ریاکاری کا شائبہ نہیں رہتا۔ اس خرچ کا محرک اللہ کی خوشنودی ہے تو یہ انفاق بہت درجہ رکھتا ہے۔

اگر علانیہ انفاق کرے تو اس علانیہ کرنے کا محرک ریاکاری نہ ہو بلکہ انفاق کو لوگوں میں ترویج دینے کے لیے ہو تو اس کا اپنا درجہ ہے۔

۵۔ یَّرۡجُوۡنَ تِجَارَۃً لَّنۡ تَبُوۡرَ: راہ خدا میں انفاق ایک ایسی سعادت مندانہ تجارت ہے جس کا ایک فریق اللہ ہے۔ دوسرا فریق اس کا اپنا بندہ۔ مال بھی خود اللہ کا۔ بندے کے پاس کچھ دنوں کے لیے امانت تھی۔ فضلیت اس میں ہے کہ بندے نے اس امانت کا اس کے حقیقی مالک کی مرضی کے مطابق اسی کے ساتھ معاملہ کیا ہے۔ جس معاملے کا ایک فریق اللہ ہو بھلا اس معاملے میں خسارے کا امکان ہے؟ نہیں بلکہ یہ تصور سے زیادہ نفع بخش تجارت ہے۔ ایسی تجارت جس میں منافع کی ضمانت دی گئی ہے۔ راہ خدا میں مال خرچ کرنا ایسی سرمایہ کاری ہے جس کا نفع بخش ہونا یقینی ہے۔

اس تجارت کے منافع کی طرف سورۂ بقرہ آیت ۲۶۱ میں اشارہ فرمایا ہے جس میں ایک کے مقابلے عام طور پر سات سو گنا ثواب ملے گا اور خاص بندوں کے لیے اس ثواب کو مضاعف یعنی کئی گنا کیا جا سکتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ تلاوت قرآن کا ذکر نماز سے پہلے آیا ہے چونکہ قرآن فہمی نماز کے لیے بنیاد ہے۔

۲۔ نماز انفاق کے ساتھ ہونی چاہیے۔

۳۔ مال حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے: رَزَقۡنٰہُمۡ ....

۴۔ جس تجارت کا ایک فریق اللہ ہو اس سے زیادہ نفع بخش تجارت نہیں ہو سکتی۔

لِیُوَفِّیَہُمۡ اُجُوۡرَہُمۡ وَ یَزِیۡدَہُمۡ مِّنۡ فَضۡلِہٖ ؕ اِنَّہٗ غَفُوۡرٌ شَکُوۡرٌ ﴿۳۰﴾

۳۰۔ تاکہ اللہ ان کا پورا اجر انہیں دے بلکہ اپنے فضل سے مزید بھی عطا فرمائے، یقیناً اللہ بڑا معاف کرنے والا، قدردان ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ لِیُوَفِّیَہُمۡ اُجُوۡرَہُمۡ: ان کی تجارت میں خسارے کا امکان اس لیے نہیں رکھا ہے تاکہ ان کو ان کے اس انفاق کا پورا اجر مل جائے۔ وہ اجر اللہ نے تفضلاً مقرر فرما رکھا ہے۔

۲۔ وَيَزِيۡدَهُمۡ مِّنۡ فَضۡلِهٖ: بلکہ مزید بھی عنایت ہوگا۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ انفاق کے لیے جو اجراللہ نے مقرر فرمایا ہے اس میں بھی تفضّل ہے۔ وَيَزِيۡدَهُمۡ اس پر بھی اپنے فضل سے مزید دیا جائے گا۔
وَاللّٰهُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِيۡمِ ۝[1]		اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

۳۔ اِنَّهٗ غَفُوۡرٌ شَكُوۡرٌ: انسان سے گناہ بھی سرزد ہوتا ہے اور عمل صالح بھی۔ اللہ گناہوں کو معاف فرمانے والا اور عمل صالح کی قدر دانی کرنے والا ہے۔ یہ ہیں اللہ کے ذوالفضل ہونے کے تقاضے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ تعالیٰ اجر بھی پورا دیتا ہے اور مزید بھی عطا فرماتا ہے: وَيَزِيۡدَهُمۡ مِّنۡ فَضۡلِهٖ....

وَالَّذِيۡۤ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ مِنَ الۡكِتٰبِ هُوَ الۡحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِعِبَادِهٖ لَخَبِيۡرٌۢ بَصِيۡرٌ ﴿۳۱﴾

۳۱۔ اور ہم نے جو کتاب آپ کی طرف وحی کی ہے وہی برحق ہے، یہ ان کتابوں کی تصدیق کرتی ہے جو اس سے پہلے آئی ہیں، یقیناً اللہ اپنے بندوں سے خوب باخبر، ان پر نظر رکھنے والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ جس کتاب کی آپ کی طرف وحی کی ہے اس کے مبنی بہ حق ہونے کی ایک دلیل یہ ہے کہ یہ کتاب سابقہ آسمانی کتب کی حقانیت کی تصدیق کرتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ سلسلۂ انبیاء علیہم السلام کے ایک برحق نبی ہیں۔

۲۔ اِنَّ اللّٰهَ بِعِبَادِهٖ لَخَبِيۡرٌۢ بَصِيۡرٌ: وہ اپنے بندوں کے ظاہر و باطن سے باخبر ہے۔ اس خبر کے مطابق اللہ اس بندے کے ساتھ سلوک کرتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو اللہ نے اپنی وحی اور رسالت کے لیے بہترین اور لائق ترین پایا تو آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو یہ کتاب دی گئی ہے۔

ثُمَّ اَوۡرَثۡنَا الۡكِتٰبَ الَّذِيۡنَ اصۡطَفَيۡنَا مِنۡ عِبَادِنَا ۚ فَمِنۡهُمۡ ظَالِمٌ لِّنَفۡسِهٖ ۚ وَمِنۡهُمۡ مُّقۡتَصِدٌ ۚ وَمِنۡهُمۡ سَابِقٌۢ بِالۡخَيۡرٰتِ بِاِذۡنِ اللّٰهِ

۳۲۔ پھر ہم نے اس کتاب کا وارث انہیں بنایا جنہیں ہم نے اپنے بندوں میں سے برگزیدہ کیا ہے پس ان میں سے کچھ اپنے نفس پر ظلم کرنے والے ہیں اور کچھ میانہ رو ہیں اور کچھ اللہ کے اذن سے نیکیوں میں سبقت لے جانے

---
[1] ۲ بقرہ: ۱۰۵

ذٰلِکَ ہُوَ الۡفَضۡلُ الۡکَبِیۡرُ ﴿۳۲﴾ والے ہیں یہی تو بڑا فضل ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ ثُمَّ اَوۡرَثۡنَا الۡکِتٰبَ: الۡکِتٰبَ سے مراد وہ کتاب ہے جس کا ذکر سابقہ آیت میں آیا ہے۔ چنانچہ الۡکِتٰبَ میں الف لام اسی مذکورہ کتاب یعنی القرآن کی طرف اشارہ ہے۔ لہٰذا اس آیت میں وارثین قرآن کا ذکر ہے۔

اس آیت میں فرمایا: پھر ہم نے کتاب کا وارث اپنے ان بندوں کو بنا دیا جنہیں ہم نے برگزیدہ کیا ہے۔ کتاب یعنی قرآن کی وارث اور اللہ کی برگزیدہ قوم کون لوگ ہیں؟

اکثر مفسرین کے نزدیک وہ قوم جسے وارث قرآن اور برگزیدہ بنایا، امت مسلمہ ہے۔ اس پر یہ سوال پیدا ہو گیا کہ وارث قرآن اور اللہ کی برگزیدہ قوم ظلم بنفس کا ارتکاب کر سکتی ہے؟

اس کا جواب یہ دیا گیا ہے: جب کسی قوم میں چند برگزیدہ ہستیوں کو کتاب کا وارث بنایا جاتا ہے تو نسبت پوری قوم کی طرف دی جاتی ہے۔ چنانچہ فرمایا:

وَ اَوۡرَثۡنَا بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ الۡکِتٰبَ ۔[1] اور بنی اسرائیل کو ہم نے اس کتاب کا وارث بنایا۔

واضح رہے کہ بنی اسرائیل پوری قوم کو نہیں اس قوم میں چند برگزیدہ ہستیوں کو وارث بنایا۔

دوسرا جواب یہ ہے: اللہ نے انہیں وارث کتاب بنانے کے لیے برگزیدہ کیا تھا کہ قرآن کو دستور حیات بنائیں مگر وہ تین گروہوں میں تقسیم ہو گئے:

الف: فَمِنۡہُمۡ ظَالِمٌ لِّنَفۡسِہٖ: اس گروہ نے اس دستور زندگی سے انحراف کیا اور اس سعادت ابدی سے اپنے آپ کو محروم کر کے اپنے نفس پر ظلم کیا۔ یہ بھی ان لوگوں کی طرح ہو گئے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَ اِنَّ الَّذِیۡنَ اُوۡرِثُوا الۡکِتٰبَ مِنۡۢ بَعۡدِہِمۡ لَفِیۡ شَکٍّ مِّنۡہُ مُرِیۡبٍ ۔[2] اور جو لوگ ان کے بعد کتاب کے وارث ہوئے وہ اس کے بارے میں شبہ انگیز شک میں ہیں۔

اس سے معلوم ہوا وارث بنائے جانے کے بعد وہ اسی کتاب کے بارے میں شک سے دوچار ہو جاتے ہیں اور وارث نہیں بن پاتے۔

دوسری آیت میں فرمایا:

فَخَلَفَ مِنۡۢ بَعۡدِہِمۡ خَلۡفٌ وَّرِثُوا الۡکِتٰبَ یَاۡخُذُوۡنَ عَرَضَ ہٰذَا الۡاَدۡنٰی ...[3] پھر ان کے بعد ناخلف لوگ ان کے جانشین ہوئے جو کتاب اللہ کے وارث بن کر اس ادنیٰ زندگی کا مال و متاع سمیٹتے تھے۔

---

[1] ۴۰ غافر: ۵۳ [2] ۴۲ شوریٰ: ۱۴ [3] ۷ اعراف: ۱۶۹

رہا یہ سوال کہ اس گروہ کو برگزیدہ کیسے فرمایا؟ جب کہ اصطفی کا لفظ صرف انبیاء علیہم السلام کے لیے استعمال ہوا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے: سیاق آیت سے یہ بات معلوم ہوتا ہے کہ اس قوم کو مکلّف بنانے کے لیے انتخاب کیا تھا، ثواب و درجات کی بلندی کے لیے نہیں۔ جیسا کہ فرمایا:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا ارۡکَعُوۡا وَ اسۡجُدُوۡا وَ اعۡبُدُوۡا رَبَّکُمۡ وَ افۡعَلُوا الۡخَیۡرَ لَعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ﴿ۚ﴾ وَ جَاهِدُوۡا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجۡتَبٰىکُمۡ ... [1]

اے ایمان والو! رکوع کرو اور سجدہ کرو اور اپنے پروردگار کی عبادت کرو نیز نیک عمل انجام دو، امید ہے کہ (اس طرح) تم فلاح پا جاؤ۔ اور راہ خدا میں ایسے جہاد کرو جیسے جہاد کرنے کا حق ہے۔ اس نے تم کو برگزیدہ کیا ہے۔

اس آیت میں چند احکام کا ذکر کر کے فرمایا: هُوَ اجۡتَبٰىکُمۡ اس نے تمہیں برگزیدہ کیا ہے۔ یعنی ان شرعی احکام کا مکلّف بنانے کے لیے منتخب کیا ہے۔

اسی طرح امت مسلمہ کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جیسے خاتم المرسل نبی مبعوث کر کے اور قرآن جیسا دستور زندگی دے کر اس بار امانت کو اٹھانے کے احکام جاری کرنے کے لیے منتخب کیا تھا۔ لیکن اس گروہ نے ظلم بہ نفس کر کے اس بار امانت و وراثت اٹھانے کا اہل ہونے کا ثبوت نہ دیا۔ البتہ اس انتخاب میں وہ لوگ شامل ہی نہیں ہیں جو ظلم بغیر کرتے ہیں دوسرے لوگوں پر ظلم کر کے ان کا حق چھین لیتے ہیں، ابن کثیر اپنی تفسیر میں ایک قول نقل کرتے ہیں کہ ظالم بہ نفس بھی اس امت میں شامل نہیں۔

ب: وَ مِنۡهُمۡ مُّقۡتَصِدٌ: اس گروہ نے میانہ روی اختیار کی۔ نہ ظلم بہ نفس کرنے والوں کی طرح انحراف کا شکار ہوئے، نہ سَابِقٌۢ بِالۡخَیۡرٰتِ کی طرح بن سکے۔ اس گروہ کا ذکر چونکہ ظلم بہ نفس کرنے والوں کے مقابلے میں ہوا ہے اس لیے یہ وہ لوگ ہوں گے جو قرآن کو دستور زندگی بنانے میں ناکام بھی نہیں ہوئے اور گناہان کبیرہ کے مرتکب بھی نہ ہوئے بلکہ چند گناہان صغیرہ کبھی ان سے سرزد ہوئے ہیں۔ شاید یہ لوگ اس آیت کا مصداق ہوں:

اَلَّذِیۡنَ یَجۡتَنِبُوۡنَ کَبٰٓئِرَ الۡاِثۡمِ وَ الۡفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ ؕ اِنَّ رَبَّکَ وَاسِعُ الۡمَغۡفِرَةِ ... [2]

جو لوگ گناہان کبیرہ اور بے حیائیوں سے اجتناب برتتے ہیں سوائے گناہان صغیرہ کے تو آپ کے پروردگار کی مغفرت کا دائرہ یقیناً بہت وسیع ہے....

ج: وَ مِنۡهُمۡ سَابِقٌۢ بِالۡخَیۡرٰتِ: تیسرا گروہ وہ ہے جو سَابِقٌۢ بِالۡخَیۡرٰتِ ہونے کی وجہ سے پہلے گروہ

---

[1] ۲۲ حج: ۷۷۔۷۸ [2] ۵۳ نجم: ۳۲

کی طرح ظلم بہ نفس نہیں کرتا اور دوسرے گروہ کی طرح چھوٹے گناہوں کا بھی ارتکاب نہیں کرتا۔ وہ کسی خیر کو خواہ وہ واجب ہو یا مستحب نہیں چھوڑتا۔ چونکہ یہ تیسرا گروہ سابقہ دو گروہوں کے مقابلے میں ہے اس لیے اس گروہ میں سابقہ دونوں گروہوں کی خامیاں نہیں ہوں گی۔ یہی مقام عصمت ہے اور اللہ کے برگزیدہ مکلف ہونے کے مرحلے کے بعد اجر و درجات کے مقام پر بھی فائز ہے۔ یہی لوگ وارث قرآن ہونے کا حق ادا کرنے والے ہیں۔

چنانچہ اہل سنت کے مصادر میں آیا ہے۔ ابو الدرداء راوی ہیں رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ نے فرمایا:

السابق الذی یدخل الجنۃ بغیر حساب۔[1] سابق وہ ہیں جو جنت میں بغیر حساب داخل ہوں گے۔

ابن کثیر نے اپنی تفسیر ۶: ۴۸۴ میں سَابِقٌۢ بِالۡخَیۡرٰتِ کی تشریح میں لکھا ہے: یہ وہ لوگ ہیں جو واجبات اور مستحبات پر عمل کرتے ہیں۔ محرمات اور مکروہات اور بعض مباحات ترک کرتے ہیں۔ کیا عصمت اس کے علاوہ کسی اور چیز کا نام ہے؟

۲۔ ذٰلِکَ هُوَ الۡفَضۡلُ الۡکَبِیۡرُ: اللہ کا فضل کبیر شامل حال ہونے ہی کی وجہ سے سَابِقٌۢ بِالۡخَیۡرٰتِ کے درجات پر فائز ہوتے ہیں۔ چنانچہ ائمہ اہل بیت علیہم السلام سے روایت ہے کہ اس کے مصداق آل رسول صلی اللہ علیہ و آلہ ہیں۔ چنانچہ حدیث ثقلین سے بھی ثابت ہے قرآن و اہل بیت قیامت تک ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے۔

انی تارک فیکم الثقلین کتاب اللّٰہ و عترتی اهل بیتی لن یفترقا حتی یردا علی الحوض۔

فضیلت: ذیل میں ہم فریقین کے مصادر سے چند روایات کا ذکر کرتے ہیں۔

روایت ہے کہ حضرت امام باقر علیہ السلام سے اس آیت کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؑ نے فرمایا:

السَّابِقُ بِالۡخَیۡرَاتِ الۡاِمَامُ وَ الۡمُقۡتَصِدُ الۡعَارِفُ لِلۡاِمَامِ وَ الظَّالِمُ لِنَفۡسِهِ الَّذِی لَا یَعۡرِفُ الۡاِمَامَ۔[2] السابق بالخیرات نیکیوں میں سبقت لے جانے والے ائمہؑ ہیں، میانہ رو والے ائمہؑ کی معرفت رکھنے والے ہیں اور ظالم وہ ہیں جو امام کی معرفت نہیں رکھتے۔

امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام سے روایت ہے:

هی لنا ایانا عنی۔[3] یہ آیت ہمارے بارے میں ہے اور ہم ہی مراد لیے گئے ہیں۔

ابو حمزہ ثمالی راوی ہیں:

امام زین العابدین علیہ السلام کے پاس بیٹھا تھا تو اہل عراق کے دو افراد آپ کے پاس آئے

---

[1] تفسیر ابن کثیر ذیل آیہ [2] الکافی ۱: ۲۱۴ [3] مجمع البیان

اور اس آیت کے بارے میں سوال کیا تو آپؑ نے فرمایا: اہل عراق کیا کہتے ہیں؟ کہا وہ کہتے ہیں پوری امت مراد ہے۔ امامؑ نے فرمایا: پھر پوری امت جنت میں جائے گی؟ راوی کہتے ہیں میں نے کہا: فرزند رسول! پھر کن کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ہے؟ جواب میں تین بار فرمایا: فینا اهل البیت۔ ہم اہل بیت کی شان میں نازل ہوئی ہے۔[1]

نیز شواهد التنزیل ۲: ۱۵۶ میں حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپؑ فرمایا:

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ سے اس آیت کے بارے میں سوال کیا تو فرمایا: هم ذریتك و ولدك۔ وہ آپ کی ذریت اور آپ کی اولاد ہے۔

ابن مردویه نے حضرت علی علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ ثُمَّ اَوۡرَثۡنَا الۡکِتٰبَ ....کے بارے میں فرمایا: ہم ہی وہ لوگ ہیں۔

ملاحظہ ہو الاربلی کشف الغمة ۱: ۳۱۷۔

محمد بن العباس نے ابواسحاق السبعی سے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کا یہ فرمان روایت کیا ہے کہ آپ علیہ السلام نے فرمایا:

هی لنا خاصة۔ یہ آیت صرف ہمارے بارے میں ہے۔

ان روایات کے بعد ان اصناف ثلاثہ کے بارے میں مفسرین کے چالیس سے زیادہ اقوال کے گرداب میں پھنسنے کی نوبت نہیں آتی۔

اہم نکات

۱۔ سابق بالخیرات، ظالم اور مقتصد نہیں ہیں تو معصوم ہیں۔

۲۔ سابق بالخیرات ہی وارث قرآن ہوتے ہیں۔

۳۔ اللہ کی برگزیدہ ہستیاں تمام نیکیوں کی طرف سبقت لے جاتی ہیں۔

جَنّٰتُ عَدۡنٍ یَّدۡخُلُوۡنَہَا یُحَلَّوۡنَ فِیۡہَا مِنۡ اَسَاوِرَ مِنۡ ذَہَبٍ وَّ لُؤۡلُؤًا ۚ وَ لِبَاسُہُمۡ فِیۡہَا حَرِیۡرٌ ﴿۳۳﴾	۳۳۔ وہ دائمی جنتیں ہیں جن میں یہ داخل ہوں گے، وہاں انہیں سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائیں گے اور وہاں ان کا لباس ریشمی ہوگا۔

تفسیر آیات

اس آیت کا تعلق مذکورہ تین گروہوں میں سے تیسرے گروہ سے ہے۔ سابق بالخیرات ہی دائمی

---

[1] ملاحظہ ہو شواهد التنزیل ۲: ۱۵۲

جنت میں مذکورہ درجہ پر فائز ہوں گے۔

بعض مفسرین کے نزدیک اس آیت کا تعلق تینوں گروہوں سے ہے۔ تعجب کا مقام ہے کہ ظالم بہ نفس اور سابق بالخیرات ایک ہی درجے پر کیسے فائز ہو سکتے ہیں۔

ہمارے نزدیک ظالم بہ نفس اور مقتصد کے بارے میں اس آیت میں سکوت اختیار فرمایا گیا ہے۔ آیت سے ہٹ کر دیگر دلائل سے ان دونوں کے انجام کے بارے میں موقف اختیار کیا جا سکتا ہے کہ بعض روایات کے مطابق مقتصد آسان حساب کے بعد اور ظالم بہ نفس مکمل حساب کے بعد شفاعت کے ذریعے جنت داخل ہوں گے۔ مگر ان تینوں گروہوں کا درجہ ایک ہونا معقول نہیں ہے۔

وَ قَالُوا الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡۤ اَذۡہَبَ عَنَّا الۡحَزَنَ ؕ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوۡرٌ شَکُوۡرُۨ ﴿۳۴﴾

۳۴۔ اور وہ کہیں گے: ثنائے کامل ہے اس اللہ کے لیے جس نے ہم سے غم کو دور کیا، یقیناً ہمارا رب بڑا معاف کرنے والا قدردان ہے۔

تفسیر آیات

ان سابق بالخیرات نے اپنی زندگی جس حزن و ملال کے ساتھ گزاری ہے اس سے آزاد ہو کر اللہ کے فضل کریم سے فیضیاب ہونے پر حمد خدا بجا لائیں گے۔

اَلَاۤ اِنَّ اَوۡلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ۞ [1]

سنو! جو اولیاء اللہ ہیں انہیں نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ وہ رنجیدہ ہوں گے۔

الَّذِیۡۤ اَحَلَّنَا دَارَ الۡمُقَامَۃِ مِنۡ فَضۡلِہٖ ۚ لَا یَمَسُّنَا فِیۡہَا نَصَبٌ وَّ لَا یَمَسُّنَا فِیۡہَا لُغُوۡبٌ ﴿۳۵﴾

۳۵۔ جس نے اپنے فضل سے ہمیں دائمی اقامت کی جگہ میں ٹھہرایا جہاں ہمیں نہ کوئی مشقت اور نہ تھکاوٹ لاحق ہو گی۔

تفسیر آیات

۱۔ یہ دائمی اقامت گاہ اسی فضل کبیر کے نتیجے میں ہے جس کا ذکر آیت ۳۲ میں ہوا ہے۔ اگر ہم آیت ۳۲ کو سابق بالخیرات کے گروہ سے متعلق قرار دیتے ہیں، اس کے بعد کی سب آیات اسی گروہ سے متعلق ہوں گی۔

---

[1] ۱۰ یونس: ۶۲

۲۔ لَا یَمَسُّنَا فِیۡهَا: اس دائمی اقامت گاہ میں اس قسم کی مشقت اور تھکاوٹ نہ ہو گی جو دنیا میں تھی۔ چونکہ دنیا علل و اسباب کی زندگی تھی۔ مشقتوں سے پُر زندگی تھی۔ جنت کی زندگی صرف اور صرف ارادے سے کام بننے کی زندگی ہے۔ ارادہ کرنے میں نہ مشقت ہے، نہ تھکاوٹ۔

اہم نکات

۱۔ جنت دار الجزا ہے۔ وہاں کوئی حزن، مشقت اور تھکاوٹ نہ ہو گی۔

وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لَهُمۡ نَارُ جَهَنَّمَ ۚ لَا یُقۡضٰی عَلَیۡهِمۡ فَیَمُوۡتُوۡا وَ لَا یُخَفَّفُ عَنۡهُمۡ مِّنۡ عَذَابِهَا ؕ کَذٰلِکَ نَجۡزِیۡ کُلَّ کَفُوۡرٍ ﴿۳۶﴾

۳۶۔ اور جنہوں نے کفر اختیار کیا ان کے لیے جہنم کی آتش ہے، نہ تو ان کی قضا آئے گی کہ مر جائیں اور نہ ہی ان کے عذاب جہنم میں تخفیف کی جائے گی، ہر کفر کرنے والے کو ہم اسی طرح سزا دیا کرتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ سوال یہ پیدا کرتے ہیں کہ کافر نے صرف ستر، اسّی سال جرم کیا ہے۔ سزا دائمی کیوں؟

جواب: اولاً انسان کے اچھے برے اعمال اس کے جسم کے حصے ہوتے ہیں جو انرجی کی شکل میں اس کے جسم سے نکل جاتے ہیں۔ یہ انرجی ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ ایک ذرہ بھی نابود نہیں ہوتا۔ لہٰذا اچھا عمل انسان کا ساتھ نہیں چھوڑتا اور برا عمل انسان کی جان نہیں چھوڑتا کیونکہ انسان کے اچھے اور برے اعمال ابدی ہیں مگر یہ کہ اچھے اعمال حبط ہو جائیں اور برے اعمال کی بخشش ہو جائے۔

ثانیاً: مجرم خود ختم ہوا تھا۔ اس نے جرم ختم نہیں کیا تھا۔

ثالثاً: جرم دیکھا جاتا ہے کتنا بڑا ہے۔ وہ وقت نہیں دیکھا جاتا جو جرم پر لگا۔ گولی سے ناحق انسان کے قتل پر چند سیکنڈ لگتے ہیں۔ سزا عمر قید کیوں؟

وَ هُمۡ یَصۡطَرِخُوۡنَ فِیۡهَا ۚ رَبَّنَاۤ اَخۡرِجۡنَا نَعۡمَلۡ صَالِحًا غَیۡرَ الَّذِیۡ کُنَّا نَعۡمَلُ ؕ اَوَ لَمۡ نُعَمِّرۡکُمۡ مَّا یَتَذَکَّرُ فِیۡهِ مَنۡ تَذَکَّرَ وَ جَآءَکُمُ

۳۷۔ اور وہ جہنم میں چلا کر کہیں گے: اے ہمارے پروردگار! ہمیں اس جگہ سے نکال، ہم نیک عمل کریں گے برخلاف ان کاموں کے جو ہم (پہلے) کرتے رہے ہیں، (جواب ملے گا) کیا ہم نے تمہیں اتنی عمر نہیں دی جس میں نصیحت حاصل

النَّذِیۡرُ ؕ فَذُوۡقُوۡا فَمَا لِلظّٰلِمِیۡنَ مِنۡ نَّصِیۡرٍ ﴿۳۷﴾	کرنے والا نصیحت حاصل کر سکتا تھا؟ جب کہ تمہارے پاس تنبیہ کرنے والا بھی آیا تھا، اب ذائقہ چکھو کہ ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ هُمۡ یَصۡطَرِخُوۡنَ فِیۡهَا: عذاب کے مشاہدے کے بعد ایک بار پھر دنیا کی طرف مراجعت کی تمنا قدرتی امر ہے۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ کافر عفو الٰہی کی تمنا نہیں کرتے بلکہ دنیا میں ایک مرتبہ پھر واپس جانے کی تمنا کرتے ہیں کیونکہ انہیں اس بات کا علم ہو گیا ہوتا ہے کہ عفو کا وقت گزر چکا ہے۔ دنیا میں ایمان و عمل ہی ذریعۂ نجات تھے، لہٰذا اب وہ دنیا میں واپس جا کر اس ذریعے کو حاصل کرنا چاہتے ہیں:

وَ لَوۡ رُدُّوۡا لَعَادُوۡا لِمَا نُهُوۡا عَنۡهُ ... [1]	اگر انہیں واپس بھیج دیا جائے تو یہ پھر وہی کریں گے جس سے انہیں منع کیا گیا تھا۔

۲۔ اَوَ لَمۡ نُعَمِّرۡکُمۡ مَّا یَتَذَکَّرُ فِیۡهِ: جواب دیا جائے گا کہ کیا ہم نے تمہیں اتنی عمر نہیں دی جس میں نصیحت حاصل کرنے والا نصیحت حاصل کر سکتا تھا۔ نیک و بد اور حق و باطل میں امتیاز کرنا اس کے لیے ممکن تھا اور عمر کی اس مہلت کے ساتھ اللہ کی طرف سے حجت پوری کرنے والے نبی بھی تمہاری طرف آئے تھے اور تمہیں خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لیے حق کی طرف دعوت دیتے رہے۔

حدیث رسول ﷺ میں آیا ہے:

من عمره الله ستين سنة فقد اعذر اليه۔ [2]	جسے اللہ نے ساٹھ سال کی عمر دی اسے عذر کا موقع دیا ہے۔

دوسری حدیث میں فرمایا:

اذا كان يوم القيمة قيل اين ابناء الستين وهو المعمر الذى قال الله اَوَ لَمۡ نُعَمِّرۡکُمۡ ... [3]	جب قیامت کا دن ہو گا تو کہا جائے گا: ساٹھ سال عمر والے کہاں ہیں؟ یہ وہ عمر رسیدہ ہیں جن کے بارے میں قرآن نے فرمایا تھا: کیا ہم نے تمہیں اتنی عمر نہیں دی جس میں نصیحت حاصل کرنے والا نصیحت حاصل کر سکتا تھا۔

اہم نکات

۱۔ فرصت ہاتھ سے نکل جانے کے بعد نالہ و فریاد لاحاصل ہے: یَصۡطَرِخُوۡنَ ...

۲۔ واحد ذریعہ نجات ایمان کے ہمراہ عمل صالح ہے: نَعۡمَلۡ صَالِحًا ...

---

[1] ۶ انعام: ۲۸ [2] مجمع البیان [3] سنن بیہقی

۳۔ ساٹھ سال کی عمر کے بعد کوئی عذر قابل قبول نہیں ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ عٰلِمُ غَیۡبِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ اِنَّہٗ عَلِیۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ﴿۳۸﴾

۳۸۔ یقیناً اللہ آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ باتوں کا جاننے والا ہے اور وہ ان باتوں کو بھی خوب جانتا ہے جو سینوں میں (مخفی) ہیں.

تفسیر آیات

علم غیب بذات خود صرف اللہ جانتا ہے۔ غیر اللہ کے علم کا مآخذ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اس موضوع پر گزشتہ متعدد آیات میں گفتگو ہو چکی ہے۔

ہُوَ الَّذِیۡ جَعَلَکُمۡ خَلٰٓئِفَ فِی الۡاَرۡضِ ؕ فَمَنۡ کَفَرَ فَعَلَیۡہِ کُفۡرُہٗ ؕ وَ لَا یَزِیۡدُ الۡکٰفِرِیۡنَ کُفۡرُہُمۡ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ اِلَّا مَقۡتًا ۚ وَ لَا یَزِیۡدُ الۡکٰفِرِیۡنَ کُفۡرُہُمۡ اِلَّا خَسَارًا ﴿۳۹﴾

۳۹۔ اسی نے تمہیں زمین میں جانشین بنایا، پس جو کفر کرتا ہے اس کے کفر کا نقصان اسی کو ہے اور کفار کے لیے ان کا کفران کے رب کے نزدیک صرف غضب میں اضافہ کرتا ہے اور کفار کے لیے ان کا کفر صرف ان کے خسارے میں اضافے کا موجب بنتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ ہُوَ الَّذِیۡ جَعَلَکُمۡ خَلٰٓئِفَ: پوری انسانیت، نوع انسانی سے خطاب ہے کہ اللہ نے تمہیں گزشتہ نسلوں کی جگہ جانشین بنایا ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

وَ رَبُّکَ الۡغَنِیُّ ذُو الرَّحۡمَۃِ ؕ اِنۡ یَّشَاۡ یُذۡہِبۡکُمۡ وَ یَسۡتَخۡلِفۡ مِنۡۢ بَعۡدِکُمۡ مَّا یَشَآءُ کَمَاۤ اَنۡشَاَکُمۡ مِّنۡ ذُرِّیَّۃِ قَوۡمٍ اٰخَرِیۡنَ ؕ[۱]

اور آپ کا رب بے نیاز ہے، رحمت کا مالک ہے، اگر وہ چاہے تو تمہیں ختم کر کے تمہاری جگہ جسے چاہے جانشین بنا دے جیسا کہ خود تمہیں دوسری قوم کی نسل سے پیدا کیا ہے۔

اس کی دوسری تفسیر یہ ہے: اللہ نے تمہیں اللہ کی طرف سے بعض تصرفات کے عارضی، مجاز ہونے

----

[۱] ۶ انعام: ۱۳۳

کی حیثیت سے جانشین بنایا ہے ورنہ حقیقی مالکیت کا حق صرف اسی ذات کو حاصل ہے۔

پہلی تفسیر زیادہ قرین واقع ہے۔ وہ اس طرح ہے۔ وقت کے مشرکین کی رد میں فرمایا: نسلوں کا سلسلہ جاری رکھنا جہاں تدبیر سے مربوط ہے وہاں تخلیق سے بھی مربوط ہے۔ اس طرح اس آیت میں یہ نکتہ بیان کیا گیا کہ تدبیر اور تخلیق نا قابل تفریق ہے۔

۲۔ فَمَنۡ کَفَرَ فَعَلَیۡہِ: اس کے باوجود اگر کوئی اللہ تعالیٰ کی مدبریت کو نہیں مانتا اور یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ اللہ نے تدبیر کائنات دوسروں کے سپرد کر رکھی ہے، اس کفر کا منفی نتیجہ خود اسی کافر کو بھگتنا ہوگا۔

۳۔ وَلَا یَزِیۡدُ الۡکٰفِرِیۡنَ: کفر کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کے کفر کے سبب ان کی ہلاکت اور غضب الٰہی میں مبتلا ہونے میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ جیسے وہ اپنے کفر پر ڈٹے رہیں گے ان کے خلاف غضب الٰہی میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ جو بہت بڑے خسارے میں اضافہ ہے۔

اہم نکات

۱۔ نسلوں کا سلسلہ جاری رکھنا جہاں تخلیق سے مربوط ہے تدبیر سے بھی مربوط ہے۔

۲۔ تخلیق و تدبیر قابل تفریق نہیں ہیں۔

قُلۡ اَرَءَیۡتُمۡ شُرَکَآءَکُمُ الَّذِیۡنَ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ ؕ اَرُوۡنِیۡ مَاذَا خَلَقُوۡا مِنَ الۡاَرۡضِ اَمۡ لَہُمۡ شِرۡکٌ فِی السَّمٰوٰتِ ۚ اَمۡ اٰتَیۡنٰہُمۡ کِتٰبًا فَہُمۡ عَلٰی بَیِّنَتٍ مِّنۡہُ ۚ بَلۡ اِنۡ یَّعِدُ الظّٰلِمُوۡنَ بَعۡضُہُمۡ بَعۡضًا اِلَّا غُرُوۡرًا ﴿۴۰﴾	۴۰۔ کہد یجیے: یہ تو بتاؤ ان شریکوں کے بارے میں جنہیں تم اللہ کو چھوڑ کر پکارتے ہو؟ مجھے دکھلاؤ! انہوں نے زمین سے کیا پیدا کیا؟ یا کیا آسمانوں میں ان کی شرکت ہے؟ یا ہم نے انہیں کوئی کتاب دی ہے جس کی بنا پر یہ کوئی دلیل رکھتے ہوں؟ (نہیں) بلکہ یہ ظالم لوگ ایک دوسرے کو محض فریب کی خاطر وعدے دیتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ قُلۡ اَرَءَیۡتُمۡ شُرَکَآءَکُمۡ: اس آیہ شریفہ میں مشرکین کے اس موقف کو رد کرنے کے لیے کہ کائنات کی تدبیر ان کے معبودوں کے ہاتھ میں ہے، دو دلائل بیان کیے ہیں۔

الف: قُلۡ اَرَءَیۡتُمۡ شُرَکَآءَکُمۡ: مجھے بتاؤ تمہارے شریکوں نے کیا پیدا کیا؟ کیا زمین کی کسی چیز کی تخلیق میں ان کا حصہ ہے؟ خاک پانی کی تخلیق میں یا خاک میں دانے کی روئیدگی کی صلاحیت

میں تمہارے معبودوں کا کوئی کردار ہے؟
مشرکین خود اس بات کے قائل تھے کہ خالق خدا ہے۔ آیت کا اشارہ اس طرف ہے: معبود وہی ہے جو خالق ہے۔ خلق اور تدبیر قابل تفریق نہیں ہیں۔
ب: اَمۡ اٰتَیۡنٰہُمۡ کِتٰبًا فَہُمۡ : دوسری بات یہ ہے کہ کیا تمہارے پاس کوئی کتاب یا کوئی سند ایسی ہے جس میں تمہیں اللہ نے بتایا ہو کہ تدبیر کائنات میں تمہارے معبودوں کا کوئی کردار ہے جس کی بنیاد پر تم نے انہیں اپنا معبود بنایا اور اپنے دنیوی مفادات ان سے وابستہ کر رکھے ہیں؟
۲۔ بَلۡ اِنۡ یَّعِدُ الظّٰلِمُوۡنَ بَعۡضُہُمۡ بَعۡضًا اِلَّا غُرُوۡرًا: بلکہ یہ تمام مشرکانہ عقائد ان کے بڑے مفاد پرستوں کی طرف سے ایک دھوکہ ہیں۔ ان کے پاس کوئی عقلی دلیل ہے اور نہ ہی کوئی اور سند موجود ہے۔

اہم نکات

۱۔ مشرکین کے پاس نہ کوئی عقلی دلیل موجود ہے، نہ کوئی اور سند۔
۲۔ جس کے پاس منطق نہ ہو، وہ دھوکہ فریب سے کام لیتا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ یُمۡسِکُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ اَنۡ تَزُوۡلَا ۬ۚ وَ لَئِنۡ زَالَتَاۤ اِنۡ اَمۡسَکَہُمَا مِنۡ اَحَدٍ مِّنۡۢ بَعۡدِہٖ ؕ اِنَّہٗ کَانَ حَلِیۡمًا غَفُوۡرًا ﴿۴۱﴾

۴۱۔ اللہ آسمانوں اور زمین کو یقیناً تھامے رکھتا ہے کہ یہ اپنی جگہ چھوڑ نہ جائیں، اگر یہ اپنی جگہ چھوڑ جائیں تو اللہ کے بعد انہیں کوئی تھامنے والا نہیں ہے، یقیناً اللہ بڑا بردبار، بخشنے والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّ اللّٰہَ یُمۡسِکُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ: کائنات کی اس بیکراں فضا میں موجود اجرام کو ایک غیر مرئی کڑی میں اللہ ہی نے مربوط رکھا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اللہ نے اس کائنات کو صرف خلق کیا ہے۔ خلق کے بعد یہ خود چل رہی ہو یا اللہ کے علاوہ کوئی اور چلا رہا ہو بلکہ ہر لحہ تخلیق کا سلسلہ جاری ہے۔ ایک لحہ کے لیے فیض الٰہی رکتا نہیں ہے۔ کُلَّ یَوۡمٍ ہُوَ فِیۡ شَاۡنٍ۔[۱] وہ ہر روز ایک (نئی) کرشمہ سازی میں ہے۔ لہٰذا اس نظام کائنات کی بقا، تخلیق مسلسل پر موقوف ہے اور پہلے بھی ذکر کیا تخلیق مسلسل، وہی تدبیر ہے۔
۲۔ وَ لَئِنۡ زَالَتَاۤ اِنۡ اَمۡسَکَہُمَا مِنۡ اَحَدٍ مِّنۡۢ بَعۡدِہٖ: اللہ کی قائم کردہ یہ کڑی اگر ٹوٹ جائے (جس کی سائنسداں پیشگوئی کرتے ہیں) تو کوئی طاقت ایسی نہیں جو اس کائنات کو سنبھالے اور ان کڑیوں کو

---
[۱] ۵۵ رحمٰن: ۲۹

دوبارہ جوڑ دے۔ جس ذات نے اس کائنات کو خلق کیا ہے وہی اس کائنات کو قائم رکھ سکتی ہے۔ لہٰذا مشرکین کا یہ نظریہ کسی بنیاد پر قائم نہیں ہے کہ تدبیر کائنات میں ان کے معبودوں کا کوئی کردار ہے۔

۳۔ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا: یہ اللہ کے حلم و بردباری کا نتیجہ ہے کہ دنیا میں اکثر لوگوں کے حکم خدا سے منحرف ہونے کے باوجود اس نظام کو قائم رکھا ہے اور وہ غفور ہے، جلد عذاب نازل نہیں فرماتا۔

اہم نکات

۱۔ کائنات کا وجود اور بقا دونوں اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں۔

۲۔ کائنات کو تباہی سے صرف اللہ بچا سکتا ہے۔

وَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ لَّيَكُوْنُنَّ اَهْدٰى مِنْ اِحْدَى الْاُمَمِ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ مَّا زَادَهُمْ اِلَّا نُفُوْرَا ۙ ﴿۴۲﴾

۴۲۔ اور یہ لوگ اللہ کی پکی قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ اگر ان کے پاس کوئی تنبیہ کرنے والا آتا تو وہ ہر قوم سے بڑھ کر ہدایت یافتہ ہو جاتے لیکن جب ایک متنبہ کرنے والا ان کے پاس آیا تو ان کی نفرت میں صرف اضافہ ہوا۔

اسْتِكْبَارًا فِي الْاَرْضِ وَ مَكْرَ السَّيِّئِ ؕ وَ لَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ ؕ فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِيْنَ ۚ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۚ وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا ﴿۴۳﴾

۴۳۔ یہ زمین میں تکبر اور بری چالوں کا نتیجہ ہے، حالانکہ بری چال کا وبال اس کے چلنے والے پر ہی پڑتا ہے، تو کیا یہ لوگ اس دستور (الٰہی) کے منتظر ہیں جو پچھلی قوموں کے ساتھ رہا؟ لہٰذا آپ اللہ کے دستور میں کوئی تبدیلی نہیں پائیں گے اور نہ آپ اللہ کے دستور میں کوئی انحراف پائیں گے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ: بعض مصادر میں آیا ہے کہ قریش نے جب سنا کہ یہود و نصاریٰ نے اپنے اپنے رسولوں کی تکذیب کی ہے تو کہا: اگر تمہارے پاس کوئی رسول آتا تو ہم ان سے بہتر ان کی پذیرائی کرتے۔ یہ اس وقت کی بات تھی جب ابھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مبعوث نہیں ہوئے تھے۔

۲۔ فَلَمَّا جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ: جب ان کی طرف رسول آیا تو سوائے ان کی نفرت کے اور کسی چیز

میں اضافہ نہیں ہوا۔ اس مضمون کی آیت سورہ انعام آیت ۱۵۷ میں بھی آ گئی ہے۔

۳۔ اسۡتِكۡبَارًا فِي الۡاَرۡضِ وَ مَكۡرَ السَّيِّئِ: ان میں آنے والے رسول سے نفرت کی دو وجوہات کا ذکر ہے: ایک وجہ تکبر ہے۔ وہ اپنے آپ کو اس رسول سے بہتر، بالاتر اور افضل سمجھتے تھے۔ ان کے تکبر اور نخوت نے انہیں تکذیب کرنے پر اکسایا ہے۔ دوسری وجہ ان میں موجود بری چال ہے جس کے تحت وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف طرح طرح کی سازشیں کرتے رہے یہاں تک کہ آپ کو شہید کرنے پر ان کا اتفاق ہوا تھا۔

۴۔ وَلَا يَحِيۡقُ الۡمَكۡرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهۡلِهٖ: اس آیۂ شریفہ میں مشرکین کی بری چال کے ذکر کے بعد ایک اصول ارشاد فرمایا: بری چال، خود چال چلنے والے کو ہی لے ڈوبتی ہے۔ ہر عمل اور ہر چال کا ایک قدرتی نتیجہ ہوتا ہے۔ اس میں دیر ہے، اندھیر نہیں ہے۔ اس بارے میں عربوں میں بھی ایک ضرب المثل ہے: من حفر لاخیه جبا وقع فیه منکبا۔ جو اپنے برادر کے خلاف گڑھا کھودے گا وہ خود اسی میں منہ کے بل گر جائے گا۔

امیر المومنین علیہ السلام سے مروی ہے:

لَوْ لَا اَنَّ الْمَكْرَ وَ الْخَدِيعَةَ فِي النَّارِ لَكُنْتُ اَمْكَرَ النَّاسِ۔[1]	اگر مکار اور فریبی جہنمی نہ ہوتا تو میں عربوں میں سب سے زیادہ مکار ہوتا۔

دوسری حدیث میں آیا ہے۔

خمسة فی کتاب اللّٰہ تعالیٰ من کن فیه کن علیه قیل و ما هی یا رسول اللّٰہ قال: النکث، والمکر، والبغی، والخداع، والظلم۔[2]	پانچ چیزیں اگر کسی میں ہوں تو وہ خود اس کے خلاف ثابت ہوں گی۔ پوچھا گیا: یا رسول اللہؐ وہ پانچ چیزیں کیا ہیں؟ فرمایا: عہد شکنی، مکر، بغاوت، دھوکہ اور ظلم۔

۵۔ فَهَلۡ يَنۡظُرُوۡنَ اِلَّا سُنَّتَ الۡاَوَّلِيۡنَ: کیا یہ لوگ اس بات کا انتظار کر رہے جس برے انجام سے سابقہ قومیں دوچار ہوئی ہیں یہ بھی اسی انجام سے دوچار ہو جائیں۔ گزشتہ اقوام کی عبرتناک تاریخ ان کے سامنے ہے کہ انہوں نے اپنے رسولوں کی تکذیب کی۔ اللہ نے انہیں ایک وقت تک مہلت دی پھر اس کے بعد وہ ایسی تباہ ہوئیں کہ نام و نشان تک مٹ گیا۔

۶۔ فَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبۡدِيۡلًا: سنت اللّٰہ سے مراد وہ قانون الٰہی ہے جو مجرمین کے لیے ہے۔ اس قانون میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں آ سکتی کہ سزا کی جگہ انعام دیا جائے یا بغیر توبہ و انابت کے بلاوجہ سزا معاف ہو جائے۔ اللہ کا یہ قانون اٹل ہے۔

۷۔ وَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحۡوِيۡلًا: نہ ہی قانون الٰہی میں انحراف ہو گا کہ مجرم قوم کی جگہ ایک

---

[1] الکافی ۲: ۳۳۶ [2] معدن الجواهر: ۴۸

بے گناہ قوم کو سزا دے بلکہ اللہ کا قانون اٹل ہے اس قانون کی زد میں صرف مجرم ہی آئیں گے۔

اہم نکات

۱۔ امتحان سے عملاً گزرے بغیر صرف دعویٰ سے حقیقت حال معلوم نہیں ہوتی۔

۲۔ تکبر بہت سی برائیوں کے لیے بنیاد ہے۔

۳۔ انسان بری چال میں خود پھنس جاتا ہے۔

اَوَلَمۡ یَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَیَنۡظُرُوۡا کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ وَ کَانُوۡۤا اَشَدَّ مِنۡہُمۡ قُوَّۃً ؕ وَ مَا کَانَ اللّٰہُ لِیُعۡجِزَہٗ مِنۡ شَیۡءٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ اِنَّہٗ کَانَ عَلِیۡمًا قَدِیۡرًا ﴿۴۴﴾

۴۴۔ کیا یہ لوگ زمین میں چل پھر کر نہیں دیکھتے کہ ان لوگوں کا کیا انجام ہوا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں؟ جب کہ وہ ان سے زیادہ طاقتور تھے، اللہ کو آسمانوں اور زمین میں کوئی شے عاجز نہیں کر سکتی، وہ یقیناً بڑا علم رکھنے والا، بڑی قدرت رکھنے والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اَوَلَمۡ یَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ: اس جملے کی تشریح سورہ روم آیت ۹ میں ہو چکی ہے۔

۲۔ وَ مَا کَانَ اللّٰہُ لِیُعۡجِزَہٗ: وہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے خلاف تدبیر میں یہ سوچ رہے ہوں کہ ہم اللہ کے اس منصوبے کو ناکام بنا دیں گے تو یہ ان کی بھول ہے۔ اللہ کے ارادے کو کوئی طاقت ناکام نہیں بنا سکتی۔ اگر وہ زمین پر چل پھر کر دیکھ لیتے تو ان کو علم ہو جاتا کہ ان سے کہیں زیادہ طاقتور قوموں نے بھی اللہ کے رسولوں کے خلاف سازشیں کیں۔ آج ان کا وجود صفحۂ ہستی سے مٹ گیا ہے۔

اہم نکات

۱۔ گزشتہ اقوام کی تاریخ میں عبرت کے بہت سے اسباق ہیں۔

۲۔ اللہ کے منصوبوں کو کوئی چال ناکام نہیں بنا سکتی۔

وَ لَوۡ یُؤَاخِذُ اللّٰہُ النَّاسَ بِمَا کَسَبُوۡا

۴۵۔ اور اگر اللہ لوگوں کو ان کی حرکات کی پاداش میں

مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّ لٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِعِبَادِهٖ بَصِيْرًا ﴿۴۵﴾

اپنی گرفت میں لے لیتا تو وہ روئے زمین پر کسی چلنے پھرنے والے کو نہ چھوڑتا لیکن وہ ایک مقررہ وقت تک مہلت دیتا ہے چنانچہ جب ان کا مقررہ وقت آ جائے گا تو اللہ اپنے بندوں پر خوب نگاہ رکھنے والا ہے۔

اس مضمون کی آیت کی تشریح سورہ نحل آیت ۶۱ میں ہو چکی ہے۔

خالی

سُورَةُ يٰسٓ

خالی

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ کی پہلی آیت کے الفاظ پر اس سورۃ کا نام یٰسٓ رکھا گیا ہے۔

سورۃ کے مضامین سے واضح ہے کہ یہ مکی سورۃ ہے۔ اس کے اولین مخاطبین اہل مکہ ہیں اور انداز بیان استدلالی ہے۔ ممکن ہے اس سورۃ کا تعلق مکی زندگی کے اواخر سے ہو۔

فضیلت سورۃ یٰسٓ: رسول کریم ﷺ کی احادیث ہیں:

۱۔ اِنَّ لِکُلِّ شَیْءٍ قلباً وَ قَلْبُ الْقُرآنِ یٰسٓ۔[1] — ہر چیز کا ایک دل ہوتا ہے اور قرآن کا دل یٰس ہے۔

۲۔ سُوْرَۃُ یٰسٓ تُدْعَی فِی التَّوْرَاۃِ الْمُعِمَّۃَ قِیْلَ وَمَا الْمُعِمَّۃُ قَالَ ص تَعُمُّ صَاحِبَھَا خَیْرَ الدُّنْیَا وَ الْآخِرَۃِ ....[2] — سورۃ یٰس کو توریت میں المعمۃ کہتے ہیں۔ پوچھا گیا: المعمۃ کیا ہے؟ فرمایا: جس کے پاس سورۃ یٰس ہو گی اس کے پاس دنیا و آخرت کی بھلائی ہو گی۔

۳۔ عَلِّمُوا اَوْلَادَکُمْ یٰسٓ فَاِنَّھَا رَیْحَانَۃُ الْقُرآنِ۔[3] — اپنی اولاد کو سورۃ یٰس کی تعلیم دو، یہ قرآن کا گلدستہ ہے۔

اس سورت کے مضامین پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہیں:

۱۔ روایت کے مطابق رسول کریم ﷺ کے اسمائے مبارکہ میں سے ایک اسم یٰسٓ ہے۔ سورت کی ابتدا آپؐ کی رسالت کی توثیقی قسمیہ جملے سے ہوتی ہے: وَالۡقُرۡاٰنِ الۡحَکِیۡمِ ۙ﴿۲﴾ اِنَّکَ لَمِنَ الۡمُرۡسَلِیۡنَ ۔

۲۔ اس قوم کا ذکر ہے جس کی طرف آپؐ مبعوث ہوئے۔ ایسی قوم کی طرف جن میں آپؐ سے پہلے کوئی نبی نہیں آیا: لِتُنۡذِرَ قَوۡمًا مَّاۤ اُنۡذِرَ اٰبَآؤُہُمۡ ....

۳۔ تاریخ انبیاء علیہم السلام کا ایک ورق: وَ اضۡرِبۡ لَہُمۡ مَّثَلًا اَصۡحٰبَ الۡقَرۡیَۃِ ۔ اس کے بعد انبیاء علیہم السلام کی تکذیب کرنے والوں کا انجام: یٰحَسۡرَۃً عَلَی الۡعِبَادِ ۔

---

[1] مستدرک الوسائل ۴: ۳۲۳ [2] مستدرک الوسائل ۴: ۳۲۲ [3] مستدرک الوسائل ۴: ۳۲۵

۴۔ اللہ تعالیٰ کے رازق اور مدبر ہونے پر چند نشانیوں کی نشاندہی: وَ اٰیَۃٌ لَّہُمُ الۡاَرۡضُ الۡمَیۡتَۃُ ۚۖ اَحۡیَیۡنٰہَا....

۵۔ تدبیر کائنات کے ایک اہم نکتہ '' زوجیت'' کے آفاقی نظام کا ذکر: سُبۡحٰنَ الَّذِیۡ خَلَقَ الۡاَزۡوَاجَ کُلَّہَا....

۶۔ تدبیر کائنات سے متعلق شب و روز کی آمد و رفت، سورج اور چاند کی گردش میں پوشیدہ نکات: وَ الشَّمۡسُ تَجۡرِیۡ لِمُسۡتَقَرٍّ لَّہَا....

۷۔ اللہ کے مدبر کائنات ہونے کی ایک اور نشانی کا ذکر۔ سمندر اور کشتی رانی کے نظام کا ذکر: وَ اٰیَۃٌ لَّہُمۡ اَنَّا حَمَلۡنَا ذُرِّیَّتَہُمۡ فِی الۡفُلۡکِ الۡمَشۡحُوۡنِ۔

۸۔ انفاق فی سبیل اللہ کے بارے میں کفار کا احمقانہ موقف: اَنُطۡعِمُ مَنۡ لَّوۡ یَشَآءُ اللّٰہُ اَطۡعَمَہٗۤ ....

۹۔ قیامت کے دفعتاً قائم ہونے کا ذکر: مَا یَنۡظُرُوۡنَ اِلَّا صَیۡحَۃً....

۱۰۔ اہل جنت کا احوال: اِنَّ اَصۡحٰبَ الۡجَنَّۃِ الۡیَوۡمَ فِیۡ شُغُلٍ فٰکِہُوۡنَ۔

۱۱۔ اہل جہنم کا احوال: وَ امۡتَازُوا الۡیَوۡمَ اَیُّہَا الۡمُجۡرِمُوۡنَ۔

۱۲۔ ایک مرتبہ پھر اللہ تعالیٰ کے تدبیر کائنات کے شواہد۔

۱۳۔ اعادۂ حیات پر ایک دلیل: قُلۡ یُحۡیِیۡہَا الَّذِیۡۤ اَنۡشَاَہَاۤ اَوَّلَ مَرَّۃٍ....

۱۴۔ ہر شے ارادۂ الٰہی کی گرفت میں: بِیَدِہٖ مَلَکُوۡتُ کُلِّ شَیۡءٍ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ بنام خدائے رحمٰن رحیم

یٰسٓ ۝۱ ۱۔ یا، سین ۔

تفسیر آیات

۱۔ یٰسٓ: حروف مقطعات کے بارے میں ہمارا موقف سورۂ بقرہ کی ابتدا میں بیان ہوا ہے کہ یہ ایک رمز ہیں۔ خالق اور اپنے حبیب کے درمیان ان حروف سے رسول اللہ صلى الله عليه وآله وسلم کے علاوہ کسی اور سے خطاب مقصود نہیں ہے۔

البتہ روایات میں آیا ہے کہ یٰسٓ رسول اللہ صلى الله عليه وآله وسلم کے اسمائے مبارکہ میں سے ہے۔ چنانچہ السید الحمیری اپنے ایک شعر میں کہتے ہیں:

یا نفس لا تمحضی بالود جاهدة
علی المودة الا آل یا سینا [1]

اے نفس! آل یاسین کے علاوہ کسی کی خالص محبت کرنے کی سعی نہ کر۔

روایت کے مطابق اس پر دلیل یہ بھی ہے کہ یٰسٓ کے بعد رسول اللہ صلى الله عليه وآله وسلم سے خطاب ہوا ہے۔ جیسے کہا ہو: یا محمد انك لمن المرسلین۔ چنانچہ حضرت علی اور امام محمد باقر علیہما السلام سے روایت ہے: یٰسٓ اسم نبی ہے۔[2]

وَ الۡقُرۡاٰنِ الۡحَکِیۡمِ ۝۲ ۲۔ قسم ہے قرآن حکیم کی

---

۱ روح المعانی ۲ مجمع البیان

اِنَّکَ لَمِنَ الۡمُرۡسَلِیۡنَ ۙ﴿۳﴾ ۳۔ کہ آپ یقیناً رسولوں میں سے ہیں،

عَلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ؕ﴿۴﴾ ۴۔ راہ راست پر ہیں۔

تَنۡزِیۡلَ الۡعَزِیۡزِ الرَّحِیۡمِ ۙ﴿۵﴾ ۵۔ (یہ قرآن) غالب آنے والے مہربان کا نازل کردہ ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ الۡقُرۡاٰنِ الۡحَکِیۡمِ: قسم ہے قرآن حکیم کی کہ آپؐ رسولوں میں سے ہیں۔ اللہ تعالیٰ رسول اللہ ﷺ کی رسالت کے برحق ہونے پر قرآن کی قسم اس لیے کھا رہا ہے کہ قرآن آپؐ کی رسالت کا ایک معجزہ ہے۔ یہ معجزہ عصائے موسیٰ کی طرح ایک جامد شے نہیں ہے بلکہ یہ معجزہ حکیم بھی ہے۔ حکیم کے ہم نے روایات کے مطابق معنی کیے ہیں: حقائق بیں، صائب رائے۔ اس کے مقابلے میں ''خطا'' ہے۔

۲۔ اِنَّکَ لَمِنَ الۡمُرۡسَلِیۡنَ: اللہ تعالیٰ یہ فرمانا چاہتا ہے کہ یٰسٓ اس حکیمانہ معجزے (قرآن) کی قسم آپؐ مرسلین میں سے ہیں۔ یہ قرآن آپؐ کی رسالت کا ثبوت ہے کہ ناقابل تردید حقائق پر مشتمل ایک دستور حیات پیش کرنے والا یقیناً اللہ کا رسول ہے۔

۳۔ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ: آپؐ راہ راست پر ہیں۔ جس میں ذرہ برابر انحراف نہیں کہ اس انسان کو جس قسم کی ہدایت و رہنمائی کی ضرورت تھی آپؐ وہی پیش کر رہے ہیں۔ اس بھٹکے ہوئے انسان کو جو دستور زندگی آپ دے رہے ہیں وہ اس کے دنیوی و اخروی مفادات کے لیے بہترین تحفظ فراہم کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے تکوینی نظام میں کوئی تصادم نہیں ہے۔ پانی، خاک، دھوپ، ہوا، انسان، درخت، سبزہ اور حیوانات وغیرہ آپس میں نہ صرف یہ کہ متصادم نہیں ہیں بلکہ ایک دوسرے کے معاون، مربوط اور کرۂ ارض میں حیات کی بنیاد ہیں۔

اسی طرح رسول اسلام ﷺ نے جو دستور حیات پیش کیا ہے اس دستور کے اوامر و نواھی، محرمات، مستحبات اور مکروہات و مباحات اور انسانی فطری تقاضوں میں نہ صرف تصادم نہیں ہے بلکہ ایک جامع نظام حیات کی تشکیل میں بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔

۴۔ تَنۡزِیۡلَ الۡعَزِیۡزِ الرَّحِیۡمِ: یہ قرآن ایسی ذات کا نازل کردہ ہے جو دو صفات کی مالک ہے: وہ عزیز ہے، ہر قوت پر غالب آنے والا ہے۔ اس میں کوئی ایسی کمزوری نہیں ہے جس سے کوئی اسے مغلوب کر سکے، اس کی سزا سے بچ سکے اور اس کے نافذ کردہ فیصلوں کو کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔

وہ رحیم ہے۔ اس ذات کی مہربانی کا مظہر یہ قرآن ہے کہ انسانوں کی دنیا و آخرت کی سعادت کے لیے ایک مہربان رسول ﷺ مبعوث فرمایا اور سعادت دارین کی ضامن کتاب عنایت فرمائی۔

اہم نکات

۱۔ قرآن حکیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی رسالت کا بولتا ثبوت ہے۔

۲۔ یہ رسولؐ انسانی فطرت و سعادت کی طرف سیدھا راستہ دکھانے والا ہے۔

لِتُنۡذِرَ قَوۡمًا مَّاۤ اُنۡذِرَ اٰبَآؤُہُمۡ فَہُمۡ غٰفِلُوۡنَ ﴿۶﴾

۶۔ تاکہ آپ ایک ایسی قوم کو تنبیہ کریں جس کے باپ دادا کو تنبیہ نہیں کی گئی تھی لہٰذا وہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔

تفسیر آیات

یہ قرآن اس لیے نازل کیا گیا تاکہ آپؐ اس قوم کی تنبیہ کریں جس کے باپ دادا کو تنبیہ نہیں کی گئی۔ رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے معاصر لوگوں کے قریبی آبا و اجداد کی تنبیہ نہیں ہوئی۔ یہ تنبیہ نہ ہونے کی وجہ نذیر کا نہ ہونا نہیں ہے بلکہ تحریفات اور خیانتوں کی وجہ سے انبیاء علیہم السلام کی تنبیہ ان تک نہیں پہنچی۔ یہ اس فترہ اور وقفہ کے دوران کی بات ہے جس میں پانچ سو سال تک کوئی نبی معبوث نہیں ہوا۔

سوال یہ پیدا ہوسکتا ہے سورۂ فاطر آیت ۲۴ میں فرمایا: وَ اِنۡ مِّنۡ اُمَّۃٍ اِلَّا خَلَا فِیۡہَا نَذِیۡرٌ ۔ اور کوئی امت ایسی نہیں گزری جس میں کوئی متنبہ کرنے والا نہ آیا ہو۔ یہاں فرمایا: مَّاۤ اُنۡذِرَ اٰبَآؤُہُمۡ ان کے باپ دادا کی تنبیہ نہیں کی گئی۔ ان دونوں آیات میں تصادم نہیں ہے؟

جواب یہ ہے: اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا: ما ارسلنا الیھم نذیراً ہم نے ان کی طرف کسی تنبیہ کرنے والے کو نہیں بھیجا کہ اعتراض درست ہو جائے بلکہ فرمایا: مَّاۤ اُنۡذِرَ ان کی تنبیہ نہیں کی گئی۔ تنبیہ نہ ہونا نذیر اور نبی نہ ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کی تعلیمات میں تحریف اور خود لوگوں کی طرف سے رکاوٹ ڈالنے کی وجہ سے تنبیہ نہیں ہوئی۔ ورنہ ان کی طرف حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل، ہود، صالح اور شعیب علیہم السلام معبوث ہوئے۔

لَقَدۡ حَقَّ الۡقَوۡلُ عَلٰۤی اَکۡثَرِہِمۡ فَہُمۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۷﴾

۷۔ بتحقیق ان میں سے اکثر پر اللہ کا فیصلہ حتمی ہو چکا ہے پس اب وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

تفسیر آیات

ان میں سے اکثر پر اللہ کا فیصلہ حتمی ہو چکا ہے۔ اب وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

۱۔ لَقَدۡ حَقَّ الۡقَوۡلُ: اللہ کا فیصلہ حتمی ہو گیا۔ قرآن مجید اس تعبیر حَقَّ الۡقَوۡلُ کو اپنے حتمی اور اٹل فیصلے کے لیے استعمال کرتا ہے:

وَ لٰکِنۡ حَقَّ الۡقَوۡلُ مِنِّیۡ لَاَمۡلَـَٔنَّ جَہَنَّمَ مِنَ الۡجِنَّۃِ وَ النَّاسِ اَجۡمَعِیۡنَ ۝ [1]

لیکن میری طرف سے فیصلہ حتمی ہو چکا ہے کہ میں دوزخ کو جنوں اور انسانوں سے ضرور بھر دوں گا۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ حَقَّتۡ عَلَیۡہِمۡ کَلِمَتُ رَبِّکَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ۝ [2]

جن لوگوں کے بارے میں آپ کے رب کا فیصلہ قرار پا چکا ہے وہ یقیناً ایمان نہیں لائیں گے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے سامان ہدایت فراہم اور حجت پوری ہونے کے باوجود لوگ ایمان نہیں لائے اور علم خدا کے مطابق یہ آیندہ ایمان لانے والے بھی نہیں ہیں تو ان پر اللہ کا فیصلہ عذاب اٹل ہو جاتا ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب ان کا ایمان نہ لانا علم خدا میں اٹل ہے۔

اِنَّا جَعَلۡنَا فِیۡۤ اَعۡنَاقِہِمۡ اَغۡلٰلًا فَہِیَ اِلَی الۡاَذۡقَانِ فَہُمۡ مُّقۡمَحُوۡنَ ۝۸

۸۔ ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈال رکھے ہیں اور وہ ٹھوڑیوں تک (پھنسے ہوئے) ہیں اسی لیے ان کے سر اوپر کی طرف الٹے ہوئے ہیں۔

تشریح کلمات

مُّقۡمَحُوۡنَ: (ق م ح) فراء اور زجاج کے مطابق المقمح سر اٹھانے اور آنکھ بند کرنے کو کہتے ہیں۔
لسان العرب میں مادہ قمح میں ایک حدیث بیان ہوئی ہے:

وفی حدیث علی کرم اللّٰہ وجهه قال له النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم ستقدم علی اللّٰہ تعالی انت و شیعتك راضیین مرضیین و یقدم علیك عدوك مقمحین ثم جمع یده الی عنقه یریهم کیف الاقماع۔

حضرت علی کرم اللہ وجهه کی ایک حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: آپ اور آپ کے شیعہ اللہ کی بارگاہ میں، اللہ پر راضی اور اللہ ان سے راضی کی حالت میں پیش ہوں گے اور آپ کے دشمن آپ کے سامنے سر اوپر کی طرف الٹے ہوئے پیش ہوں گے۔ پھر آپ نے اپنے ہاتھ گردن کی طرف جمع کر کے دکھایا کہ اقماع کس طرح ہو گا۔

تفسیر آیات

جو لوگ ایمان نہیں لائیں گے ان کی ہٹ دھرمی اور نخوت و تکبر کو ہم ان کی گردن کا طوق بنائیں

---

[1] ۳۲ سجدہ: ۱۳ [2] ۱۰ یونس: ۹۶

گے جس سے ان کے سر گردن کے اوپر کی طرف الٹے ہوئے ہوں گے۔ نہ صرف یہ کہ سامنے کا راستہ نہیں دیکھ پائیں گے بلکہ اپنے جسم تک کو بھی نہیں دیکھ سکیں گے کہ ان کے جسم کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔

وَجَعَلۡنَا مِنۡۢ بَیۡنِ اَیۡدِیۡہِمۡ سَدًّا وَّ مِنۡ خَلۡفِہِمۡ سَدًّا فَاَغۡشَیۡنٰہُمۡ فَہُمۡ لَا یُبۡصِرُوۡنَ ﴿۹﴾

۹۔ اور ہم نے ان کے آگے دیوار کھڑی کی ہے اور ان کے پیچھے بھی دیوار کھڑی کی ہے اور ہم نے انہیں ڈھانک دیا ہے لہٰذا وہ کچھ دیکھ نہیں پاتے۔

تفسیر آیات

ا۔ وَجَعَلۡنَا مِنۡۢ بَیۡنِ اَیۡدِیۡہِمۡ سَدًّا: جب لوگ اپنی ہٹ دھرمی سے ایمان نہیں لاتے تو اللہ تعالیٰ ان سے ہاتھ اٹھا لیتا اور انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔ جب ہدایت کا سرچشمہ ان سے ہاتھ اُٹھا لے تو کون ہے جو انہیں ہدایت دے:

فَمَنۡ یَّہۡدِیۡ مَنۡ اَضَلَّ اللّٰہُ ... [1] پس جسے اللہ گمراہ کردے اسے کون ہدایت دے سکتا ہے؟

وَمَنۡ یُّضۡلِلِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ مِنۡ ہَادٍ ﴿﴾ [2] اور اللہ جسے گمراہ کردے اسے ہدایت دینے والا کوئی نہیں۔

اس آیت میں ان لوگوں کا حال بیان ہو رہا ہے جنہیں اللہ نے ان کی حالت پر چھوڑ دیا ہے۔ اب وہ گمراہی کی تاریکی میں اس طرح مبتلا ہیں جس طرح کوئی شخص ایک حصار میں بند ہو۔ نہ آگے کا راستہ دکھائی دیتا ہے، نہ منزل کی طرف واپس آنے کا راستہ نظر آتا ہے۔ نہ گزشتہ اقوام کے سبق آموز واقعات سے عبرت حاصل کرتے ہیں، نہ آنے والے خطرات سے بچنے کا کوئی چارہ سوچتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ انبیاء علیہم السلام کا پیغام نہ پہنچنے کی وجہ سے لوگ غافل ہو جاتے ہیں: فَہُمۡ غٰفِلُوۡنَ۔

۲۔ اللہ کا فیصلہ اٹل ہونے کی نوبت آنے کے بعد ہدایت کے راستے بند ہو جاتے ہیں: لَقَدۡ حَقَّ الۡقَوۡلُ ....

۳۔ جس سے اللہ ہاتھ اٹھا لے اس کے لیے سارے راستے بند ہو جاتے ہیں۔

وَسَوَآءٌ عَلَیۡہِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَہُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡہُمۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۰﴾

۱۰۔ اور ان کے لیے یکساں ہے کہ آپ انہیں تنبیہ کریں یا نہ کریں وہ (ہر حالت میں) ایمان نہیں لائیں گے۔

---

[1] ۳۰ روم: ۲۹   [2] ۱۳ رعد: ۳۳

تفسیر آیات

اس مضمون کی آیت کی تشریح سورہ بقرہ آیت ۶ کے ذیل میں ہو گئی ہے۔

اشاعرہ نے اس قسم کی آیات سے استدلال کیا ہے کہ تکلیف بالمحال جائز ہے۔ کہتے ہیں جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وہ ایمان نہیں لائیں گے تو پھر ان کا ایمان لانا ممکن نہیں ہے۔ اس کے باوجود انہیں ایمان لانے کا حکم دیا جاتا ہے۔ اس سے یہ بات لازم آتی ہے کہ ایک ناممکن چیز کا حکم دینا جائز ہے۔

جواب یہ ہے کہ اللہ کو علم ہے کہ وہ ایمان پر قادر ہوتے ہوئے ایمان نہیں لائیں گے۔ علم خدا کی وجہ سے وہ ایمان نہ لانے پر مجبور نہیں ہوتے۔ دوسرے لفظوں میں علم تابع ہے معلوم کا۔ معلوم مقدور ہے اور تابع اپنے متبوع کی علت نہیں ہوتا۔

اگر اشاعرہ کا یہ استدلال صحیح ہو جائے تو اللہ تعالیٰ سے قدرت سلب ہو جاتی ہے چونکہ کائنات میں جو کچھ رونما ہونے والا ہے وہ سب اللہ کے علم میں ہے اور علم کی وجہ سے معلوم غیر مقدور ہو جاتا ہے تو تمام کائنات میں جو کچھ رونما ہونے والا ہے وہ سب اللہ کے لیے غیر مقدور ہو جائے گا۔ فتدبر۔

اِنَّمَا تُنۡذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّکۡرَ وَ خَشِیَ الرَّحۡمٰنَ بِالۡغَیۡبِ ۚ فَبَشِّرۡہُ بِمَغۡفِرَۃٍ وَّ اَجۡرٍ کَرِیۡمٍ ﴿۱۱﴾

۱۱۔ آپ تو صرف اسے تنبیہ کر سکتے ہیں جو اس ذکر کی اتباع کرے اور بن دیکھے رحمٰن کا خوف رکھے ایسے شخص کو مغفرت اور اجر کریم کی بشارت دے دیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّمَا تُنۡذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّکۡرَ: اس آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہے جن کے لیے تنبیہ سود مند ہے۔ دو خصلتیں ایسی بیان فرمائی ہیں جن کی وجہ سے تنبیہ موثر ہو جایا کرتی ہے:

الف: مَنِ اتَّبَعَ الذِّکۡرَ: جن میں قرآن کی پیروی کرنے کی صلاحیت موجود ہو یا تذکر و نصیحت پر کان دھرنے کی قابلیت ہو تو ایسے باضمیر لوگوں کو تنبیہ کی جائے تو وہ آپ کی تنبیہ و نصائح سے اثر لیں گے۔

ب: وَ خَشِیَ الرَّحۡمٰنَ: بن دیکھے رحمٰن کا خوف ہو تو وہ لوگ آپ کی تنبیہ سے اثر لیں۔ ان کا ضمیر بیدار ہو اور وہ اس ذات کا خوف کریں جو رحمٰن ہے۔ رحمت والی ذات سے خوف کرنے کا مطلب یہ ہوا کہ اس کے ظلم سے نہیں بلکہ اس کے عدل سے خوف ہو گا۔

یہ وہ لوگ ہوں گے جن کی فطرت ابھی بیدار ہے اور وجدان پر پردہ نہیں ہے۔ اس بیداری ضمیر و فطرت

کی وجہ سے وحی کی آواز ان کے وجدان سے ٹکراتی ہے تو دل میں خوف آتا ہے چونکہ فطرت اس آواز کو پہچان لیتی ہے۔

۲۔ فَبَشِّرۡہُ بِمَغۡفِرَۃٍ وَّ اَجۡرٍ کَرِیۡمٍ: ایسے باوجدان، بیدار فطرت لوگوں کو مغفرت اور اجر کریم کی بشارت دیں۔ کریم سے مراد وہ شیٔ ہے جو قابل ستائش ہو۔ الکریم اسم جامع لکل مایحمد۔ جس میں کسی نامطلوب چیز کا شائبہ نہ ہو وہ اجر کریم ہے۔

اہم نکات

۱۔ جن کا ضمیر مردہ ہو چکا ہے وہ حق کی آواز نہیں سن سکتے۔ وَسَوَآءٌ عَلَیۡہِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَہُمۡ....

۲۔ اتباع اور خوف، ارادہ و شعور کی علامت ہیں جو زندہ ضمیروں کے پاس ہوا کرتا ہے۔

اِنَّا نَحۡنُ نُحۡیِ الۡمَوۡتٰی وَ نَکۡتُبُ مَا قَدَّمُوۡا وَ اٰثَارَہُمۡ ؕ وَ کُلَّ شَیۡءٍ اَحۡصَیۡنٰہُ فِیۡۤ اِمَامٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۱۲﴾

۱۲۔ ہم ہی مردوں کو زندہ کرتے ہیں اور جو کچھ وہ آگے بھیج چکے ہیں اور جو آثار پیچھے چھوڑ جاتے ہیں سب کو ہم لکھتے ہیں اور ہر چیز کو ہم نے ایک امام مبین میں جمع کر دیا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّا نَحۡنُ نُحۡیِ الۡمَوۡتٰی: مشرکین کا عقیدہ تھا:

اِنۡ ہِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنۡیَا نَمُوۡتُ وَ نَحۡیَا وَ مَا نَحۡنُ بِمَبۡعُوۡثِیۡنَ ﴿﴾ [1]
بس یہی دنیاوی زندگی ہے جس میں ہمیں مرنا اور جینا ہے اور ہم اٹھائے نہیں جائیں گے۔

مشرکین اور اہل توحید کے درمیان بنیادی اختلاف حیات بعد الموت پر ہے۔ اسی لیے اسی سورہ میں معاد پر مختلف دلائل دیے ہیں۔

۲۔ وَ نَکۡتُبُ مَا قَدَّمُوۡا وَ اٰثَارَہُمۡ: اور ہم لکھتے ہیں ان سب اعمال کو خواہ وہ اچھے ہوں یا برے جو وہ آگے بھیج چکے ہیں اور جو آثار پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔

نَکۡتُبُ: ہم لکھتے ہیں کا مطلب اعمال کا ثبت ہونا ہے کہ عمل (انرجی) ایک مرتبہ وجود میں آنے کے بعد مٹتا نہیں ہے۔

مَا قَدَّمُوۡا: وہ اعمال جو اس نے اپنی زندگی میں انجام دیے ہیں:

وَ لۡتَنۡظُرۡ نَفۡسٌ مَّا قَدَّمَتۡ لِغَدٍ ... [2]
اور ہر شخص کو یہ دیکھنا چاہیے کہ اس نے کل (روز قیامت) کے لیے کیا بھیجا ہے....

---

[1] ۲۳ مومنون: ۳۷　[2] ۵۹ حشر: ۱۸

وَاٰثَارَهُمۡ : اور جو آثار پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔ ان سب کو اللہ تعالیٰ اپنے دفتر قدرت میں ثبت کرتا ہے۔ وہ اعمال بعینہ محفوظ کیے جاتے ہیں۔ اس سے مراد وہ صدقات جاریہ ہیں جو انسان کے مرنے کے بعد جاری رہتے ہیں۔ جیسے حدیث میں آیا ہے:

من سن سنة حسنة فله اجرها و اجر من عمل بها من بعده من غير ان ينقص من اجورهم شيئا و من سن سنة سيئة كان عليه وزرها و وزر من عمل بها من بعده لا ينقص من اوزارهم شيئا۔ ثم تلا هذه الاية۔[1]

جو کسی اچھی روایت کو رواج دے تو اس کے لیے اسے رواج دینے کا ثواب ہے اور جو اس کے بعد اس پر عمل کرے گا اس سب کا ثواب ملے گا اس پر عمل کرنے والوں کے ثواب میں کسی قسم کی کمی کے بغیر اور کسی بری روایت کو رواج دے گا تو اسے رواج دینے کا وبال بھی اس کے سر پر ہوگا اور جو اس کے بعد اس بری روایت پر عمل کرے گا ان سب کا وبال بھی اس پر ہوگا بغیر اس کے کہ اس کے وبال میں کسی قسم کی کمی کی جائے۔

دوسری حدیث ہے:

اذا مات ابن آدم انقطع عمله الا من ثلاث، علم ينتفع به، او ولد صالح يدعو له، او صدقة جارية من بعده۔[2]

ابن آدم جب فوت ہو جاتا ہے تو اس کا عمل منقطع ہو جاتا ہے (اس کی فائل بند ہو جاتی ہے) سوائے تین چیزوں کے: علم چھوڑ جائے جس سے فائدہ اٹھایا جائے۔ نیک اولاد چھوڑ جائے جو اس کے لیے دعا کرتی رہے یا ایسا صدقہ چھوڑ جائے جو اس کے مرنے کے بعد جاری رہے۔

۳۔ وَكُلَّ شَيۡءٍ اَحۡصَيۡنٰهُ فِيۡۤ اِمَامٍ مُّبِيۡنٍ: ہم نے ہر چیز کو امام مبین میں جمع کیا ہے۔ بعض کے نزدیک آیت کا موضوع حیات بعد الموت اور انسان کا عمل ہے۔ اس اعتبار سے سیاق آیت یہ بنتا ہے کہ امام مبین، نامہ اعمال کی طرف اشارہ ہے۔ جیسے فرمایا:

وَكُلُّ شَيۡءٍ فَعَلُوۡهُ فِي الزُّبُرِ ۝ وَكُلُّ صَغِيۡرٍ وَّ كَبِيۡرٍ مُّسۡتَطَرٌ ۝ [3]

اور جو کچھ انہوں نے کیا ہے سب نامہ اعمال میں درج ہے اور ہر چھوٹی اور بڑی بات (اس میں) لکھی ہوئی ہے۔

دوسری آیت میں فرمایا:

يٰوَيۡلَتَنَا مَالِ هٰذَا الۡكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيۡرَةً وَّلَا كَبِيۡرَةً اِلَّاۤ اَحۡصٰهَا ۚ وَ

ہائے ہماری رسوائی! یہ کیسا نامۂ اعمال ہے؟ اس نے کسی چھوٹی اور بڑی بات کو نہیں چھوڑا (بلکہ) سب کو درج کر لیا ہے اور جو کچھ انہوں نے کیا تھا وہ ان

---

[1] صحيح مسلم۔ وسائل الشيعة باب اقامة السنن۔ الفاظ صحیح مسلم کے ہیں۔
[2] صحيح مسلم۔ مستدرك الوسائل باب اقامة السنن [3] ۵۴ قمر: ۵۲۔۵۳

وَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا...[1] ان سب کو حاضر پائیں گے۔

نامۂ اعمال کو امام اس لیے کہا ہے کہ جو کچھ اس میں لکھا ہے اس کی پیروی کرنی پڑے گی۔ خواہ جنت جانے کا فیصلہ ہے یا جہنم جانے کا۔

دوسرے بعض مفسرین کے نزدیک امام مبین سے مراد لوح محفوظ ہے۔ لوح محفوظ کو کتاب مبین بھی کہتے ہیں:

وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ○[2] کوئی خشک و تر ایسا نہیں ہے جو کتاب مبین میں موجود نہ ہو۔

وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ○[3] اور زمین اور آسمان کی ذرہ برابر اور اس سے چھوٹی یا بڑی کوئی چیز ایسی نہیں جو آپ کے رب سے پوشیدہ ہو اور روشن کتاب میں درج نہ ہو۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ○[4] اور زمین پر چلنے والا کوئی ایسا نہیں جس کا رزق اللہ کے ذمے نہ ہو اور وہ جانتا ہے کہ اس کی جائے قرار کہاں ہے اور عارضی جگہ کہاں ہے، سب کچھ روشن کتاب میں موجود ہے۔

وَمَا مِنْ غَآئِبَةٍ فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ○[5] اور آسمان اور زمین میں کوئی ایسی پوشیدہ بات نہیں ہے جو کتاب مبین میں نہ ہو۔

اس موقف کے مطابق جس چیز میں سب چیزوں کو جمع کیا گیا ہے وہ لوح محفوظ ہے۔ لوح محفوظ کو امام اس لیے کہا ہے کہ مقدرات عالم اس کے تابع ہیں۔

شیخ طوسیؒ نے البیان، طبرسی نے مجمع البیان، کاشانی نے زبدة التفاسیر، علامہ طباطبائی نے المیزان میں یہی موقف اختیار کیا ہے۔

فضائل: بعض مصادر میں متعدد روایات موجود ہیں کہ امام مبین حضرت علی علیہ السلام کی ذات والا صفات ہے۔

حضرت ابن عباس راوی ہیں کہ ان سے حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام نے فرمایا:

انا واللّٰه الامام المبين ابين الحق من الباطل ورثته من رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وآله وسلم۔[6] قسم بخدا! میں امام مبین ہوں۔ حق کو باطل سے جدا کر کے بیان کرنے والا میں ہوں، جسے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ سے وراثت میں لیا ہے۔

---

[1] ۱۸ کہف: ۴۹ [2] ۶ انعام: ۵۹ [3] ۱۰ یونس۔ ۶۱
[4] ۱۱ ھود: ۶ [5] ۲۷ نمل: ۷۵
[6] سليمان قندوزی حنفی ينابيع المودة طبع استنبول۔ بحار الانوار ۳۵: ۴۲۷۔ تفسیر قمی ذیل آیت

دوسری روایت معانی الاخبار میں ہے۔ابو جارود نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے، آپؑ نے اپنے پدر بزرگوار سے، انہوں نے اپنے جد بزرگوار سے، انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی ہے:

انه قال فی علی انه الامام الذی احصی اللّٰہ تبارك و تعالیٰ فیه علم کل شیء[1]	رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی علیہ السلام کے بارے میں فرمایا: یہ وہ امام ہیں جن میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے ہر چیز کا علم جمع کیا ہے۔

علامہ طباطبائی ان دونوں روایات کے ذکر کے بعد فرماتے ہیں:

یہ دونوں احادیث اگر صحیح ہوں تو یہ آیت کی تفسیر نہیں ہیں بلکہ ان کا مضمون بطن قرآن و اشارات قرآن سے ہے اور اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے کہ ایک عبد خدا نے اگر وحدانیت کا اقرار کیا ہو اور وہ اللہ کی بندگی میں اخلاص کی منزل پر فائز ہوا ہو، اسے اللہ کتاب مبین کا علم عنایت کرے جب کہ وہ نبی کے بعد سید الموحدین ہو۔

بعض دیگر شیعہ مفسرین اسے تفسیر نہیں، تطبیق کہتے ہیں۔

آلوسی اپنی تفسیر روح المعانی میں اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

بعض شیعہ غالیوں کی یہ بات مجھے بتائی گئی کہ ان کے ہاں امام مبین سے مراد علی کرم اللّٰہ تعالیٰ وجہ ہیں اور ہر شے کا علم ان میں جمع کر دینا شاعر کے اس قول کے مطابق لیتے ہیں۔

لیس علی اللّٰہ بمستنکر
ان یجمیع العالم فی واحد

اللہ کے لیے یہ بات کوئی انوکھی نہیں ہے کہ عالم کو ایک ہی ذات میں جمع کر دے۔ ان میں سے بعض تو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ علی کرم اللّٰہ وجہ کو لوح محفوظ کی طرح معلومات کا خزانہ بنایا ہے۔ اس بات میں کتاب جلیل کے بارے میں جو جہالت ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اللہ سے عفو اور عافیت کا طالب ہوں اور ممکن ہے ان کی مراد وہی ہو جو اہل تصوف مراد لیتے ہیں کہ وہ اپنی اصطلاح میں انسان کامل کو کتاب مبین کہتے ہیں۔ اس سے جہالت کا معاملہ کچھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ امام علی کرم اللّٰہ وجہ کے کمال کا تو صرف ناقص العقل اور بے دین ہی انکار کر سکتا ہے۔

آلوسی صاحب خود بھی جانتے ہیں ناقص العقل، بے دین لوگوں کی کمی نہیں ہے۔ رہی یہ بات کہ شیعہ اس مسئلے میں کیا نظریہ رکھتے ہیں؟ یہ آپ کو معلوم ہو گیا اور جو لوگ تفسیر اور تطبیق میں فرق جانتے

---

[1] المیزان ذیل آیہ

ہیں ان کے لیے جواب ہو گیا۔

کسی شیعہ روایت میں نہیں ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کو لوح محفوظ کی طرح بنایا گیا ہے۔ لوح محفوظ خزانۂ علم الٰہی کی ایک تعبیر ہے جس کا کسی کے ساتھ مقابلہ قابل تصور نہیں ہے۔

حضرت علی علیہ السلام ہر اس علم کا خزانہ ہیں جس کی بشر کو احتیاج ہے۔ چنانچہ سب کا علی علیہ السلام کی طرف رجوع کرنا اور علی علیہ السلام کا کسی کی طرف رجوع نہ کرنا اس بات کا بین ثبوت ہے کہ علی علیہ السلام وارث علم رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔

اگر کوئی صوفی یہ دعویٰ کرے کہ اسے علم علی علیہ السلام کے سمندر میں سے ایک قطرہ حاصل ہے اور وہ انسان کامل کہلائے اور امام مبین کا اطلاق اس پر درست بھی ہے تو آپ کی نظر میں جہالت کا معاملہ ہلکا ہو جاتا ہے۔ ہماری نظر میں اس سے جہالت کا معاملہ سنگین ہو جاتا ہے کہ قطرے کو امام مبین کہنا جہالت نہ ہو اور سمندر کو امام مبین کہنا جہالت ہو۔ مَا لَكُمْ ۟ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ. دیکھیے مشہور صوفی مفسر العلامۃ اسماعیل حقی برسوی اپنی تفسیر روح البیان میں اس جگہ کیا لکھتے ہیں:

واعلم ان قلب الانسان الکامل امام مبین ولوح الٰھی فیہ انوار الملکوت منتقشة و اسرار الجبروت منطبعة۔	جان لے: انسانِ کامل کا قلب امام مبین اور لوح الٰہی ہے جس میں ملکوتی روشنیاں منقش ہوتی ہیں اور جبروتی اسرار ثبت ہوتے ہیں۔

اس عبارت سے پہلے وہ التاویلات النجمیة ہی کی یہ عبارت نقل کرتے ہیں:

(وکل شیء) مما یتقربون الینا اَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ ای اثبتنا آثارہ وانوارہ فی لوح محفوظ قلوب احبابنا.	امام مبین میں جمع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان اعمال صالحہ کے آثار اور انوار کو ہمارے احباب کے دلوں کے لوح محفوظ میں ہم نے جمع کیا ہے۔

اس قسم کی عبارت پڑھنے کے بعد جہالت کا معاملہ جس قدر آپ کے لیے ہلکا ہو جاتا ہے اسی قدر ہمارے لیے سنگین تر ہو جاتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ انسان کے تمام اعمال خود اور اس پر مترتب ہونے والے آثار سب اللہ کے ہاں ثبت ہیں: وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَاٰثَارَهُمْ ....

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ ۘ اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۱۳﴾	۱۳۔ اور ان کے لیے بستی والوں کو مثال کے طور پر پیش کرو جب ان کے پاس پیغمبر آئے۔
اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ	۱۴۔ جب ہم نے ان کی طرف دو پیغمبر بھیجے تو انہوں

فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوْٓا اِنَّآ اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ ﴿۱۴﴾

نے دونوں کی تکذیب کی پھر ہم نے تیسرے سے (انہیں) تقویت بخشی تو انہوں نے کہا: ہم تو تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَاضۡرِبۡ لَهُمۡ مَّثَلًا اَصۡحٰبَ الۡقَرۡيَةِ: آپ مکہ والوں کو بستی والوں کا قصہ مثال کے طور پر سنا دیں۔ انبیاء علیہم السلام کی تکذیب کرنے والوں کی تاریخ میں اہل مکہ کے تکذیبی عناصر کے لیے بہتر مثال موجود ہے۔ اہل مکہ کی ہٹ دھرمی تعصب اور حق کے منکر ہونے کے بارے میں یہ لوگ اسی روش پر چل رہے ہیں جس پر اس بستی کے رہنے والے چل رہے تھے اور ان کا انجام بھی وہی ہوگا جو اس بستی والوں کا ہوا ہے۔

اکثر مفسرین نے اس روایت کو اپنی تفاسیر میں ایک مسلمہ واقعہ کی طرح جگہ دی کہ اس بستی سے مراد شام کا شہر انطاکیہ ہے اور جن رسولوں کا بھی ذکر ہے وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے مبلغین تھے لیکن بعض مفسرین اس روایت کے ساتھ اتفاق نہیں کرتے۔ اس روایت اور سیاق اور تاریخی حقائق میں اختلاف نظر آتا ہے اور قرآن نے اس بستی کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا۔

سیاق آیت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان رسولوں کو اللہ نے مبعوث فرمایا تھا اور ان کا انکاری لہجہ بھی وہی ہے جو اللہ کے بھیجے ہوئے رسولوں کے خلاف استعمال ہوا کرتا ہے۔ اہل مکہ کو اس بستی کی مثال پیش کرنے کا حکم اس لیے ہوا ہے کہ تکذیب و تعذیب میں اسی بستی والوں کی طرح تھے اور انجام بد بھی اس بستی جیسا ہوگا۔

۲۔ اِذۡ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلَيۡهِمُ اثۡنَيۡنِ: ان کی طرف دو رسولوں کو بہ یک وقت بھیجا گیا تھا جیسے موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو فرعون کی طرف بھیجا گیا تھا لیکن اہل قریہ نے ان دونوں کی تکذیب کی۔

۳۔ فَعَزَّزۡنَا بِثَالِثٍ: اللہ نے تیسرا رسول اس لیے مبعوث فرمایا کہ سابقہ دونوں رسولوں کی تقویت ہو جائے۔

۴۔ فَقَالُوۡۤا اِنَّاۤ اِلَيۡكُمۡ مُّرۡسَلُوۡنَ: اب تینوں رسولوں نے مل کر کہا: ہم سب کو اللہ نے تمہاری طرف مبعوث فرمایا ہے۔

اہم نکات

۱۔ انسانی تاریخ میں عبرت آموز اسباق ہوتے ہیں: وَاضۡرِبۡ لَهُمۡ مَّثَلًا اَصۡحٰبَ الۡقَرۡيَةِ ....

۲۔ صرف ہدایت ایسی چیز ہے جسے فراہم کرنے والے محتاج کے پاس جاتے ہیں: اَرۡسَلۡنَاۤ اِلَيۡهِمُ ....

قَالُوۡا مَاۤ اَنۡتُمۡ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُنَا ۙ وَ مَاۤ اَنۡزَلَ الرَّحۡمٰنُ مِنۡ شَیۡءٍ ۙ اِنۡ اَنۡتُمۡ اِلَّا تَکۡذِبُوۡنَ ﴿۱۵﴾	۱۵۔ (بستی والوں نے) کہا: تم تو صرف ہم جیسے بشر ہو اور خدائے رحمٰن نے کوئی چیز نازل نہیں کی ہے، تم تو محض جھوٹ بولتے ہو۔

تفسیر آیات

بستی والوں کا موقف وہی تھا جو اللہ کی طرف سے آنے والے رسولوں کے بارے میں کافروں کا ہوتا ہے۔ وہ انسان کو اللہ کا رسول نہیں مانتے تھے۔ اگر یہ مبلغین ہوتے تو یہ اعتراض نہ آتا۔ مکہ والے بھی یہی کہتے تھے محمد ﷺ چونکہ انسان ہیں لہٰذا وہ رسول نہیں بن سکتے:

وَ قَالُوۡا مَالِ ہٰذَا الرَّسُوۡلِ یَاۡکُلُ الطَّعَامَ وَ یَمۡشِیۡ فِی الۡاَسۡوَاقِ ...[1]	اور وہ کہتے ہیں: یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے؟

دیگر تکذیب کرنے والی قوموں نے بھی یہی کہا ہے:

اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُہٗۤ ...[2]	کیا ہم اپنوں میں سے ایک بشر کی پیروی کریں؟

قَالُوۡا رَبُّنَا یَعۡلَمُ اِنَّاۤ اِلَیۡکُمۡ لَمُرۡسَلُوۡنَ ﴿۱۶﴾	۱۶۔ رسولوں نے کہا: ہمارا رب جانتا ہے کہ ہم تمہاری طرف ہی بھیجے گئے ہیں۔
وَ مَا عَلَیۡنَاۤ اِلَّا الۡبَلٰغُ الۡمُبِیۡنُ ﴿۱۷﴾	۱۷۔ اور ہم پر تو فقط واضح طور پر پیغام پہنچانا (فرض) ہے اور بس۔

تفسیر آیات

۱۔ ان کی تکذیب کے جواب میں علم خدا کا حوالہ دیا کہ ہمارا رب جانتا ہے کہ ہم اسی کی طرف سے بھیجے ہوئے ہیں۔ اگر ہم اپنے رب کی طرف سے نہ آئے ہوتے تو یہ معجزات ہم خود اپنی طرف سے نہیں دکھا سکتے تھے۔

۲۔ وَ مَا عَلَیۡنَاۤ اِلَّا الۡبَلٰغُ الۡمُبِیۡنُ: انبیاء علیہم السلام کے ذمے پیغام الٰہی کو غیر مبہم اور واضح انداز میں پہنچانا ہے قبولوانا ان کی ذمہ داری نہیں ہے۔ نہ ہی اتمام حجت سے آگے طاقت کا استعمال ایمان کی منطق کے ساتھ سازگار ہے چونکہ ایمان کا تعلق دل سے ہے اور دل صرف منطق اور دلیل کی بات سمجھتا ہے۔ طاقت کی زبان

---

[1] ۲۵ فرقان: ۷ [2] ۵۴ قمر: ۲۴

نہیں سمجھتا۔

قَالُوۡۤا اِنَّا تَطَیَّرۡنَا بِکُمۡ ۚ لَئِنۡ لَّمۡ تَنۡتَہُوۡا لَنَرۡجُمَنَّکُمۡ وَ لَیَمَسَّنَّکُمۡ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ﴿۱۸﴾

۱۸۔ بستی والوں نے کہا: ہم تمہیں اپنے لیے برا شگون سمجھتے ہیں، اگر تم باز نہ آئے تو ہم تمہیں ضرور سنگسار کر دیں گے اور ہماری طرف سے تمہیں دردناک عذاب ضرور پہنچے گا۔

تفسیر آیات

۱۔ دین الٰہی سے دور رہنے والے حقائق سے بھی دور اور اوہام کی وادی میں سرگرداں رہتے ہیں۔ چنانچہ جب بھی کسی رسول نے لوگوں کو اللہ کی طرف اور ان کے مصنوعی معبودوں کو ترک کرنے کی دعوت دی تو وہ اپنے اوہام کی دنیا کے مطابق اس وہم میں مبتلا ہوئے تھے کہ تمہاری وجہ سے ہمارے معبود ناراض ہو گئے اور آفت ہم پر اسی وجہ سے آ رہی ہے۔

واضح رہے اسلامی تعلیمات میں بدشگونی کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ یہ صرف توہم پرستی ہے۔

حدیث رسولؐ ہے:

لَا عَدْوَی وَلَا طِیَرَۃَ وَلَا ہَامَۃَ وَلَا شُوْمَ...۔[1]

سرایت کرنے، بدشگونی اور شومی کی حقیقت نہیں ہے۔

دوسری حدیث میں ہے:

کَفَّارَۃُ الطِّیَرَۃِ التَّوَکُّلُ۔[2]

بدشگونی کا کفارہ توکل ہے

۲۔ لَئِنۡ لَّمۡ تَنۡتَہُوۡا لَنَرۡجُمَنَّکُمۡ: اگر تم باز نہ آئے تو ہم تمہیں سنگسار کر دیں گے۔ منکر کے پاس جب منطق نہیں ہوتی تو طاقت استعمال کرنے پر اتر آتا ہے۔

قَالُوۡا طَآئِرُکُمۡ مَّعَکُمۡ ؕ اَئِنۡ ذُکِّرۡتُمۡ ؕ بَلۡ اَنۡتُمۡ قَوۡمٌ مُّسۡرِفُوۡنَ ﴿۱۹﴾

۱۹۔ رسولوں نے کہا: تمہاری بدشگونی خود تمہارے ساتھ ہے، کیا یہ (بدشگونی) اس لیے ہے کہ تمہیں نصیحت کی گئی ہے؟ بلکہ تم حد سے تجاوز کرنے والے ہو۔

---

[1] الکافی ۸: ۱۹۶ حدیث ۳۰۴ [2] الکافی ۸: ۱۹۸ حدیث ۳۳۶

تفسیر آیات

۱۔ کوئی کسی کے لیے بدشگون نہیں ہوتا ہر شخص کی بدشگونی اس کا اپنا عمل ہوتا ہے۔ اس وقت تمہاری بدشگونی خود تمہارے اپنے اعمال کی روشنی میں تمہارے ساتھ ہے۔ اللہ کے رسولوں کی تکذیب ہی بدشگونی ہے جس کا عنقریب تمہیں علم ہوگا۔

۲۔ اَئِنۡ ذُکِّرۡتُمۡ: کیا اس میں بدشگونی ہے کہ تمہیں نصیحت کی گئی ہے؟ تمہیں برے انجام سے نجات دلانے کی بات کی جاتی ہے تو الٹا اسے بدشگونی کہتے ہو۔

۳۔ بَلۡ اَنۡتُمۡ قَوۡمٌ مُّسۡرِفُوۡنَ: بلکہ تمہاری بدشگونی یہ ہے کہ تم حد سے تجاوز کرنے والے ہو اور اس تجاوز کی وجہ سے تم پر وہ آفت آنے والی ہے جو تمہارے وہم و گمان میں نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ بدشگونی کا توہم، جاہلانہ سوچ ہے۔

۲۔ حقائق سے دور ہونے والے توہمات میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ نصیحت کو بدشگونی سمجھتے ہیں۔

وَ جَآءَ مِنۡ اَقۡصَا الۡمَدِیۡنَۃِ رَجُلٌ یَّسۡعٰی قَالَ یٰقَوۡمِ اتَّبِعُوا الۡمُرۡسَلِیۡنَ ﴿۲۰﴾

۲۰۔ شہر کے دور ترین گوشے سے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا، بولا: اے میری قوم! ان رسولوں کی پیروی کرو۔

تفسیر آیات

۱۔ شہر کے دور ترین گوشے کا ذکر اور یہ فرمانا کہ وہ دوڑتا ہوا آیا اس بات کو واضح کرنے کے لیے ہے کہ یہ شخص ایمان و اخلاص کے کس درجے پر فائز تھا۔ یہی درجہ مؤمن آل فرعون کا بھی تھا۔ وہ بھی شہر کے دور ترین گوشے سے موسیٰ علیہ السلام کو بچانے کے لیے دوڑتا ہوا آیا: وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنۡ اَقۡصَا الۡمَدِیۡنَۃِ یَسۡعٰی ....[1]۔

یہ مومن دوڑتے ہوئے اس لیے آیا ہوگا کہ لوگ ان مرسلین کو قتل کرنے والے تھے۔ اس مومن کے بارے میں زیادہ اختلاف ہے کہ ان کا نام کیا تھا۔ ان کے والد کا نام کیا تھا، ان کا پیشہ کیا تھا۔ روایات مضطرب ہونے کی وجہ سے ہم اس کی تفصیل میں نہیں جاتے۔

فضائل: حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے:

سباق الامم ثلاثۃ لم یکفروا باللہ طرفۃ — امتوں میں سبقت لے جانے والے تین ہیں جنہوں

[1] ۲۸ قصص: ۲۰

عین۔ علی بن ابی طالب و صاحب آل یسٓ و مؤمن آل فرعون، فھم الصدیقون و علی افضلھم۔

نے ایک لمحے کے لیے بھی کفر اختیار نہیں کیا: علی ابن ابی طالب، صاحب آل یاسین اور مؤمن آل فرعون۔ یہی صدیقین ہیں اور علی ان میں افضل ہیں۔

اس حدیث کو مختلف لفظوں میں ابن عباس اور ابو لیلی نے روایت کیا ہے۔ ابن عباس سے ایک روایت عمرو بن جمع کی وجہ سے ضعیف ہے جسے ثعلبی نے اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے۔ دیگر طرق سے عقیلی، طبرانی اور ابن مردویہ نے مجاھد سے انہوں نے ابن عباس سے روایت کی ہے۔ ملاحظہ ہو الکشاف ۴: ۱۰، تفسیر قرطبی ۱۶: ۲۰، روح المعانی ذیل آیت، الدرالمنثور ۵: ۲۱۲، کنز العمال ۱۱: ۱۰۱

دوسری حدیث ابوداؤد، ابو نعیم، ابن عساکر اور دیلمی نے ابو لیلی سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

الصدیقون ثلاثۃ، حبیب النجار مؤمن آل یاسین الذی قَالَ یٰقَوۡمِ اتَّبِعُوا الۡمُرۡسَلِیۡنَ و حزقیل مومن آل فرعون الذی قال اَتَقۡتُلُوۡنَ رَجُلًا اَنۡ یَّقُوۡلَ رَبِّیَ اللّٰہُ و علی بن ابی طالب وھو افضلھم۔[1]

صدیقین تین ہیں: حبیب النجار مومن آل یاسین جس نے کہا تھا: ''اے میری قوم ان مرسلین کی پیروی کرو۔'' حزقیل مومن آل فرعون جس نے کہا تھا: ''کیا تم اس شخص کو قتل کرو گے اس کہنے پر کہ اللہ میرا رب ہے۔'' اور علی بن ابی طالب جو ان سب میں افضل ہیں۔

ان ہستیوں کو فضیلت اس لیے ملی کہ انہوں نے راسخ ایمان کے ساتھ اپنے وقت کے رسول کو بچانے کے لیے اپنی جان کی پرواہ نہ کی اور علی علیہ السلام ان میں افضل ہیں کہ علی علیہ السلام نے اپنے وقت کے خاتم الرسل سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے کئی بار اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا۔

شب ہجرت اپنی جان نثاری کا ذکر خود بیان فرماتے ہیں:

وقیت بنفسی خیر من وطی الحصی
و من طاف بالبیت العتیق و بالحجر

میں نے اپنی جان دے کر اس ہستی کو بچایا جو روئے زمین پر چلنے والوں
اور قدیم گھر اور حجر کا طواف کرنے والوں میں سب سے افضل ہے۔

اہم نکات

۱۔ مؤمن پوری قوم میں تنہا ہونے کے باوجود حق کی آواز بلند کرتا ہے: رَجُلٌ....

---

[1] الدرالمنثور ۵: ۲۱۲

۲۔ مجاہد حمایت حق کے لیے سرعت کے ساتھ آگے آتا ہے: یَّسۡعٰی ....

اتَّبِعُوۡا مَنۡ لَّا یَسۡـَٔلُکُمۡ اَجۡرًا وَّ ہُمۡ مُّہۡتَدُوۡنَ ﴿۲۱﴾

۲۱۔ان کی اتباع کرو جو تم سے کوئی اجر نہیں مانگتے اور وہ راہ راست پر ہیں۔

تفسیر آیات

اس مجاہد مؤمن نے اپنے رسول کی حمایت اور ان کی پیروی کرنا لازم ہونے پر دو باتوں سے استدلال کیا ہے:

i۔ ایسے داعیان حق کی پیروی لازم ہے جن کی دعوت میں اپنے کوئی مادی مفادات نہیں ہیں۔ وہ جو باتیں کرتے ہیں ان میں اگر اپنا کوئی مفاد ہو تو خودغرضی کا امکان ہوتا ہے۔

ii۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ داعی خود ہدایت پر ہو اور خود ہدایت پر ہونے کی دلیل بھی ساتھ ہو۔

اَفَمَنۡ یَّہۡدِیۡۤ اِلَی الۡحَقِّ اَحَقُّ اَنۡ یُّتَّبَعَ اَمَّنۡ لَّا یَہِدِّیۡۤ اِلَّاۤ اَنۡ یُّہۡدٰی ....[1]

جو حق کی راہ دکھاتا ہے وہ اس بات کا زیادہ حقدار ہے کہ اس کی پیروی کی جائے یا وہ جو خود اپنی راہ نہیں پاتا جب تک اس کی رہنمائی نہ کی جائے؟

وَ مَا لِیَ لَاۤ اَعۡبُدُ الَّذِیۡ فَطَرَنِیۡ وَ اِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۲۲﴾

۲۲۔ اور میں کیوں نہ اس ذات کی بندگی کروں جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور جس کی طرف تم سب کو پلٹ کر جانا ہے۔

ءَاَتَّخِذُ مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اٰلِـہَۃً اِنۡ یُّرِدۡنِ الرَّحۡمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغۡنِ عَنِّیۡ شَفَاعَتُہُمۡ شَیۡئًا وَّ لَا یُنۡقِذُوۡنِ ﴿۲۳﴾

۲۳۔کیا میں اس ذات کے علاوہ کسی کو معبود بناؤں؟ جب کہ اگر خدائے رحمٰن مجھے ضرر پہنچانے کا ارادہ کر لے تو ان کی شفاعت مجھے کوئی فائدہ نہیں دے سکتی اور نہ وہ مجھے چھڑا سکتے ہیں۔

اِنِّیۡۤ اِذًا لَّفِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۲۴﴾

۲۴۔تب تو میں صریح گمراہی میں مبتلا ہو جاؤں گا۔

اِنِّیۡۤ اٰمَنۡتُ بِرَبِّکُمۡ فَاسۡمَعُوۡنِ ﴿۲۵﴾

۲۵۔ میں تو تمہارے پروردگار پر ایمان لے آیا ہوں لہٰذا میری بات سن لو۔

----

[1] ۱۰ یونس: ۳۵

تفسیر آیات

۱۔ وَ مَا لِیَ لَاۤ اَعۡبُدُ الَّذِیۡ فَطَرَنِیۡ: اس آیت میں مومن آل یاسین اپنا ایمانی موقف اور منطق عقلی دلیل کی بنیاد پر بیان کرتا ہے۔

الف: عبادت صرف اس ذات کی ہونی چاہیے جس نے پیدا کیا ہے۔ مشرکین اللہ کو خالق تسلیم کرتے تھے تو ان کے مسلمات سے استدلال ہوا ہے کہ جس ذات کو خود تم خالق تسلیم کرتے ہو، عبادت اور بندگی اسی کی ہونی چاہیے۔

ب: نیز عبادت اس ذات کی ہونی چاہیے جس کی طرف تمہاری بازگشت ہے۔ اس کے حضور تم نے حساب دینا ہے اور اپنی دائمی قسمت کا فیصلہ اسی سے سننا ہے

ج: ءَاَتَّخِذُ مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اٰلِـہَۃً: کیا میں ایسی بے حس جامد چیزوں کو اپنا معبود بناؤں کہ اگر میرا معبود حقیقی مجھ سے ناراض ہو جائے اور مجھے میرے گناہوں کی وجہ سے عذاب میں ڈالنا چاہے تو یہ معبود نہ اللہ کی بارگاہ میں میری سفارش کر سکتے ہیں نہ عذاب سے چھڑا سکتے ہیں۔ مشرکین کے اس عقیدے کی رد ہے کہ ان کے معبود اللہ کے ہاں شفاعت کریں گے۔

۲۔ اِنۡ یُّرِدۡنِ الرَّحۡمٰنُ بِضُرٍّ: اگر رحمٰن مجھے ضرر پہنچانے کا ارادہ کر لے۔ رحمٰن سے ضرر کا تصور کیسے؟ اگر وہ رحمٰن رحم سے لبریز ذات ہے تو اس سے ضرر کیسا؟ جواب یہ ہے خدائے رحمٰن کی طرف سے عدل و انصاف ہوگا ظلم اور ضرر نہ ہوگا۔ لیکن انسان سے اگر گناہ سرزد ہوتا ہے تو اس صورت میں عدل الٰہی کے تحت انسان کو خود اپنی داعمالی کی وجہ سے ضرر پہنچے گا۔

۳۔ اِنِّیۡۤ اِذًا لَّفِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ: اگر میں اس عادل کی عدالت میں اس حالت میں پہنچ جاؤں کہ نہ میری شفاعت کرنے والا کوئی ہوگا، نہ مجھے عذاب الٰہی سے بچانے والا کوئی ہوگا تو میں کھلی گمراہی میں مبتلا ہو جاؤں گا۔ لہٰذا خدائے واحد کی عبادت کرتا ہوں تاکہ رحمٰن کی رحمت میرے شامل حال ہو۔

۴۔ اِنِّیۡۤ اٰمَنۡتُ بِرَبِّکُمۡ فَاسۡمَعُوۡنِ: خطاب مشرکین سے ہے۔ جیسے اتَّبِعُوۡا اور تُرۡجَعُوۡنَ کا خطاب مشرکین سے ہے۔ یعنی میں تمہارے خالق اور تمہارے رب پر ایمان لے آیا ہوں لہٰذا میری بات سن لو۔ ان مرسلین کی پیروی کرو، ان پر ایمان لے آؤ۔ جو مفسرین اس جملے کا مخاطب مرسلین کو قرار دیتے ہیں وہ قطعاً سیاق و مضمون آیت کے خلاف ہے کہ ایک امتی اپنے رسولوں سے فَاسۡمَعُوۡنِ "میری بات سنو" کہے۔ قرآن مشرکین کے لیے ربکم کے خطاب سے پر ہے:

قَدۡ جَآءَتۡکُمۡ بَیِّنَۃٌ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ ؕ هٰذِهٖ نَاقَۃُ اللّٰهِ ...[1]	تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس واضح دلیل آ چکی ہے، یہ اللہ کی اونٹنی ہے۔

[1] اعراف: ۷۳

اہم نکات

۱۔ دعوت کا ایک اسلوب اپنا عقیدہ دلیل کیساتھ بیان کرنا ہے: وَمَا لِیَ لَاۤ اَعۡبُدُ الَّذِیۡ فَطَرَنِیۡ ...۔

۲۔ خالق ہونے کی وجہ سے لائق عبادت سمجھ کر، اِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ اور خوف عدالت کی وجہ سے عبادت درست ہے۔

قِیۡلَ ادۡخُلِ الۡجَنَّۃَ ؕ قَالَ یٰلَیۡتَ قَوۡمِیۡ یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۶﴾

۲۶۔ اس سے کہدیا گیا: جنت میں داخل ہو جاؤ، اس نے کہا: کاش! میری قوم کو اس بات کا علم ہو جاتا۔

بِمَا غَفَرَ لِیۡ رَبِّیۡ وَ جَعَلَنِیۡ مِنَ الۡمُکۡرَمِیۡنَ ﴿۲۷﴾

۲۷۔ کہ میرے رب نے مجھے بخش دیا اور مجھے عزت والوں میں شامل کیا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ قِیۡلَ ادۡخُلِ الۡجَنَّۃَ: سیاق آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے اس مومن کو شہید کر دیا اور شہید ہوتے ہی فرشتوں نے اسے جنت میں داخل ہونے کا حکم دے دیا۔ بظاہر یہ عالم برزخ کی جنت ہے، جیسے شہداء کے لیے برزخی حیات و رزق ہے:

بَلۡ اَحۡیَآءٌ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ یُرۡزَقُوۡنَ ○[۱]　　بلکہ وہ زندہ ہیں، اپنے رب کے پاس سے رزق پا رہے ہیں۔

جیسے سورہ نحل میں فرمایا کہ قبض روح کے وقت جنت میں داخل ہونے کا حکم دیا جاتا ہے:

الَّذِیۡنَ تَتَوَفّٰىہُمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ طَیِّبِیۡنَ ۙ یَقُوۡلُوۡنَ سَلٰمٌ عَلَیۡکُمُ ۙ ادۡخُلُوا الۡجَنَّۃَ بِمَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ○[۲]　　جن کی روحیں فرشتے پاکیزہ حالت میں قبض کرتے ہیں (اور انہیں) کہتے ہیں: تم پر سلام ہو! اپنے (نیک) اعمال کی جزا میں جنت میں داخل ہو جاؤ۔

۲۔ قَالَ یٰلَیۡتَ قَوۡمِیۡ یَعۡلَمُوۡنَ: وہ اپنی شہادت کے بعد جب داخل جنت ہوتے ہیں اور جنت کی نعمتوں کو دیکھ کر فوراً اپنی منکر قوم کے انجام بد کا خیال آتا ہے اور آرزو کرتے ہیں کہ کاش میری قوم کو علم ہوتا کہ حیات اخروی کی سعادت ان مرسلین کی باتوں پر ایمان لانے میں ہے۔

۳۔ بِمَا غَفَرَ لِیۡ رَبِّیۡ: شہادت کی وجہ سے گزشتہ تمام گناہوں کی مغفرت ہوگئی۔

۴۔ وَ جَعَلَنِیۡ مِنَ الۡمُکۡرَمِیۡنَ: کاش میری قوم کو اس بات کا بھی علم ہو جاتا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے

---

[۱] ۳ آل عمران: ۱۶۹　[۲] ۱۶ نحل: ۳۲

مجھے عزت و اکرام والوں میں شامل کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مکرمین کا لفظ اپنے مقرب فرشتوں کے لیے استعمال فرمایا ہے:

وَ قَالُوا اتَّخَذَ الرَّحۡمٰنُ وَلَدًا سُبۡحٰنَہٗ ؕ بَلۡ عِبَادٌ مُّکۡرَمُوۡنَ ﴿۲۶﴾ [1] اور وہ کہتے ہیں: اللہ نے بیٹا بنایا ہے، وہ پاک ہے (ایسی باتوں سے) بلکہ یہ تو اللہ کے محترم بندے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ شہادت اور جنت کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہے: قِیۡلَ ادۡخُلِ الۡجَنَّۃَ ....

۲۔ مومن موت کے بعد زندوں کی فکر میں ہوتا ہے: یٰلَیۡتَ قَوۡمِیۡ یَعۡلَمُوۡنَ۔

وَ مَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلٰی قَوۡمِہٖ مِنۡۢ بَعۡدِہٖ مِنۡ جُنۡدٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَ مَا کُنَّا مُنۡزِلِیۡنَ ﴿۲۸﴾ ۲۸۔ اور اس کے بعد اس کی قوم پر ہم نے آسمان سے کوئی لشکر نہیں اتارا اور نہ ہم کوئی لشکر اتارنے والے تھے۔

اِنۡ کَانَتۡ اِلَّا صَیۡحَۃً وَّاحِدَۃً فَاِذَا ہُمۡ خٰمِدُوۡنَ ﴿۲۹﴾ ۲۹۔ وہ تو محض ایک ہی چیخ تھی پس وہ یکایک بجھ کر رہ گئے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ مَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلٰی قَوۡمِہٖ مِنۡۢ بَعۡدِہٖ: اس مؤمن کے قتل کے بعد اس کی قوم پر عذاب نازل کرنے کے لیے ہم نے آسمان سے لشکر نہیں اتارا اور ہم اس طرح کسی قوم کی ہلاکت کے لیے ایسا نہیں کرتے بلکہ دوسری جگہ فرمایا:

فَمِنۡہُمۡ مَّنۡ اَرۡسَلۡنَا عَلَیۡہِ حَاصِبًا ۚ وَ مِنۡہُمۡ مَّنۡ اَخَذَتۡہُ الصَّیۡحَۃُ ۚ وَ مِنۡہُمۡ مَّنۡ خَسَفۡنَا بِہِ الۡاَرۡضَ ۚ وَ مِنۡہُمۡ مَّنۡ اَغۡرَقۡنَا... [2] ان میں سے کچھ پر تو ہم نے پتھر برسائے اور کچھ کو چنگھاڑ نے گرفت میں لیا اور کچھ کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا اور کچھ کو ہم نے غرق کر دیا۔

بنابر قول بعض مفسرین یہ صرف خاتم المرسلین ﷺ کی تکذیب کرنے والوں کی تباہی کے لیے آسمان سے فرشتوں کا لشکر نازل ہوا:

بِخَمۡسَۃِ اٰلٰفٍ مِّنَ الۡمَلٰٓئِکَۃِ مُسَوِّمِیۡنَ ﴿۱۲۵﴾ [3] پانچ ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا۔

۲۔ اِنۡ کَانَتۡ اِلَّا صَیۡحَۃً: بلکہ اس قوم کی تباہی کے لیے صرف ایک چنگھاڑ تھی جس سے وہ بجھ کر رہ

---

[1] ۲۱ انبیاء: ۲۶ [2] ۲۹ عنکبوت: ۴۰ [3] ۳ آل عمران: ۱۲۵

گئے۔ زمین پھٹنے کی آواز ہو یا آسمان سے بجلی گرنے کی آواز۔ ایک آواز نے ان کی زندگی کی شمع بجھا دی۔
اگر یہ واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے بعد کا ہوتا تو یہ عظیم واقعہ تاریخ میں ثبت ہوتا۔

اہم نکات

۱۔ ایک مومن کے قتل کے جرم میں پوری قوم کر تباہ کر دی گئی۔

يٰحَسۡرَةً عَلَى الۡعِبَادِ ۚ مَا يَاۡتِيۡهِمۡ مِّنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا كَانُوۡا بِهٖ يَسۡتَهۡزِءُوۡنَ ﴿۳۰﴾

۳۰۔ ہائے افسوس! ان بندوں پر جن کے پاس جو بھی رسول آیا اس کے ساتھ انہوں نے تمسخر کیا۔

اَلَمۡ يَرَوۡا كَمۡ اَهۡلَكۡنَا قَبۡلَهُمۡ مِّنَ الۡقُرُوۡنِ اَنَّهُمۡ اِلَيۡهِمۡ لَا يَرۡجِعُوۡنَ ﴿۳۱﴾

۳۱۔ کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ان سے پہلے کتنی قوموں کو ہم نے ہلاک کر دیا؟ اب وہ ان کی طرف لوٹ کر نہیں آئیں گے۔

وَ اِنۡ كُلٌّ لَّمَّا جَمِيۡعٌ لَّدَيۡنَا مُحۡضَرُوۡنَ ﴿۳۲﴾

۳۲۔ اور ان سب کو ہمارے روبرو حاضر کیا جائے گا۔

تفسیر آیات

۱۔ يٰحَسۡرَةً عَلَى الۡعِبَادِ: اے حسرت و ندامت! اگر تجھے حسرت و ندامت کرنا ہے تو اس کے لیے سزاوار ترین قوم وہ لوگ ہیں جن کی ہدایت و سعادت کے لیے اللہ کی طرف سے رسول آتے ہیں تو نہ صرف یہ کہ اس عظیم رحمت الٰہی کو ٹھکرا دیتے ہیں بلکہ ان کا مذاق اڑاتے ہیں اور ان رسولوں سے اپنی ابدی زندگی کو سعادت مند بنانے کی جگہ ان کا تمسخر اڑا کر اپنے لیے ہمیشہ کی تباہی اختیار کرتے ہیں۔

۲۔ اَلَمۡ يَرَوۡا: کیا ان تمسخر کرنے والوں نے نہیں دیکھا۔ یعنی علمی بصیرت سے نہیں دیکھا کہ ان سے پہلے کتنے تمسخری عناصر کو ہم نے ایسے ہی جرائم کی پاداش میں تباہ کر دیا۔ ان تمسخری عناصر میں اہل مکہ شامل ہیں۔ اسی شمولیت کی بنا پر کلام کا رخ ان کی طرف ہے کہ ان کی ہلاکت تاریخ کا حصہ بننے والی ہے۔

۳۔ اَنَّهُمۡ اِلَيۡهِمۡ لَا يَرۡجِعُوۡنَ: اَنَّهُمۡ یعنی اقوام اِلَيۡهِمۡ اہل مکہ کی طرف لوٹ کر نہیں آئیں گی۔
کیا اہل مکہ کو علم نہیں ہے کہ تمسخری عناصر اپنی نابودی کے بعد پھر دوبارہ آباد ہونے والے نہیں ہیں؟

۴۔ وَ اِنۡ كُلٌّ لَّمَّا جَمِيۡعٌ لَّدَيۡنَا مُحۡضَرُوۡنَ: یہ ہلاک شدہ قومیں اہل مکہ کی طرف لوٹ کر واپس نہیں آئیں گی بلکہ وہ اللہ کی عدالت میں اپنے جرائم کے محاسبہ کے لیے حاضر کی جائیں گی جہاں انہیں

اپنے اعمال کا حساب دینا ہوگا۔

اہم نکات

۱۔ داعیان حق ہمیشہ زبان کے زخموں کی زد میں رہے ہیں: اِلَّا کَانُوۡا بِہٖ یَسۡتَہۡزِءُوۡنَ۔

۲۔ حسرت و ندامت ان لوگوں کے لیے ہے جو راہنماؤں کا تمسخر اڑاتے ہیں۔

۳۔ اللہ کے قہر و غضب میں ہلاک ہونے والے کبھی واپس نہیں آ سکتے۔

وَ اٰیَۃٌ لَّہُمُ الۡاَرۡضُ الۡمَیۡتَۃُ ۚۖ اَحۡیَیۡنٰہَا وَ اَخۡرَجۡنَا مِنۡہَا حَبًّا فَمِنۡہُ یَاۡکُلُوۡنَ ﴿۳۳﴾

۳۳۔ اور مردہ زمین ان کے لیے ایک نشانی ہے جسے ہم نے زندہ کیا اور اس سے غلہ نکالا جس سے یہ کھاتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اٰیَۃٌ لَّہُمُ: ان منکرین معاد کے لیے وجود معاد کی ایک نشانی، نظیر اور مثال یہ ہے کہ الۡاَرۡضُ الۡمَیۡتَۃُ ۚۖ اَحۡیَیۡنٰہَا مردہ زمین کو ہم زندہ کرتے ہیں اور حیات بعد از موت کا نظارہ وہ ہمیشہ کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

فَاِذَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡہَا الۡمَآءَ اہۡتَزَّتۡ وَ رَبَتۡ ؕ اِنَّ الَّذِیۡۤ اَحۡیَاہَا لَمُحۡیِ الۡمَوۡتٰی ...[1]

اور جب ہم اس پر پانی برسائیں تو وہ یکایک جنبش میں آتی ہے اور پھلنے پھولنے لگتی ہے، تو جس نے زمین کو زندہ کیا وہی یقیناً مردوں کو زندہ کرنے والا ہے

اس موضوع پر گزشتہ متعدد آیات میں تفصیل سے گفتگو ہوگئی ہے۔

۲۔ وَ اَخۡرَجۡنَا مِنۡہَا حَبًّا فَمِنۡہُ یَاۡکُلُوۡنَ: آیت کے اس جملے میں دو نکات پوشیدہ ہیں: ایک یہ کہ ہم نے مردہ زمین سے دانہ نکالا۔ اس دانے سے تم اپنی زندگی کا تسلسل باقی رکھ رہے ہو۔ اس زمین کی حیات سے تم اپنی حیات کی بقا کا سامان فراہم کر رہے ہو۔ پھر کہتے ہو اللہ موت کے بعد زندگی کیسے دے گا؟ اللہ اس دانے سے تمہارے مردہ خلیوں کو ہر آن زندہ کرتا ہے پھر کہتے ہو اللہ مردوں کو کیسے زندہ کرے گا؟

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ تمہاری حیات کی تدبیر اللہ کے ہاتھ میں ہے اور تمہیں روزی فراہم کرنے والا اللہ ہے۔ چنانچہ ہم نے قرآن کے ساتھ کئی بار اس بات کا ذکر کیا ہے کہ رزق تخلیق مسلسل کا نام ہے۔ اس آیت میں یہی فرمایا کہ ہم نے زمین سے دانہ نکالا جس سے تم کھاتے ہو۔ زمین سے دانہ نکالنا تخلیق اور ترزیق ہے۔ لہٰذا خالقیت اور رازقیت قابل تفریق نہیں ہے۔

---

[1] ۴۱ حم سجدہ: ۳۹

وَ جَعَلۡنَا فِیۡهَا جَنّٰتٍ مِّنۡ نَّخِیۡلٍ وَّ اَعۡنَابٍ وَّ فَجَّرۡنَا فِیۡهَا مِنَ الۡعُیُوۡنِ ﴿۳۴﴾

۳۴۔ اور ہم نے اس (زمین) میں کھجوروں اور انگوروں کے باغ بنائے اور ہم نے اس (زمین) میں کچھ چشمے جاری کیے۔

لِیَاۡکُلُوۡا مِنۡ ثَمَرِهٖ ۙ وَ مَا عَمِلَتۡهُ اَیۡدِیۡهِمۡ ؕ اَفَلَا یَشۡکُرُوۡنَ ﴿۳۵﴾

۳۵۔ تاکہ وہ اس کے پھلوں سے اور اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھائیں، تو کیا یہ شکر نہیں کرتے؟

تفسیر آیات

۱۔ وَ جَعَلۡنَا فِیۡهَا جَنّٰتٍ: اس زمین سے زندگی کو تسلسل دینے کا ذکر ہے۔ ان میں اہم ترین حیات بخش غذا کھجور ہے جو غذائیت سے بھرپور ہونے کے ساتھ سب سے زیادہ سرعت کے ساتھ خون میں جذب ہونے والی غذا ہے۔ دوسرے نمبر پر انگور ہے۔ اس کی افادیت تو اس مضمون کے ماہرین بہتر بتا سکتے ہیں۔

۲۔ وَّ فَجَّرۡنَا فِیۡهَا مِنَ الۡعُیُوۡنِ: چشموں سے نکلنے والے پانی سے بھی حیات کو دوام ملتا ہے۔ خود پانی کا حیات بخش ہونا کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔

۳۔ لِیَاۡکُلُوۡا مِنۡ ثَمَرِهٖ: تاکہ اس کا پھل کھائیں۔ وہ پھل جو اللہ نے بنایا۔ ثَمَرِهٖ کی ضمیر بعض کے نزدیک مجعول کی طرف جاتی ہے جسے جعلنا سے سمجھا گیا ہے۔ یعنی لیاکلوا من ثمر المجعول، بعض دیگر کے نزدیک من ثمر المذکور، بعض کے نزدیک من ثمر النخل ہے۔

۴۔ وَ مَا عَمِلَتۡهُ اَیۡدِیۡهِمۡ: اور وہ چیز بھی کھائیں جو ان کے ہاتھوں کی محنت اور کمائی ہے۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ "ما" نافیہ ہے۔ وہ چیز کھائیں جو ان کے ہاتھوں کی پیداوار نہیں ہے۔ اللہ کا بنائی ہوئی ہے۔ شاید اَفَلَا یَشۡکُرُوۡنَ۔ کیا وہ شکر نہیں کرتے۔ اس دوسری تفسیر کے لیے قرینہ بن جائے چونکہ انسان کے ہاتھوں کی کمائی وَ مَا عَمِلَتۡهُ اَیۡدِیۡهِمۡ اللہ کی بنائی ہوئی، جَعَلۡنَا کے مقابلے میں نہیں ہے۔ انسان اسی پھل کو حاصل کرتا ہے جو اللہ کا بنایا ہوا ہے۔

اہم نکات

۱۔ جو ذات دنیا میں پھلوں اور دانوں کے ذریعے ہر آن تمہاری تجدید حیات کر رہی ہے کیا وہ اس زندگی کو دوبارہ خلق نہیں کر سکتی؟

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡ خَلَقَ الۡاَزۡوَاجَ کُلَّهَا

۳۶۔ پاک ہے وہ ذات جس نے تمام جوڑے

مِمَّا تُنۡۢبِتُ الۡاَرۡضُ وَ مِنۡ اَنۡفُسِہِمۡ وَ مِمَّا لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۳۶﴾

بنائے ان چیزوں سے جنہیں زمین اگاتی ہے اور خود ان سے اور ان چیزوں سے جنہیں یہ جانتے ہی نہیں۔

تفسیر آیات

ساری کائنات زوجیت کے نظام پر قائم ہے۔ انسان کو عالم نباتات اور عالم انفس میں زوجیت کا نظام نافذ ہونے کا تو قدیم سے علم تھا اور عالم مجہولات میں بھی یہی نظام نافذ ہے۔ یعنی جہاں انسان کی علمی رسائی نہیں ہوتی وہاں بھی زوجیت کا نظام ہے۔ چنانچہ کل تک انسان کے علم میں نہ تھا کہ ایٹم کیا چیز ہے۔ آج انسان کو جب ایٹم کا پتہ چلا تو علم ہوا اس میں بھی زوجیت کا اصول کارفرما ہے۔ چنانچہ دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

وَ مِنۡ کُلِّ شَیۡءٍ خَلَقۡنَا زَوۡجَیۡنِ ...[1] — اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے بنائے ہیں۔

عناصر کی زوجیت کے بغیر کوئی ترکیب وجود میں نہیں آتی۔ حتیٰ خود مادے کی ترکیب منفی اور مثبت برقی توانائی کی زوجیت کی مرہون منت ہے۔ غرض اس کا وجود اور اس کی رنگارنگی انہی عناصر میں ازدواج و ترکیب کی کرشمہ سازی ہے۔

کائنات کو ازدواجی نظام پر قائم رکھنے کا کام غیر اللہ کے لیے ممکن نہیں ہے چونکہ اس غیر اللہ کا وجود ایجاداً و بقاءً ازدواج کا محتاج ہے۔ چنانچہ ایک فکرانگیز توحیدی خطبے میں حضرت علی سے مروی ہے:

مُؤَلِّفٌ بَیْنَ مُتَعَادِیَاتِھَا وَ مُفَرِّقٌ بَیْنَ مُتَدَانِیَاتِھَا دَالَّۃً بِتَفْرِیقِھَا عَلَی مُفَرِّقِھَا وَ بِتَالِیفِھَا عَلَی مُؤَلِّفِھَا وَ ذَلِکَ قَوْلُہُ تَعَالیٰ وَ مِنۡ کُلِّ شَیۡءٍ خَلَقۡنَا زَوۡجَیۡنِ لَعَلَّکُمۡ تَذَکَّرُوۡنَ فَفَرَّقَ بَیْنَ قَبْلٍ وَ بَعْدٍ لِیُعْلَمَ اَنْ لَا قَبْلَ لَہُ وَلَا بَعْدَ لَہُ،شَاھِدَۃً بِغَرَائِزِھَا اَنْ لَا غَرِیزَۃَ لِمُغْرِزِھَا، مُخْبِرَۃً بِتَوْقِیتِھَا اَنْ لَا وَقْتَ لِمُوَقِّتِھَا حَجَبَ بَعْضَھَا عَنْ بَعْضٍ لِیُعْلَمَ اَنْ لَا حِجَابَ بَیْنَہُ وَ

اللہ تعالیٰ ان اشیاء میں متضاد چیزوں کو جوڑنے والا ہے اور مربوط چیزوں کو توڑنے والا ہے۔ یہ توڑ، توڑنے والے پر دلالت کرتی ہے اور جوڑ جوڑنے والے پر جیسا کہ فرمایا: ”ہر چیز کے ہم نے دو جوڑے بنائے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔“ اللہ نے قبل اور بعد میں امتیاز پیدا کیا تاکہ معلوم ہو خود اس کے لیے قبل اور بعد نہیں ہے۔ ان اشیاء میں موجود طبیعتیں یہ گواہی دے رہی ہیں کہ خود اس خالق کی کوئی طبیعت نہیں ہے۔ ان کو وقت اور زمانے کے ساتھ مقید کرنا بتاتا ہے خود اس کے لیے کوئی وقت اور زمانہ نہیں ہے۔ ان چیزوں کو ایک دوسرے سے پوشیدہ رکھا، یہ بتانے کے لیے کہ اس کے اور اس کی مخلوق کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہے۔ وہ

---

[1] ۵۱ ذاریات: ۴۹

بَیْنَ خَلْقِهِ كَانَ رَبّاً اِذْ لَا مَرْبُوبَ وَ اِلَهاً اِذْ لَا مَأْلُوهَ وَ عَالِماً اِذْ لَا مَعْلُومَ وَ سَمِيعاً اِذْ لَا مَسْمُوعَ۔[1]

کا س وقت بھی رب تھا جب کوئی مربوب نہ تھا اور اس وقت بھی معبود تھا جب کوئی عبادت گزار نہ تھا اور اس وقت بھی عالم تھا جب کوئی معلوم نہ تھا۔ اس وقت بھی سننے والا تھا جب سننے کی کوئی چیز نہ تھی۔

واضح رہے کہ زوجیت کا مطلب نر و مادہ کے درمیان ازدواج نہیں ہے کہ کہا جائے سیلز اور ابتدائی حیوانات اور بعض کیڑے بغیر نر و مادہ کے ازدواج کے پیدا ہوتے ہیں بلکہ زوجیت کا مطلب جفت ہے کہ کائنات کو اللہ تعالیٰ نے جفت کے نظام میں خلق فرمایا ہے۔

اہم نکات

۱۔ کائنات کو جفت کے تحت بنایا کہ خود خالق کا کوئی جفت نہیں۔

۲۔ ہر چیز اپنے وجود اور بقاء میں جفت کی محتاج ہے۔ خالق کسی شریک کا محتاج نہیں۔

وَ اٰيَةٌ لَّهُمُ الَّيْلُ ۚ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ فَاِذَا هُمْ مُّظْلِمُوْنَ ﴿۳۷﴾

۳۷۔ اور رات بھی ان کے لیے ایک نشانی ہے جس سے ہم دن کو کھینچ لیتے ہیں تو ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اٰيَةٌ لَّهُمُ الَّيْلُ: اس بات کی ایک نشانی کہ تدبیر کائنات خود اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، اسے کسی شریک کے سپرد نہیں کیا ہے، دن اور رات کا آنا جانا ہے۔

یہ ایک طرف کائنات کے نظام کا حصہ ہے جو اجرام کی گردش پر قائم ہے اور اللہ تعالیٰ کا وضع کردہ نظام ہے۔ اس نظام کا بھی وجود اور بقا ارادۂ الٰہی پر موقوف ہے۔

دوسری طرف زمین پر انسان، حیوانات اور نباتات کا وجود اور نشو و نما، اسی گردش اور اس کے نتیجے میں وجود میں آنے والے روز و شب کے مرہون منت ہے۔

نَسْلَخُ کے لغوی معنی کھال کھینچنے کے ہیں۔ کرۂ ارض بذات خود تاریک ہے۔ اس پر سورج کا نور ایک لباس کی طرح پہنایا جاتا ہے۔ جب یہ لباس ہٹا دیا جاتا ہے تو تاریکی چھا جاتی ہے اور خود تاریکی بھی اس نظام کی تدبیر کے لیے ضروری ہے کہ اگر شب کی تاریکی نہ ہوتی تو ہمیشہ دن ہی دن ہوتا تو بھی تابش آفتاب کی وجہ سے یہ نظام درہم برہم ہو جاتا۔

اہم نکات

۱۔ جہاں دن کی روشنی ضروری ہے، وہاں شب کا وجود بھی ضروری ہے۔

---

[1] الکافی ۱: ۱۳۸ باب جوامع التوحید

وَ الشَّمۡسُ تَجۡرِیۡ لِمُسۡتَقَرٍّ لَّہَا ؕ ذٰلِکَ تَقۡدِیۡرُ الۡعَزِیۡزِ الۡعَلِیۡمِ ﴿۳۸﴾

۳۸۔ اور سورج اپنے مقررہ ٹھکانے کی طرف چلا جا رہا ہے، یہ بڑے غالب آنے والے دانا کی تقدیر ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ الشَّمۡسُ تَجۡرِیۡ لِمُسۡتَقَرٍّ لَّہَا: جب یونانی نظریات مسلمانوں میں منتقل ہوئے تو بطلیموس کا یہ نظریہ بھی مسلمانوں کے ہاں رائج ہوا کہ زمین مرکز ہے اور سورج، چاند اور دیگر سیارے زمین کے گرد گھومتے ہیں۔ جب بطلیموسی نظریہ باطل ثابت ہوا اور معلوم ہوا کہ زمین نہیں بلکہ سورج مرکز ہے اور اپنی جگہ ساکن ہے باقی سیارے سورج کے گرد گھومتے ہیں تو الحادی نظریہ رکھنے والوں اور اسلام دشمنوں نے نعرہ لگانا شروع کیا کہ جدید حقائق کے سامنے قرآن کا نظریہ باطل ثابت ہوا کیونکہ جدید انکشافات سے معلوم ہوا کہ سورج مرکز ہے اور باقی سیارے اس کے گرد گھومتے ہیں جبکہ قرآن کہتا ہے: وَ الشَّمۡسُ تَجۡرِیۡ سورج گھومتا ہے لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ سورج مرکز ہونے کے باوجود اپنی فیملی کے افراد (سیاروں) کے ساتھ ۲۰ کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے حرکت کر رہا ہے اور تَجۡرِیۡ ایک سمت کی طرف رواں دواں ہونے کے معنوں میں ہے۔ اس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ کرۂ ارض کے رہنے والے فضائے عالم میں محو سفر ہیں اور سال میں چھ سو ملین کلومیٹر کی رفتار سے ہم اپنے سورج کے ساتھ اپنی نامعلوم منزل و مستقر کی طرف جا رہے ہیں۔

لِمُسۡتَقَرٍّ لَّہَا میں لام بمعنی الی ہو سکتا ہے۔ یہ سورج اپنے ٹھکانے یعنی اپنے خاتمے تک حرکت کرتا رہے گا۔ چنانچہ سورج سے چار ملین ٹن انرجی فی سیکنڈ کم ہو رہی ہے تاہم یہ سورج کئی ملین سال تک زندہ رہ سکتا ہے۔

ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی ایک قرائت لا مستقرلھا ہے۔ یعنی سورج جاری ہے۔ اس کا کوئی مستقر نہیں ہے۔ اپنے خاتمے تک حرکت کرتا رہے گا۔

حقیقت امر یہ ہے کہ مستقر کا صحیح مفہوم انسان اس وقت سمجھ سکتا ہے جب انسان کے پاس کائنات کے بارے میں ناقابل تبدیل علم موجود ہو جبکہ انسانی علم ہر زمانے میں بدلتا رہتا ہے اور انسان کو جو حاصل ہے وہ علم نہیں، اکثر مفروضہ ہے اور یہ مفروضہ قابل تبدیل ہے۔

۲۔ ذٰلِکَ تَقۡدِیۡرُ الۡعَزِیۡزِ الۡعَلِیۡمِ: یہ مقدرات اس ذات کے ترتیب دادہ ہیں جو قوت و طاقت کے اعتبار سے ہر قوت پر غالب آنے والی ہے اور علم کے اعتبار سے فوق کل ذی علم علیم ہے۔ وہی ذات اس بات سے باخبر ہے کہ ہمیں کہاں لے جایا جا رہا ہے۔

اہم نکات

۱۔ ہم ایک نامعلوم منزل کی طرف محو پرواز ہیں: وَالشَّمۡسُ تَجۡرِیۡ ....

۲۔ مقدرات عالم کا راز ابھی پردۂ خفا میں ہے: ذٰلِکَ تَقۡدِیۡرُ الۡعَزِیۡزِ الۡعَلِیۡمِ ۔

وَالۡقَمَرَ قَدَّرۡنٰہُ مَنَازِلَ حَتّٰی عَادَ کَالۡعُرۡجُوۡنِ الۡقَدِیۡمِ ﴿۳۹﴾

۳۹۔اور چاند کے لیے ہم نے منزلیں مقرر کی ہیں یہاں تک کہ وہ کھجور کی پرانی شاخ کی طرح لوٹ جاتا ہے۔

تفسیر آیات

چاند کے گھٹنے اور بڑھنے کی منازل صفحۂ آسمان پر ہر ایک کو نظر آنے والی ایک قدرتی تقویم ہے۔ یہ تقویم اربوں سال سے جاری ہے اور ان منزلوں میں کبھی ایک سیکنڈ کے لیے فرق نہیں آیا۔

قَدَّرۡنٰہُ: اللہ تعالیٰ کی تکوینی تقدیر میں کوئی تبدیلی نہیں آتی اور اللہ کے ضابطہ تخلیق میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا۔ چنانچہ چاند پہلی تاریخ کو ہلال، چودھویں کو بدر کامل ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد گھٹنا شروع ہوتا ہے۔ آخر میں پھر ہلال کی شکل میں واپس آ جاتا ہے جسے اللہ نے کھجور کی پرانی شاخ کے ساتھ تشبیہ دی کہ ہلال جب پہلی تاریخ نمودار ہوتا ہے تو چمک دمک کے ساتھ اور یہی ہلال مہینے کے آخری دنوں میں زرد رنگ کا بے رونق ہو جاتا ہے، جیسے کھجور کی خشک ٹہنی۔

اہم نکات

۱۔ صفحہ آسمان پر چاند اللہ تعالیٰ کی تدبیر کی ایک اہم نشانی ہے۔

لَا الشَّمۡسُ یَنۡۢبَغِیۡ لَہَاۤ اَنۡ تُدۡرِکَ الۡقَمَرَ وَ لَا الَّیۡلُ سَابِقُ النَّہَارِ ؕ وَ کُلٌّ فِیۡ فَلَکٍ یَّسۡبَحُوۡنَ ﴿۴۰﴾

۴۰۔ نہ سورج کے لیے سزاوار ہے کہ وہ چاند کو پکڑ لے اور نہ ہی رات دن پر سبقت لے سکتی ہے اور وہ سب ایک ایک مدار میں تیر رہے ہیں۔

تشریح کلمات

یَّسۡبَحُوۡنَ: (س ب ح) السباحۃ پانی میں تیرنے کو کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ لَا الشَّمۡسُ یَنۡۢبَغِیۡ: سورج اور چاند کے مدار جدا ہیں۔ ہر ایک کو اپنے مدار میں پابند رکھا

گیا ہے۔ نہ سورج چاند کے مدار میں آ سکتا ہے، نہ ہی چاند سورج کے مدار میں داخل ہو سکتا ہے۔ چاند زمین کے گرد ایک مختصر مدار میں گھومتا ہے جب کہ سورج اپنے ایک وسیع مدار میں گھوم رہا ہے۔ لہٰذا سورج اور چاند کے مدار میں بہت زیادہ فرق ہے۔ اس لیے فرمایا: سورج کے لیے سزاوار نہیں کہ وہ اپنے تابع سیارات میں سے ایک سیارے (زمین) کے تابع چاند کے مدار میں آ جائے۔ یعنی اپنے تابع کے تابع کے مدار میں آ جائے۔ اسی لیے فرمایا: سورج کے لیے سزاوار نہیں ہے۔ لہٰذا نظام کائنات میں سورج اور چاند دونوں کے لیے ممکن نہیں ہے کہ دوسرے کے مدار میں آ جائیں کہ سورج کے طلوع کے موقع پر چاند اور چاند کے طلوع کے موقع پر سورج نکل آئے۔

۲۔ وَلَا الَّیۡلُ سَابِقُ النَّہَارِ: نظام کائنات میں سورج اور چاند دونوں کے لیے ممکن نہیں کہ دوسرے کے مدار میں آ جائیں اور نہ ہی ایسا ممکن ہے کہ دن کی مقررہ مدت ختم ہونے سے پہلے یا دن کے آنے کے مقررہ وقت سے پہلے رات آ جائے۔ اربوں سال سے دن اور رات اپنے اپنے مقررہ وقت پر آ رہے ہیں۔ یعنی شب و روز کا آنا جانا ایک دقیق حساب کے مطابق ہے۔ اس میں کروڑوں سال میں ایک سیکنڈ کا فرق نہیں آ سکتا۔ جب فرق آئے گا تو یہ نظام درہم برہم ہو جائے گا:

فَاِذَا بَرِقَ الۡبَصَرُ ۙ﴿۷﴾ وَ خَسَفَ الۡقَمَرُ ۙ﴿۸﴾ وَ جُمِعَ الشَّمۡسُ وَ الۡقَمَرُ ۙ﴿۹﴾ یَقُوۡلُ الۡاِنۡسَانُ یَوۡمَئِذٍ اَیۡنَ الۡمَفَرُّ ﴿۱۰﴾[1]	۷۔ پس جب آنکھیں پتھرا جائیں گی، اور چاند بے نور ہو جائے گا، اور سورج اور چاند ملا دیے جائیں گے تو انسان اس دن کہے گا: بھاگ کر کہاں جاؤں؟

یہ محکم نظام ایک نظم دہندہ پر دلالت کرتا ہے۔ کسی غیر اللہ کے بس میں نہیں ہے کہ وہ ایسا نظام اور تدبیر بنائے۔

۳۔ وَ کُلٌّ فِیۡ فَلَکٍ یَّسۡبَحُوۡنَ: یعنی کل من الشمس و القمر فی فلك یسبحون۔ سورج اور چاند میں سے ہر ایک اپنے مدار میں گھوم رہا ہے۔ سورج مرکز ہونے کے باوجود حرکت میں ہے جس طرح چاند حرکت میں ہے۔ اس جملے میں دیگر اجرام کا ذکر نہیں ہے۔ لہٰذا وَ کُلٌّ سے مراد تمام اجرام لینا خلاف ظاہر ہے اگرچہ تمام اجرام حرکت میں ہیں۔

سورج اور چاند کی حرکت کو پانی میں تیرنے کے ساتھ تعبیر کرنا قابل توجہ ہے کہ یہ اجرام فضائے آسمان میں اس طرح گھوم رہے ہیں جس طرح مچھلی پانی میں تیر رہی ہوتی ہے۔

وَ اٰیَۃٌ لَّہُمۡ اَنَّا حَمَلۡنَا ذُرِّیَّتَہُمۡ فِی الۡفُلۡکِ الۡمَشۡحُوۡنِ ﴿۴۱﴾	۴۱۔ اور یہ بھی ان کے لیے ایک نشانی ہے کہ ہم نے ان کی نسل کو بھری ہوئی کشتی میں سوار کیا۔

----

[1] ۷۵ قیامت: ۷ تا ۱۰

تفسیر آیات

اللہ تعالیٰ کی تدبیری نشانیوں میں سے ایک نشانی اور دلائل میں سے ایک دلیل یہ ہے کہ اللہ نے انسان کی نسلوں کو ایک کشتی کے ذریعے محفوظ فرمایا۔ بنا بقول بعض مفسرین اشارہ طوفان نوح کی طرف ہے کہ اس طوفان سے انسانی نسل کو نابودی کا خطرہ تھا۔ ایک بھری کشتی کے ذریعے اسے بچایا۔ اس جگہ حملنا ابائھم کی جگہ ذُرِّیَّتَهُمۡ اس لیے فرمایا کہ اس کشتی کے ذریعے کرۂ ارض پر انسانی نسلوں کا سلسلہ جاری رکھا گیا۔ بعض مفسرین اس سے مراد مطلق کشتی لیتے ہیں چونکہ کشتی اللہ کی آیات تدبیری میں سے ہے لیکن الۡمَشۡحُوۡنِ پہلی تفسیر کے لیے قرینہ بن سکتا ہے۔

وَ خَلَقۡنَا لَهُمۡ مِّنۡ مِّثۡلِهٖ مَا يَرۡكَبُوۡنَ ﴿۴۲﴾	۴۲۔ اور ہم نے ان کے لیے اس (کشتی) جیسی اور (سواریاں) بنائیں جن پر یہ سوار ہوتے ہیں۔

تفسیر آیات

ایک تفسیر یہ کی گئی ہے کہ نوح کی کشتی کے بعد ہم نے اُس جیسی کشتیاں بنائیں۔ پہلی کشتی نوح علیہ السلام نے بنائی تو انسان کو کشتی کے ذریعے دریا عبور کرنے کا طریقہ معلوم ہوا جس سے کشتی سازی شروع ہوگئی۔

دوسری تفسیر یہ کی جاتی ہے کہ مِّثۡلِهٖ سے مراد اونٹ و دیگر سواریاں ہیں جن پر انسان سوار ہو کر مسافات طے کرتا ہے۔ کہتے ہیں مِّنۡ مِّثۡلِهٖ میں وہ تمام ذرائع حمل و نقل آ گئے جنہیں انسان اللہ کی عطا کردہ صلاحیت اور فراست سے ایجاد کرتا ہے۔

وَ اِنۡ نَّشَاۡ نُغۡرِقۡهُمۡ فَلَا صَرِيۡخَ لَهُمۡ وَ لَا هُمۡ يُنۡقَذُوۡنَ ﴿۴۳﴾	۴۳۔ اور اگر ہم چاہیں تو انہیں غرق کر دیں پھر ان کے لیے نہ کوئی فریاد رس ہو گا اور نہ ہی وہ بچائے جائیں گے۔

تفسیر آیات

اگر اللہ کی مشیت یہ ہوتی کہ اس نسل کو غرق کر کے نابود کر دیا جائے تو ان کا کوئی فریاد رس نہ تھا کہ انہیں غرق ہونے سے بچائے لیکن اللہ کی مشیت یہ تھی کہ کرۂ ارض پر انسان کو آباد رکھا جائے اس لیے اللہ تعالیٰ کی رحمت ان کے شامل حال ہوگئی۔

اِلَّا رَحۡمَۃً مِّنَّا وَ مَتَاعًا اِلٰی حِیۡنٍ ﴿۴۴﴾

۴۴۔ مگر ہماری طرف سے رحمت ہے اور (جس سے) انہیں ایک وقت تک متاع (حیات) مل جاتی ہے۔

تفسیر آیات

اس نسل کو آباد رکھنے میں دو باتیں مؤثر تھیں: پہلی بات اللہ کی رحمت ہے جو اس نسل انسانی کے شامل حال رہی اور رحمت الٰہی کی وجہ سے یہ نسل تباہی سے بچ گئی۔ دوسری بات اللہ کا فیصلہ تھا کہ اس نسل کو ایک مدت تک باقی رکھنا ہے۔ اللہ کا یہ فیصلہ اٹل تھا اس لیے اس نسل کو غرق ہونے سے بچا لیا۔

اہم نکات

۱۔ کشتی انسانی نسل کو بچانے کا ذریعہ رہی ہے اور آج سامان زیست مَتَاعًا کا ذریعہ ہے۔

وَ اِذَا قِیۡلَ لَہُمُ اتَّقُوۡا مَا بَیۡنَ اَیۡدِیۡکُمۡ وَ مَا خَلۡفَکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ ﴿۴۵﴾

۴۵۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس (گناہ) سے بچو جو تمہارے سامنے ہے اور اس (عذاب) سے جو تمہارے پیچھے آنے والا ہے شاید تم پر رحم کیا جائے۔

تفسیر آیات

جب ان مشرکین سے کہا جاتا ہے کہ تم جس جرم کے مرتکب ہو رہے ہو اس کا مکافاتِ عمل دنیا میں دیکھنے والے ہو اور آخرت میں تو دائمی عذاب تمہارے انتظار میں ہے، اس سامنے آنے والے اور آخرت کے دائمی عذاب سے بچنے کا سامان کرو، اس طرح تم رحمت الٰہی کے اہل بن جاؤ گے اور یہ عذاب تم سے ٹل جائے گا تو وہ اس نصیحت کو قبول کرنے کی جگہ اللہ کی طرف سے آنے والی دلیلوں اور نشانیوں کو نظر انداز کرتے ہیں۔

وَ مَا تَاۡتِیۡہِمۡ مِّنۡ اٰیَۃٍ مِّنۡ اٰیٰتِ رَبِّہِمۡ اِلَّا کَانُوۡا عَنۡہَا مُعۡرِضِیۡنَ ﴿۴۶﴾

۴۶۔ اور ان کے رب کی نشانیوں میں سے جو بھی نشانی ان کے پاس آتی ہے وہ اس سے منہ موڑ لیتے ہیں۔

تفسیر آیات

ان مشرکین کے سامنے اللہ کی وحدانیت اور عدم شریک کے بارے میں جو دلائل و معجزات پیش کیے گئے ان سب کو ان لوگوں نے ٹھکرا دیا۔

وَ اِذَا قِیۡلَ لَہُمۡ اَنۡفِقُوۡا مِمَّا رَزَقَکُمُ اللّٰہُ ۙ قَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنُطۡعِمُ مَنۡ لَّوۡ یَشَآءُ اللّٰہُ اَطۡعَمَہٗۤ ٭ۖ اِنۡ اَنۡتُمۡ اِلَّا فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۴۷﴾

۴۷۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو رزق تمہیں اللہ نے عنایت کیا ہے اس سے کچھ (راہ خدا میں) خرچ کرو تو کفار مومنین سے کہتے ہیں: کیا ہم اسے کھلائیں جسے اگر اللہ چاہتا تو خود کھلا دیتا؟ تم تو بس صریح گمراہی میں مبتلا ہو۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اِذَا قِیۡلَ لَہُمۡ اَنۡفِقُوۡا: جب ان مشرکین سے کہا جاتا ہے ان غریبوں کو کچھ دے دو۔ کہنے والے کا ذکر نہیں ہے۔ ممکن ہے انسانی ہمدردی کی بنیاد پر کچھ باضمیر لوگوں نے یہ بات کہی ہو۔ بہرحال مشرکین میں سے متمول لوگوں سے کہا گیا ان مسلمان فقیروں کو کچھ دے دو تو ان کا یہ جاہلانہ جواب تھا:

۲۔ اَنُطۡعِمُ مَنۡ لَّوۡ یَشَآءُ اللّٰہُ اَطۡعَمَہٗۤ: ہم اسے کیوں کھلائیں جسے اللہ چاہتا تو کھلا دیتا۔ اس کا مطلب یہ کہنا ہے کہ جسے اللہ نے نہیں کھلایا ہم اسے کیوں کھلائیں؟

مشرکین ہمیشہ اپنے موقف کے جواز کے لیے خلقت اور نظام شریعت میں خلط کرتے ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں: لو شاء اللّٰہ ما اشرکنا۔ اگر اللہ چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے۔ ہم سے شرک صادر ہونا دلیل ہے اللہ نے شرک کو چاہا ہے۔ اسی طرح اگر اللہ چاہتا تو یہ فقیر نہ ہوتے۔ اس کا فقیر ہونا دلیل ہے اللہ نے اسے چاہا ہے۔ ہم اللہ کی مشیت کے خلاف انہیں مال کیوں دیں؟ جس طرح شرک ترک کرنے کا حکم اللہ کی مرضی کے خلاف ہے اسی طرح غریبوں پر خرچ کرنے کا حکم اللہ کی مرضی کے خلاف ہے۔

جواب یہ ہے: انسان کا عمل اس کی خود مختاری کے تحت وجود میں آتا ہے، نہ اللہ کی مرضی کے مطابق۔ امیر و فقیر اسباب و علل کے تحت وجود میں آتے ہیں، نہ اللہ کی مرضی کے مطابق۔

اللہ خود مختاری کے تحت شرک ترک کرنے کا حکم دیتا ہے اور علل و اسباب کے مارے غریبوں کی کمک کرنے کا حکم دیتا ہے۔

۳۔ اِنۡ اَنۡتُمۡ اِلَّا فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ: بعض کے نزدیک یہ جملہ مشرکین کا ہے کہ وہ مومنین کو گمراہ سمجھتے

ہیں۔ دوسرے بعض کے نزدیک یہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے مشرکین سے۔ سیاق کلام کے مطابق پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔

اہم نکات

۱۔ دولت مند اپنی ناجائز دولت کو فضل ربی سمجھتا ہے اور غریبوں کو اس سے محروم۔

وَیَقُوۡلُوۡنَ مَتٰی ہٰذَا الۡوَعۡدُ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۴۸﴾

۴۸۔ اور وہ کہتے ہیں: اگر تم سچے ہو (تو بتاؤ) یہ وعدہ (قیامت) کب (پورا) ہو گا؟

مَا یَنۡظُرُوۡنَ اِلَّا صَیۡحَۃً وَّاحِدَۃً تَاۡخُذُہُمۡ وَ ہُمۡ یَخِصِّمُوۡنَ ﴿۴۹﴾

۴۹۔ (درحقیقت) یہ ایک ایسی چیخ کے منتظر ہیں جو انہیں اس حالت میں گرفت میں لے گی جب یہ لوگ آپس میں جھگڑ رہے ہوں گے۔

فَلَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ تَوۡصِیَۃً وَّ لَاۤ اِلٰۤی اَہۡلِہِمۡ یَرۡجِعُوۡنَ ﴿۵۰﴾

۵۰۔ پھر نہ تو وہ وصیت کر پائیں گے اور نہ ہی اپنے گھر والوں کی طرف واپس جا سکیں گے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَیَقُوۡلُوۡنَ مَتٰی ہٰذَا الۡوَعۡدُ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت میں حیات بعد الموت اور قیامت کو بنیادی اہمیت حاصل ہونے کی وجہ سے منکرین قیامت مشرکین تمسخر کیا کرتے تھے کہ جس قیامت سے ہمیں ڈراتے ہو وہ کب آنے والی ہے؟ جب قیامت کے دن کا تعین نہیں ہوتا تھا تو وہ اسے دلیل بناتے تھے کہ قیامت کا تصور ایک غلط واہمہ ہے ورنہ اس کے وقت کا تعین ہوتا حالانکہ وقت کا عدم تعین اس کے عدم وقوع کی دلیل نہیں ہے۔ انسان کو اپنی موت پر یقین ہے لیکن موت کے وقت کا تعین نہیں ہے تو کیا یہ عدم موت کی دلیل ہے؟

۲۔ مَا یَنۡظُرُوۡنَ اِلَّا صَیۡحَۃً وَّاحِدَۃً: قیامت ایسی نہیں ہو گی کہ تدریجاً آئے بلکہ یہ ایسے وقت میں آئے گی جب لوگ اپنے دنیوی اُمور میں الجھ رہے ہوں گے۔ اپنی محفلوں میں بیٹھ کر ادھر اُدھر کی باتیں کر رہے ہوں گے چونکہ قیامت موجودہ نظامِ کائنات کے خاتمے کا نام ہے اور یہ دفعتاً میں وقوع پذیر ہو گی:

وَمَاۤ اَمۡرُ السَّاعَۃِ اِلَّا کَلَمۡحِ الۡبَصَرِ اَوۡ ہُوَ اَقۡرَبُ ...[۱]

اور قیامت کا معاملہ تو ایسا ہے جیسے آنکھ کا جھپکنا بلکہ اس سے بھی قریب تر۔

---

[۱] ۱۶ النحل: ۷۷

صَيۡحَةً وَّاحِدَةً ایک دھماکہ ہوگا۔ پہلا صور پھونکنے کی وجہ سے پوری کائنات میں اس کی زور دار آواز گونجے گی جس سے ہر ذی روح موت کی آغوش میں چلائے گا۔

۳۔ فَلَا يَسۡتَطِيۡعُوۡنَ تَوۡصِيَةً: اس صور کے پھونکنے کے بعد ایک ہی لمحے میں قیامت برپا ہوگی۔ کوئی کسی کو وصیت نہیں کر سکے گا۔ وصیت کس کو کرے گا؟ کوئی پیچھے زندہ نہیں بچے گا۔

۴۔ وَّلَاۤ اِلٰٓی اَهۡلِهِمۡ يَرۡجِعُوۡنَ: اگر وہ اپنے گھر سے کچھ فاصلے پر ہوں گے تو اپنے گھر والوں کے پاس واپس جانے کی فرصت نہیں پائیں گے۔

اہم نکات

۱۔ قیامت کس گھڑی برپا ہوگی؟ صرف اللہ جانتا ہے۔

۲۔ قیامت ایک لمحے میں ایک صور پھونکنے پر برپا ہوگی۔

وَنُفِخَ فِى الصُّوۡرِ فَاِذَا هُمۡ مِّنَ الۡاَجۡدَاثِ اِلٰى رَبِّهِمۡ يَنۡسِلُوۡنَ ﴿۵۱﴾

۵۱۔ اور جب صور میں پھونک ماری جائے گی تو وہ اپنی قبروں سے اپنے رب کی طرف دوڑ پڑیں گے۔

تشریح کلمات

الۡاَجۡدَاثِ: (ج د ث) جدث کی جمع۔ قبر کے معنوں میں ہے۔

يَنۡسِلُوۡنَ: (ن س ل) نَسَلَ تیزی کے ساتھ دوڑنے کو کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَنُفِخَ فِى الصُّوۡرِ: یہ نفخة الثانیة دوسرا صور ہے۔ اس صور کے پھونکنے سے سب زندہ ہو جائیں گے۔ صور ایک آواز ہے جو تمام مردوں کے اعماق اور گہرائیوں میں سرایت کر جائے گی جس سے سب مردے بیدار ہو جائیں گے۔ جس طرح حضرت آدم علیہ السلام کے جسم میں روح پھونکنے کے لیے بھی یہی لفظ استعمال ہوا ہے:

فَاِذَا سَوَّيۡتُهٗ وَنَفَخۡتُ فِيۡهِ مِنۡ رُّوۡحِىۡ ...[1]

پھر جب میں اس کی تخلیق مکمل کر لوں اور اس میں اپنی روح میں سے پھونک دوں۔

لہٰذا نفخ ایجاد حیات کا ایک خالقانہ عمل ہے جس کی حقیقت سے انسان واقف نہیں ہے۔ البتہ سلب حیاة کے لیے بھی یہی لفظ استعمال ہوا ہے۔ لہٰذا ایجاد حیات اور سلب حیات دونوں کے لیے ایک لفظ

---

[1] ۱۵ حجر: ۲۹

استعمال ہوا ہے۔ فرق ارادۂ الٰہی کا ہے۔ اس سے بیشتر اس کی حقیقت سے بشر آگاہ نہیں ہے۔

نفخۂ اولیٰ اور نفخۂ ثانیہ کے درمیان کتنی مدت کا فاصلہ ہوگا؟ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ تفسیر صافی کی ایک روایت میں تو یہ فاصلہ تصور سے بھی زیادہ بتایا گیا ہے۔

۲۔ فَاِذَا هُمۡ مِّنَ الۡاَجۡدَاثِ اِلٰی رَبِّهِمۡ یَنۡسِلُوۡنَ: نفخ صور کے نتیجے میں جیسے ہی ان میں زندگی آ جائے گی، اللہ کی بارگاہ میں حساب دینے اور اپنی ابدی قسمت کا فیصلہ سننے کے لیے دوڑ پڑیں گے۔ یہ وہ لمحہ ہوگا جس میں اللہ کی حکومت سے فرار کا کوئی راستہ نہیں ہوگا لہٰذا خود اللہ کی طرف بھاگنے پر مجبور ہوں گے۔ وَ لَا مُفَرَّ مِنْكَ اِلَّا اِلَيْكَ۔[1] (اے اللہ) تجھ سے فرار کا کوئی راستہ نہیں مگر یہ کہ خود تیری طرف بھاگے۔

اہم نکات

۱۔ قبروں سے اٹھتے ہی اللہ کی طرف بھاگنا پڑے گا: اِلٰی رَبِّهِمۡ یَنۡسِلُوۡنَ۔

۲۔ مومن کو وہ دن یاد رکھنا چاہیے جس میں اللہ سے نہیں، اللہ کی طرف بھاگنا پڑے گا۔

قَالُوۡا یٰوَیۡلَنَا مَنۡۢ بَعَثَنَا مِنۡ مَّرۡقَدِنَا ؐ هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحۡمٰنُ وَ صَدَقَ الۡمُرۡسَلُوۡنَ ﴿۵۲﴾

۵۲۔ کہیں گے: ہائے ہماری تباہی! ہماری خوابگاہوں سے ہمیں کس نے اٹھایا؟ یہ وہی بات ہے جس کا خدائے رحمٰن نے وعدہ کیا تھا اور پیغمبروں نے سچ کہا تھا۔

تفسیر آیات

۱۔ قَالُوۡا یٰوَیۡلَنَا: ویل تباہی اور رسوائی کے معنوں میں ہے۔ جب منکرین قیامت قبروں سے اٹھائے جائیں گے تو اس دن کو اپنے سامنے دیکھ لیں گے جسے دنیا میں جھٹلاتے رہے ہیں اور بے ساختہ کہہ اٹھیں گے: یٰوَیۡلَنَا ہائے ہماری رسوائی۔

۲۔ مَنۡۢ بَعَثَنَا: ہمیں کس نے اٹھایا؟ مارے دہشت کے زندہ ہونے کے بعد ابتدائی لمحوں میں یہ سوال ذہنوں میں آئے گا کہ ہمیں کس نے قبروں سے اٹھایا ہے؟

۳۔ مِنۡ مَّرۡقَدِنَا: ہماری خوابگاہوں سے ہمیں کس نے اٹھایا؟ ممکن ہے قیامت کی ہولناک صورت حال کے مقابلے میں قبر کو خوابگاہ سے تعبیر کیا گیا ہو کیونکہ کافر قبر، عالم برزخ میں بھی عذاب میں مبتلا ہوتا ہے۔ بعض کے بقول دونوں صور پھونکنے کے درمیانی وقفے میں یہ لوگ عالم خواب میں ہوں گے۔ بعض لوگوں کے لیے عالم برزخ میں نیند کی حالت طاری رہے گی۔ چنانچہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

---

[1] الفقیہ ۱: ۳۰۳ (حدیث)

وَمَا بَیْنَ الْمَوْتِ وَ الْبَعْثِ اِلَّا کَنَوْمَۃٍ نِمْتَھَا ثُمَّ اسْتَیْقَظْتَ مِنْھَا...۔[1] موت اور قیامت کی درمیانی مدت نیند کی مانند ہوگی جس کے بعد تو بیدار ہو جائے گا۔

حیات برزخی کی مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ المؤمنون آیت ۱۰۰۔

۴۔ ھٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ: ہمیں کس نے اٹھایا کے جواب میں فرشتے ان سے کہیں گے یا خود انہیں علم ہو جائے گا: یہ وہی دن ہے جس کا خدائے رحمٰن نے وعدہ کیا تھا۔

یہ دن اللہ نے اپنے رحمتوں سے نوازنے کے لیے مقرر کیا تھا، اس لیے رحمٰن سے تعبیر کیا مگر کافروں نے اس رحمت کا انکار کر کے اپنے آپ کو اس سے دور کر لیا۔

اہم نکات

۱۔ قبروں سے اٹھنے کے لمحات کو فزع اکبر کہتے ہیں۔

۲۔ قیامت کی ہولناکی کے مقابلے میں برزخ کی زندگی خواب کی مانند لگے گی۔

اِنْ کَانَتْ اِلَّا صَیْحَۃً وَّاحِدَۃً فَاِذَا ھُمْ جَمِیْعٌ لَّدَیْنَا مُحْضَرُوْنَ ﴿۵۳﴾

۵۳۔ وہ تو صرف ایک چیخ ہوگی پھر سب کے سب ہمارے سامنے حاضر کیے جائیں گے۔

تفسیر آیات

قیام قیامت صرف ایک زور دار آواز سے ہوگا اور اسی وقت اللہ کے حضور پیش ہونا ہوگا: لَّدَیْنَا ہمارے سامنے کی تعبیر سے ظاہر ہے کہ حساب براہ راست اللہ تعالیٰ خود لے گا اور ہر شخص کو اللہ کے سامنے جوابدہی کا سامنا کرنا ہے۔

فَالْیَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَیْـًٔا وَّلَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۵۴﴾

۵۴۔ اس روز کسی پر کچھ بھی ظلم نہیں کیا جائے گا اور تمہیں بس وہی بدلہ دیا جائے گا جیسا تم عمل کرتے رہے ہو۔

تفسیر آیات

۱۔ فَالْیَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ: آج کی اس عدالت گاہ میں کسی پر شَیْـًٔا کسی قسم کا ظلم نہ ہوگا چونکہ حساب لینے والی ذات وہ ہے جو کسی چیز کی محتاج نہیں ہے کہ ظلم کے ذریعے اسے حاصل کیا جائے۔

۲۔ وَّلَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ: دوسری بات عدم ظلم کی یہ ہے کہ اس عدالت میں

---

[1] اصول الکافی ۲: ۱۳۴

ثواب و عقاب خود انسان کا اپنا عمل ہوگا۔ عمل سے ہٹ کر کوئی فیصلہ ہونا ہوتا تو ظلم کا سوال پیدا ہو سکتا ہے۔ چونکہ انسان کا عمل اگر اچھا ہے تو وہ اس کا ساتھ نہیں چھوڑتا اور اگر برا ہے تو وہ بھی اس کی جان نہیں چھوڑتا۔

اہم نکات

۱۔ ہر ایک کو خود اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہے: لَّدَیۡنَا مُحۡضَرُوۡنَ۔

۲۔ انسان کا اپنا عمل اس کے حق میں یا خلاف فیصلہ دے گا۔

اِنَّ اَصۡحٰبَ الۡجَنَّۃِ الۡیَوۡمَ فِیۡ شُغُلٍ فٰکِہُوۡنَ ﴿۵۵﴾

۵۵۔ آج اہل جنت یقیناً کیف و سرور کے ساتھ مشغلے میں ہوں گے۔

تشریح کلمات

شُغُلٍ: (ش غ ل) ایسی مصروفیت جس کی وجہ سے دوسرے کاموں کی طرف توجہ نہ دی جا سکے۔

فٰکِہُوۡنَ: (ف ک ہ) الفکاھۃ خوش طبعی کی باتیں۔ خوش گپی۔

تفسیر آیات

۱۔ اس دن اہل جنت شُغُلٍ فٰکِہُوۡنَ مصروفیت میں ہوں گے۔ نعمتوں میں مشغول ہوں گے۔ ہر چیز سے بے پرواہ اور بے فکر ہو کر نہایت آسودگی کے ساتھ کیف و سرور فٰکِہُوۡنَ میں ہوں گے۔

یہ حالت اللہ کی بارگاہ میں حاضری دینے اور حساب سے فارغ ہونے کے بعد کی ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

وَّ یَنۡقَلِبُ اِلٰۤی اَہۡلِہٖ مَسۡرُوۡرًا ؕ [1]	اور وہ اپنے گھر والوں کی طرف خوشی سے پلٹے گا۔

مومن سے ایک آسان حساب لیا جائے گا اور حساب سے فارغ ہونے کے بعد وہ اپنے خاندان کے پاس خوشی سے واپس جائے گا۔

۲۔ فٰکِہُوۡنَ: مزے لینا۔ ہنسی مزاح میں مشغول ہونا:

فٰکِہِیۡنَ بِمَاۤ اٰتٰہُمۡ رَبُّہُمۡ ... [2]	ان کے رب نے جو کچھ انہیں عطا کیا ہے اس پر وہ خوش ہوں گے۔

ہُمۡ وَ اَزۡوَاجُہُمۡ فِیۡ ظِلٰلٍ عَلَی الۡاَرَآئِکِ مُتَّکِـُٔوۡنَ ﴿۵۶﴾

۵۶۔ وہ اور ان کی ازواج سایوں میں مسندوں پر تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے۔

---

[1] ۸۴ انشقاق: ۹ [2] ۵۲ طور: ۱۸

تفسیر آیات

۱۔ هُمۡ وَاَزۡوَاجُهُمۡ: ازواج سے مراد ممکن ہے وہ ازواج ہوں جو جنت میں حورالعین کی شکل میں ان کے ساتھ ہوں گی اور دنیا میں جو ازواج ہوں گی ان کا ان کے ساتھ جنت میں ہونا ضروری نہیں ہے۔ چنانچہ نوح اور لوط علیہا السلام کی بیویوں کے بارے میں قرآن میں صراحت سے فرمایا:

كَانَتَا تَحۡتَ عَبۡدَيۡنِ مِنۡ عِبَادِنَا صَالِحَيۡنِ فَخَانَتٰهُمَا...[1] یہ دونوں ہمارے بندوں میں سے دو صالح بندوں کی زوجیت میں تھیں مگر ان دونوں نے اپنے شوہروں سے خیانت کی۔

۲۔ فِىۡ ظِلٰلٍ: یہ اپنی ازواج کے ساتھ زیر سایہ ہوں گے۔ سایہ سے یہ مراد ہو سکتا ہے کہ وہ کسی قسم کی گرمی میں نہیں ہوں گے۔ سایہ سے مراد ہماری دنیا والا سایہ نہیں ہو سکتا چونکہ جنت میں دھوپ کی تپش نہ ہوگی کہ سایہ کی ضرورت پڑے:

لَا يَرَوۡنَ فِيۡهَا شَمۡسًا وَّلَا زَمۡهَرِيۡرًا ۝[2] جس میں نہ دھوپ کی گرمی دیکھنے کا اتفاق ہو گا اور نہ سردی کی شدت۔

۳۔ عَلَى الۡاَرَآئِكِ مُتَّكِــُٔوۡنَ: مسندوں پر تکیہ لگائے بیٹھنا جنت کی آسائش کی طرف ایک ایسا اشارہ ہے جو ہمارے لیے قابل فہم ہے ورنہ جنت کی زندگی کا دنیاوی آسائش کے ساتھ موازنہ نہیں ہو سکتا۔

لَهُمۡ فِيۡهَا فَاكِهَةٌ وَّلَهُمۡ مَّا يَدَّعُوۡنَ ۝۵۷

۵۷۔ وہاں ان کے لیے میوے اور ان کی مطلوبہ چیزیں موجود ہوں گی۔

تفسیر آیات

۱۔ لَهُمۡ فِيۡهَا فَاكِهَةٌ: جنت میں ان کے لیے میوے ہوں گے۔ ان میووں کا دوسری آیات میں ذکر آیا ہے۔ جب قرآن جنت کی نعمتوں کا نام لے کر ذکر فرماتا ہے تو عیناً وہی نہیں ہوں گی جو دنیا میں ہیں:

وَاُتُوۡا بِهٖ مُتَشَابِهًا...[3] حالانکہ انہیں ملتا جلتا دیا گیا ہے۔

۲۔ وَّلَهُمۡ مَّا يَدَّعُوۡنَ: ان کے لیے ان کی مطلوبہ چیزیں موجود ہوں گی۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ دنیوی زندگی اور جنت کی زندگی میں بنیادی فرق جو ہمارے لیے قابل فہم ہے وہ یہ ہے کہ دنیوی زندگی میں انسان اپنی مطلوبہ چیزوں کو وسائل و ذرائع، علل و اسباب کے ذریعے حاصل کرتا ہے۔ یہ چیزیں فراہم

---

[1] ۶۶ تحریم: ۱۰ [2] ۷۶ انسان: ۱۳ [3] ۲ بقرہ: ۲۵

ہونے پر مطلوبہ مقصد پورا ہو جاتا ہے اور فراہم نہ ہونے پر انسان کی خواہش پوری نہیں ہوتی۔

مگر جنت کی زندگی میں خواہشات صرف ارادے سے پوری ہو جاتی ہیں: وَّلَهُمۡ مَّا يَدَّعُوۡنَ ان کے لیے وہ سب فراہم ہوگا جو وہ طلب کریں گے:

لَهُمۡ مَّا يَشَآءُوۡنَ فِيۡهَا وَلَدَيۡنَا مَزِيۡدٌ ○ [1] وہاں ان کے لیے جو وہ چاہیں گے حاضر ہے اور ہمارے پاس مزید بھی ہے۔

وَلَكُمۡ فِيۡهَا مَا تَشۡتَهِىۡۤ اَنۡفُسُكُمۡ وَلَكُمۡ فِيۡهَا مَا تَدَّعُوۡنَ ○ [2] اور یہاں تمہارے لیے تمہاری من پسند چیزیں موجود ہیں اور جو چیز تم طلب کرو گے وہ تمہارے لیے اس میں موجود ہو گی۔

اہم نکات

۱۔ اہل جنت کا ارادہ نافذ ہو گا۔

سَلٰمٌ ۟ قَوۡلًا مِّنۡ رَّبٍّ رَّحِيۡمٍ ﴿۵۸﴾ ۵۸۔مہربان رب کی طرف سے سلام کہا جائے گا۔

تفسیر آیات

جنت کی سب سے بڑی نعمت جس سے انسان کیف و سرور کی انتہا کو پہنچ جاتا ہے اللہ کی خوشنودی ہے:

وَ رِضۡوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكۡبَرُ ...[3] اور اللہ کی طرف سے خوشنودی تو ان سب سے بڑھ کر ہے۔

جب جنت والوں کے لیے اللہ کی طرف سے سلام آئے گا تو اہل جنت کے کیف و سرور کی حالت و صفت بیان کی حدود سے خارج ہو گی۔

وَامۡتَازُوا الۡيَوۡمَ اَيُّهَا الۡمُجۡرِمُوۡنَ ﴿۵۹﴾ ۵۹۔ اے مجرمو! آج تم الگ ہو جاؤ۔

اَلَمۡ اَعۡهَدۡ اِلَيۡكُمۡ يٰبَنِىۡۤ اٰدَمَ اَنۡ لَّا تَعۡبُدُوا الشَّيۡطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمۡ عَدُوٌّ مُّبِيۡنٌ ۙ﴿۶۰﴾ ۶۰۔ اے اولاد آدم! کیا ہم نے تم سے عہد نہیں لیا تھا کہ تم شیطان کی پرستش نہ کرنا؟ بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

---

[1] ۵۰ ق: ۳۵ [2] ۴۱ حم سجدہ: ۳۱ [3] ۹ توبۃ: ۷۲

وَّ اَنِ اعۡبُدُوۡنِیۡ ؕ ہٰذَا صِرَاطٌ مُّسۡتَقِیۡمٌ ﴿۶۱﴾ ۶۱۔ اور یہ کہ میری بندگی کرنا، یہی سیدھا راستہ ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَامۡتَازُوا الۡیَوۡمَ اَیُّہَا الۡمُجۡرِمُوۡنَ: دنیا میں تم مؤمنین کی صفوں میں داخل ہو کر اپنے کفر و نفاق پر پردہ ڈال سکتے تھے، لیکن آج تمہیں الگ ہونا پڑے گا:

وَ یَوۡمَ تَقُوۡمُ السَّاعَۃُ یَوۡمَئِذٍ یَّتَفَرَّقُوۡنَ ○[۱] اور جس دن قیامت برپا ہو گی اس دن لوگ گروہوں میں تقسیم ہو جائیں گے۔

آج مجرم لوگ جب اہل ایمان سے جدا کیے جائیں گے تو اہانت، حقارت اور مایوسی کی ایک ناقابل وصف و بیان حالت میں پڑے ہوں گے۔

۲۔ اَلَمۡ اَعۡہَدۡ اِلَیۡکُمۡ یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ: اس عہد سے مراد وہ عہد ہو سکتا ہے جو اللہ نے ہر انسان کی فطرت و جبلت میں رکھا ہے۔ جیسا کہ سورۂ شمس آیت ۸ میں فرمایا:

فَاَلۡہَمَہَا فُجُوۡرَہَا وَ تَقۡوٰىہَا ○ پھر اس نفس کو اس کی بدکاری اور اس سے بچنے کی سمجھ دی۔

اور فطرت سے بھٹکنے والوں کو دوبارہ فطرت کی راہ پر لگانے اور اس عہد کی یاد تازہ کرنے کے لیے انبیاء علیہم السلام وقتاً فوقتاً تذکر دیتے رہے۔

یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ لَا یَفۡتِنَنَّکُمُ الشَّیۡطٰنُ کَمَاۤ اَخۡرَجَ اَبَوَیۡکُمۡ مِّنَ الۡجَنَّۃِ ...[۲] اے اولاد آدم! شیطان تمہیں کہیں اس طرح نہ بہکا دے جس طرح تمہارے ماں باپ کو جنت سے نکلوایا۔

شیطان کی عبادت یہ ہے کہ اس کے کہنے پر عمل کیا جائے۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

مَنْ اَصۡغٰی اِلٰی نَاطِقٍ فَقَدْ عَبَدَہٗ۔ فَاِنْ کَانَ النَّاطِقُ عَنِ اللّٰہِ فَقَدْ عَبَدَ اللّٰہَ وَاِن کَانَ النَّاطِقُ عَنْ اِبْلِیسَ فَقَدْ عَبَدَ اِبْلِیسَ۔[۳] جو کسی بولنے والے کی بات کو کان دھر کے سن لے تو اس نے اس کی عبادت کی۔ اگر بولنے والا اللہ کی طرف سے بول رہا ہے تو اللہ کی عبادت ہوئی۔ اور اگر بولنے والا ابلیس کی طرف سے بول رہا ہے تو ابلیس کی عبادت ہو گی۔

۳۔ وَّ اَنِ اعۡبُدُوۡنِیۡ ؕ ہٰذَا صِرَاطٌ مُّسۡتَقِیۡمٌ: تمام غیر اللہ کی اطاعت کو مسترد کر کے صرف اور صرف اللہ کی اطاعت اور اللہ کی وحدانیت کی طرف دعوت دینے والوں کی اطاعت کر کے صرف اللہ کی

---

[۱] ۳۰ روم: ۱۴ [۲] ۷ اعراف: ۲۷ [۳] وسائل الشیعۃ ۱۷: ۱۵۳ اعتقادات صدوق

بندگی، راہ مستقیم ہے جس پر چلنے والے تمام پیچیدگیوں سے آزاد ہوں گے۔

اہم نکات

۱۔ قیامت کے دن مجرموں کو الگ تھلگ دھتکار دیا جائے گا: وَ امۡتَازُوا الۡیَوۡمَ ....۔

۲۔ عہد الٰہی کی پاسداری کرنے والے صراط مستقیم پر ہیں۔

وَ لَقَدۡ اَضَلَّ مِنۡکُمۡ جِبِلًّا کَثِیۡرًا ؕ اَفَلَمۡ تَکُوۡنُوۡا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۶۲﴾

۶۲۔ اور بتحقیق اس نے تم میں سے بہت سی مخلوق کو گمراہ کر دیا ہے تو کیا تم عقل نہیں رکھتے؟

ہٰذِہٖ جَہَنَّمُ الَّتِیۡ کُنۡتُمۡ تُوۡعَدُوۡنَ ﴿۶۳﴾

۶۳۔ یہ وہی جہنم ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔

اِصۡلَوۡہَا الۡیَوۡمَ بِمَا کُنۡتُمۡ تَکۡفُرُوۡنَ ﴿۶۴﴾

۶۴۔ آج اس جہنم میں جھلس جاؤ اس کفر کے بدلے میں جو تم کیا کرتے تھے۔

تشریح کلمات

جِبِلًّا: (ج ب ل) بڑی جماعت۔

اِصۡلَوۡ: (ص ل ی) الصلی آگ میں تپا دینا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ لَقَدۡ اَضَلَّ مِنۡکُمۡ جِبِلًّا کَثِیۡرًا: اس عدو مبین نے تم میں سے ایک خلق کثیر کو گمراہ کر دیا ہے۔ اگر تمہارے پاس چشم عبرت موجود ہے تو گزشتہ گمراہ قوموں کی سیاہ تاریخ تمہارے سامنے ہے کہ اس کی گمراہ کن حربے سے کتنی قومیں صفحۂ ہستی سے مٹ گئیں۔

۲۔ اَفَلَمۡ تَکُوۡنُوۡا تَعۡقِلُوۡنَ: عقل کا تقاضا تو یہ تھا کہ اس تباہ کن دشمن سے اپنے آپ کو بچائے۔ مگر ان لوگوں نے عقل سے کام نہیں لیا اور اسی تباہی کے راستے پر چل پڑے۔

۳۔ ہٰذِہٖ جَہَنَّمُ الَّتِیۡ کُنۡتُمۡ تُوۡعَدُوۡنَ: انہیں جہنم کے سامنے لایا جائے گا اور جب جہنم کی آتش فشانی نظر آئے گی تو ان سے کہا جائے: یہ وہی جہنم ہے جس کے بارے میں تم سے کہا تھا اور تم اس کا انکار کرتے تھے۔

۴۔ اِصۡلَوۡہَا الۡیَوۡمَ بِمَا کُنۡتُمۡ تَکۡفُرُوۡنَ: آج تپ جاؤ اسی آتش میں اور دنیا میں جس کا تم انکار کرتے تھے اس میں جلتے جاؤ۔ اس میں ایک قسم کی اہانت اور طعنہ بھی ہے۔

اہم نکات

۱۔ عقل سے کام لینے والے شیطان کے دام میں نہیں پھنستے: تَعۡقِلُوۡنَ۔

۲۔ منکروں کو عذاب جہنم کے ساتھ نفسیاتی عذاب بھی دیا جائے گا: اِصۡلَوۡہَا الۡیَوۡمَ ....۔

اَلۡیَوۡمَ نَخۡتِمُ عَلٰۤی اَفۡوَاہِہِمۡ وَ تُکَلِّمُنَاۤ اَیۡدِیۡہِمۡ وَ تَشۡہَدُ اَرۡجُلُہُمۡ بِمَا کَانُوۡا یَکۡسِبُوۡنَ ﴿۶۵﴾

۶۵۔ آج ہم ان کے منہ پر مہر لگا دیتے ہیں اور ان کے ہاتھ ہم سے بولیں گے اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے اس کے بارے میں جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اَلۡیَوۡمَ نَخۡتِمُ عَلٰۤی اَفۡوَاہِہِمۡ: جس منہ سے دنیا میں اللہ کی وحدانیت اور روز قیامت کا انکار ہوتا رہا اور جس زبان سے رسول اللہ ﷺ کی تکذیب ہوتی رہی وہ آج بند رہے گی چونکہ یہ منہ، یہ زبان حق اور حقیقت بیان کرنے کی عادی نہیں ہے۔

چنانچہ روایت میں ہے کہ وہ اس دن بھی اپنے گناہوں کا انکار اور جھگڑا کریں گے۔ چنانچہ قرآن نے بھی اس کا ذکر کیا ہے:

ثُمَّ لَمۡ تَکُنۡ فِتۡنَتُہُمۡ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوۡا وَ اللّٰہِ رَبِّنَا مَا کُنَّا مُشۡرِکِیۡنَ ﴿﴾[1]

پھر ان سے اور کوئی عذر بن نہ سکے گا سوائے اس کے کہ وہ کہیں: اپنے رب اللہ کی قسم ہم مشرک نہیں تھے۔

۲۔ تُکَلِّمُنَاۤ اَیۡدِیۡہِمۡ: ان کے ہاتھ ہم سے بات کرنے لگیں گے۔ ہاتھ انسان کا وہ اوزار ہیں جو سب سے زیادہ استعمال ہوتا ہے لہٰذا ممکن ہے کہ ہاتھ کے پاس کرنے کی بہت ساری باتیں ہوں۔ ہاتھ کے تکلم کا موضوع گواہی ہے کہ میرے مالک نے مجھے کن کن جرائم میں استعمال کیا۔

۳۔ وَ تَشۡہَدُ اَرۡجُلُہُمۡ: پاؤں بھی گواہی دیں گے۔ ان جرائم کی جن کے ارتکاب کی طرف چلنے کے لیے پاؤں سے کام لیا گیا۔

اس آیت میں صرف ہاتھ اور پاؤں کا ذکر من باب المثال مذکور ہے۔ دیگر آیات میں باقی اعضاء کا بھی ذکر ہے:

حَتّٰۤی اِذَا مَا جَآءُوۡہَا شَہِدَ عَلَیۡہِمۡ سَمۡعُہُمۡ وَ اَبۡصَارُہُمۡ وَ جُلُوۡدُہُمۡ بِمَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿﴾[2]

یہاں تک کہ جب سب وہاں پہنچ جائیں گے تو ان کے کان اور ان کی آنکھیں اور ان کی کھالیں ان کے خلاف گواہی دیں گی کہ وہ کیا کچھ کرتے رہے ہیں۔

اور سورہ نور آیت ۲۴ میں فرمایا:

---

[1] ۶ انعام: ۲۳　[2] ۴۱ حم سجدہ: ۲۰

یَّوۡمَ تَشۡہَدُ عَلَیۡہِمۡ اَلۡسِنَتُہُمۡ وَ اَیۡدِیۡہِمۡ وَ اَرۡجُلُہُمۡ بِمَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ۝ اس دن ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں ان سب اعمال کی گواہی دیں گے جو یہ کرتے رہے ہیں۔

نَخۡتِمُ عَلٰۤی اَفۡوَاہِہِمۡ: ان کے منہ پر مہر لگا دی جائے گی کہ خود اپنے ارادے سے نہیں بول سکیں گے۔

تَشۡہَدُ عَلَیۡہِمۡ اَلۡسِنَتُہُمۡ وَ اَیۡدِیۡہِمۡ ان کی زبانیں ان کے خلاف گواہی دیں گی اللہ کے حکم و ارادے سے، نہ صاحب زبان کے ارادے سے۔ لہٰذا ان دونوں آیات میں تصادم نہیں ہے۔

رہی یہ بحث ان اعضاء کی گواہی کس صورت میں ہوگی؟ کیا اللہ تعالیٰ ان میں قوت گویائی پیدا کرے گا یا ان کے جرائم انرجی کی شکل میں باقی رہیں گے اور قیامت کے دن ظاہر ہو جائیں گے؟ یہ ہمارے دائرہ علم و بحث سے خارج ہے چونکہ عالم آخرت کے حالات کو عالم دنیا کی روشنی میں سمجھنا ممکن نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ قیامت کے دن مجرم کو اپنے اعضاء پر اختیار نہیں ہوگا۔

۲۔ سب سے سچا گواہ آلۂ جرم ہے۔

وَ لَوۡ نَشَآءُ لَطَمَسۡنَا عَلٰۤی اَعۡیُنِہِمۡ فَاسۡتَبَقُوا الصِّرَاطَ فَاَنّٰی یُبۡصِرُوۡنَ ﴿۶۶﴾ ۶۶۔ اور اگر ہم چاہیں تو ان کی آنکھوں کو مٹا دیں پھر یہ راستے کی طرف لپک بھی جائیں تو کہاں سے راستہ دیکھ سکیں گے؟

وَ لَوۡ نَشَآءُ لَمَسَخۡنٰہُمۡ عَلٰی مَکَانَتِہِمۡ فَمَا اسۡتَطَاعُوۡا مُضِیًّا وَّ لَا یَرۡجِعُوۡنَ ﴿۶۷﴾ ۶۷۔ اور اگر ہم چاہیں تو انہیں ان ہی کی جگہ پر اس طرح مسخ کر دیں کہ نہ آگے جانے کی استطاعت ہوگی اور نہ پیچھے پلٹ سکیں گے۔

تشریح کلمات

لَطَمَسۡنَا: (ط م س) کسی چیز کا نام و نشان مٹا دینا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ لَوۡ نَشَآءُ لَطَمَسۡنَا عَلٰۤی اَعۡیُنِہِمۡ: آخرت کی بات دور کی ہے۔ خود دنیا میں اگر اللہ کی مشیت

میں ہوتا تو تم سے تمہاری بینائی سلب ہو سکتی تھی۔

۲۔ فَاسۡتَبَقُوا الصِّرَاطَ: بینائی سلب ہونے کے بعد وہ اگر صحیح راستہ کی طرف لپک کر شوق سے جانا بھی چاہیں تو ان کو راستہ نظر نہیں آتا۔

استبقوا کے ایک معنی سبقت لے جانا، لپک جانا ہیں۔ دوسرے معنی یہ کیے ہیں: تجاوز کر جانا۔ بینائی نہ ہونے کی وجہ سے وہ راستے سے تجاوز کر جائیں۔ راستہ دیکھ نہیں پاتے۔

لسان العرب نے استبق کا ایک معنی تجاوز کیا ہے۔

۳۔ وَلَوۡ نَشَآءُ لَمَسَخۡنٰہُمۡ عَلٰی مَکَانَتِہِمۡ: اگر اللہ انہیں مسخ کر کے اپنی جگہ پر جامد کر دے تو یہ خود اپنی ذاتی قوت سے کسی قسم کی حرکت پر قادر نہ ہوتے، نہ آگے بڑھ سکتے، نہ واپس اپنے گھر آ سکتے مگر اللہ نے ایسا نہیں کیا۔

تو یہ لوگ از خود نہ بینائی کے مالک ہیں، نہ حرکت و جنبش کے، نہ ہی ان کے معبود ان کو بینائی اور حرکت دے سکتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ انسان کی یہ زندگی ہر لحہ اللہ کی محتاج ہے۔ اگر اللہ ہاتھ اٹھا لے تو یہ خود یا اس کے خود ساختہ معبود نہ بینائی دے سکتے ہیں، نہ حرکت کی قوت۔

وَمَنۡ نُّعَمِّرۡہُ نُنَکِّسۡہُ فِی الۡخَلۡقِ ؕ اَفَلَا یَعۡقِلُوۡنَ ﴿۶۸﴾

۶۸۔ اور جسے ہم لمبی زندگی دیتے ہیں اسے خلقت میں اوندھا کر دیتے ہیں، کیا وہ عقل سے کام نہیں لیتے؟

تشریح کلمات

نُنَکِّسۡہُ: (ن ك س) نکس کے معنی کسی چیز کے الٹا دینے کے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَمَنۡ نُّعَمِّرۡہُ نُنَکِّسۡہُ فِی الۡخَلۡقِ: جسے ہم لمبی عمر دیتے ہیں اس کی جسمانی ساخت کے اعتبار سے پھر ناتوانی کی طرف الٹ دیتے ہیں۔ بڑھاپے میں انسان ناتوانی اور بے بسی میں شیر خوار بچے کی طرح ہو جاتا ہے۔ وہ کھانے پینے چلنے پھرنے میں دوسروں کا محتاج ہو جاتا ہے۔ یہاں تک وہ اپنے بستر پر ہی رفع حاجت کرنے لگتا ہے۔

یہ حقیقت اس جگہ بیان کرنے کی غرض کیا ہے؟ اکثر مفسرین نے لکھا ہے:

اس کی غرض یہ بیان کرنا ہے جب ہم ایک توانا انسان کو ناتوان بنا سکتے ہیں تو تمہاری بینائی ختم کرنا اور تمہیں مسخ کر کے جامد کرنا ہمارے لیے مشکل نہیں ہے۔

دوسری تفسیر مجمع البیان میں بیان فرمائی ہے:

غرض یہ بتانا ہے کہ جب ہم یہ کام کر سکتے ہیں تو اعادۂ حیات کا بھی کام کر سکتے ہیں۔

صاحب تفسیر التحریر و التنویر اس کی یہ تفسیر کرتے ہیں:

جسے مہلت دیتے ہیں اسے ہم مخلوقات میں ذلیل کرتے ہیں۔

وہ نُعَمِّرۡہُ کو مہلت کے معنوں میں لیتے ہیں جیسے اَوَلَمۡ نُعَمِّرۡکُمۡ مَّا یَتَذَکَّرُ فِیۡہِ ...[۱] میں یہ لفظ مہلت کے معنوں میں ہے اور الۡخَلۡقِ مخلوقات کے معنوں میں ہے۔

شاید ان سب میں بہتر تفسیر سابقہ آیات کے ساتھ مربوط کر کے اس طرح کی جائے:

اگر ہم چاہتے تو ان سے ان کی بینائی سلب کر لیتے اور انہیں اپنی جگہ مسخ کر کے جامد کر دیتے تو ایسا کر سکتے تھے لیکن ہم نے اپنی رحمت کی بنا پر ایسا نہیں کیا۔ البتہ ایک کام ہم کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ جسے ہم لمبی عمر دیتے ہیں انہیں اوندھا کر کے الٹ دیتے ہیں۔ ان سے بینائی بھی سلب ہو جاتی ہے اور تقریباً جوانی کی بہ نسبت مسخ ہو جاتے ہیں: لَمَسَخۡنٰہُمۡ عَلٰی مَکَانَتِہِمۡ ۔ اپنی جگہ سے نہ ہل نہیں سکتے ہیں، نہ آگے جا سکتے ہیں، نہ واپس اپنی جگہ آ سکتے ہیں۔

اَفَلَا یَعۡقِلُوۡنَ: کیا وہ عقل سے کام نہیں لیتے کہ ان کی زندگی کے تمام امور ہمارے ہاتھ میں ہیں اور خود بے بس ہیں:

وَ ضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّ نَسِیَ خَلۡقَہٗ ...[۲] — پھر وہ ہمارے لیے مثالیں دینے لگتا ہے اور اپنی خلقت بھول جاتا ہے

وَ مَا عَلَّمۡنٰہُ الشِّعۡرَ وَ مَا یَنۡۢبَغِیۡ لَہٗ ؕ اِنۡ ہُوَ اِلَّا ذِکۡرٌ وَّ قُرۡاٰنٌ مُّبِیۡنٌ ﴿۶۹﴾

۶۹۔اور ہم نے اس (رسول) کو شعر نہیں سکھایا اور نہ ہی یہ اس کے لیے شایان شان ہے، یہ تو بس ایک نصیحت (کی کتاب) اور روشن قرآن ہے۔

لِّیُنۡذِرَ مَنۡ کَانَ حَیًّا وَّ یَحِقَّ الۡقَوۡلُ عَلَی الۡکٰفِرِیۡنَ ﴿۷۰﴾

۷۰۔ تاکہ جو زندہ ہیں انہیں تنبیہ کرے اور کافروں کے خلاف حتمی فیصلہ ہو جائے۔

---

[۱] ۳۵ فاطر: ۳۷ [۲] ۳۶ یس: ۷۸

تفسیر آیات

۱۔ وَمَا عَلَّمۡنٰہُ الشِّعۡرَ: قرآنی تعلیمات کے تین اہم اصولوں توحید و قیامت پر دلیل قائم کرنے کے بعد رسالت کے موضوع کا ذکر ہے۔

رسالت کے منکرین رسول اللہ ﷺ کو کاہن، مجنون اور ساحر بھی کہتے تھے اور شاعر بھی:

وَیَقُوۡلُوۡنَ اَئِنَّا لَتَارِکُوۡۤا اٰلِہَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجۡنُوۡنٍ ؁[1] اور کہتے تھے: کیا ہم ایک دیوانے شاعر کی خاطر اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں؟

اس آیت میں شاعر ہونے کے الزام کی تردید ہے۔ چونکہ اس الزام کا تعلق قرآن سے ہے اور قرآن رسول کریم ﷺ کا معجزہ ہے۔ اہل زبان عرب قرآن سے متاثر ہو کر اسلام میں داخل ہو رہے تھے لہٰذا منکرین کا زیادہ زور اس بات پر تھا کہ قرآن کلام اللہ نہیں بلکہ شاعرانہ کلام ہے۔

اس الزام کی تردید میں فرمایا: یہ قرآن شاعرانہ کلام نہیں ہے۔ اس کا اسلوب شعری نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اللہ کے علاوہ کسی سے کچھ نہیں سیکھا اور اللہ نے اپنے رسول کو شعر سکھایا ہی نہیں ہے۔ کیوں نہیں سکھایا؟

۲۔ وَمَا یَنۡۢبَغِیۡ لَہٗ: چونکہ شاعری انہیں زیب نہیں دیتی اور ان کے شایان شان نہیں ہے۔ اس لیے قرآن اور شعر میں بنیادی فرق ہے۔ قرآن انسانیت کے لیے سب سے اہم ترین حقیقت اور واقع کی نشاندہی اور ابدی سعادت کی ہدایت کرتا ہے جب کہ شعر واقع کی نشاندہی سے دور خلاف واقع تخیلات پر مبنی باتیں کرتا ہے۔ شعر دل نشین ہوتا ہے، واقع بین نہیں ہوتا۔ شعر کے بارے میں مشہور ہے: الشعر اعذبہ اکذبہ۔ شعر میں سب سے میٹھا وہ ہے جو سب سے بڑا جھوٹ ہو۔

چنانچہ یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ امر واقع بیان کرنے کے لیے برھان سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ برھان، یقینیات پر مشتمل ہوتا ہے اور سامعین کو قائل کرنے کے لیے خطاب سے استفادہ کیا جاتا ہے اور خطاب سامعین کے مسلمات پر مشتمل ہوتا ہے۔ لوگوں کے جذبات ابھارنے کے لیے شعر سے استفادہ کیا جاتا ہے اور شعر تخیلات پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس طرح برھان، یقینیات پر، خطاب مسلمات پر اور شعر تخیلیات پر مشتمل ہوتا ہے۔

۳۔ اِنۡ ہُوَ اِلَّا ذِکۡرٌ وَّ قُرۡاٰنٌ مُّبِیۡنٌ: یہ کتاب ذکر و نصیحت ہے۔ ابدی سعادت کی طرف دعوت دیتی ہے۔ حقائق کی نشاندہی کرتی ہے۔ کسی اور کلام میں یہ خصوصیت نہیں ملتی۔ یہ قرآن ہے۔ یہ وہ کتاب ہے جو پڑھی جائے گی۔ کسی زمانے میں اس کی تلاوت متروک نہیں ہو گی۔ اس کی قرائت پرانی نہیں

---

[1] ۳۷ صافات: ۳۶

ہو گی۔ اسے بار بار پڑھنے سے ذہن خستہ نہ ہو گا۔

۴۔ لِّیُنۡذِرَ مَنۡ کَانَ حَیًّا: یہ قرآن ایسے لوگوں کی تنبیہ و نصیحت کرتا ہے جن میں زندگی کے آثار موجود ہوں۔ گوش شنوا، چشم بینا اور قلب دانا رکھتے ہوں۔ جن میں زندگی کے آثار نہ ہوں بلکہ قبر میں مدفون مردوں کی طرح کسی بات کے سمجھنے کی قابلیت نہ رکھتے ہوں ان کی نصیحت کرنا صرف اتمام حجت کے لیے ہے:

وَمَاۤ اَنۡتَ بِمُسۡمِعٍ مَّنۡ فِی الۡقُبُوۡرِ ۝[1] اور آپ قبروں میں مدفون لوگوں کو تو نہیں سنا سکتے۔

۵۔ وَّیَحِقَّ الۡقَوۡلُ عَلَی الۡکٰفِرِیۡنَ: تنبیہ و نصیحت کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ دلیل و برہان قائم کرنے کے بعد بھی وہ اپنے کفر پر ڈٹے رہتے ہیں تو ان کافروں کے بارے میں اللہ کا فیصلہ اٹل اور حتمی ہو جاتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ قرآن برہان اور یقینیات پر مشتمل دستور ہدایت ہے۔
۲۔ رسول ﷺ نے صرف اللہ سے تعلیم لی ہے۔ اللہ نے آپ کو شعر نہیں سکھایا۔
۳۔ قرآن حیات آفرین ہے۔ مردے اس حیات کے اہل نہیں ہیں۔

اَوَلَمۡ یَرَوۡا اَنَّا خَلَقۡنَا لَہُمۡ مِّمَّا عَمِلَتۡ اَیۡدِیۡنَاۤ اَنۡعَامًا فَہُمۡ لَہَا مٰلِکُوۡنَ ﴿۷۱﴾

۷۱۔ کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ ہم نے اپنے دست قدرت سے بنائی ہوئی چیزوں میں سے ان کے لیے مویشی پیدا کیے چنانچہ اب یہ ان کے مالک ہیں؟

وَ ذَلَّلۡنٰہَا لَہُمۡ فَمِنۡہَا رَکُوۡبُہُمۡ وَ مِنۡہَا یَاۡکُلُوۡنَ ﴿۷۲﴾

۷۲۔ اور ہم نے انہیں ان کے لیے مسخر کر دیا چنانچہ کچھ پر یہ سوار ہوتے ہیں اور کچھ کو کھاتے ہیں۔

وَ لَہُمۡ فِیۡہَا مَنَافِعُ وَ مَشَارِبُ ؕ اَفَلَا یَشۡکُرُوۡنَ ﴿۷۳﴾

۷۳۔ اور ان میں ان کے لیے دیگر فوائد اور مشروبات ہیں تو کیا یہ شکر ادا نہیں کرتے؟

تفسیر آیات

۱۔ اَوَلَمۡ یَرَوۡا اَنَّا خَلَقۡنَا لَہُمۡ: ان آیات میں اپنی توحید اور نفی شرک کے بارے میں دلائل دیے ہیں۔ اس آیت میں فرمایا: یہ بات تو ان مشرکین کے مشاہدے میں ہے کہ ان کے زیر تسخیر مویشیوں کو ان کے

---

[1] ۳۵ فاطر: ۲۲

معبودوں نے نہیں، ہم نے اپنے دست قدرت سے پیدا کیا ہے اور ہمارے خلق کردہ مویشیوں سے تم اپنی زندگی کے بیشتر لوازمات فراہم کرتے ہو۔ اس کے باوجود تم یہ عقیدہ رکھتے ہو کہ تمہاری زندگی چلانے والے وہ ہیں جو ان چیزوں کے خالق نہیں ہیں۔

۲۔ عَمِلَتۡ اَیۡدِیۡنَاۤ: اپنے دست قدرت سے۔ کہنے سے مراد نفی شرک ہے کہ ہم نے اپنی قدرت کاملہ سے خلق کیا اور اَیۡدِیۡنَاۤ ہاتھوں سے مراد قدرت ہے۔ ید کہہ کر قدرت مراد لینا ایک محاورہ ہے۔

۳۔ فَهُمۡ لَهَا مٰلِكُوۡنَ: چنانچہ اب وہ ان کے مالک ہیں۔ اس جملے سے فردی ملکیت ثابت ہے۔ اگرچہ حقیقی مالک اللہ تعالیٰ کی ذات ہے لیکن اللہ کی طرف سے انسان کو ملکیت یعنی فائدہ اٹھانے کا حق اس شرط کے تحت دیا گیا ہے کہ اس سے دوسروں کی حق تلفی نہ ہوتی ہو۔ آپ کو اپنی زمین پر درخت لگانے کا حق ہے لیکن اگر آپ کے درخت کی شاخیں دوسرے کی زمین کی فصل خراب کرتی ہیں تو ان شاخوں پر آپ کی ملکیت سلب ہو جاتی ہے۔

۴۔ وَ ذَلَّلۡنٰهَا لَهُمۡ فَمِنۡهَا رَكُوۡبُهُمۡ وَ مِنۡهَا يَاۡكُلُوۡنَ: اور ہم نے انہیں رام و مسخر کیا ہے۔ جس کے نتیجے میں لوگ ان پر سوار ہو کر ان سے مسافتوں کو طے کرنے کا کام لیتے ہیں۔ جیسے اونٹ، خچر، گھوڑے اور کچھ مویشی ایسے ہیں کہ ان کا گوشت کھاتے ہیں۔ سواری اور کھانا دونوں انسان کی زندگی کے اہم امور سے ہیں۔ انہیں اللہ نے فراہم کیا ہے مگر یہ لوگ دوسروں کی پوجا کرتے ہیں۔

۵۔ وَ لَهُمۡ فِيۡهَا مَنَافِعُ وَ مَشَارِبُ: سواری اور کھانے کے علاوہ بھی ان کے لیے ان مویشیوں میں ان کی لوازم زندگی کی آٹھ چیزیں موجود ہیں۔ جیسے ان کی کھال، بال، دودھ وغیرہ سے ان کی زندگی چلتی ہے۔

۶۔ اَفَلَا يَشۡكُرُوۡنَ: اس کے باوجود وہ اللہ کا نہیں، ایسوں کا شکر کرتے ہیں جن کا ان چیزوں کی فراہمی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

وَ اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لَّعَلَّهُمۡ يُنۡصَرُوۡنَ ﴿۷۴﴾

۷۴۔ اور انہوں نے اللہ کے سوا اوروں کو معبود بنا لیا ہے کہ شاید انہیں مدد مل سکے۔

لَا يَسۡتَطِيۡعُوۡنَ نَصۡرَهُمۡ ۙ وَ هُمۡ لَهُمۡ جُنۡدٌ مُّحۡضَرُوۡنَ ﴿۷۵﴾

۷۵۔ (حالانکہ) وہ (نہ صرف) ان کی مدد نہیں کر سکتے اور وہ الٹے ان معبودوں کے (تحفظ کے) لیے آمادہ لشکر ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ ان تمام حقائق کے باوجود ان مشرکوں نے اللہ کو چھوڑ کر غیر اللہ کو اپنا معبود بنایا۔ یہ نعمتیں اللہ کی

طرف سے ہونے کے باوجود وہ اپنے جامد معبودوں کے آگے نذریں پیش کرتے ہیں اور ان سے مزید نعمت مانگتے ہیں۔ جبکہ یہ مشرکین خود اس بات کے قائل ہیں کہ ان مویشیوں کی خالق اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ مشرکین کے عقائد میں یہ ایک عجیب منطق ہے کہ مویشی کو پیدا اللہ کرتا ہے، اس کے تھن سے دودھ دوسرے دیتے ہیں۔

۲۔ لَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ نَصۡرَهُمۡ : حالانکہ یہ بے شعور معبود ان کی کوئی کمک نہیں کر سکتے۔ چونکہ یہ کسی قسم کی کمک کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔

۳۔ وَهُمۡ لَهُمۡ جُنۡدٌ مُّحۡضَرُوۡنَ : البتہ ان بتوں کے عبادت گزار اپنے معبودوں کی حفاظت کے لیے ایک آمادہ اور حاضر باش لشکر ضرور ہیں۔ یہ معبود اپنی بقا کے لیے ان عبادت گزاروں کے محتاج ہیں، وہ ان کی کیا مدد کریں گے؟ اگر یہ لوگ انہیں نہ تراشیں اور سجا کر بتکدے میں حفاظت سے نہ رکھیں، دن رات ان کی دیکھ بھال نہ کریں، ان کی معبودیت کا چرچا نہ کریں تو ان کی معبودیت ایک دن کے لیے بھی باقی نہ رہے۔ پس ان کے یہ معبود ان پوجا کرنے والوں کو کیا تحفظ دیں گے۔ الٹا یہ اپنے معبودوں کو تحفظ دیتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ انسانی زندگی چلانے والی وہ ذات ہے جس نے ان مویشیوں کو انسان کے لیے مسخر کیا۔

۲۔ مشرکین کی فکری بے مائیگی ہے کہ جو معبود خود ان کے محتاج ہیں ان کے پاس اپنی حاجتیں لے جاتے ہیں۔

فَلَا یَحۡزُنۡکَ قَوۡلُهُمۡ ۘ اِنَّا نَعۡلَمُ مَا یُسِرُّوۡنَ وَ مَا یُعۡلِنُوۡنَ ﴿۷۶﴾

۷۶۔ لہٰذا ان کی باتیں آپ کو رنجیدہ نہ کریں، ہم سب باتیں جانتے ہیں جو یہ چھپاتے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ فَلَا یَحۡزُنۡکَ قَوۡلُهُمۡ : ایسے لوگوں کی باتیں آپ کو رنجیدہ نہ کریں جن کی فکری سطح اس قدر گری ہوئی ہے کہ ایسے معبودوں سے مدد کی توقع رکھتے ہیں جو خود ان کے محتاج ہیں۔ ان کی ہرزہ گوئی سے آپ کو کوئی نقصان پہنچنے والا نہیں ہے۔

۲۔ اِنَّا نَعۡلَمُ مَا یُسِرُّوۡنَ وَ مَا یُعۡلِنُوۡنَ : ایک ایسی ذات آپ کی پشت پر ہے جو ان کی بیہودہ باتوں کے پیچھے موجود عزائم سے آگاہ ہے۔ آپ ایک ایسی ذات کے زیر نظر ہیں جس کی نظر میں آپ کے دشمنوں کی ہر پوشیدہ اور اعلانیہ باتیں ہیں۔ آپ کو ان سے، کسی قسم کا گزند پہنچانے اور آپ کے مشن کو ناکام

کرنے کا خطرہ نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ الٰہی مشن کی حامل ہستیوں کو دشمن کا طعنہ نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

اَوَلَمۡ یَرَ الۡاِنۡسَانُ اَنَّا خَلَقۡنٰہُ مِنۡ نُّطۡفَۃٍ فَاِذَا ہُوَ خَصِیۡمٌ مُّبِیۡنٌ ﴿۷۷﴾

۷۷۔ کیا انسان یہ نہیں دیکھتا کہ ہم نے اسے نطفے سے پیدا کیا ہے اتنے میں وہ کھلا جھگڑالو بن گیا؟

وَ ضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّ نَسِیَ خَلۡقَہٗ ؕ قَالَ مَنۡ یُّحۡیِ الۡعِظَامَ وَ ہِیَ رَمِیۡمٌ ﴿۷۸﴾

۷۸۔ پھر وہ ہمارے لیے مثالیں دینے لگتا ہے اور اپنی خلقت بھول جاتا ہے اور کہنے لگتا ہے: ان ہڈیوں کو خاک ہونے کے بعد کون زندہ کرے گا؟

تفسیر آیات

۱۔ اَوَلَمۡ یَرَ الۡاِنۡسَانُ: کیا اعادۂ حیات پر اعتراض کرنے والے اس بات پر نظر نہیں ڈالتے کہ ایک حقیر بوند سے پیدا ہونے والا انسان رب العالمین کے مقابلے میں کھڑا ہو جاتا ہے اور کہتا ہے۔ ان بوسیدہ ہڈیوں کو خاک ہونے کے بعد کون زندہ کر سکتا ہے۔ ایک ناتواں جرثومے سے پیدا ہونے والا یہ انسان اس قابل ہو سکتا ہے کہ اپنے خالق سے اعادۂ حیات کے بارے میں بحث اور مخاصمت کر سکے تو اس کا خالق اس بوسیدہ ہڈی کو دوبارہ زندہ کیوں نہیں کر سکتا؟

۲۔ وَ ضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّ نَسِیَ خَلۡقَہٗ: وہ ہمارے لیے مثالیں دیتا ہے کہ ہڈی کے خاک ہونے کے بعد اسے کون زندہ کر سکتا ہے اور اپنی خلقت کو بھول جاتا ہے کہ وہ بھی تو اسی خاک سے پیدا ہوا ہے۔ اس کے جسم کے تمام عناصر ارضی ہیں۔ چنانچہ بیج کا دانہ زیر زمین جا کر زمین کے مختلف عناصر جذب کر کے غذا تیار کرتا ہے۔ زمینی عناصر پر مشتمل غذا سے خون اور خون سے نطفہ اور نطفہ سے انسان بنتا ہے۔ کیا انسان اس بات کو بھول گیا کہ اس کا وجود اسی رَمِیۡمٌ خاک کا مرہون منت ہے۔

قُلۡ یُحۡیِیۡہَا الَّذِیۡۤ اَنۡشَاَہَاۤ اَوَّلَ مَرَّۃٍ ؕ وَ ہُوَ بِکُلِّ خَلۡقٍ عَلِیۡمُۨ ﴿۷۹﴾

۷۹۔ کہد یجیے: انہیں وہی زندہ کرے گا جس نے انہیں پہلی بار پیدا کیا تھا اور وہ ہر قسم کی تخلیق کو خوب جانتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ قُلۡ یُحۡیِیۡہَا الَّذِیۡۤ اَنۡشَاَہَاۤ اَوَّلَ مَرَّۃٍ: کہد یجیے: جس ذات نے پہلی بار انشا کیا ہے وہ احیاء پر بہتر قادر ہے۔ انشا عدم محض سے وجود دینے کو کہتے ہیں اور احیاء موجود چیز میں زندگی پیدا کرنے کو۔ جو ذات عدم سے ایجاد پر قادر ہے وہ رَمِیۡمٌ کو زندہ کرنے پر بہتر قادر ہے۔ عدم سے رَمِیۡمٌ ہزار درجہ بہتر ہے چونکہ عدم اور رَمِیۡمٌ میں عدم اور وجود کا فرق ہے۔

روایت میں آیا ہے:

> شام کے ایک یہودی عالم نے حضرت امیرالمومنین علی علیہ السلام سے کہا: حضرت ابراہیم نے کافر کو اپنی نبوت پر دلیل و برہان قائم کرکے مبہوت و متحیر کر دیا تھا!!۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے بھی ایسا کیا ہے۔ ایک منکر قیامت ابی بن خلف الجمحی آپ کے پاس آتا ہے۔ اس کے پاس ایک بوسیدہ ہڈی تھی۔ اس نے اسے کو ریزہ کر دیا اور کہا: اے محمد! مَنۡ یُّحۡیِ الۡعِظَامَ وَ ہِیَ رَمِیۡمٌ ؟ اس ہڈی کے خاک ہونے کے بعد اسے کون زندہ کرے گا؟ اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی زبانی اپنی محکم آیات جاری فرماتے ہوئے ان کی نبوت پر برہان قائم فرمائی اور فرمایا: یُحۡیِیۡہَا الَّذِیۡۤ اَنۡشَاَہَاۤ اَوَّلَ مَرَّۃٍ انہیں وہی زندہ کرے گا جس نے انہیں پہلے پیدا کیا تھا تو وہ بھی مبہوت اور متحیر ہو کر واپس گیا۔[1]

۲۔ وَ ہُوَ بِکُلِّ خَلۡقٍ عَلِیۡمٌ: خلق کی ابتدا ہو یا اعادۂ تخلیق، راز خلقت کے مالک کو کسی قسم کی تخلیق میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ بِکُلِّ خَلۡقٍ میں تخلیق کی اربوں کی تعداد میں موجود اقسام شاہد ہیں کہ وہ ہر قسم کی تخلیق جانتا ہے۔ چنانچہ سمندری اور خشکی کی مخلوقات، پرندوں کی اقسام جو انسان کے دائرہ معلومات میں آئی ہیں، ان کا ایک طائرانہ جائزہ لینے والا انتہائی شگفت انگیزی کے ساتھ کہدے گا: وَ ہُوَ بِکُلِّ خَلۡقٍ عَلِیۡمٌ۔ صدق اللّٰہ العلی العظیم اور ان اربوں موجودات میں انشا و احیا کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ دیکھ کر کہہ اٹھے گا: سبحان الخلاق العلیم۔

اہم نکات

۱۔ انسان کی اپنی خلقت میں معاد کی دلیل و نمونہ موجود ہے: وَّ نَسِیَ خَلۡقَہٗ۔

۲۔ انشا و ایجاد سے اعادہ حیات اللہ کے لیے زیادہ آسان ہے۔

---

[1] نور الثقلین ذیل آیت

الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمۡ مِّنَ الشَّجَرِ الۡاَخۡضَرِ نَارًا فَاِذَاۤ اَنۡتُمۡ مِّنۡہُ تُوۡقِدُوۡنَ ﴿۸۰﴾

۸۰۔ وہی ہے جس نے تمہارے لیے سبز درخت سے آگ پیدا کی پھر تم اس سے آگ سلگاتے ہو۔

تفسیر آیات

معاد اور اعادہ حیات کی ایک مثال ہرے بھرے درختوں سے آتش نکل آنا ہے کہ اگر دو ہری ٹہنیوں کو آپس میں رگڑ دیا جائے تو ان میں حرارت پیدا ہوتی ہے پھر آتش نکل آتی ہے۔

جنگلوں میں آگ اسی سے لگتی ہے کہ ہوا کی وجہ سے ٹہنیاں آپس میں رگڑ کھاتی ہیں اور آگ بھڑکتی ہے۔

اس جگہ قابل توجہ یہ ہے کہ ہرے درخت میں پانی کی رطوبت موجود ہوتی ہے۔ اس رطوبت میں آتش کی پیدائش، کیا اس بات کا ایک نمونہ نہیں ہے کہ اس بوسیدہ ہڈی سے زندگی کی حرارت پیدا ہو جائے گی؟

استادہ آب میں یہ روانی خدا کی شان
پانی میں آگ، آگ میں پانی خدا کی شان

میر انیس

اہم نکات

۱۔ ہری ٹہنی کی رطوبت سے آتش نکل آتی ہے تو بوسیدہ ہڈی سے زندگی بھی نکل سکتی ہے۔

اَوَ لَیۡسَ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ بِقٰدِرٍ عَلٰۤی اَنۡ یَّخۡلُقَ مِثۡلَہُمۡ ؕ؃ بَلٰی ٭ وَ ہُوَ الۡخَلّٰقُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۸۱﴾

۸۱۔ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے، آیا وہ اس بات پر قادر نہیں ہے کہ ان جیسوں کو پیدا کرے؟ کیوں نہیں! وہ تو بڑا خالق، دانا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اَوَ لَیۡسَ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ: کیا جس ذات نے آسمانوں اور زمین پر مشتمل ایک کائنات بنائی ہے اسے اعادۂ حیات میں کیا مشکل پیش آ سکتی ہے جب کہ کائنات کی تخلیق کے مقابلے میں انسان کی تخلیق کی کوئی خاص حیثیت نہیں ہے۔ فرمایا:

لَخَلۡقُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ اَکۡبَرُ — آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا انسانوں کے خلق کرنے

مِنۡ خَلۡقِ النَّاسِ ....[1] سے زیادہ بڑا کام ہے۔

کائنات کا وہ حصہ جو انسان کے احاطۂ علمی میں آیا ہے، محیر العقول ہے۔ کل کائنات کا انسان کو نہ علم ہے نہ اندازہ۔ جس کہکشاں میں ہمارا نظام شمسی موجود ہے، کہتے ہیں اس میں تین ارب ستارے موجود ہیں۔ یعنی تین ارب آفتاب موجود ہیں۔ ان میں ایک ہمارا آفتاب ہے۔ اب تک بیس لاکھ کہکشاؤں کا اندازہ ہو سکا ہے۔ ان میں ہم سے قریب ترین کہکشاں کا فاصلہ دس لاکھ نوری سال ہے اور دور ترین کہکشاں کی روشنی ہم تک دس کروڑ سال میں پہنچی ہے۔ بعض کہکشاؤں کی روشنی اربوں سال سے چلی آرہی ہے ابھی ہم تک نہیں پہنچی۔ واضح رہے کہ روشنی کی رفتار ۱۸۸۲۸ میل فی سیکنڈ ہے۔

۲۔ اَنۡ یَّخۡلُقَ مِثۡلَہُمۡ: اس جملے میں مِثۡلَہُمۡ "ان جیسے" کا ذکر آیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود وہی نہیں، ان کی مثل پیدا ہو گے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ ہمارا عقیدہ ہے کہ معاد جسمانی ہے۔ ہم دنیا کے اسی جسم کے ساتھ اٹھائے جائیں گے اور اسی ڈھانچے میں روح دوبارہ پھونکی جائے گی۔ واضح رہے یہ ڈھانچہ دنیا میں بھی ہر چھ سال بعد خلیات کی شکست و ریخت کے نتیجے میں بدل جاتا ہے۔ لہٰذا ہم اس دنیا میں ہمیشہ ایک ڈھانچے میں نہیں ہوتے۔ ہمیشہ مِثۡلَہُمۡ میں ہوتے ہیں۔ البتہ جو نہیں بدلتا وہ روح ہے۔ اس بات سے آخرت کی مِثۡلَہُمۡ کا سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔

۳۔ بَلٰی ٭ وَ ہُوَ الۡخَلّٰقُ الۡعَلِیۡمُ: کیوں نہیں قادر!! وہ خلاقیت میں اور کس طرح خلق کرنا ہے؟ اس کے علم میں بے مثل ہے۔ وہ تمام رازہائے تخلیق پر قدرت اور علم رکھتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ ایک لامتناہی کائنات کے خالق کے لیے ایک ڈھانچے میں دوبارہ زندگی پھونکنا نہایت آسان کام ہے۔

اِنَّمَاۤ اَمۡرُہٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَیۡـًٔا اَنۡ یَّقُوۡلَ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ ﴿۸۲﴾

۸۲۔ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کر لیتا ہے تو بس اس کا امر یہ ہوتا ہے کہ اسے یہ کہے: ہو جا پس وہ ہو جاتی ہے۔

فَسُبۡحٰنَ الَّذِیۡ بِیَدِہٖ مَلَکُوۡتُ کُلِّ شَیۡءٍ وَّ اِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۸۳﴾

۸۳۔ پس پاک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی سلطنت ہے اور اسی کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّمَاۤ اَمۡرُہٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَیۡـًٔا: جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کو وجود میں لانے کا ارادہ کر لیتا ہے تو صرف

---

[1] ۴۰ غافر: ۵۷

ارادے سے وہ چیز وجود میں آ جاتی ہے۔ ارادے سے زیادہ کسی چیز کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ لفظ کُنْ کی بھی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ ایجاد سے پہلے کوئی مخاطب نہیں ہوتا جس سے کُنْ کا خطاب کیا جائے۔ بنابرایں کُنْ انسان کو سمجھانے کے لیے ایک لفظی تعبیر ہے جو عالم ایجاد کی باتوں کو تمثیلی تعبیر کے بغیر سمجھنے سے قاصر ہے۔

حضرت امیرالمومنین علیہ السلام سے منقول ہے:

یَقُولُ لِمَنْ اَرَادَ کَوْنَهُ کُنْ فَیَکُونُ لَا بِصَوْتٍ یَقْرَعُ وَلَا بِنِدَاءٍ یُسْمَعُ وَ اِنَّمَا کَلَامُهُ سُبْحَانَهُ فِعْلٌ مِنْهُ اَنْشَاَهُ...[1]

جسے پیدا کرنا چاہتا ہے اسے ”ہو جا“ کہتا ہے جس سے وہ ہو جاتی ہے بغیر کسی ایسی آواز کے جو کان (کے پردوں) سے ٹکرائے اور بغیر ایسی صدا کے جو سنی جا سکے بلکہ اللہ سبحانہ کا کلام بس اس کا ایجاد کردہ فعل ہے۔

واضح رہے اگر کوئی کام وسائل اور علل و اسباب کے ذریعے انجام دینا ہو تو آسان اور مشکل کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ سادہ اور کم علل و اسباب والا کام آسان اور زیادہ اور پیچیدہ علل و اسباب والا کام مشکل ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی علل و اسباب کا محتاج نہیں ہے۔ وہ کسی کام کو انجام دینا چاہتا ہے تو صرف ایک ارادہ کافی ہے اور اللہ کا ارادۂ تکوینی حتمی طور پر نافذ العمل ہو جاتا ہے۔ ممکن نہیں اللہ کسی کام کا ارادہ کرے اور وہ ارادہ نافذ نہ ہو۔

اس آیت میں یہ بتانا مقصود ہے کہ اعادۂ حیات کے لیے اللہ کا ایک ارادہ کافی ہوتا ہے۔

۲۔ فَسُبۡحٰنَ الَّذِیۡ بِیَدِہٖ مَلَکُوۡتُ کُلِّ شَیۡءٍ: ملکوت صیغہ مبالغہ ہے ملك کا۔ جیسے رحموت، رحمة کا صیغہ مبالغہ ہے۔ آیت کا مطلب یہ بنتا ہے: پاکیزہ ہے وہ ذات جس کے قبضۂ قدرت میں ہر شے کی حقیقی ملکیت ہے اور اللہ ہر شے پر ہر قسم کا تصرف کر سکتا ہے۔ اسے وجود میں لا سکتا ہے، ختم کر سکتا ہے اور دوبارہ زندہ کر سکتا ہے۔

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ توحید

خالی

سُورَۃُ الصَّافَّاتِ

خالی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اس سورۃ کا نام اس کی ابتدا میں مذکور الصّٰٓفّٰتِ سے ماخوذ ہے۔

یہ مکمل سورۃ مکہ میں نازل ہوئی اس کی آیات کی تعداد ایک سو اکاسی ہے (۱۸۱) ہے۔ اس سورۃ المبارکہ کا اسلوب کلام اس طرح ہے کہ آیات مختصر ہیں۔ جس سے مکی زندگی میں لوگوں کے لیے حفظ کرنے میں آسانی ہوتی اور اسلوب میں معجزانہ لہجہ باقی سورہ ہائے قرآن کی بہ نسبت زیادہ نمایاں ہے۔ مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ مشرکین کی مخالفت، طعنے اور استہزاء عروج پر تھا۔ اسی مناسبت سے ان باتوں کی رد بھی پوری قوت سے ہو رہی ہے۔

اس سورہ مبارکہ میں خاص طور پر معجزہ یہ ہے کہ اس کی آیات ۱۷۱ تا ۱۷۳ میں فرمایا:

وَ لَقَدۡ سَبَقَتۡ کَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الۡمُرۡسَلِیۡنَ ﴿ۚۖ﴾ اِنَّہُمۡ لَہُمُ الۡمَنۡصُوۡرُوۡنَ ﴿۪﴾ وَ اِنَّ جُنۡدَنَا لَہُمُ الۡغٰلِبُوۡنَ ﴿﴾

اور تحقیق ہمارے بندگان مرسل سے ہمارا یہ وعدہ ہو چکا ہے۔ یقیناً وہ مدد کیے جانے والے ہیں، اور یقیناً ہمارا لشکر ہی غالب آ کر رہے گا۔

آیات میں یہ پیشگوئی ایسے حالات میں ہو رہی ہے کہ کامیابی کی کوئی امید نظر نہیں آ رہی تھی۔ مٹھی بھر مسلمان نہایت بے سروسامانی میں مشرکین کے طعنے سن رہے تھے۔ ممکن ہے اس وقت مکے میں چالیس سے پچاس تک مسلمانوں کی نہایت بے بسی کی حالت میں قرآن یہ اعلان فرما رہا ہے: وَ اِنَّ جُنۡدَنَا لَہُمُ الۡغٰلِبُوۡنَ۔ یقیناً ہمارا لشکر ہی غالب آ کر رہے گا۔ اس آیت کے نزول کے وقت کوئی لشکر موجود نہ تھا۔ چند بے بس لوگ تھے۔

مشرکین کہتے تھے: وہ عذاب جس سے ہمیں ڈراتے ہو کب آئے گا؟ جواب میں آیت ۱۷۷ میں ارشاد فرمایا:

فَاِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِہِمۡ فَسَآءَ صَبَاحُ الۡمُنۡذَرِیۡنَ ﴿﴾

پس جب یہ (عذاب) ان کے دالان میں اترے گا تو تنبیہ شدگان کی صبح بہت بری ہو گی۔

چنانچہ چشم فلک نے دیکھ لیا دس ہزار پر مشتمل لشکر نے فتح مکہ کے موقع پر ان کے گھروں کے دالان میں ذلت و رسوائی اور ننگ و عار اتار دیا ہے اور عمر بھر رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جنگ کرنے والے بظاہر حکم اسلام زبان پر جاری کر کے اپنی جان بچانے پر مجبور ہو گئے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ	بنام خدائے رحمن رحیم
وَ الصّٰٓفّٰتِ صَفًّا ۙ﴿۱﴾	۱۔ قسم ہے پوری طرح صف باندھنے والوں کی،
فَالزّٰجِرٰتِ زَجۡرًا ۙ﴿۲﴾	۲۔ پھر بطور کامل جھڑکی دینے والوں کی،
فَالتّٰلِیٰتِ ذِکۡرًا ۙ﴿۳﴾	۳۔ پھر ذکر کی تلاوت کرنے والوں کی،
اِنَّ اِلٰـہَکُمۡ لَوَاحِدٌ ؕ﴿۴﴾	۴۔ یقیناً تمہارا معبود ایک ہی ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ الصّٰٓفّٰتِ صَفًّا: یہ قرآن کا پہلا سورہ ہے جس کی ابتدا قسم سے ہو رہی ہے۔ قسم ہے فرشتوں کی اس جماعت کی جو صف بستہ عبادت میں کھڑی ہے۔ چنانچہ فرشتے خود اپنے بارے میں کہتے ہیں:

وَّ اِنَّا لَنَحۡنُ الصَّآفُّوۡنَ ﴿﴾[1] اور ہم ہی صف بستہ رہتے ہیں۔

وَ صَافُّونَ لَا یَتَزَایَلُونَ ...[2] وہ صف بستہ ہوتے ہیں اور صفیں چھوڑتے نہیں ہیں۔

فرشتے اللہ کی اطاعت میں ہمیشہ صف بستہ کھڑے رہتے ہیں چونکہ اوامر الٰہی کا نفاذ فرشتوں کے ذریعے ہوتا ہے۔

۲۔ فَالزّٰجِرٰتِ زَجۡرًا: قسم ہے فرشتوں کی اس جماعت کی جو سختی سے جھڑکی دینے والی ہے۔ شیطانوں کو بھگانے والی یا انسان کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے ہر قسم کے خطرات کو دور کرنے والی جماعت:

یُرۡسِلُ عَلَیۡکُمۡ حَفَظَۃً ...[3] اور تم پر نگہبانی کرنے والے بھیجتا ہے۔

اِنۡ کُلُّ نَفۡسٍ لَّمَّا عَلَیۡہَا حَافِظٌ ﴿﴾[4] کوئی نفس ایسا نہیں جس پر نگہبان نہ ہو۔

---

[1] ۳۷ صافات: ۱۶۵ [2] نہج البلاغہ: خطبہ اول [3] ۶ انعام: ۶۱ [4] ۸۶ طارق: ۴

یہ فرشتے شیطان کی گمراہی اور اللہ کی نافرمانی سے بچاتے ہیں۔

۳۔ فَالتّٰلِیٰتِ ذِکۡرًا: فرشتوں کی اس جماعت کی قسم جو ذکر کی تلات کرتے ہیں۔ ایک تفسیر کے مطابق وہ فرشتے جو وحی الٰہی لے کر نازل ہوتے اور رسولوں کے لیے تلاوت کرتے ہیں۔

۴۔ اِنَّ اِلٰـہَکُمۡ لَوَاحِدٌ: تمہارا معبود ایک ہی ہے۔ عالم بالا، عالم ارضی اور ان دونوں کے درمیان قائم نظام صرف اور صرف ایک ہی معبود کی نشاندہی کرتا ہے۔

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ مَا بَیۡنَہُمَا وَ رَبُّ الۡمَشَارِقِ ؈
۵۔ جو آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا پروردگار اور مشرقوں کا پروردگار ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ یہ اللہ واحد وہی ہے جو آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان موجودات کو ایک تدبیر کے ساتھ چلا رہا ہے اور ان موجودات کا رَب اور مالک ہے۔

۲۔ وَرَبُّ الۡمَشَارِقِ: اور وہ مشرقوں کا مالک۔ مشرقوں کا اس جگہ ممکن ہے اس لیے ذکر ہوا ہو کہ سورج کے طلوع کا تدبیر حیات میں کلیدی کردار ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کی وحدانیت پر کل کائنات کا نظام شاہد ہے۔

اِنَّا زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنۡیَا بِزِیۡنَۃِۣ الۡکَوَاکِبِ ۙ؆
۶۔ ہم نے آسمان دنیا کو ستاروں کی زینت سے مزین کیا،

وَ حِفۡظًا مِّنۡ کُلِّ شَیۡطٰنٍ مَّارِدٍ ؇
۷۔ اور ہر سرکش شیطان سے بچاؤ کا ذریعہ بھی۔

تفسیر آیات

۱۔ زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنۡیَا: ہم نے قریب ترین آسمان کو ستاروں کی زینت سے مزین کیا سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو ستارے اور کہکشائیں انسان کے مشاہدے میں آئی ہیں وہ سب سات آسمانوں میں سے صرف آسمانِ اول السَّمَآءَ الدُّنۡیَا سے متعلق ہیں بلکہ پہلے آسمان کے بارے میں بھی انسانی مشاہدات اور معلومات نہایت محدود ہیں۔ چنانچہ آسمان اولیٰ کا جو حصہ انسانی مشاہدے میں آیا ہے اس کی وسعت کا یہ عالم

ہے کہ بعض کہکشاؤں کی روشنی اربوں سالوں سے چلی ہوئی ہے لیکن ابھی تک ہم تک نہیں پہنچی۔ یاد رہے کہ روشنی کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار دو سو چوراسی میل فی سیکنڈ ہے۔

۲۔ وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ: انہی ستاروں کو جہاں آسمان اول کے لیے زینت بنایا وہاں ان ستاروں کو مردود شیاطین کو بھگانے کا بھی ذریعہ بنایا ہے۔ اس آیت سے ظاہر ہے کہ عالم بالا میں جہاں ان ستاروں کا دائرہ اثر ہے ان ملکوتی فضاؤں میں شیاطین کا داخلہ ناممکن ہے۔

لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى وَيُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ ۝ۖ ۸ ۸۔ کہ وہ عالم بالا کی طرف کان نہ لگا سکیں اور ہر طرف سے ان پر (انگارے) پھینکے جاتے ہیں۔

دُحُوْرًا وَّلَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ ۝ۙ ۹ ۹۔ دھتکارے جاتے ہیں اور ان پر دائمی عذاب ہے۔

اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ ۝ ۱۰ ۱۰۔ مگر ان میں سے جو کسی بات کو اچک لے تو ایک تیز شعلہ اس کا پیچھا کرتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ: الْمَلَاِ جماعت کے معنوں میں ہے اور یہ لفظ شریف جماعت کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ ان ستاروں کی وجہ سے شیاطین عالم بالا کی شریف جماعت کی باتوں کی طرف کان نہیں لگا سکتے۔ شریف جماعتوں سے مراد وہ ملائکہ ہو سکتے ہیں جو تدبیر امور پر مامور اور اس کائنات میں رونما ہونے والے رازوں سے واقف ہیں۔

قابل توجہ نکتہ یہ ہے:

عربوں میں کہانت کا بڑا چرچا تھا اور کاہنوں سے غیب کی خبریں معلوم کرنے کا رواج عام تھا۔ کاہنوں کا یہ دعویٰ تھا کہ جن اور شیاطین انہیں یہ خبریں بتاتے ہیں۔

مشرکین نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بھی کاہن ہونے کا الزام لگایا جیسا کہ سورۂ شعراء میں اس کی رد آئی ہے:

وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ ۝ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ۝ اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ ۝ [۱] — اور اس قرآن کو شیاطین نے نہیں اتارا۔ اور نہ یہ کام ان سے کوئی مناسبت رکھتا ہے اور نہ ہی وہ استطاعت رکھتے ہیں۔ وہ تو یقیناً (وحی کے) سننے سے بھی دور رکھے گئے ہیں۔

----

[۱] ۲۶ شعراء: ۲۱۰ تا ۲۱۲

اس آیت میں بھی اس بات کی رد ہے کہ شیاطین عالم بالا میں موجود ملائکہ کی باتیں سن سکتے ہیں۔ اگر کوشش کرتے ہیں تو ان پر ہر طرف سے حملہ ہوتا ہے۔ ممکن ہے ہر طرف سے مراد ان فضاؤں کا ماحول ہو جنہیں عبور کرنا شیاطین کے لیے ممکن نہ ہو۔ جس طرح انسان کو اپنی زمینی فضا سے خارج فضاؤں میں جانے کے لیے مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

۲۔ اِلَّا مَنۡ خَطِفَ الۡخَطۡفَۃَ: مگر ان میں سے جو کسی بات کو سن بھی لے تو شہاب ثاقب اس کا تعاقب کرتا ہے اور اسے یا تو ختم کر دیتا ہے یا وہ بات سننے کی نوبت نہیں آنے دیتا۔

شہاب ثاقب کے بارے میں ہم نے سورۃ الحجر آیت ۱۸۔۱۹ میں تفصیلاً گفتگو کی ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں جمالیاتی قدروں کا بھرپور مظاہرہ ہے۔ اِنَّا زَیَّنَّا السَّمَآءَ ۔۔۔۔

۲۔ شیاطین کے لیے اللہ کے راز ہائے تدبیری میں مداخلت ممکن نہیں ہے۔

فَاسۡتَفۡتِہِمۡ اَہُمۡ اَشَدُّ خَلۡقًا اَمۡ مَّنۡ خَلَقۡنَا ؕ اِنَّا خَلَقۡنٰہُمۡ مِّنۡ طِیۡنٍ لَّازِبٍ ﴿۱۱﴾

۱۱۔ تو ان سے پوچھ لیجیے کہ کیا ان کا پیدا کرنا مشکل ہے یا وہ جنہیں ہم نے (ان کے علاوہ) خلق کیا ہے؟ ہم نے انہیں لیسدار گارے سے پیدا کیا۔

تشریح کلمات

لَّازِبٍ: (ل ز ب) اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی مقام پر ثبت ہو جائے اور چمٹ جائے۔

تفسیر آیات

۱۔ اے رسول! خود منکرین قیامت سے سوال کریں کہ تمہاری نظر میں خود تمہاری تخلیق مشکل کام ہے یا دیگر کائنات کی تخلیق۔ جس ذات نے بیکراں کائنات کو خلق کیا ہے اس کے مقابلے میں خود تمہاری ابتدائی تخلیق یا اعادۂ تخلیق کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

۲۔ اِنَّا خَلَقۡنٰہُمۡ مِّنۡ طِیۡنٍ لَّازِبٍ: تم کہتے ہو کہ انسان مرنے کے بعد جب مٹی ہو جاتا ہے تو دوبارہ کیسے زندہ ہو جاتا ہے؟ جواب میں فرمایا:

> خود ان انسان کی تخلیق بھی مٹی سے ہوئی ہے۔ اگر مٹی میں زندگی نہیں آ سکتی ہے تو خود تم میں زندگی کیسے آ گئی؟ تم بھی تو لیس دار گارے سے پیدا ہوئے ہو۔

لیسدار گارے یعنی مٹی میں پانی پڑنے سے اس میں نباتی حیات آ جاتی ہے۔ اسی نبات سے انسان

اور حیوان اپنی غذا حاصل کرتے ہیں اور اسی غذا سے نطفہ بن جاتا ہے۔ پھر انسان کی تخلیق ہو جاتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ انسان کی ابتدائی تخلیق ہو یا اعادہ تخلیق دونوں کا تعلق مٹی سے ہے۔

بَلۡ عَجِبۡتَ وَ یَسۡخَرُوۡنَ ﴿۱۲﴾	۱۲۔ بلکہ آپ تعجب کر رہے ہیں اور یہ لوگ تمسخر کرتے ہیں۔
وَ اِذَا ذُکِّرُوۡا لَا یَذۡکُرُوۡنَ ﴿۱۳﴾	۱۳۔ اور جب انہیں نصیحت کی جاتی ہے تو نصیحت نہیں مانتے۔
وَ اِذَا رَاَوۡا اٰیَۃً یَّسۡتَسۡخِرُوۡنَ ﴿۱۴﴾	۱۴۔ اور جب کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔
وَ قَالُوۡۤا اِنۡ ہٰذَاۤ اِلَّا سِحۡرٌ مُّبِیۡنٌ ﴿۱۵﴾	۱۵۔ اور کہتے ہیں: یہ تو ایک کھلا جادو ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ بَلۡ عَجِبۡتَ وَ یَسۡخَرُوۡنَ: آپ کے اور ان کے موقف میں کتنا زیادہ فاصلہ ہے۔ اعادۂ حیات پر واضح دلائل اور نظیریں پیش کرنے پر یقین کرنے کی بجائے وہ اس کا انکار کرتے ہیں تو ان کے اس انکار سے آپ کو تعجب ہو رہا ہے اور مشرکین اس موضوع کا مذاق اڑاتے ہیں:

وَ اِنۡ تَعۡجَبۡ فَعَجَبٌ قَوۡلُہُمۡ ءَاِذَا کُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِیۡ خَلۡقٍ جَدِیۡدٍ ...[1]	اور اگر آپ کو تعجب ہوتا ہے تو ان (کفار) کی یہ بات تعجب خیز ہے کہ جب ہم خاک ہو جائیں گے تو کیا ہم نئی پیدائش میں ہوں گے؟

اعادۂ حیات کے انکار پر آپ کو تعجب ہو رہا ہے اور مشرکین اسی اعادہ حیات کا تمسخر اڑا رہے ہیں۔ جو موضوع آپ کے لیے اس قدر واضح ہے کہ اس کے انکار پر تعجب ہوتا ہے، وہی موضوع مشرکین کے لیے اس قدر نامعقول ہے کہ اس کا تمسخر اڑا رہے ہیں۔

۲۔ وَ اِذَا ذُکِّرُوۡا لَا یَذۡکُرُوۡنَ: وہ اعادۂ حیات کو اس قدر نامعقول سمجھتے ہیں کہ اس موضوع کو سمجھنے اور اس کے بارے میں کسی نصیحت کو قبول کرنے کے لیے آمادہ بھی نہیں ہیں۔

۳۔ وَ اِذَا رَاَوۡا اٰیَۃً یَّسۡتَسۡخِرُوۡنَ: اور جب کوئی معجزہ دیکھتے ہیں تو اس معجزے سے اثر لینے کی جگہ اس کا بھی تمسخر اڑاتے ہیں۔ مثلاً شق القمر کا عظیم معجزہ دیکھ کر ایمان لے آنا چاہیے تھا مگر وہ اسے جادو

----

[1] ۱۳ رعد: ۵

کہتے ہیں۔

۴۔ وَقَالُوۡۤا اِنۡ ہٰذَاۤ اِلَّا سِحۡرٌ مُّبِیۡنٌ: رسول اللہ ﷺ کے معجزات کو کھلا جادو کہنا خود اپنی جگہ اس بات کا ثبوت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قرآن کے علاوہ بھی معجزے پیش کیے تھے۔ قرآن کو تو وہ شاعرانہ کلام کہتے تھے چونکہ معجزے اور جادو، دونوں کا تعلق بظاہر عام بشری طاقت سے باہر ہے۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ جادو حقیقت سے دور، صرف دھوکہ ہوتا ہے اور معجزہ حقیقت پر مبنی ہوتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ مشرکین اعادۂ حیات کو نا معقول سمجھتے ہیں جب کہ اسے قبول نہ کرنا باعث تعجب ہے۔

۲۔ رسول اللہ ﷺ نے قرآن کے علاوہ بھی معجزات پیش کیے ہیں جنہیں یہ لوگ جادو کہتے تھے۔

ءَاِذَا مِتۡنَا وَ کُنَّا تُرَابًا وَّ عِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبۡعُوۡثُوۡنَ ﴿۱۶﴾
اَوَ اٰبَآؤُنَا الۡاَوَّلُوۡنَ ﴿۱۷﴾

۱۶۔ کیا جب ہم مر چکیں گے اور خاک اور ہڈیاں ہو جائیں گے تو کیا ہم (دوبارہ) اٹھائے جائیں گے؟
۱۷۔ کیا ہمارے اگلے باپ دادا بھی (اٹھائے جائیں گے)؟

تفسیر آیات

۱۔ ءَاِذَا مِتۡنَا وَ کُنَّا تُرَابًا: مشرکین کا یہ قول قرآن مجید نے متعدد مقامات پر ذکر کیا ہے۔ سورۂ رعد:۵، مومنون:۳۵، نحل:۶۷، ق:۳، واقعہ:۴۷ اور اس سورہ میں دو مقامات پر اس موقف کا ذکر ہے:

وَقَالُوۡۤا ءَاِذَا ضَلَلۡنَا فِی الۡاَرۡضِ ءَاِنَّا لَفِیۡ خَلۡقٍ جَدِیۡدٍ ...[۱]
اور وہ کہتے ہیں: جب ہم زمین میں ناپید ہو جائیں گے تو کیا ہم نئی خلقت میں آئیں گے؟

دیگر آیات میں بھی ان کے اس موقف کا ذکر کیا ہے: جب ہم خاک ہو جائیں گے تو خاک میں زندگی کیسے آ سکتی ہے۔ ہمارے باپ دادا برسوں سے قبروں میں خاک ہو چکے ہیں۔ کیا وہ بھی زندہ ہو جائیں گے؟

قُلۡ نَعَمۡ وَ اَنۡتُمۡ دَاخِرُوۡنَ ﴿۱۸﴾
فَاِنَّمَا ہِیَ زَجۡرَۃٌ وَّاحِدَۃٌ فَاِذَا ہُمۡ

۱۸۔ کہہ دیجیے: ہاں اور تم ذلیل کر کے (اٹھائے جاؤ گے)۔
۱۹۔ وہ تو بس ایک جھڑکی ہوگی پھر وہ اپنی آنکھوں

---
[۱] ۳۲ سجدہ: ۱۰

يَنۡظُرُوۡنَ ﴿۱۹﴾ سے دیکھیں گے۔

تفسیر آیات

۱۔ قُلۡ نَعَمۡ: کہہ دیجیے: تم زندہ کیے جاؤ گے۔ تم ذلت و خواری کی حالت میں زندہ کیے جاؤ گے۔ جب ان لوگوں کو زندہ کیا جائے گا کہ پوری زندگی اس کا انکار اور اس فکر کا تمسخر اڑاتے رہے ہیں ان کا زندہ کیا جانا خود ایک اہانت ہو گی۔

۲۔ فَاِنَّمَا هِیَ زَجۡرَۃٌ وَّاحِدَۃٌ: کہہ دیجیے کہ تمہارا دوبارہ زندہ کرنا اللہ کے لیے نہ صرف مشکل نہیں ہے بلکہ یہ تو ایک جھڑکی سے زیادہ کا کام نہیں ہے۔ اے منکرو! تمہیں زندہ کرنے کا طریقہ بھی ایسا ہو گا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے غیض و غضب کے ساتھ آنے والی ایک جھڑکی ہو گی۔

۳۔ فَاِذَا هُمۡ يَنۡظُرُوۡنَ: اس خوفناک آواز کے نتیجے میں تم اٹھ جاؤ گے اور دیکھنے لگ جاؤ گے کہ یہ کیا ہو گیا۔ محشر کی ہولناکیاں دیکھ کر تمہاری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔ دوسری جگہ فرمایا:

ثُمَّ نُفِخَ فِیۡهِ اُخۡرٰی فَاِذَا هُمۡ قِیَامٌ يَّنۡظُرُوۡنَ ○ [1] — پھر دوبارہ اس میں پھونک ماری جائے گی تو اتنے میں وہ سب کھڑے ہو کر دیکھنے لگیں گے۔

وَقَالُوۡا يٰوَيۡلَنَا هٰذَا يَوۡمُ الدِّيۡنِ ﴿۲۰﴾ — ۲۰۔ اور کہیں گے: ہائے ہماری تباہی! یہ تو یوم جزا ہے۔

هٰذَا يَوۡمُ الۡفَصۡلِ الَّذِیۡ كُنۡتُمۡ بِهٖ تُكَذِّبُوۡنَ ﴿۲۱﴾ — ۲۱۔ یہ فیصلے کا وہ دن ہے جس کی تم تکذیب کرتے تھے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَقَالُوۡا يٰوَيۡلَنَا: جیسے وہ زندہ ہو جائیں گے اور ہوش میں آ جائیں گے۔ صورت حال ان پر واضح ہو جائے گی۔ حقیقت سامنے آ جائے گی تو بات سمجھ میں آ جائے گی اور کہیں گے: هٰذَا يَوۡمُ الدِّيۡنِ ہائے ہماری رسوائی یہ تو یوم جزا ہے۔

۲۔ هٰذَا يَوۡمُ الۡفَصۡلِ: دوسری طرف ان کو بتا دیا جائے گا۔ ہاں اب تم سمجھ گئے۔ یہ وہی فیصلے کا دن ہے جس کی تم پوری زندگی تکذیب کرتے رہے۔

يَوۡمُ الۡفَصۡلِ سے مراد یہ ہو سکتا ہے کہ آج اس بات کا فیصلہ ہونے والا ہے کہ اہل جنت کون ہیں اور اہل جہنم کون ہیں۔ دوسرا معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آج مومن کو منکر اور مجرم کو متقی سے جدا کرنے والا

---

[1] ۳۹ زمر: ۶۸

دن ہے۔

اہم نکات

۱۔ منکرین، قیامت کے دن ذلت وخواری کے ساتھ محشور ہوں گے۔

۲۔ قیامت برپا کرنے کے لیے ایک زور دار جھڑکی کافی گی۔

اُحۡشُرُوا الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا وَ اَزۡوَاجَہُمۡ وَ مَا کَانُوۡا یَعۡبُدُوۡنَ ﴿۲۲﴾ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ فَاہۡدُوۡہُمۡ اِلٰی صِرَاطِ الۡجَحِیۡمِ ﴿۲۳﴾

۲۲۔ گھیر لاؤ ظلم کا ارتکاب کرنے والوں کو اور ان کے ہم جنسوں کو اور انہیں جن کی یہ پوجا کیا کرتے تھے۔

۲۳۔ اللہ کو چھوڑ کر۔ پھر انہیں جہنم کے راستے کی طرف ہانکو۔

تفسیر آیات

۱۔ اُحۡشُرُوا الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا: مجرمین کی قسمت کا فیصلہ ہونے کے بعد متعلقہ فرشتوں کو یہ حکم ملے گا: درج ذیل گروہوں کو ایک جگہ جمع کرو:

جن لوگوں نے ظلم کا ارتکاب کیا ہے۔ ظلم کا ارتکاب کرنے والوں سے مراد وہ ظالم لوگ ہیں جنہوں نے شرک کا ارتکاب کیا، اس پر ڈٹے رہے اور کفر وشرک کی حالت میں مر گئے۔

۲۔ وَ اَزۡوَاجَہُمۡ: اور ان ظالموں کے ہم جنس لوگوں کو بھی جمع کرو۔ ہم جنس سے مراد وہ شیاطین ہو سکتے ہیں جنہوں نے ان مشرکین کو گمراہ کیا۔

۳۔ وَ مَا کَانُوۡا یَعۡبُدُوۡنَ ۙ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ: اور ان کے معبودوں کو بھی ان کے ساتھ جمع کرو۔ ان کے بتوں، فراعنہ ونمرودوں اور وہ جن کی اطاعت کر کے یہ لوگ گمراہ ہوئے ہیں، کو ایک جگہ جمع کرو۔ ان معبودوں میں ملائکہ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام شامل نہیں ہیں چونکہ ان ہستیوں نے اپنی عبادت کی دعوت نہیں دی۔

۴۔ فَاہۡدُوۡہُمۡ اِلٰی صِرَاطِ الۡجَحِیۡمِ: حکم ہوگا کہ ان سب کی آتش جہنم کی طرف ہدایت کرو۔ جہنم کی طرف ہدایت کرو، ایک تحقیری جملہ ہے۔ جس طرح فَبَشِّرۡہُمۡ بِعَذَابٍ اَلِیۡمٍ "انہیں دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیں" کہنے میں تحقیر وتذلیل ہے۔

وَ قِفُوۡہُمۡ اِنَّہُمۡ مَّسۡـُٔوۡلُوۡنَ ﴿۲۴﴾

۲۴۔ انہیں روکو ان سے پوچھا جائے گا۔

تفسیر آیات

انہیں جہنم کی طرف لے جاتے ہوئے رکنے کا حکم ہوگا کہ ان سے سوال ہوگا۔ مضمون سوال کیا ہو گا؟ بعض کے نزدیک مضمون یہ ہوگا:

اَلَمۡ یَاۡتِکُمۡ رُسُلٌ مِّنۡکُمۡ یَتۡلُوۡنَ عَلَیۡکُمۡ اٰیٰتِ رَبِّکُمۡ ...[1]	کیا تمہارے پاس تم میں سے پیغمبر نہیں آئے تھے، جو تمہارے رب کی آیات تمہیں سناتے....

بعض دیگر مفسرین لکھتے ہیں: ان کے اعمال و عقائد کے بارے میں سوال ہوگا۔

فضائل: اس جگہ از باب تطبیق متعدد روایات موجود ہیں کہ اس مرحلے میں ولایۃ علی علیہ السلام کے بارے میں سوال ہوگا۔ ہم ذیل میں ان روایت کے ساتھ شیعہ سنی مصادر کا ذکر کرتے ہیں:

ابو ہارون العبدی نے ابو سعید خدری سے روایت کی ہے: وَقِفُوۡهُمۡ اِنَّهُمۡ مَّسۡـُٔوۡلُوۡنَ امامت علی بن ابی طالب علیہ السلام کے بارے میں پوچھا جائے گا۔

اس روایت کو دوسرے طریق سے قیس نے ابو ہارون سے، انہوں نے ابو سعید خدری سے روایت کیا ہے۔ اس میں کہا ہے: عن ولایۃ علی بن ابی طالب. ملاحظہ ہو شواھد التنزیل ۲: ۱۶۱، تاریخ بغداد ۸: ۹۵

اس روایت کو حافظ ابن مردویۃ نے چند ایک طرق سے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ ملاحظہ ہو کشف الغمۃ ۱: ۳۱۵ اور حاکم حسکانی نے سعید بن جبیر کی روایت ابن عباس سے نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اذا کان یوم القیامۃ اوقف انا و علیٌّ علی الصراط ، فمایمرُّ بنا احد الاسألناہ عن ولایۃ علی فمن کانت معہ والا القیناہ فی النار و ذلك قولہ: وَقِفُوۡهُمۡ اِنَّهُمۡ مَّسۡـُٔوۡلُوۡنَ ۔[2]	جب قیادت کا دن ہوگا مجھے اور علی کو پل صراط پر بٹھا دیا جائے گا۔ پھر جو شخص بھی گزرے گا اس سے ہم ولایت علی کے بارے میں پوچھیں گے اگر اس کے ساتھ ولایت علی موجود ہے تو درست ورنہ اسے آتش میں پھینک دیں گے اور یہ اللہ کا فرمان ہے: انہیں روکو ان سے پوچھا جائے گا۔

ایک اور روایت میں مغیرہ سے، انہوں نے شعبی سے، انہوں نے حضرت ابن عباس سے یہی مضمون روایت کیا ہے۔ دیگر روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

لا یزول قدم عبد یوم القیامۃ حتی یسئل عن اربعۃ عن عمر فیما افناہ	قیامت کے دن انسان کا کوئی قدم آگے نہیں بڑھے گا جب تک چار چیزوں کے بارے میں سوال نہ ہو۔ اس

---

[1] ۳۹ زمر: ۷۱　　[2] شواھد التنزیل ۲: ۱۱۳

و عن شبابه فيما ابلاه و عن ماله من اين اكتسبه و فيها انفقه و عن حبنا اهل البيت۔[1]

کی عمر کے بارے میں کہ کس چیزیں گزاری۔ اس کے جوانی کے بارے میں کہ اسے کس چیز میں ختم کیا۔ اس کے مال کے بارے میں کہ اسے کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا اور ہم اہل بیت کی محبت کے بارے میں.

اہل سنت کے مصادر میں بھی یہ روایت موجود ہے مگر عن حبنا اهل البيت کی جگہ عن عمله ماذا عمل به ہے۔

آلوسی روح العانی میں اس روایت کے ذکر کے بعد لکھتے ہیں:

و اولى هذه الاقوال ان السوال عن العقائد والاعمال ورأس ذلك لا اله الا اللّٰہ ومن اجله ولاية على كرم اللّٰہ وجهه وكذا ولاية اخوانه الخلفاء الراشدين رضی اللّٰہ تعالیٰ عنهم اجمعين۔

ان اقوال میں بہتر قول یہ ہے کہ سوال عقائد و اعمال سے ہو گا۔ ان میں سب سے اہم لا الہ الا اللہ ہے اور ان میں سب سے جلیل القدر ولایت علی کرم اللہ وجہ ہے اور اسی طرح ان کے برادران خلفائے راشدین کی ولایت ہے۔

ولایت علی علیہ السلام سے سوال تو حدیث کے مطابق ہے مگر دیگر خلفاء کی ولایت مؤلف کی اپنی ذاتی خواہش کے مطابق ہے۔

اہم نکات

۱۔ قیامت کے دن حضرت علی علیہ السلام اور اہل بیت کی ولایت کے بارے میں سوال ہوگا۔

مَا لَكُمْ لَا تَنَاصَرُوْنَ ﴿۲۵﴾

۲۵۔ تمہیں ہوا کیا ہے کہ تم ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے؟

بَلْ هُمُ الْيَوْمَ مُسْتَسْلِمُوْنَ ﴿۲۶﴾

۲۶۔ بلکہ آج تو وہ گردنیں جھکائے (کھڑے) ہیں۔

تفسیر آیات

جب ان جہنمیوں کو جہنم کی طرف لے جایا جائے گا تو کوئی کسی کی مدد کو نہیں پہنچ رہا ہوگا۔ دنیا میں ان دوستوں، سرداروں، پیروں پر کوئی گزند آنے کا خدشہ ہوتا تو تم لوگ اپنی جان نچھاور کرتے اور مؤمنین کے خلاف ملت واحدہ بن کر ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے، آج ایک دوسرے کی مدد کے لیے آگے کیوں نہیں آتے؟

بَلْ هُمُ الْيَوْمَ مُسْتَسْلِمُوْنَ: مگر آج وہ گردن جھکائے بیٹھے ہیں۔ آج تو اپنے آپ کو تباہی کی طرف

----

[1] بحار ۲۷: ۳۱۱

لے جانے والوں کے آسانی سے حوالہ کر رہے ہیں۔ کل دنیا میں اللہ کے سامنے جھکنے میں عار محسوس کرتے تھے۔ اللہ کے رسولؐ کی اطاعت کو تکبر و نخوت کے ساتھ ٹھکراتے تھے اور آج کی رسوائی سے بچنے کے لیے جو نصیحتیں ہوتی تھیں ان کا مذاق اڑاتے تھے۔

وَ اَقۡبَلَ بَعۡضُہُمۡ عَلٰی بَعۡضٍ یَّتَسَآءَلُوۡنَ ﴿۲۷﴾

۲۷۔ اور وہ ایک دوسرے کی طرف رخ کر کے باہم سوال کرتے ہیں۔

تفسیر آیات

ان اہل جہنم میں بعض وہ لوگ جو تابع، مرید اور رعیت رہ چکے ہیں، ان بعض سے سوال کریں گے جو سردار، پیر و مرشد اور لیڈر تھے۔

اس سے آگے چند آیات میں اہل جہنم کے باہمی جھگڑے کا ذکر ہے کیونکہ شکست خوردہ لوگ شکست کے بعد ایک دوسرے سے لڑتے ہیں اور شکست کی ذمے داری ایک دوسرے پر ڈالتے ہیں۔

قَالُوۡۤا اِنَّکُمۡ کُنۡتُمۡ تَاۡتُوۡنَنَا عَنِ الۡیَمِیۡنِ ﴿۲۸﴾

۲۸۔ کہتے ہیں: تم ہمارے پاس طاقت سے آتے تھے۔

تفسیر آیات

الۡیَمِیۡنِ: آیت کے سیاق کے مطابق یہاں طاقت کے معنی میں استعمال ہوا ہے چونکہ اگلی آیت میں ان کے جواب میں کہا گیا: وَ مَا کَانَ لَنَا عَلَیۡکُمۡ مِّنۡ سُلۡطٰنٍ ہمارا تم پر کوئی زور نہ تھا۔

آیت کا مفہوم یہ ہے کہ تابع اور زیر اثر لوگ اپنے سرداروں سے کہیں گے: تم نے طاقت اور اپنے اثر و رسوخ کے ذریعے ہمیں گمراہ کیا۔

قَالُوۡا بَلۡ لَّمۡ تَکُوۡنُوۡا مُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۲۹﴾

۲۹۔ وہ کہیں گے: بلکہ تم خود ایمان لانے والے نہ تھے،

وَ مَا کَانَ لَنَا عَلَیۡکُمۡ مِّنۡ سُلۡطٰنٍ ۚ بَلۡ کُنۡتُمۡ قَوۡمًا طٰغِیۡنَ ﴿۳۰﴾

۳۰۔ ورنہ ہمارا تم پر کوئی زور نہ تھا بلکہ تم خود سرکش لوگ تھے۔

تفسیر آیات

۱۔ سرداروں کا جواب میں یہ کہنا ہے کہ تم خود ایمان کی رغبت نہیں رکھتے تھے۔ ایمان سے تمہاری

محرومی کا سبب ہم نہیں تھے۔تم اگر ایمان لاتے اور اس پر قائم رہتے تو یہ تمہارے لیے ممکن تھا۔

۲۔ وَمَا كَانَ لَنَا عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ: ہمارے بس میں نہیں تھا کہ ہم تم سے ایمان سلب کر لیں۔ اگر کوئی بالادستی تھی بھی تو وہ خود تمہاری طرف سے ہمیں بالادستی ملی۔تم نے خود ہمیں بالادستی دی تھی ورنہ تم ہمارے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے تو ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

۳۔ بَلْ كُنْتُمْ قَوْمًا طٰغِيْنَ: تم خود سرکش لوگ تھے ورنہ ہمارے کہنے پر ایمان کو مسترد نہ کرتے، انبیاء کے خلاف محاذ قائم نہ کرتے، ہمارے خلاف محاذ قائم کرتے۔

فَحَقَّ عَلَيْنَا قَوْلُ رَبِّنَآ ۖ اِنَّا لَذَآئِقُوْنَ ﴿۳۱﴾

۳۱۔ پس ہمارے بارے میں ہمارے رب کا فیصلہ حتمی ہو گیا، اب ہم (عذاب) چکھیں گے۔

تفسیر آیات

چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہمارے خلاف اٹل ہو گیا۔یعنی اللہ تعالیٰ کے حتمی فیصلے کی زد میں آ گئے۔ وہ حتمی فیصلہ یہ تھا کہ جو لوگ کفر پر ڈٹ جاتے اور کفر کی حالت میں مر جاتے ہیں ان کے لیے عذاب لازمی ہے۔

فَاَغْوَيْنٰكُمْ اِنَّا كُنَّا غٰوِيْنَ ﴿۳۲﴾

۳۲۔ پس ہم نے تمہیں گمراہ کیا جب کہ ہم خود بھی گمراہ تھے۔

تفسیر آیات

ہم نے تمہیں اس لیے گمراہ کیا چونکہ خود ہم بھی گمراہ تھے۔ ہم اگر گمراہ نہ ہوتے تو تمہیں گمراہی کی دعوت نہ دیتے۔تم اگر گمراہ نہ ہوتے تو ہماری دعوت پر لبیک نہ کہتے۔

فَاِنَّهُمْ يَوْمَئِذٍ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ ﴿۳۳﴾

۳۳۔ تو اس دن وہ سب کے سب عذاب میں شریک ہوں گے۔

تفسیر آیات

پیر و مرشد بھی مرید بھی، گمراہ کرنے والے بھی اور گمراہ ہونے والے بھی، سب عذاب میں شریک ہوں گے۔ پیر کا یہ عذر نہیں سنا جائے گا کہ مرید خود ایمان لانا نہیں چاہتا تھا اور مرید کا یہ عذر نہیں سنا جائے گا

کہ اسے پیر نے مجبور کیا۔

اِنَّا كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ ۝٣٤   ۳۴۔ہم مجرموں کے ساتھ یقیناً ایسا ہی کیا کرتے ہیں۔

تفسیر آیات

مجرمین کے ساتھ یہ سلوک اس لیے کرتے ہیں:

اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا ۭ لَا يَسْتَوٗنَ ۝ [1]   بھلا جو مومن ہو وہ فاسق کی طرح ہو سکتا ہے؟ یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔

جب ان دونوں کا برابر ہونا ممکن نہیں ہے تو مومن کو ثواب نہ دینا اور کافر کو عذاب نہ دینا ممکن نہیں ہے۔

اِنَّهُمْ كَانُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ۙ يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝٣٥   ۳۵۔ جب ان سے کہا جاتا تھا: اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں تو یہ تکبر کرتے تھے،

تفسیر آیات

پتھر کے سامنے جھکنے میں عار نہیں آتا تھا۔ رب العالمین کی وحدانیت کا اقرار کرنے میں اس لیے تکبر کرتے تھے کہ عبد اللہ کے یتیم کے کہنے پر ہم کلمہ توحید کا اقرار کیوں کریں!

وَيَقُوْلُوْنَ اَئِنَّا لَتَارِكُوْٓا اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ ۝٣٦   ۳۶۔اور کہتے تھے: کیا ہم ایک دیوانے شاعر کی خاطر اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں؟

تفسیر آیات

رسول اللہ ﷺ کا کہا ماننے سے تکبر ان کے دامن گیر ہوتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو ان کے مقابلے میں عاجز اور کمتر پاتے تھے۔ اس احساس کمتری، حقارت اور حسد کی وجہ سے وہ جذبہ انتقام سے لبریز رہتے تھے۔ ان جذبات و احساسات کا ردعمل تکبر کی صورت میں سامنے آیا کیونکہ وہ پہنچنے والے اپنے احساسِ حقارت کو تکبر کے ذریعے کم کرنا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے دیگر حربوں کا استعمال بھی جاری رکھا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے جو کلام پیش کیا اسے شعر اور خود رسول ﷺ کو شاعر اور مجنون کہنا اس احساس حقارت و کمتری کا انتقامی حربہ تھا ورنہ بہتر طریقے سے جانتے تھے کہ یہ کلام شعر ہے اور نہ یہ رسول مجنون۔

---

[1] ۳۲ سجدہ: ۱۸

بَلۡ جَآءَ بِالۡحَقِّ وَ صَدَّقَ الۡمُرۡسَلِیۡنَ ﴿۳۷﴾

۳۷۔ (نہیں) بلکہ وہ حق لے کر آئے ہیں اور اس نے رسولوں کی تصدیق کی ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ یہ رسول نہ شاعر ہے، نہ مجنون بلکہ وہ حق لے کر آئے ہیں اور حق کی طرف دعوت دے رہے ہیں۔ ان کا پیغام خود اس بات کا شاہد ہے کہ یہ حق کا پیغام ہے۔

۲۔ وَصَدَّقَ الۡمُرۡسَلِیۡنَ: یہ کوئی نرالی بات نہیں سنا رہے ہیں۔ گزشتہ انبیاء کے پیغامات کے تسلسل کی ایک کڑی ہے۔ دلیل یہ ہے کہ ان تمام مرسلین کی تصدیق کرتے ہیں اور وہی بات کر رہے ہیں جو گزشتہ تمام انبیاء کرتے آئے ہیں۔

اِنَّکُمۡ لَذَآئِقُوا الۡعَذَابِ الۡاَلِیۡمِ ﴿۳۸﴾

۳۸۔ بتحقیق تم دردناک عذاب چکھنے والے ہو۔

وَ مَا تُجۡزَوۡنَ اِلَّا مَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۳۹﴾

۳۹۔ اور تمہیں صرف اس کی جزا ملے گی جو تم کرتے تھے۔

تفسیر آیات

اے منکرو! تم نے آج دردناک عذاب چکھنا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ اپنے جذبہ انتقام کو ٹھنڈا کرنے کے لیے عذاب دے گا بلکہ اس عذاب کا موجب خود تمہارا عمل ہے جو تمہیں ستا رہا ہے۔

اِلَّا عِبَادَ اللّٰہِ الۡمُخۡلَصِیۡنَ ﴿۴۰﴾

۴۰۔ سوائے اللہ کے مخلص بندوں کے۔

تفسیر آیات

سوائے ان بندوں کے جنہیں اللہ نے اپنے لیے خالص بنایا۔ ان کے عمل، ارادوں اور ان کی خواہش میں غیر اللہ کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ مخلَص، بفتح لام وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے خالص بنایا ہے اور مخلِص بکسر لام وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو اللہ کے لیے خالص بنایا ہے۔

جب انسان مخلِص ہوتا ہے اور اس کے اخلاص کو اللہ قبول فرماتا ہے تو اس کے بعد اللہ تعالیٰ اسے اپنے لیے مخلَص بناتا ہے۔ پہلے مخلِص ہوتا ہے، بعد میں مخلَص۔

أُولَٰئِكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَعْلُومٌ ﴿٤١﴾

۴۱۔ ان کے لیے ایک معین رزق ہے،

فَوَاكِهُ ۖ وَهُمْ مُكْرَمُونَ ﴿٤٢﴾

۴۲۔ (ہر قسم کے) میوے اور وہ احترام کے ساتھ ہوں گے

تفسیر آیات

رزق کا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ ان مخلص بندوں کا رزق دوسروں سے مختلف اور متعین ہو۔ وہ اگرچہ فَوَاكِهُ میوے ہوں گے نام اور عنوان وہی ہوگا مگر لذت اور خصوصیات دوسروں سے مختلف ہوں گی۔ مثلاً جنت میں حضرت رسول کریم ﷺ اور حضرت خدیجہ الکبری سلام اللہ علیہا دونوں ایک ساتھ رہتے ہوئے ایک دسترخوان پر کھانا تناول فرما رہے ہوں گے لیکن لذت اور خصوصیات درجے کے مطابق ہوں گی۔ پھر یہ میوے غذا کے طور پر نہ ہوں گے۔ جنت میں انسانی جسم دنیا کی طرح تحلیل نہ ہوگا کہ غذا کی ضرورت پڑے بلکہ صرف لذت کے لیے ہوں گے۔

فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ ﴿٤٣﴾

۴۳۔ نعمتوں والی جنت میں۔

تفسیر آیات

یہ میوے نعمت بھری جنت میں صرف لذت کے لیے ہوں گے اور یہ نعمتیں کمانا نہیں پڑیں گی جیسے دنیا میں ہے بلکہ صرف ارادہ کرنا ہوگا۔ جنت کی نعمت کی یہ خصوصیت ہوگی کہ صرف ارادے سے میسر آ جائے۔

عَلَىٰ سُرُرٍ مُتَقَابِلِينَ ﴿٤٤﴾

۴۴۔ وہ تختوں پر ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوں گے۔

تفسیر آیات

ان نعمتوں میں سے ایک اہم نعمت کا ذکر ہے کہ دوستوں کی محفل برپا ہو گی اور مسندوں پر ایک دوسرے کے روبرو بیٹھ کر مختلف موضوعات پر گفتگو کرنے میں بھی ایک خاص لذت ہے۔ خصوصاً یہ گفتگو گزشتہ دنیوی زندگی کی تلخیوں اور مختلف آزمائش میں کامیابیوں کے ذکر پر ہو اور دیگر ایسے لوگوں کو کا بھی ذکر آئے جو دنیا میں ان کے ساتھ اس دن کے بارے میں اختلاف اور دشمنی کرتے تھے۔

يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِكَأْسٍ مِنْ مَعِينٍ ﴿٤٥﴾

۴۵۔ بہتی شراب کے جام ان میں پھرائے جائیں گے۔

تفسیر آیات

بِكَأْسٍ: جس پیالے میں شراب موجود ہو عربی میں اسے کأس کہتے ہیں اور جس میں شراب نہ ہو اسے قدح کہتے ہیں۔ لہٰذا لفظ کأس، ساغر یا جام کہنے سے شراب خود ذہن میں آتی ہے۔ جنت کی پاکیزہ شراب پینے کے لیے کچھ کرنا نہیں پڑے گا صرف اس کا ارادہ کافی ہے جس پر جام بھر بھر کے ان کے درمیان پھرائے جائیں گے۔

مَّعِيْنٍ: جاری کے معنوں میں ہے۔ شراب کے چشمے جاری ہوں گے جن سے جام بھرنے کی بھی ضرورت نہ ہوگی بلکہ جام پھرائے جا رہے ہوں گے۔

بَيْضَآءَ لَذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ ﴿۴۶﴾ ۴۶۔ جو چمکتی ہوگی، پینے والوں کے لیے لذیذ ہوگی۔

تفسیر آیات

۱۔ یہ پاکیزہ شراب چمکدار ہوگی۔ ہر قسم کی گندگیوں سے پاک اور شفاف ہوگی۔

۲۔ لَذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ: اپنے پینے والوں کے لیے مجسمہ لذت ہوگی جس میں کسی قسم کی منفی خاصیت کا شائبہ تک نہ ہوگا البتہ سرور حاصل ہوگا۔

لَا فِيْهَا غَوْلٌ وَّ لَا هُمْ عَنْهَا يُنْزَفُوْنَ ﴿۴۷﴾ ۴۷۔ جس میں نہ سر درد ہوگا اور نہ ہی اس سے ان کی عقل زائل ہوگی۔

تشریح کلمات

غَوْلٌ: (غ و ل) کسی کو بے خبری میں ہلاک کرنا۔ العین میں آیا ہے الغول: الصداع۔ غول سر درد کو کہتے ہیں۔

يُنْزَفُوْنَ: (ن ز ف) نزف الماء کے معنی ہیں۔ کنویں سے تدریجا سارا پانی کھینچ لینا۔ اس سے مست اور عقل زائل ہونے کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

تفسیر آیات

اس پاکیزہ شراب میں وہ منفی خاصیتیں نہ ہوں گی جو دنیوی شراب میں ہوتی ہیں۔ نہ اس میں بدبو

ہوگی، نہ ذائقہ میں تلخی، نہ صحت پر برے اثرات مترتب ہوں گے، نہ اس سے عقلی نقصانات ہوں گے، نہ یہ کہ نشہ اترنے پر خمار میں مبتلا ہوگا۔ لہٰذا جنت کی شراب میں کیف و سرور ہوگا لیکن نہ جسمانی نقصانات ہوں گے نہ عقلی۔ دنیوی شراب سے تو انسان کی شریانیں، معدہ، گردے اور جگر متاثر ہوتے ہیں۔ ان تمام خرابیوں کو ایک وقتی سرور کی خاطر برداشت کیا جاتا ہے۔

وَ عِنۡدَہُمۡ قٰصِرٰتُ الطَّرۡفِ عِیۡنٌ ﴿۴۸﴾

۴۸۔ اور ان کے پاس نگاہ نیچے رکھنے والی بڑی آنکھوں والی عورتیں ہوں گی۔

تفسیر آیات

۱۔ عورتوں کی بنیادی خصوصیت کا ذکر ہے کہ ان کی نگاہیں صرف اپنے شوہر تک محدود ہوں گی۔ یعنی عفت کا تصور جنت میں بایں معنی ہوگا کہ یہ عورتیں اپنے شوہروں کی قدر و قیمت کو خوب جانتی ہوں گی۔

۲۔ عِیۡنٌ: بڑی آنکھوں والی۔ یہ ان کے حسن کی طرف اشارہ ہے۔ عفت و چاہت کے ساتھ جمالی اعتبار سے بھی کمال درجے کی ہوں گی۔

کَاَنَّہُنَّ بَیۡضٌ مَّکۡنُوۡنٌ ﴿۴۹﴾

۴۹۔ گویا کہ وہ محفوظ انڈے ہیں۔

تفسیر آیات

عربوں میں یہ محاورہ ہے کہ وہ گوری عورت کو حسن و جمال اور صفائی میں انڈے کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں۔ مَّکۡنُوۡنٌ سے ایک اہم خصوصیت سامنے آتی ہے کہ وہ ایسی محفوظ و مستور ہیں کہ نہ کسی کا ہاتھ لگا ہے، نہ آلودہ ہیں۔

فَاَقۡبَلَ بَعۡضُہُمۡ عَلٰی بَعۡضٍ یَّتَسَآءَلُوۡنَ ﴿۵۰﴾

۵۰۔ پھر وہ آمنے سامنے بیٹھ کر آپس میں باتیں کریں گے۔

تفسیر آیات

احباب کی محفل میں گفتگو کا انداز یہی ہوا کرتا ہے۔ کسی سے کوئی سوال ہوا، اس نے جواب میں ساری کہانی سنا دی۔

قَالَ قَآئِلٌ مِّنۡهُمۡ اِنِّیۡ کَانَ لِیۡ قَرِیۡنٌ ﴿۵۱﴾

۵۱۔ ان میں سے ایک کہنے والا کہے گا: میرا ایک ہم نشین تھا۔

یَّقُوۡلُ اَئِنَّکَ لَمِنَ الۡمُصَدِّقِیۡنَ ﴿۵۲﴾

۵۲۔ جو (مجھ سے) کہتا تھا: کیا تم (قیامت کی) تصدیق کرنے والوں میں سے ہو؟

ءَاِذَا مِتۡنَا وَ کُنَّا تُرَابًا وَّ عِظَامًا ءَاِنَّا لَمَدِیۡنُوۡنَ ﴿۵۳﴾

۵۳۔ بھلا جب ہم مر چکیں گے اور مٹی اور ہڈیاں ہو جائیں گے تو کیا ہمیں جزا ملے گی؟

تفسیر آیات

اہل جنت باہمی گفتگو میں مصروف ہوں گے۔ اسی دوران ایک جنتی مومن اپنی دنیوی زندگی کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنے ایک کافر ساتھی کا ذکر چھیڑے گا جو اس بات پر اس کا مذاق اڑاتا تھا کہ وہ مؤمن قیامت اور حیات بعد از ممات کا معتقد تھا اور وہ کافر اسی بات کی رٹ لگاتا تھا جو ہر کافر اور منکر لگاتا ہے کہ جب ہم خاک ہو جائیں گے تو کسی جزا سزا کے لیے کیسے اٹھائے جائیں گے۔

قَالَ هَلۡ اَنۡتُمۡ مُّطَّلِعُوۡنَ ﴿۵۴﴾

۵۴۔ ارشاد ہوگا: کیا تم دیکھنا چاہتے ہو؟

فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِیۡ سَوَآءِ الۡجَحِیۡمِ ﴿۵۵﴾

۵۵۔ پھر اس نے جھانکا تو اسے وسط جہنم میں دیکھے گا۔

قَالَ تَاللّٰهِ اِنۡ کِدۡتَّ لَتُرۡدِیۡنِ ﴿۵۶﴾

۵۶۔ کہے گا: قسم بخدا قریب تھا کہ تو مجھے بھی ہلاک کر دے۔

وَ لَوۡلَا نِعۡمَةُ رَبِّیۡ لَکُنۡتُ مِنَ الۡمُحۡضَرِیۡنَ ﴿۵۷﴾

۵۷۔ اور اگر میرے رب کی نعمت نہ ہوتی تو میں بھی (عذاب میں) حاضر کیے جانے والوں میں ہوتا۔

تفسیر آیات

اہل جنت اور اہل جہنم کی باہمی گفتگو سے یہ بات سامنے آتی ہے آخرت میں زمان و مکان کا وہ تصور نہ ہوگا جو دنیا میں ہے اور نہ کوئی انسان یہ سوال کر سکتا ہے کہ جہنم جنت کے اس قدر نزدیک ہے کہ ایک دوسرے کو دیکھ سکیں اور آپس میں گفتگو کر سکیں؟ جب کہ ہماری دنیا کے پیمانے کے مطابق جنت اور جہنم میں فاصلہ ہمارے تصور سے زیادہ ہوگا بلکہ ایک جنتی کو جتنی جگہ ملتی ہے وہ بھی ہمارے تصور سے زیادہ ہے۔

اَفَمَا نَحۡنُ بِمَیِّتِیۡنَ ﴿۵۸﴾ ۵۸۔ کیا اب ہمیں نہیں مرنا؟

اِلَّا مَوۡتَتَنَا الۡاُوۡلٰی وَ مَا نَحۡنُ بِمُعَذَّبِیۡنَ ﴿۵۹﴾ ۵۹۔ ہماری پہلی موت کے بعد ہمیں کوئی اور عذاب نہ ہو گا؟

تفسیر آیات

مجمع البیان میں اس آیت کی دو تفسیریں بیان ہوئی ہیں:

i۔ یہ مومن اپنے ہم نشین سے بعنوان ملامت کہے گا: کیا تو دنیا میں نہیں کہا کرتا تھا کہ ہم صرف ایک بار مریں گے۔ وہی موت جو دنیا میں ہمیں آتی ہے اور ہمیں کوئی عذاب نہیں ملے گا۔ اب تجھے معلوم ہوا تیری یہ باتیں درست نہیں تھیں۔

ii۔ یہ اہل جنت کی باہمی گفتگو ہو گی۔ وہ جنت کی دائمی نعمتوں سے اظہار سرور کے طور پر یہ جملے کہیں گے اسی لیے بعد میں کہا: اِنَّ ھٰذَا لَھُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ ۔ یقیناً یہ عظیم کامیابی ہے۔ اس باہمی گفتگو کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس جنت میں مرنے والے نہیں ہیں سوائے اس ایک موت کے جو دنیا میں آ گئی تھی۔ اب ہمیں کوئی عذاب نہ ہو گا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ہم سے وعدہ فرمایا ہے۔

میرے نزدیک دوسری تفسیر زیادہ قرین واقع ہے۔ رہا یہ سوال کہ اس گفتگو میں صرف ایک موت کا ذکر ہے جبکہ دوسری آیت میں دو موت کا ذکر ہے:

رَبَّنَاۤ اَمَتَّنَا اثۡنَتَیۡنِ وَ اَحۡیَیۡتَنَا اثۡنَتَیۡنِ ...[1] اے ہمارے پروردگار! تو نے ہمیں دو مرتبہ موت اور دو مرتبہ زندگی دی ہے....،

اس کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ دنیوی زندگی کا خاتمہ تو ایک موت سے ہوا ہے۔ رہی وہ موت جو برزخی زندگی کے بعد واقع ہوئی ہے، وہ مکمل زندگی نہ تھی، تھوڑی دیر کے لیے تھی۔

اِنَّ ھٰذَا لَھُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ ﴿۶۰﴾ ۶۰۔ یقیناً یہ عظیم کامیابی ہے۔

تفسیر آیات

اس کامیابی کی عظمت اس کی ابدیت اور دوام سے معلوم ہوتی ہے۔ اگر وہ مدت لا محدود اور ابدی ہے تو اس صورت میں اس کامیابی کی عظمت بھی لا محدود ہو گی۔

---

[1] ۴۰ غافر: ۱۱

لِمِثۡلِ ہٰذَا فَلۡیَعۡمَلِ الۡعٰمِلُوۡنَ ﴿۶۱﴾ ۶۱۔ عمل کرنے والوں کو ایسی ہی کامیابی کے لیے عمل کرنا چاہیے۔

تفسیر آیات

ہر صاحب عقل کے لیے ایک فکر انگیز دعوت ہے کہ اگر مسئلہ ایک مدت سے مربوط ہو تو انسان کہہ سکتا ہے کہ اسے گزار لیں گے۔ بقول سعدی چون میگذرد غم نیست۔ چونکہ گزر جانا ہے، غم نہیں ہے لیکن اگر مسئلہ ابدی اور دائمی اور نہ ختم ہونے والی زندگی سے متعلق ہو تو اس ابدی زندگی کے لیے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہیے۔ خاص طور پر دنیا کی اس پرُ آشوب زندگی کے ہر لمحہ کے مقابلے میں جنت کی زندگی کے اربوں سال کی سعادت ملنا ہو تو لِمِثۡلِ ہٰذَا فَلۡیَعۡمَلِ الۡعٰمِلُوۡنَ۔

اَذٰلِکَ خَیۡرٌ نُّزُلًا اَمۡ شَجَرَۃُ ۶۲۔ کیا یہ مہمانی اچھی ہے یا زقوم کا درخت؟

تفسیر آیات

زقوم ایک درخت کا نام ہے جس کا مزہ بہت تلخ ہوتا ہے۔ بدبودار ہے اور توڑنے کی صورت میں دودھ جیسا رس نکلتا ہے۔ جسم کو لگ جائے تو ورم ہو جاتا ہے۔

موازنہ ہے اللہ کے مخلص بندوں اور منکرین کا۔ مخلص بندوں کے لیے جنت کی نعمتوں میں کیف و سرور کی زندگی ہے اور منکرین کے لیے زقوم جیسی چیزوں سے سروکار ہوگا۔

اِنَّا جَعَلۡنٰہَا فِتۡنَۃً لِّلظّٰلِمِیۡنَ ﴿۶۳﴾ ۶۳۔ ہم نے اسے ظالموں کے لیے ایک آزمائش بنا دیا ہے۔

تفسیر آیات

فتنہ اگر آزمائش کے معنوں میں لیا جائے تو آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ کون اسے سن کر اس کی تصدیق کرتا ہے اور کون تکذیب۔ اس کا دوسرا ترجمہ یہ ہو سکتا ہے کہ ہم نے اسے ظالموں کے لیے عذاب بنا دیا ہے۔ اس صورت میں فتنہ سے مراد عذاب ہوگا جیسے اس آیت میں ہے:

عَلٰی خَوۡفٍ مِّنۡ فِرۡعَوۡنَ وَ مَلَا۠ئِہِمۡ اَنۡ یَّفۡتِنَہُمۡ ...[۱] فرعون اور اس کے سرداروں کے خوف کی وجہ سے کہ کہیں وہ انہیں مصیبت سے دوچار نہ کر دیں۔

---

[۱] ۱۰ یونس: ۸۳

اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخۡرُجُ فِيۡۤ اَصۡلِ الۡجَحِيۡمِ ﴿۶۴﴾ ۶۴۔ یہ ایسا درخت ہے جو جہنم کی تہ سے نکلتا ہے۔

تفسیر آیات

اَصۡلِ: سے مراد تہ ہے۔ یعنی درخت جہنم کی تہ میں اُگے گا۔ سوال یہ ہے کہ آتش کے درمیان درخت کیسے؟ جواب یہ ہے کہ یہ درخت ہی آتشیں ہو گا۔ ثانیاً آخرت کے قانونِ طبیعت کو دنیا کے فیزیکل قوانین پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ کافروں کو آتش جہنم میں زندہ رکھنا دنیوی اعتبار سے کیسے ممکن ہے؟

طَلۡعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوۡسُ الشَّيٰطِيۡنِ ﴿۶۵﴾ ۶۵۔ اس کے خوشے شیاطین کے سروں جیسے ہیں۔

تفسیر آیات

اگر چہ شیطان کے سروں کو کسی نے نہیں دیکھا کہ ان کے ساتھ تشبیہ دی جائے تاہم لوگوں کے ذہنوں میں شیاطین کے بارے میں یہ خیال مسلمہ ہے کہ وہ کریہ المنظر ہوتے ہیں اور فرشتے نہایت حسین و جمیل۔ اس لیے یہ تشبیہ درست ہے۔

فَاِنَّهُمۡ لَاٰكِلُوۡنَ مِنۡهَا فَمَالِـُٔوۡنَ مِنۡهَا الۡبُطُوۡنَ ﴿۶۶﴾ ۶۶۔ پھر وہ اس میں سے کھائیں گے اور اس سے پیٹ بھریں گے۔

تفسیر آیات

جہنم میں ہر قسم کا عذاب ہو گا۔ ان میں سے ایک عذاب بھوک ہے۔ اپنی بھوک مٹانے کے لیے اس درخت کی طرف لپکیں گے تو اس کی تلخی اور اس کے جھلسا دینے والے رس کی وجہ سے پیاس کی شدت میں اضافہ ہو گا۔

ثُمَّ اِنَّ لَهُمۡ عَلَيۡهَا لَشَوۡبًا مِّنۡ حَمِيۡمٍ ﴿۶۷﴾ ۶۷۔ پھر ان کے لیے اس پر کھولتا ہوا پانی ملا دیا جائے گا۔

تفسیر آیات

اس درخت سے کھانے پر جو سوزش ہو گی اسے دور کرنے کے لیے پانی پینا پڑے گا لیکن پانی بھی

کھولتا ہوا ملے گا تو دونوں کی سوزش آپس میں مل جائے گی۔ شوباً (خلط) اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔

ثُمَّ اِنَّ مَرۡجِعَهُمۡ لَاۡ اِلَی الۡجَحِیۡمِ ﴿۶۸﴾

۶۸۔ پھر ان کا ٹھکانا بہر صورت جہنم ہوگا۔

تفسیر آیات

شجرہ زقوم اور کھولتے پانی کی سوزش کے بعد انہیں کچھ آرام کا موقع ملے گا؟ نہیں۔ ان کا ٹھکانا تو آتش دوزخ ہی ہے۔ بتانا یہ مقصود ہے کہ انہیں آتش جہنم سے خلاصی نہیں ملے گی۔ ایک عذاب سے دوسرے عذاب کی طرف منتقل ہوتے رہیں گے۔

اِنَّهُمۡ اَلۡفَوۡا اٰبَآءَهُمۡ ضَآلِّیۡنَ ﴿۶۹﴾

۶۹۔ بلا شبہ انہوں نے اپنے باپ دادا کو گمراہ پایا۔

فَهُمۡ عَلٰۤی اٰثٰرِهِمۡ یُهۡرَعُوۡنَ ﴿۷۰﴾

۷۰۔ پھر وہ ان کے نقش قدم پر دوڑ پڑے۔

تشریح کلمات

اَلۡفَوۡا: (ل ف ی) الفیت کے معنی کسی چیز کو پالینے کے ہیں

یُهۡرَعُوۡنَ: (ھ ر ع) ھرع سختی سے ہانکنے کے معنی میں ہے۔

تفسیر آیات

ان کے اس دردناک عذاب میں مبتلا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ کے رسولوں کی طرف سے اتمام حجت کے باوجود اپنی آبائی اندھی تقلید پر ڈٹے رہے۔ اگرچہ اپنے باپ دادا کو گمراہ راستوں پر پایا مگر وہ ہدایت کی طرف آنے کا نام نہیں لیتے تھے۔

فَهُمۡ عَلٰۤی اٰثٰرِهِمۡ یُهۡرَعُوۡنَ: یہ لوگ ان گمراہ لوگوں کے نقش قدم پر چلنے میں لپک جاتے ہیں۔ انبیاء کی دعوت پر توجہ دینے کی بجائے وہ اس گمراہی کی طرف چل دوڑتے ہیں۔

وَ لَقَدۡ ضَلَّ قَبۡلَهُمۡ اَکۡثَرُ الۡاَوَّلِیۡنَ ﴿۷۱﴾

۷۱۔ اور تحقیق ان سے پہلے اگلوں کی اکثریت گمراہ ہو چکی ہے۔

تفسیر آیات

اس آیت سے آگے انبیاء علیہم السلام کی تاریخ پر ایک طائرانہ نظر ہے کہ کس طرح انبیاء علیہم السلام ان کی طرف

مبعوث ہوئے لیکن امتوں نے انبیاء علیہم السلام کی تکذیب کی اور اپنی گمراہی پر قائم رہے۔

وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا فِیۡہِمۡ مُّنۡذِرِیۡنَ ﴿۷۲﴾

۷۲۔اور ہم نے ان میں تنبیہ کرنے والے (رسول) بھیجے تھے۔

تفسیر آیات

حالانکہ ہم نے ان کی رہنمائی کرنے اور گمراہی سے بچنے کی تنبیہ کرنے والے انبیاء بھیجے تھے۔

مشرک اور گمراہ لوگوں کو پہلے تنبیہ کی جاتی ہے۔ اکثر قومیں گمراہی میں ہوتی ہیں لہٰذا انذار کا پلّہ ہمیشہ بھاری ہوتا ہے، بشارت کی نوبت بعد میں آتی ہے اور لوگوں کی قلیل تعداد کو بشارت ملتی ہے۔

فَانۡظُرۡ کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الۡمُنۡذَرِیۡنَ ﴿۷۳﴾

۷۳۔پھر دیکھو کہ تنبیہ شدگان کا کیا انجام ہوا۔

تفسیر آیات

ان اقوام کی سرگزشت کا مطالعہ کر کے دیکھ لو کہ ان کا کیا انجام ہوا۔ ظاہر ہے اس کا جواب یہ ہے کہ ان سب کی عاقبت تباہی پر منتج ہوگئی، سوائے ان بندوں کے جن کا ذکر اگلی آیت میں آ رہا ہے۔

اِلَّا عِبَادَ اللّٰہِ الۡمُخۡلَصِیۡنَ ﴿۷۴﴾

۷۴۔سوائے اللہ کے مخلص بندوں کے۔

تفسیر آیات

سوائے ان بندوں کے جنہوں نے اپنے آپ کو اللہ کے لیے خالص کیا تو اللہ نے بھی ان کو اپنے لیے مخلص بنایا۔

وَلَقَدۡ نَادٰىنَا نُوۡحٌ فَلَنِعۡمَ الۡمُجِیۡبُوۡنَ ﴿۷۵﴾

۷۵۔اور نوح نے ہمیں پکارا تو دیکھا کہ ہم کیسے بہترین جواب دینے والے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ حضرت آدم علیہ السلام کے بعد دوسرے ابو البشر اور پہلے اول العزم رسول حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر ہے

جنہوں نے پوری قوم کو توحید کی دعوت دی:

فَلَمۡ یَزِدۡهُمۡ دُعَآءِیۡۤ اِلَّا فِرَارًا ۝ [1] لیکن میری دعوت نے ان کے گریز میں اضافہ ہی کیا،

تو جب اپنی قوم سے مایوس ہوئے تو اللہ تعالیٰ کو پکارا

فَدَعَا رَبَّهٗۤ اَنِّیۡ مَغۡلُوۡبٌ فَانۡتَصِرۡ ۝ [2] پس نوح نے اپنے رب کو پکارا: میں مغلوب ہو گیا ہوں پس تو انتقام لے۔

۲۔ فَلَنِعۡمَ الۡمُجِیۡبُوۡنَ: چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو بہتر جواب دیا اور انہیں غرق کر کے ان سے انتقام لیا۔ حضرت آیۃ اللہ شیخ محمد الحسین کاشف الغطاء اس گمان کا اظہار کرتے ہیں کہ طوفانِ نوح آسمان سے ایک بہت بڑا پتھر سمندر میں گرنے سے آیا تھا۔

وَ نَجَّیۡنٰهُ وَ اَهۡلَهٗ مِنَ الۡکَرۡبِ الۡعَظِیۡمِ ﴿۟ۖ۷۶﴾ ۷۶۔ اور ہم نے انہیں اوران کے گھر والوں کو عظیم مصیبت سے بچایا۔

تفسیر آیات

کَرۡبِ الۡعَظِیۡمِ: سے مراد طوفان ہے۔ اور اَهۡلَهٗ سے مراد ان کی اولاد ہوسکتی ہے۔ چنانچہ سورہ ہود کی آیات ۴۵۔ ۴۶ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے حضرت نوح علیہ السلام سے یہ وعدہ فرمایا تھا کہ ان کے گھر کے افراد کو نجات دی جائے گی:

رَبِّ اِنَّ ابۡنِیۡ مِنۡ اَهۡلِیۡ وَ اِنَّ وَعۡدَكَ الۡحَقُّ ... اے میرے پروردگار! میرا بیٹا میرے گھر والوں میں سے ہے اور یقیناً تیرا وعدہ سچا ہے۔

جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا۔

اِنَّهٗ لَیۡسَ مِنۡ اَهۡلِكَ ... بے شک یہ آپ کے گھر والوں میں سے نہیں ہے۔

اس جگہ دوسرے مؤمنین کی نجات کا ذکر نہیں ہے جنہیں نوح علیہ السلام کے ساتھ نجات دی گئی تھی کیونکہ اس جگہ نجات سے مراد یہ ہوسکتی ہے کہ وہ ہوں جن سے انسانی نسل آگے بڑھی ہے اور وہ ان کی اولاد ہے۔ اس پر اگلی آیت قرینہ بن سکتی ہے۔

وَ جَعَلۡنَا ذُرِّیَّتَهٗ هُمُ الۡبٰقِیۡنَ ﴿۫ۖ۷۷﴾ ۷۷۔ اور ان کی نسل کو ہم نے باقی رہنے والوں میں رکھا۔

---

[1] ۷۱ نوح: ۶ [2] ۵۴ قمر: ۱۰

تفسیر آیات

کہتے ہیں طوفان کے بعد حضرت نوح علیہ السلام ہی کی اولاد باقی رہی اس لیے حضرت نوح علیہ السلام کو آدم علیہ السلام کے بعد دوسرا ابو البشر کہتے ہیں۔

ترمذی و دیگر اصحاب سنن نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

نوح کی اولاد میں سے سام عرب کا باپ، حام حبش کا باپ، یافث اہل روم کا باپ ہے۔

لیکن ایک رائے یہ ہے کہ زمین پر موجود تمام انسان نوح علیہ السلام کی اولاد سے نہیں ہیں۔[1] حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے کہ وَجَعَلۡنَا ذُرِّیَّتَہٗ ہُمُ الۡبٰقِیۡنَ ہم نے نوح کی نسل کو باقی رہنے والوں میں رکھا سے مراد یہ ہے کہ حق، نبوت، کتاب اور ایمان ان کی نسل میں رکھا ہے اور روئے زمین پر موجود سب اولاد آدم ہیں، حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد نہیں ہیں۔[2]

وَ تَرَکۡنَا عَلَیۡہِ فِی الۡاٰخِرِیۡنَ ﴿۷۸﴾ ۷۸۔ اور ہم نے آنے والوں میں ان کے لیے (ذکر جمیل) باقی رکھا۔

تفسیر آیات

یعنی ترکنا علیہ ذکرا جمیلاً آنے والوں میں قیامت تک ان کے لیے ذکر جمیل باقی رکھا اور وہ ذکر جمیل یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کا ہزاروں برس سے آج تک دنیا میں ذکر خیر ہے اور قیامت تک پوری دنیا میں ان کا ذکر جمیل باقی رہے گا۔

سَلٰمٌ عَلٰی نُوۡحٍ فِی الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۷۹﴾ ۷۹۔ تمام عالمین میں نوح پر سلام ہو۔

تفسیر آیات

وہ ذکر جمیل جو آخرین میں باقی رکھا گیا ہے، یہ ہے کہ پوری دنیا میں نوح علیہ السلام پر سلام ہو۔ چنانچہ عالمین میں ان کا ذکر باقی ہے اور ذکر کے ساتھ سلام بھی ہے۔ جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام تمام انبیاء علیہم السلام میں سب طویل عرصے، ۹۵۰ سال تک اپنی قوم میں تبلیغ فرماتے رہے۔ اس لیے ان کے ذکر جمیل کو بھی اللہ تعالیٰ نے قیامت تک باقی رکھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے جلیل القدر نبی کو آپ کا شیعہ قرار دیا۔ آپ کے شیعہ ابراہیم خلیل علیہ السلام ابو الانبیاء قرار پائے اور نبوت و ہدایت کا سلسلہ تا قیام قیامت جاری ہے۔

---

[1] البحر المحیط [2] تفسیر قمی

اِنَّا كَذٰلِكَ نَجۡزِی الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۸۰﴾　　۸۰۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسے ہی جزا دیتے ہیں۔

تفسیر آیات

حضرت نوح علیہ السلام کو عالمین میں یہ مقام کیسے مل گیا، اس کی وجہ اور سبب کا ذکر ہے۔ جیسے نوح علیہ السلام کا جہاد طویل تھا اللہ نے انہیں عظیم مرتبہ عنایت فرمایا۔ جس طویل مشقت سے آپ علیہ السلام نے توحید کی تحریک چلائی، اس تحریک کو اللہ نے دوام بخشا۔ یہ ایک مثال سب کے لیے ہے کہ جو راہ خدا میں قدم اٹھاتا ہے اسے اللہ جزائے خیر سے نوازتا ہے اگرچہ وہ نوح علیہ السلام کے مرتبے کو نہیں پہنچ سکتا تاہم اللہ احسان کرنے والوں کو احسان کے مطابق جزا دیتا ہے۔

اِنَّهٗ مِنۡ عِبَادِنَا الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۸۱﴾　　۸۱۔ بے شک وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھے۔

تفسیر آیات

یہ مرتبہ اور فضیلت انہیں اس ایمانی مرتبے کی وجہ سے ملی جس پر وہ فائز تھے۔ ایمان اور یقین وہ بنیاد ہے جس پر عشق، جہاد، فنا فی اللّٰہ کا جذبہ وجود میں آتا ہے۔ ایمان کے جس درجے پر حضرت نوح علیہ السلام فائز تھے اس پر فائز ہونے والی چند ہستیاں اولاد نوح علیہ السلام میں مل جاتی ہیں۔

ثُمَّ اَغۡرَقۡنَا الۡاٰخَرِیۡنَ ﴿۸۲﴾　　۸۲۔ پھر ہم نے دوسروں کو غرق کر دیا۔

تفسیر آیات

نوح علیہ السلام اور ان پر ایمان لانے والوں کے علاوہ باقی لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے طوفان میں غرق کر دیا جو رہتی دنیا تک کے لوگوں کے لیے عبرت بن گے۔

وَ اِنَّ مِنۡ شِیۡعَتِهٖ لَاِبۡرٰهِیۡمَ ﴿۸۳﴾　　۸۳۔ اور ابراہیم یقیناً نوح کے پیروکاروں میں سے تھے۔

تفسیر آیات

حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت نوح علیہ السلام کے شیعہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آپ علیہ السلام نے نوح علیہ السلام کا مشن آگے بڑھایا اور اس راستے میں پیش آنے والی مشکلات کا نوح علیہ السلام کی طرح مقابلہ کیا۔ توحید کی راہ میں نوح علیہ السلام کا جہاد طویل ہونے کی وجہ سے منفرد تھا۔ ابراہیم علیہ السلام کا جہاد کٹھن ہونے کی وجہ سے منفرد تھا۔ پیروکار

اپنے پیرو سے بہتر ہوسکتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام، نوح علیہ السلام سے افضل ہیں۔ شیعہ کی تعریف میں شیخ مفیدؒ کی تعریف جامع ہے۔ فرماتے ہیں:

التشیع هو فی اصل اللغة الاتباع علی وجه التدین و الولاء للمتبوع علی الاخلاص۔　　تشیع اصل لغت میں اس پیروی کو کہتے ہیں جو دیانتداری اور اپنے پیرو سے محبت اور اخلاص کے ساتھ ہو۔

اس بناء ہر پیروی کو تشیع نہیں کہتے بلکہ اپنے پیرو سے محبت کے ساتھ پیروی کرنے کو کہتے ہیں۔ یہ تعریف قرآن مجید کی اس آیت سے نکل آتی ہے:

هٰذَا مِنۡ شِیۡعَتِهٖ وَ هٰذَا مِنۡ عَدُوِّهٖ ...[1]　　ایک ان کی قوم میں سے تھا اور دوسرا ان کے دشمنوں میں سے تھا۔

اس آیت میں شیعہ دشمن کے مقابلے میں ذکر ہوا ہے لہٰذا شیعہ وہ ہے جو دل میں اپنے پیرو سے محبت رکھتا ہے۔ اگلی آیت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے شیعۂ نوح علیہ السلام ہونے کی وجہ اور علت بیان فرمائی:

اِذۡ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلۡبٍ سَلِیۡمٍ ○　　جب وہ اپنے رب کی بارگاہ میں قلب سلیم لے کر آئے۔

اِذۡ اس جگہ وجہ اور علت بیان کرنے کے لیے ہے جیسے اس آیت میں ہے:

وَ لَنۡ یَّنۡفَعَکُمُ الۡیَوۡمَ اِذۡ ظَّلَمۡتُمۡ اَنَّکُمۡ فِی الۡعَذَابِ مُشۡتَرِکُوۡنَ ○[2]　　اور جب تم ظلم کر چکے تو آج (ندامت) تمہیں فائدہ نہیں دے گی، عذاب میں تم سب یقیناً شریک ہو۔

حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے درمیان کتنی مدت کا فاصلہ ہے کوئی مستند رائے قائم نہیں ہوسکتی۔ اکثر نے بغیر کسی سند کے لکھ دیا ہے کہ یہ فاصلہ ۲۶۰۰ سال کا ہے اور صاحب جامع الاصول لکھتے ہیں یہ فاصلہ ۱۱۴۲ سال ہے۔ البتہ قرآنی آیات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت نوح اور حضرت ابراہیم کی درمیانی مدت میں حضرت ہود اور حضرت صالح مبعوث ہوئے۔ ہود علیہ السلام کے بارے میں فرمایا:

٣١٩

وَ اذۡکُرُوۡۤا اِذۡ جَعَلَکُمۡ خُلَفَآءَ مِنۡۢ بَعۡدِ قَوۡمِ نُوۡحٍ ...[3]　　اور یاد کرو جب قوم نوح کے بعد اس نے تمہیں جانشین بنایا۔

اور صالح علیہ السلام کے بارے میں فرمایا:

وَ اذۡکُرُوۡۤا اِذۡ جَعَلَکُمۡ خُلَفَآءَ مِنۡۢ بَعۡدِ عَادٍ ...[4]　　اور یاد کرو جب اللہ نے قوم عاد کے بعد تمہیں جانشین بنایا۔

اِذۡ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلۡبٍ سَلِیۡمٍ ﴿۸۴﴾　　**۸۴۔ جب وہ اپنے رب کی بارگاہ میں قلب سلیم لے کر آئے۔**

---

[1] ۲۸ قصص: ۱۵　[2] ۴۳ زخرف: ۳۹　[3] ۷ اعراف: ۶۹　[4] ۷ اعراف: ۷۴

تفسیر آیات

قلب سلیم یعنی وہ دل جس میں غیر اللہ کی کوئی جگہ نہ ہو۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کا مظاہرہ اس وقت کیا جب آپ علیہ السلام کو آتش نمرود میں ڈالنے کے لیے منجنیق پر آویزاں کیا گیا تھا۔ اس وقت جبرئیل نے آ کر پوچھا: کوئی حاجت ہے؟ آپؑ نے فرمایا:

اَمَّا اِلَیۡکَ فَلَا ...[1]　　حاجت ہے، مگر تجھ سے نہیں۔

چنانچہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

اَلْقَلْبُ السَّلِیمُ الَّذِی یَلْقَی رَبَّهُ وَ لَیْسَ فِیهِ اَحَدٌ سِوَاهُ ...[2]　　قلب سلیم وہ ہے کہ اپنے رب سے اس حال میں ملاقات کرے کہ اس کے دل میں اس کے سوا کوئی نہ ہو۔

دیگر روایت میں آیا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال ہوا قلب سلیم کیا ہے؟ فرمایا:

دِینٌ بِلَا شَكٍّ وَ هَوًی وَ عَمَلٌ بِلَا سُمْعَةٍ وَ رِيَاءٍ۔[3]　　دین کو بغیر شک و مفاد کے اختیار کرے اور دکھاوے کے بغیر عمل کرے۔

اِذۡ قَالَ لِاَبِیۡهِ وَ قَوۡمِهٖ مَاذَا تَعۡبُدُوۡنَ ﴿۸۵﴾　　۸۵۔ جب انہوں نے اپنے باپ (چچا) اور قوم سے کہا: تم کس کی پوجا کرتے ہو؟

اس مضمون کی آیت کی تشریح سورۃ الانعام آیت ۷۴ میں ہو چکی ہے۔

اَئِفۡکًا اٰلِهَۃً دُوۡنَ اللّٰهِ تُرِیۡدُوۡنَ ﴿۸۶﴾　　۸۶۔ کیا اللہ کو چھوڑ کر گھڑے ہوئے معبودوں کو چاہتے ہو؟

تفسیر آیات

اس کائنات کے واضح خالق حقیقی اور سچے معبود کو چھوڑ کر خود ساختہ، جھوٹے اور بے حقیقت واہمے کو اپنا معبود بناتے ہو۔ عقل اور شعور کے مالک انسان کے لیے اس بات میں عار و ننگ ہے کہ وہ ایک واہمے کے آگے جھک کر اپنی انسانی حیثیت کا مذاق اڑائے۔

فَمَا ظَنُّکُمۡ بِرَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۸۷﴾　　۸۷۔ پروردگار عالم کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟

---

[1] مستدرک الوسائل ۳: ۳۰۳　[2] الکافی ۲: ۱۶　[3] مستدرک الوسائل ۱: ۱۱۳

تفسیر آیات

جب تم نے ایک واہمے کو معبود بنایا اس عقیدے کے ساتھ کہ وہ تمہاری زندگی چلاتا ہے اس لیے وہ تمہاری عبادت کے لائق ہے تو عالمین کے رب اور مالک کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ لائق عبادت نہیں ہے؟ وہ تمہاری زندگی سے لاتعلق ہے؟ وہ تمہارے کسی کام نہیں آئے گا؟ ایک تعجبانہ استفہام ہے۔

اس آیت کی دوسری تفسیر یہ کی گئی ہے: رب العالمین کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ تمہارے شرک پر تمہیں کیا سزا دے گا؟ تمہارے ساتھ کیا سلوک کرے گا؟ لیکن یہ تفسیر ہمارے نزدیک صائب نہیں ہے۔

فَنَظَرَ نَظۡرَةً فِی النُّجُوۡمِ ﴿۸۸﴾ ۸۸۔ پھر انہوں نے ستاروں پر ایک نظر ڈالی،

فَقَالَ اِنِّیۡ سَقِیۡمٌ ﴿۸۹﴾ ۸۹۔ اور کہا: میں تو بیمار ہوں۔

تفسیر آیات

حضرت ابراہیمؑ نے ستاروں کی طرف کیوں نگاہ کی اس کی کئی توجیہات ہیں:

i۔ ستارہ پرستوں کا یہ گمان عام تھا کہ بیماری کسی ستارے کے طلوع سے مربوط ہے۔ اپنے عقیدے کے مطابق، نہیں مشرکین کے عقیدے کے مطابق بقول تمہارے اس ستارے کے طلوع کے موقع پر بیمار ہوتا ہوں۔

ii۔ آپ کو واقعی ایک بیماری لاحق تھی۔ مثلاً تپ کا دورہ پڑتا تھا۔ ستاروں کی گردش سے اس دورے کے وقت کا تعین ہوتا تھا۔ ستاروں کی طرف دیکھ کر آپؑ کو علم ہوا کہ دورہ پڑنے والا ہے تو فرمایا: اِنِّیۡ سَقِیۡمٌ میں بیمار ہونے والا ہوں۔ جس طرح اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّ اِنَّہُمۡ مَّیِّتُوۡنَ [1] کہتے ہیں۔

iii۔ سوچنے اور غور کرنے کے لیے یہ عربی کا ایک محاورہ ہے۔ جب انسان کسی مسئلے پر سوچنے لگتا ہے تو کہتے ہیں: نَظۡرَةً فِی النُّجُوۡمِ۔

ان سب سے کسی ایک کو اختیار کرنے کے لیے ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ نہ ہی اس آیت میں کوئی اشارہ ملتا ہے۔

فَقَالَ اِنِّیۡ سَقِیۡمٌ: ستاروں پر نظر ڈالنے کے بعد فرمایا: میں بیمار ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ حضرت ابراہیمؑ اپنی قوم کے میلے میں شرکت کرنا نہیں چاہتے تھے۔ کیا اس کے لیے یہ بہانہ تھا؟ یا واقعاً اس وقت بیماری لاحق تھی؟ ہمارے پاس ایسے شواہد موجود نہیں ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ بیمار نہیں تھے انہوں

---

[1] ۳۹ زمر: ۳۰ (ترجمہ) اے رسول) یقیناً آپ کو بھی انتقال کرنا ہے اور انہیں بھی یقیناً مرنا ہے۔

نے معاذ اللہ جھوٹ بولا ہے۔ اگر بیمار نہیں تھے تو ان کے لوگ اس عذر کو قبول نہ کرتے۔

اس جگہ ابو ہریرہ کی اس روایت کو ہم قبول نہیں کر سکتے جو کہتی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تین جھوٹ بولے تھے، خواہ ارباب روایت اسے صحیح السند کی سند عنایت کریں۔

فَتَوَلَّوۡا عَنۡهُ مُدۡبِرِيۡنَ ﴿۹۰﴾ ۹۰۔ چنانچہ وہ لوگ انہیں پیچھے چھوڑ گئے۔

تفسیر آیات

ان لوگوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا عذر قبول کیا اور انہیں چھوڑ کر اپنے میلے کے لیے چل دیے۔ یہ دلیل ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا عذر قابل قبول تھا۔

فَرَاغَ اِلٰۤى اٰلِهَتِهِمۡ فَقَالَ اَلَا تَاۡكُلُوۡنَ ﴿۹۱﴾ ۹۱۔ پھر وہ ان کے معبودوں میں جا گھسے اور کہنے لگے: تم کھاتے کیوں نہیں ہو؟

تشریح کلمات

فَرَاغَ: (ر و غ) کے معنی کسی تدبیر کی خاطر ایک جانب ہونا کے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ فَرَاغَ اِلٰۤى اٰلِهَتِهِمۡ: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان مشرکین کے معبود بتوں کا رخ کیا۔ سیاق کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام مندر میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ ان معبودوں کے آگے کھانے کی چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔

۲۔ اَلَا تَاۡكُلُوۡنَ: ان بتوں کی طرف کلام کا رخ ہے کہ تم کھاتے کیوں نہیں ہو۔ جامد بت قابل خطاب نہیں ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی غرض لازمِ خطاب سے یہ ہے کہ یہ کھانے کے بھی قابل نہیں ہیں۔

مَا لَكُمۡ لَا تَنۡطِقُوۡنَ ﴿۹۲﴾ ۹۲۔ تمہیں کیا ہوا ہے کہ تم بولتے نہیں ہو؟

تفسیر آیات

کیوں نہیں بولتے ہو، کا خطاب بھی اس غرض سے ہے کہ یہ بول بھی نہیں سکتے، کسی سوال کا جواب بھی نہیں دے سکتے، نہ کسی آنے والے خطرے سے اپنے آپ کو بچا سکتے ہیں۔

فَرَاغَ عَلَيۡهِمۡ ضَرۡبًۢا بِالۡيَمِيۡنِ ﴿۹۳﴾　　۹۳۔ پھر انہیں پوری طاقت سے مارنے لگے۔

تفسیر آیات

منطقی انداز میں ان بتوں کی حقیقت فاش کرنے کے بعد پوری قوت سے ان بتوں کو پاش پاش کر دیا۔ اس طرح انسانی تاریخ میں شجاعت و دلیری کا عظیم مظاہرہ کرتے ہوئے بت شکنی کی تاریخ رقم فرمائی۔ یہ عظیم کامیابی حضرت خلیل علیہ السلام کے حصے میں آئی کہ پہلے منطق سے ان بتوں کو فاش کیا، بعد میں قوت سے ان کو پاش پاش کر دیا۔ مزید تشریح کے لیے سورۃ الانبیاء آیت ۶۹ کی تشریح ملاحظہ فرمائیں۔

فَاَقۡبَلُوۡۤا اِلَيۡهِ يَزِفُّوۡنَ ﴿۹۴﴾　　۹۴۔ تو لوگ دوڑتے ہوئے ان کے پاس آئے۔

تفسیر آیات

میلے سے واپسی پر جب لوگوں نے اپنے معبودوں کو سرنگوں، ریزہ ریزہ دیکھا اور یہ بھی علم ہوا کہ ابراہیم نام کا ایک جواں سال ان بتوں کو برا کہتا تھا اسی سے یہ حرکت صادر ہوئی ہے۔ اس پر غیض و غضب میں پوری قوم تنہا اس جواں کی طرف دوڑ پڑی۔ ظاہر ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو گھیر لیا ہو گا اور ان سے جواب طلبی کی ہو گی۔

قَالَ اَتَعۡبُدُوۡنَ مَا تَنۡحِتُوۡنَ ﴿۹۵﴾　　۹۵۔ ابراہیم نے کہا: کیا تم اسے پوجتے ہو جسے تم خود تراشتے ہو؟

تفسیر آیات

یہ تنہا جواں اپنے کیے پر نادم ہے نہ خائف بلکہ پورے معاشرے کی سرزنش کرتا اور اُن کے ضمیروں کو جھنجھوڑتے ہوئے فرماتا ہے: خود تراشیدہ کو معبود بناتے ہو۔ جن بتوں کی شکل و صورت تمہارے تراشنے سے بنی ہو وہ تمہاری زندگی کے کن نقوش کو تراشیں گے؟

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمۡ وَمَا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۹۶﴾　　۹۶۔ حالانکہ خود تمہیں اور جو کچھ تم بناتے ہو (سب کو) اللہ نے پیدا کیا ہے۔

تفسیر آیات

اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے معبود کو پوجتے ہو جب کہ تمہارا خالق اللہ ہے اور جس چیز پر تم کام

کرتے ہو اس کا خالق بھی اللہ ہے۔جس پتھر کو تراشتے ہو اس پتھر کا خالق اللہ ہے۔ لہٰذا مَا موصولہ ہے اور اگر مَا کو مصدریہ تسلیم کیا جائے، آیت مشرکین کے حق میں دلیل بنتی ہے، نہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حق میں چونکہ اس صورت میں معنی یہ ہوں گے: اللہ نے تمہیں اور تمہارے عمل کو خلق کیا ہے۔عمل کا خالق اللہ ہونے کی صورت میں بتوں کا تراشنا اللہ کا عمل ہے، نہ مشرکین کا۔اس طرح یہ مشرکین کے حق میں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خلاف ثابت ہوتا ہے۔ لہٰذا اشاعرہ کا اس آیت سے نظریہ جبر پر استدلال قطعاً باطل ہے۔

قَالُوا ابۡنُوۡا لَہٗ بُنۡیَانًا فَاَلۡقُوۡہُ فِی الۡجَحِیۡمِ ﴿۹۷﴾

۹۷۔ انہوں نے کہا: اس کے لیے ایک عمارت تیار کرو پھر اسے آگ کے ڈھیر میں پھینک دو۔

فَاَرَادُوۡا بِہٖ کَیۡدًا فَجَعَلۡنٰہُمُ الۡاَسۡفَلِیۡنَ ﴿۹۸﴾

۹۸۔ پس انہوں نے اس کے خلاف ایک چال چلنے کا ارادہ کیا لیکن ہم نے انہیں زیر کر دیا۔

تفسیر آیات

ایک چار دیواری بنانے کا حکم دیا گیا اور اس میں دہکتی ہوئی آتش کا ڈھیر تیار کر کے اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پھینکنے کا اہتمام کیا۔ سورہ انبیاء آیت ۶۹ میں اس مضمون کی آیت کے ذیل میں آتش نمرود سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نجات کی تشریح ہو چکی ہے۔

اہم نکات

۱۔ دشمنان خاصان خدا ہمیشہ زیر ہوتے رہے ہیں۔

وَ قَالَ اِنِّیۡ ذَاہِبٌ اِلٰی رَبِّیۡ سَیَہۡدِیۡنِ ﴿۹۹﴾

۹۹۔ اور ابراہیم نے کہا: میں اپنے رب کی طرف جا رہا ہوں وہ مجھے راستہ دکھائے گا۔

تفسیر آیات

۱۔آتش نمرود سے نجات پانے کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنا وطن کلدان ترک کر کے کنعان ہجرت کرنے کا ارادہ فرمایا۔ یعنی عراق (بابل) سے فلسطین کی سرزمین کی طرف ہجرت فرمائی۔

اس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام پہلے مہاجر ہیں جنہوں نے راہ خدا میں ہجرت کی۔ اپنا وطن اللہ کی خاطر ترک کیا اور اس ہجرت کو اپنے رب کی طرف ہجرت ذَاہِبٌ اِلٰی رَبِّیۡ قرار دیا۔

اللہ کی طرف یہ ہجرت، کلدان سے کنعان اور کنعان سے مکہ تک جاری رہی۔ مکہ کی بے آب و گیاہ وادی میں اپنی نسل کو چھوڑا، بیت اللہ کی تعمیر فرمائی اور اپنی اولاد کو اس گھر کا محافظ بنایا۔ اسی ہجرت کا نتیجہ ہے کہ آپ علیہ السلام کی اولاد میں سے نبی آخر الزمان، رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اس مقدس سرزمین سے مبعوث ہوئے۔

۲۔ سَیَهۡدِیۡنِ: خدا کی طرف ہجرت کرنے والے کو خدا کامیابی کے راستے دکھاتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ دونوں قبلے، قدس و کعبہ ہجرت ابراہیمی کا نتیجہ ہیں۔

۲۔ ہجرت سنت ابراہیمی ہے جس سے ہدایت کے راستے کھلتے ہیں۔

رَبِّ هَبۡ لِیۡ مِنَ الصّٰلِحِیۡنَ ﴿۱۰۰﴾

۱۰۰۔ اے میرے پروردگار! مجھے صالحین میں سے (اولاد) عطا کر۔

تفسیر آیات

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اولاد کے لیے دعا ہجرت کے وقت تو نہیں کی ہوگی چونکہ اس وقت آپ جوانی کے ابتدائی دنوں میں تھے۔ یہ دعا ازدواج کے مرحلے میں داخل ہونے اور ایک مدت تک اولاد نہ ہونے کی صورت میں کی ہوگی۔ چنانچہ دوسری جگہ فرمایا:

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِیۡ وَهَبَ لِیۡ عَلَی الۡکِبَرِ اِسۡمٰعِیۡلَ وَ اِسۡحٰقَ ...[1]

ثنائے کامل ہے اس اللہ کے لیے جس نے عالم پیری میں مجھے اسماعیل اور اسحاق عنایت کیے۔

چنانچہ توریت کے مطابق حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ولادت کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام ۸۶ سال کی عمر کو پہنچ چکے تھے اور حضرت اسحاق علیہ السلام کی ولادت کے وقت آپ علیہ السلام کی عمر ۱۰۰ سال تھی۔

فَبَشَّرۡنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِیۡمٍ ﴿۱۰۱﴾

۱۰۱۔ چنانچہ ہم نے انہیں ایک بردبار بیٹے کی بشارت دی۔

تفسیر آیات

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا قبول ہوتی ہے اور ایک بردبار فرزند کی بشارت مل جاتی ہے۔ جس فرزند کی بشارت دی گئی وہ پہلے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے حلم کے اوصاف حمیدہ کے

---

[1] ۱۴ ابراهیم: ۳۹

ساتھ متصف فرمایا۔

چنانچہ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے راہ خدا میں ذبح ہونے پر آمادگی ظاہر کر کے اس حلم کا مظاہرہ فرمایا۔

توریت کے سفر تکوین اصحاح ۲۲ میں آیا ہے:

ان امور کے بعد یہ واقعہ پیش آیا کہ اللہ نے ابرہیم کا امتحان لیا اور ابراہیم سے فرمایا: اپنے اکلوتے بیٹے کو لے لو۔ جسے آپ بہت چاہتے ہیں۔ اسحاق اور اسے سرزمین مریّا لے جاؤ۔

توریت میں متعدد جگہوں پر اس فرزند کو حضرت ابرہیم علیہ السلام کا اکلوتا بیٹا کہا ہے جسے قربانی کے لیے پیش کیا گیا جب کہ اسحاق علیہ السلام اکلوتے بیٹے نہیں تھے۔ اسحاق علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دوسرے فرزند ہیں۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کے لیے جب پیش کیا جا رہا تھا اس وقت تک حضرت اسحاق علیہ السلام پیدا نہیں ہوئے تھے۔ اس لیے اکلوتے بیٹے اسماعیل علیہ السلام ہیں۔ جب حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کے لیے پیش کیا گیا اس وقت ان کی عمر ۱۳ سال تھی جب کہ حضرت اسحاق علیہ السلام جب پیدا ہوئے تو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی عمر ۱۴ سال تھی۔ یعنی حضرت اسحاق علیہ السلام کی پیدائش سے ایک سال قبل ذبح اسماعیل علیہ السلام کا واقعہ پیش آیا۔ توریت میں یہود کی تحریفات میں یہ بات بھی شامل ہے کہ انہوں نے اسماعیل کی جگہ اپنے جد اعلیٰ اسحاق کا نام درج کر لیا۔

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ۭ قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۡ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۰۲﴾

۱۰۲۔ پھر جب وہ ان کے ساتھ کام کاج کی عمر کو پہنچا تو کہا: اے بیٹا! میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں، پس دیکھ لو تمہاری کیا رائے ہے، اس نے کہا: اے ابا جان آپ کو جو حکم ملا ہے اسے انجام دیں، اللہ نے چاہا تو آپ مجھے صبر کرنے والوں میں پائیں گے۔

فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ﴿۱۰۳﴾

۱۰۳۔ پس جب دونوں نے (حکم خدا کو) تسلیم کیا اور اسے ماتھے کے بل لٹا دیا۔

تفسیر آیات

۱۔ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ: جب حضرت اسماعیل علیہ السلام اپنے والد کے ساتھ کام کاج کے لیے چلنے پھرنے کی عمر کو پہنچ گئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب دیکھا کہ انہیں حضرت اسماعیل علیہ السلام کو برائے رضا خدا ذبح کرنے کا حکم ملا۔ انبیاء علیہم السلام کے خواب وحی کا درجہ رکھتے ہیں اور وحی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے۔ اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس بات میں کوئی تردد نہیں ہوا کہ اپنے لخت جگر کو اپنے ہاتھ سے ذبح کرنے کا حکم

مل رہا ہے۔

شیخ طوسی التبیان میں اس جگہ لکھتے ہیں:

> اللہ تعالیٰ نے بیداری میں بذریعہ وحی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بتا دیا تھا کہ خواب میں جو حکم آئے گا اس پر عمل کرنا ہوگا۔ اگر وحی کے ذریعے پہلے نہ بتایا ہوتا تو صرف خواب پر عمل پیرا نہ ہوتے۔ خواب انبیاء وحی ہیں لیکن بیداری کی وحی کی تاکید سے۔

۲۔ فَانۡظُرۡ مَاذَا تَرٰی: دیکھوں تمہاری کیا رائے ہے؟ حضرت خلیل علیہ السلام کا اپنے کمسن بچے کی رائے پوچھنا دلیل ہے کہ بچہ رشد، عقل کے کامل درجہ پر فائز تھا۔ کہتے ہیں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی عمر اس وقت ۱۳، سال تھی۔ اس عمر کے بچے کو اپنی جان کا نذرانہ دینے کے لیے مکلّف بنایا جا سکتا ہے تو علی علیہ السلام کو ایمان کے لیے مکلّف بنانے میں لوگوں کو اعتراض نہیں کرنا چاہیے۔

۳۔ یٰۤاَبَتِ افۡعَلۡ مَا تُؤۡمَرُ: اے اباجان! آپ کو جو حکم ملا ہے اسے انجام دیں۔ فرزند کا ایثار اور رشد عقلی حیرت انگیز ہے کہ جواب میں کہا جو آپ کو حکم ملا ہے۔ باپ کے خواب پر نہ صرف باپ کو یقین ہے، فرزند کو بھی یقین ہے۔ فرزند یہ بھی جانتا ہے کہ میرے باپ حکم خدا کے آگے سر تسلیم خم کرنے والے ہیں۔ اس سلسلے میں مہر پدری رکاوٹ نہیں بنے گی۔ مجھے بھی حکم خدا تسلیم کرنا چاہیے اور جان کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے۔

۴۔ سَتَجِدُنِیۡۤ اِنۡ شَآءَ اللّٰہُ مِنَ الصّٰبِرِیۡنَ: جس طرح باپ نے مہر پدری ایک طرف رکھ کر حکم الٰہی کو سامنے رکھا ہے فرزند نے بھی اپنی جان ایک طرف رکھ کر حکم الٰہی کے آگے سر تسلیم خم کیا۔ صبر کی اس حیرت انگیز منزل پر بیٹا اپنے اولوالعزم باپ سے کم نظر نہیں آتا۔

۵۔ فَلَمَّاۤ اَسۡلَمَا: جب دونوں نے امر الٰہی تسلیم کیا۔ نہایت قابل توجہ ہے مقام تسلیم میں باپ اور بیٹا ایک منزل پر نظر آتے ہیں۔ دونوں کے لیے ایک تعبیر اَسۡلَمَا، دونوں نے تسلیم اختیار کی۔ اسلام اسی تسلیم و رضا کا نام ہے:

مِلَّۃَ اَبِیۡکُمۡ اِبۡرٰہِیۡمَ ؕ ہُوَ سَمّٰىکُمُ الۡمُسۡلِمِیۡنَ ۬ۙ ...[1]	یہ تمہارے باپ ابراہیم کا دین ہے اسی نے تمہارا نام مسلمان رکھا۔

۶۔ وَ تَلَّہٗ لِلۡجَبِیۡنِ: اسے ماتھے کے بل یعنی اوندھے منہ لٹا دیا تاکہ ذبح کرتے وقت چہرہ فرزند کے اضطراب سے باپ کے عزم میں تزلزل نہ آئے۔

جبین، پیشانی کے دونوں جانب کو کہتے ہیں، خود پیشانی کو جبین نہیں کہا جاتا اور نہ جبین کہہ کر مجازاً پیشانی مراد لی جاتی ہے۔ آیت اور استعمالات عرب میں یہ بات واضح نہیں ہے کہ جبین سے مراد پیشانی

---

[1] ۲۲ حج: ۷۸

لی جاتی ہے۔ بیشتر مفسرین نے دونوں احتمالات کا ذکر کیا ہے۔ ممکن ہے جبین سے مراد پیشانی اس روایت کی بنا پر لی گئی ہو کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے خود یہ درخواست کی، ابّا مجھے منہ کے بل لٹا دیجیے تا کہ ذبح کے وقت میرے چہرے کی حالت دیکھ کر شفقت پدری حکم خدا کی تعمیل میں رکاوٹ نہ بنے۔

وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ ﴿۱۰۴﴾ — ۱۰۴۔ تو ہم نے ندا دی: اے ابراہیم!

قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۰۵﴾ — ۱۰۵۔ تو نے خواب سچ کر دکھایا، بے شک ہم نیکوکاروں کو ایسے ہی جزا دیتے ہیں۔

تفسیر آیات

اپنے کم سن بچے کو ذبح کرنے کی نیت سے زمین پر لٹانے کے بعد کیا ہوا؟

قرآن میں اس کا ذکر نہیں ہے اور وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ اور وَنَادَيْنٰهُ کی درمیانی خالی جگہ پُر کرنے کے لیے بہت سی روایات شیعہ سنی مصادر میں ہیں:

i۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسماعیل علیہ السلام کے حلق پر چھری چلا دی مگر چھری کو جبریل نے الٹ دیا۔

ii۔ گلے پر تانبے کا ایک ٹکڑا آ گیا۔

iii۔ گلے کی طرف ہاتھ بڑھا ہی تھا ندا آ گئی۔

iv۔ چھری اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو ندا آ گئی۔

ان روایات میں سے کسی ایک کو ترجیح نہیں دی جا سکتی۔

ایک توجیہ یہ بھی کرتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ذبح کے لیے جو اقدامات کیے، وہی خواب میں آئے تھے۔ خواب میں یہ تو نہیں آیا تھا کہ ذبح کا کام عمل میں آچکا ہے لہٰذا ذبح کے لیے جو اقدامات کیے یہی خواب کی تعمیل تھی۔ اس لیے ندا آئی قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا آپ نے خواب سچ کر دکھایا۔

بہرحال یہاں تک تو بات واضح ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خواب میں جو حکم ملا اس سے فرزند کو ذبح کرنے کا حکم سمجھا اور اس پر عمل کرنے کے لیے مکمل آمادگی کے ساتھ فرزند کو ذبح کرنے کے پختہ عزم و ارادے سے لٹایا اور ایسے مرحلے میں داخل ہو گئے جس کے بعد ذبح کا عمل وقوع پذیر ہونے میں کوئی فاصلہ باقی نہ رہا۔ آزمائش پوری ہو گئی۔ ذبح کا وقوع پذیر ہونا منظور نہ تھا۔ ندا آئی قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ....

اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ: ہم نیکی کرنے والوں کو ایسے ہی جزا دیتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ جزا مل گئی کہ بیٹے کی قربانی کی عظیم آزمائش میں کامیاب ہو گئے اور فرزند کی نعمت بھی نہ چھینی گئی۔

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الۡبَلٰٓـؤُا الۡمُبِیۡنُ ﴿۱۰۶﴾ ۱۰۶۔ یقیناً یہ ایک نمایاں امتحان تھا۔

تفسیر آیات

تاریخ امتحان میں ایک نمایاں امتحان تھا کہ عشق الٰہی کے سامنے دنیا کا سب سے عزیز ترین وجود حائل ہوسکتا ہے!! فرزند بھی وہ جو برسوں کے ارمانوں کے بعد پیدا ہوا۔ امتحان بھی وہ کہ اپنے پارۂ جگر کا گلا اپنے ہاتھ سے کاٹ دو۔ اس عظیم قربانی کا حکم ملنے پر نہ تردد ہوتا ہے، نہ اس میں تاخیر کرنے تک کی درخواست کی جاتی ہے۔ بیٹے کی آزمائش بھی باپ سے کم نہ تھی۔ اپنے باپ کے ہاتھ موت کی آغوش میں جانے کے لیے آمادہ ہونا بھی نمایاں امتحان ہے۔

اہم نکات

۱۔ انسان کی عظمت، امتحان کی عظمت سے وابستہ ہے۔

وَ فَدَیۡنٰهُ بِذِبۡحٍ عَظِیۡمٍ ﴿۱۰۷﴾ ۱۰۷۔اور ہم نے ایک عظیم قربانی سے اس کا فدیہ دیا۔

تفسیر آیات

ہم نے ایک عظیم ذبیحہ سے ابراہیم کے فرزند کا فدیہ دیا۔ بظاہر عظیم تو وہ فرزند تھے جن کا فدیہ دیا گیا ہے۔لیکن قرآن اس ذبیحہ کو عظیم قرار دے رہا ہے۔

خصال صدوق میں روایت ہے کہ قیامت تک ہونے والی منیٰ کی قربانیاں حضرت اسماعیل علیہ السلام کا فدیہ ہیں۔

بحارالانوار اور عیون اخبار الرضا میں آیا ہے: حج کے علاوہ ہر قربانی بھی اسماعیل علیہ السلام کا فدیہ ہے۔ حضرت سید الشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام کا ذبح عظیم کے مصداق ہونے پر متعدد روایات موجود ہیں۔ ملاحظہ ہو تاویل الآیات الظاھرۃ صفحہ ۴۸۷ کہ ان تمام قربانیوں سے سبط رسولؐ کی قربانی عظیم ہونے میں کسے تأمل ہوسکتا ہے۔

وَ تَرَکۡنَا عَلَیۡهِ فِی الۡاٰخِرِیۡنَ ﴿۱۰۸﴾ ۱۰۸۔ اور ہم نے آنے والوں میں ان کے لیے (ذکر جمیل) باقی رکھا۔

تفسیر آیات

اس سے بہتر اور اعلیٰ ذکر جمیل کیا ہوسکتا ہے کہ تمام ادیان سماوی کے لیے آپؑ کی ذات سند ہے،

ان کے بعد مبعوث ہونے والے تمام انبیاء علیہم السلام ان کی ذریت و اولاد میں سے ہیں، ان کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کو حج کی عبادت قرار دیا اور ان کی قربانی کی یاد تازہ کرنے کے لیے ہر سال لاکھوں کی تعداد میں قربانیاں پیش کی جاتی ہیں۔

سَلٰمٌ عَلٰۤی اِبۡرٰہِیۡمَ ﴿۱۰۹﴾ ۱۰۹۔ ابراہیم پر سلام ہو۔

تفسیر آیات

سب سے پہلے تو سلام و محبت ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے۔ اللہ کے بعد سلام ہو ابراہیم پر ان کی نسل کے تمام انبیاء علیہم السلام کی طرف سے، ان کی تمام امتوں کی طرف سے، ان کی قربانی کی یاد تازہ رکھنے والوں کی طرف سے، رہتی دنیا کے دینداروں کی طرف سے۔

کَذٰلِکَ نَجۡزِی الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۱۱۰﴾ ۱۱۰۔ ہم نیکوکاروں کو ایسے ہی جزا دیتے ہیں۔

تفسیر آیات

ہزارہا برس سے نسلاً بعد نسلٍ سلام و محبت ایک ایسی جزا ہے جو حضرت خلیل علیہ السلام جیسے احسان کرنے والوں کے لیے سزاوار ہے۔

اِنَّہٗ مِنۡ عِبَادِنَا الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۱۱﴾ ۱۱۱۔ یقیناً وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھے۔

تفسیر آیات

حضرت ابراہیم علیہ السلام ایمان کے اس درجے پر فائز تھے جس سے اعلیٰ درجے پر ان کی اولاد میں سے حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت علی علیہ السلام فائز ہو سکتے ہیں۔ ایمان و ایقان ہی کا کارنامہ تھا کہ آتش نمرود میں اطمینان کے ساتھ کود جاتے ہیں۔ اللہ پر توکل کا یہ عالم کہ آتش نمرود میں جاتے ہوئے جبرئیل امین جیسے اللہ کے مقتدر فرشتے کی پیش کش کو اعتنا میں نہیں لاتے۔

اہم نکات

۱۔ ایک اللہ پر ایمان تمام دنیا سے بے نیاز کر دیتا ہے۔

وَ بَشَّرۡنٰہُ بِاِسۡحٰقَ نَبِیًّا مِّنَ الصّٰلِحِیۡنَ ﴿۱۱۲﴾ ۱۱۲۔ اور ہم نے ابراہیم کو اسحاق کی بشارت دی کہ وہ صالحین میں سے نبی ہوں گے۔

تفسیر آیات

اس عظیم قربانی کے بعد حضرت اسحاق علیہ السلام کا ذکر اس بات کی دلیل ہے کہ اس سے پہلے جس فرزند کی قربانی کا ذکر ہوا وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام تھے۔ لہٰذا یہ نظریہ درست نہیں ہے کہ وہ حضرت اسحاق علیہ السلام تھے۔

مسلمانوں کی روایات میں حضرت اسحاق علیہ السلام کے ذبیح اللہ ہونے کا اصل مصدر کعب احبار ہے۔ یہ یہودی حضرت عمر کے زمانے میں مسلمان ہوا اور دربار خلافت میں مقام حاصل کیا۔ یہ روایات سنایا کرتا تھا۔ خود حضرت عمر بھی اس کی روایات سنا کرتے تھے۔ اسے سرکار کی طرف سے رسمیت ملنے پر دوسرے بھی اس شخص کی روایات سننے اور نقل کرنے لگے۔ اس طرح اسرائیلیات کو اسلامی روایات میں داخل ہونے کا موقع میسر آیا۔

وَ بٰرَکۡنَا عَلَیۡہِ وَ عَلٰۤی اِسۡحٰقَ ؕ وَ مِنۡ ذُرِّیَّتِہِمَا مُحۡسِنٌ وَّ ظَالِمٌ لِّنَفۡسِہٖ مُبِیۡنٌ ﴿۱۱۳﴾

۱۱۳۔ اور ہم نے ان پر اور اسحاق پر برکات نازل کیں اور ان دونوں کی اولاد میں نیکی کرنے والا بھی ہے اور اپنے نفس پر صریح ظلم کرنے والا بھی ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ بٰرَکۡنَا عَلَیۡہِ: ہم نے ابراہیم پر اپنی برکتوں کا نزول کیا یعنی ان کی اولاد میں سے انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے۔

۲۔ وَ عَلٰۤی اِسۡحٰقَ: اور اسحاق علیہ السلام پر بھی برکتوں کا نزول ہوا اور ان کی اولاد میں سینکڑوں انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک تمام انبیاء علیہم السلام اولاد اسحاق علیہ السلام ہیں۔

۳۔ وَ مِنۡ ذُرِّیَّتِہِمَا مُحۡسِنٌ وَّ ظَالِمٌ: حضرت ابراہیم اور حضرت اسحاق علیہما السلام کی اولاد میں نیک اور صالح افراد ہوں گے اور ظلم بہ نفس کے مرتکب افراد بھی۔ یہودی نظریے کے خلاف نیک ہونا اور نیک نہ ہونا نژادی مسئلہ نہیں ہے، عمل سے مربوط ہے۔ اولاد ابراہیم علیہ السلام ہونے کے باوجود شرک جیسے ظلم بہ نفس کے مرتکب ہو سکتے ہیں۔

اس سے دو مسئلے واضح ہو جاتے ہیں: ایک یہ کہ انسان کا نیک ہونا، نہ ہونا کسی نژاد کے ساتھ مربوط نہیں ہے۔ دوسرا یہ کہ قیادت و رہبری نسل ابراہیمی سے بیرون بھی نہیں ہے۔ نژاد کی وجہ سے نہیں ایثار و قربانی کی وجہ سے۔

وَ لَقَدۡ مَنَنَّا عَلٰی مُوۡسٰی وَ ہٰرُوۡنَ ﴿۱۱۴﴾

۱۱۴۔ اور بتحقیق موسیٰ اور ہارون پر ہم نے احسان کیا۔

تفسیر آیات

موسیٰ و ہارون علیہما السلام پر اللہ کی طرف سے جو احسانات ہوئے ہیں ان کا ذکر ہے۔

وَ نَجَّيْنٰهُمَا وَ قَوْمَهُمَا مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۱۵﴾

۱۱۵۔ اور ان دونوں کو اور ان دونوں کی قوم کو عظیم مصیبت سے ہم نے نجات دی۔

تفسیر آیات

پہلا احسان یہ ہے کہ موسیٰ و ہارون علیہما السلام اور ان کی قوم کو فرعون و فرعونیوں کے عذاب عظیم سے نجات دی جو ان کی اولاد کو قتل کرتے، عورتوں کو خدمت گزاری کے لیے زندہ چھوڑتے، انسانیت سوز مظالم اور تحقیر و تذلیل سے دوچار کرتے تھے۔

وَ نَصَرْنٰهُمْ فَكَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۱۱۶﴾

۱۱۶۔ اور ہم نے ان کی مدد کی تو وہی غالب آنے والے ہو گئے۔

تفسیر آیات

دوسرا احسان یہ ہوا کہ فرعون جیسی طاغوتی سپر طاقت پر بنی اسرائیل جیسی اسیر قوم کو فتح و غلبہ عنایت فرمایا اور فرعون و فرعونیوں کو غرقِ آب کر دیا۔

وَ اٰتَيْنٰهُمَا الْكِتٰبَ الْمُسْتَبِيْنَ ﴿۱۱۷﴾

۱۱۷۔ اور ہم نے ان دونوں کو روشن کتاب دی۔

تفسیر آیات

تیسرا احسان یہ ہوا کہ ان دونوں کو توریت جیسی عظیم کتاب عنایت فرمائی جو بنی اسرائیل کے لیے دونوں جہان کی سعادت لے کر آئی۔

وَ هَدَيْنٰهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴿۱۱۸﴾

۱۱۸۔ اور ان دونوں کو سیدھا راستہ ہم نے دکھایا۔

تفسیر آیات

چوتھا احسان یہ تھا کہ ہر قدم پر دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے اللہ نے ان دونوں ہستیوں کی سیدھے

راستے کی رہنمائی فرمائی جس کی وجہ سے ایک پسی ہوئی قوم زمانے کے طاغوت کا مقابلہ کر سکی۔

وَ تَرَكْنَا عَلَيْهِمَا فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ ۱۱۹۔ اور ہم نے آنے والوں میں ان دونوں کے لیے (ذکر جمیل) باقی رکھا۔

تفسیر آیات

پانچواں احسان یہ ہوا کہ ان کا ذکر جمیل تا قیامت آنے والوں میں زندہ رکھا، ان کی طویل اور صبر آزما تحریک کو آنے والی نسلوں کے لیے مشعل راہ قرار دیا اور سب سے اہم یہ کہ قرآن جیسی ابدی کتاب ان دونوں بھائیوں کے ذکر جمیل سے پُر ہے۔

سَلٰمٌ عَلٰی مُوْسٰی وَ هٰرُوْنَ ﴿۱۲۰﴾ ۱۲۰۔ موسیٰ اور ہارون پر سلام ہو۔

تفسیر آیات

چھٹا احسان یہ ہے کہ ان دونوں بھائیوں پر اول تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سلام و محبت ہے۔ دوم یہ کہ آنے والی تمام نسلوں کی طرف سے تا قیامت سلام و محبت کا سلسلہ جاری رہے گا۔

اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۲۱﴾ ۱۲۱۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسے ہی جزا دیتے ہیں۔

تفسیر آیات

ساتواں احسان یہ ہے کہ قیامت تک آنے والی نسلوں میں سلام و محبت، ذکر جمیل، مشکلات سے نکلنے کا راستہ دکھانا، ایک عظیم کتاب عنایت فرمانا، فتح و نصرت سے نوازنا وغیرہ ایسی جزائیں ہیں جو ان دونوں بھائیوں کے شامل حال رہی ہیں۔

اِنَّهُمَا مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۲۲﴾ ۱۲۲۔ یہ دونوں ہمارے مومن بندوں میں سے تھے۔

یہ سب کچھ اس ایمانی قوت کی وجہ سے ہوا جو ان دونوں بھائیوں میں بدرجہ اتم موجود تھی۔

وَ اِنَّ اِلْيَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۲۳﴾ ۱۲۳۔ اور الیاس بھی یقیناً پیغمبروں میں سے تھے۔

تفسیر آیات

حضرت الیاس علیہ السلام انبیائے بنی اسرائیل میں سے تھے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد مبعوث ہوئے۔

جب بنی اسرائیل میں بت پرستی عام ہونا شروع ہوگئی تو حضرت الیاسؑ نے اس بت پرستی کے خلاف قیام کیا۔

حضرت سلیمانؑ کے بعد بنی اسرائیل کی سلطنت دو حصوں میں بٹ گئی۔ ایک حصے پر آل داؤد قابض تھے جو یہودی ریاست کے نام سے موسوم تھی اور دوسرے حصے کو اسرائیلی ریاست کا نام دیا گیا۔ اس کے بادشاہ نے لبنان کے بادشاہ کی لڑکی سے شادی کر لی جو مشرکہ تھی۔ بعد میں خود بھی مشرک ہوگیا جس سے بت پرستی کو تقویت ملی۔ اس وقت حضرت الیاسؑ نے بت پرستی کے خلاف قیام کیا۔ بادشاہ سے جانی خطرہ لاحق ہونے کی وجہ سے حضرت الیاسؑ نے ہجرت اختیار کی۔

اسی اثناء میں یہودی ریاست کے بادشاہ نے اسرائیل کے بادشاہ کی بیٹی سے شادی کر لی جس کی وجہ سے یہاں بھی بت پرستی کو رواج ملا۔ حضرت الیاسؑ نے یہاں بھی اس بت پرستی کیخلاف آواز اٹھائی۔

اِذۡ قَالَ لِقَوۡمِہٖۤ اَلَا تَتَّقُوۡنَ ﴿۱۲۴﴾

اَتَدۡعُوۡنَ بَعۡلًا وَّ تَذَرُوۡنَ اَحۡسَنَ الۡخَالِقِیۡنَ ﴿۱۲۵﴾

۱۲۴۔ جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا: کیا تم اپنا بچاؤ نہیں کرتے؟

۱۲۵۔ کیا تم بعل کو پکارتے ہو اور سب سے بہتر خلق کرنے والے کو چھوڑ دیتے ہو؟

تفسیر آیات

۱۔ اَلَا تَتَّقُوۡنَ: بت پرستی کے نتیجے میں آنے والی ابدی تباہی سے اپنا بچاؤ نہیں کرتے۔ انبیاءؑ انسانوں کو تباہی سے بچانے کے لیے مبعوث ہوتے ہیں۔ اسی لیے ان کی تعلیمات میں انذار کا پہلو زیادہ ہوتا ہے بہ نسبت بشارت کے۔

۲۔ اَتَدۡعُوۡنَ بَعۡلًا: تعجب ہے تم احسن الخالقین کو چھوڑ کر بَعۡل کو پوجتے ہو۔

بعل: اہل کنعان کے سب سے بڑے بت کا نام ہے۔ دراصل بعل کے معنی بلندی کے ہیں۔ اسی سے اس درخت کو بعل کہتے ہیں جو بلند ہوگیا ہو اور اپنی جڑوں کے ذریعے پانی جذب کرتا ہو۔ باب زکوٰۃ میں ہے: اذا كانت سيحا او بعلا العشر۔[1] اگر نہر یا جڑوں سے سیراب ہوتا ہے تو دسواں حصہ زکوٰۃ ہے۔ اسی سے سردار، مالک اور شوہر کو بھی بعل کہتے ہیں۔

قدیم بت پرستوں نے اپنے ایک خاص بت کو بعل کا نام دیا تھا۔ خصوصاً لبنان، شام اور فلسطین کے علاقوں میں بعل پرستی عام تھی اور اس کے ساتھ ایک دیوی بھی تھی جو عشقا روث کے نام سے موسوم تھی۔

کہتے ہیں: حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں اسی بت کو مولک کہتے تھے۔ اس بت کی شکل انسان کی شکل میں تھی۔ سر گوسالہ کا جس کے دو سینگ ہیں۔ سر پر تاج، ایک کرسی

---

[1] حدیث نبوی

پر دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے گویا کوئی چیز وصول کر رہا ہے۔ یہ تانبے سے بنا ہوا اندر سے خالی تھا۔ ایک تنور کی مانند چبوترے پر رکھا ہوا ہوتا تھا۔ وہ اس تنور کے اندر آگ جلاتے تھے اور لوگ اپنی قربانیوں کو اس کے ہاتھوں پر رکھتے تو سادہ لوح لوگ یہ سمجھتے تھے کہ معبود نے اس کی قربانی کو جلا کر قبول کیا ہے۔ پیرس کے عجائب گھر میں بعل کی ایک مورتی موجود ہے جو پتھر سے تراشی ہوئی ہے۔ انسان کی شکل میں ہے۔ سر پر ایک خود ہے جس کے دو سینگ ہیں۔ اس کے ہاتھ میں ایک گھنٹی ہے۔ شاید بعض قوموں کے نزدیک بعل کی یہ شکل ہو گی۔[1]

حضرت الیاس علیہ السلام کی آمد کی خبر تو پہلے ہی بائیبل میں دے دی گئی تھی مگر بنی اسرائیل نے انہیں نہیں پہچانا اور اذیت پہنچائی مگر بعد میں وہ حضرت الیاس علیہ السلام کے اس قدر عقیدت مند ہوگئے کہ یہ عقیدہ عام ہو گیا کہ انہیں آسمان میں اٹھا لیا گیا ہے، وہ پھر دنیا میں آنے والے ہیں۔

۳۔ وَّتَذَرُوْنَ اَحۡسَنَ الۡخَالِقِیۡنَ: بعل پرستوں کی عقلی بے مائیگی کے اظہار کے لیے نام لینے کی جگہ وَّتَذَرُوْنَ اَحۡسَنَ الۡخَالِقِیۡنَ فرمایا ہے کہ تم اَحۡسَنَ الۡخَالِقِیۡنَ کو چھوڑ کر ایک بد شکل، بے شعور، خود تراشیدہ کو پوجتے ہو۔ اللہ تعالیٰ کی تخلیق اپنی نوعیت میں سب سے بہتر ہے۔ وہ نوعیت یہ ہے کہ اللہ کی تخلیق ابداعی ہے یعنی عدم سے وجود میں لاتا ہے۔ اس نوعیت کی تخلیق پر غیر خدا، کوئی اور قادر نہیں ہے۔ انسان کی تخلیق تقدیری ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ المؤمنون:۱۴۔

اللّٰہَ رَبَّکُمۡ وَ رَبَّ اٰبَآئِکُمُ الۡاَوَّلِیۡنَ ﴿۱۲۶﴾

۱۲۶۔ اللہ ہی تمہارا اور تمہارے پہلے باپ دادا کا پروردگار ہے۔

تفسیر آیات

ان کو یاد دلایا جا رہا ہے کہ تمہارا رَبّ اللہ ہے، بعل نہیں ہے۔ تمہارے قدیم آباء و اجداد کا رَبّ ہے چونکہ ان کے قدیم آباء و اجداد موحد تھے بعد میں انحراف آیا۔

فَکَذَّبُوۡہُ فَاِنَّہُمۡ لَمُحۡضَرُوۡنَ ﴿۱۲۷﴾

۱۲۷۔ تو انہوں نے ان کی تکذیب کی پس وہ حاضر کیے جائیں گے۔

تفسیر آیات

۱۔ مشرکوں نے زن پرست بادشاہوں کی پیروی کرتے ہوئے حضرت الیاس علیہ السلام کی تکذیب کی۔

---

[1] التحریر والتنویر ذیل آیت

لبنان کے بادشاہ اخاب کی زوجہ ایزابل نے حضرت الیاس علیہ السلام کو قتل کی دھمکی دی تو آپؑ نے بئر سبع نامی جگہ کی طرف ہجرت کی۔ اس کے بعد ان کا علم نہ ہو سکا۔

بعض کے نزدیک الیاس، ادریس علیہ السلام کا نام ہے جنہیں آسمان پر اٹھا لیا گیا ہے لیکن قرآن کے نزدیک الیاس اور ادریس دو پیغمبران علیہما السلام ہیں۔ البتہ الیاس کا نام بائیبل میں ایلیاہ ہے۔

۲۔ فَاِنَّهُمۡ لَمُحۡضَرُوۡنَ: ان تکذیبی عناصر کو اللہ اپنی عدالت میں حاضر کرے گا اور ان کے جرائم کی سزا سنائی جائے گی۔

اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الۡمُخۡلَصِيۡنَ ﴿۱۲۸﴾ ۱۲۸۔ سوائے اللہ کے مخلص بندوں کے۔

وہ لوگ جنہوں نے حضرت الیاس علیہ السلام کی پیروی کی ہے اور ان کے ساتھ جہاد کیا۔ اس آیت کی تشریح اسی سورہ میں ہو چکی ہے۔

وَ تَرَكۡنَا عَلَيۡهِ فِى الۡاٰخِرِيۡنَ ﴿۱۲۹﴾ ۱۲۹۔ اور ہم نے آنے والوں میں ان کے لیے (ذکر جمیل) باقی رکھا۔

اس آیت کی تشریح پہلے گزر چکی ہے۔

سَلٰمٌ عَلٰٓى اِلۡ يَاسِيۡنَ ﴿۱۳۰﴾ ۱۳۰۔ آل یاسین پر سلام ہو۔

تفسیر آیات

بعض کے نزدیک اِلۡ يَاسِيۡنَ حضرت الیاس علیہ السلام ہی کا دوسرا تلفظ ہے۔ نافع اور ابن عامر کی قرائت میں آل یاسین آیا ہے۔

فضائل: ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے:

وقرأ آخرون سلام علی آل یاسین یعنی آل محمد۔ کچھ لوگوں نے سلام علی آل یاسین پڑھا ہے کہ اس سے مراد آل محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہیں

ابن حجر نے صواعق محرقہ میں اس آیت کو شان اہل بیت علیہم السلام میں نازل ہونے والی آیات میں شمار کیا ہے۔ حضرت ابن عباس کی روایت کو ابو صالح اور مجاهد دونوں نے بیان کیا ہے کہ آل یاسین سے مراد آل محمد ہیں۔ ملاحظہ ہو شواھد التنزیل ذیل آیت۔ مجمع الزوائد ۹: ۱۷۴۔ اربلی کشف الغمۃ ج ا ص ۲۳۴، المعجم الکبیر۔ خود حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے: یاسین محمد و نحن آل یاسین۔ ملاحظہ ہو شواھد التنزیل ذیل آیت۔

اِنَّا كَذٰلِكَ نَجۡزِی الۡمُحۡسِنِيۡنَ﴿۱۳۱﴾ ۱۳۱۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسے ہی جزا دیتے ہیں۔

اِنَّهٗ مِنۡ عِبَادِنَا الۡمُؤۡمِنِيۡنَ﴿۱۳۲﴾ ۱۳۲۔ بے شک وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھے.

ان دو آیات کی وہی تشریح ہے جو دوسرے انبیاء علیہم السلام کی شان میں ہو چکی ہے۔

وَاِنَّ لُوۡطًا لَّمِنَ الۡمُرۡسَلِيۡنَ ﴿۱۳۳﴾ ۱۳۳۔ اور لوط بھی یقیناً پیغمبروں میں سے تھے

اِذۡ نَجَّيۡنٰهُ وَاَهۡلَهٗۤ اَجۡمَعِيۡنَ ﴿۱۳۴﴾ ۱۳۴۔ جب ہم نے انہیں اور ان کے سب گھر والوں کو نجات دی۔

اِلَّا عَجُوۡزًا فِى الۡغٰبِرِيۡنَ﴿۱۳۵﴾ ۱۳۵۔ سوائے ایک بڑھیا کے جو پیچھے رہ جانے والوں میں سے تھی۔

ثُمَّ دَمَّرۡنَا الۡاٰخَرِيۡنَ﴿۱۳۶﴾ ۱۳۶۔ پھر ہم نے سب کو ہلاک کر دیا۔

تفسیر آیات

۱۔ حضرت لوط علیہ السلام کا ذکر اس سے پہلے متعدد آیات میں آچکا ہے۔

۲۔ اِلَّا عَجُوۡزًا: یہ بڑھیا حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی ہے جو ایک رسول کی بیوی ہونے کے باوجود اپنے شوہر کی نافرمانی کر کے اپنی بدکار قوم کا ساتھ دینے کو ترجیح دے رہی تھی۔ چنانچہ یہ بڑھیا بدکار قوم کے ساتھ ہلاک ہو گئی۔

۳۔ ثُمَّ دَمَّرۡنَا الۡاٰخَرِيۡنَ: پھر قوم لوط کو اس طرح تباہ کر دیا کہ وہ زمین میں دھنس گئی اور اس پر آسمان سے پتھروں کی بارش ہوئی۔

وَ اِنَّكُمۡ لَتَمُرُّوۡنَ عَلَيۡهِمۡ مُّصۡبِحِيۡنَ ﴿۱۳۷﴾ ۱۳۷۔ اور تم دن کو بھی ان (بستیوں) سے گزرتے رہتے ہو،

وَبِالَّيۡلِ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ﴿۱۳۸﴾ ۱۳۸۔ اور رات کو بھی، تو کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟

تفسیر آیات

۱۔ اہل مکہ شام کی طرف بغرض تجارت جاتے ہوئے قوم لوط کے تباہ شدہ علاقوں سے گزرا کرتے تھے۔ چنانچہ دریائے مردار کی جگہ یہ قوم آباد تھی۔ آج بھی اس علاقے پر تباہی کے آثار نمایاں ہیں۔

۲۔ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ: عقل کا تقاضا یہ تھا کہ ان کے عبرت ناک انجام سے سبق سیکھتے اور اپنے رسول صلی

اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نافرمانی نہ کرتے۔

وَاِنَّ یُوۡنُسَ لَمِنَ الۡمُرۡسَلِیۡنَ ﴿۱۳۹﴾ ۱۳۹۔ اور یونس بھی یقیناً پیغمبروں میں سے تھے۔

اِذۡ اَبَقَ اِلَی الۡفُلۡکِ الۡمَشۡحُوۡنِ ﴿۱۴۰﴾ ۱۴۰۔ جب وہ بھری ہوئی کشتی کی طرف بھاگے۔

تفسیر آیات

۱۔ یونس بن متی: عبرانی میں ان کا نام یونان بن امتای ہے۔ آپ بنی اسرائیل کے انبیاء علیہم السلام میں سے ہیں اور فلسطین سے ان کا تعلق ہے۔ انہیں کو عراق کے ایک شہر اھل (نینوی) کی طرف مبعوث کیا گیا جب بنی اسرائیل آشوریوں کے ہاں اسیر تھے۔ ان کے زمانے کا اندازہ ۸۰۰ قبل مسیح لگایا گیا ہے۔

۲۔ اِذۡ اَبَقَ: غلام کے اپنے آقا سے بھاگ جانے کو اباق کہتے ہیں۔ حضرت یونس علیہ السلام نے اپنی قوم کو چھوڑنے میں جلدی کی اور اذن خدا کے بغیر وہاں سے نکل گئے۔ ان کی قوم نے ان کی تکذیب کی، اسیری میں ہونے کی وجہ سے آشوریوں کی طرف سے زیادہ اذیت کی توقع تھی، اس لیے وہاں سے نکل گئے اور کشتی پر سوار ہوئے۔

۳۔ اِلَی الۡفُلۡکِ الۡمَشۡحُوۡنِ: شحن کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام جس کشتی پر سوار تھے اس میں گنجائش سے زیادہ افراد بیٹھے ہوئے تھے چونکہ مشحون پُر شدہ کو کہتے ہیں۔

فَسَاہَمَ فَکَانَ مِنَ الۡمُدۡحَضِیۡنَ ﴿۱۴۱﴾ ۱۴۱۔ پھر قرعہ ڈالا تو وہ مات کھانے والوں میں سے ہوئے۔

تشریح کلمات

فَسَاہَمَ: (س ھ م) قرعہ اندازی کے تیر کو سَھۡمٌ کہا جاتا ہے۔

المدحض: (د ح ض) اصل میں دَحۡض پاؤں پھسلنے کو کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ فَسَاہَمَ: سمندر میں طلاطم آیا۔ غرق کا خطرہ لاحق ہوا تو قرعہ اندازی ہوئی کہ جس کا نام نکل آئے اسے سمندر میں پھینک دیا جائے۔ یہودی تاریخ میں آیا ہے: لوگ آپس میں کہنے لگے دیکھتے ہیں اس طلاطم کا سبب کون سا شخص ہے، قرعہ اندازی کے ذریعے معلوم کرتے ہیں تو یونس کا نام نکل آیا۔

قرعہ اندازی قدیم قوموں میں رائج تھی۔ جب کسی کشتی میں گنجائش سے زیادہ افراد موجود ہوں تو قرعہ اندازی کے ذریعے اس مشکل کو حل کیا کرتے تھے۔

اس قرعہ اندازی سے حکم شرعی کا استنباط نہیں ہوسکتا چونکہ جن لوگوں نے یہ عمل کیا ہے ان کا عمل حجت نہیں ہے۔ اگر حضرت یونس علیہ السلام کا قبول کرنا حجت قرار دیا جاتا ہے تو بھی ہماری شریعت میں ثابت نہیں ہے۔ البتہ ہماری شریعت میں چند ایک شرائط کے تحت قرعہ اندازی مشروع ہے۔

حضرت مریم علیہا السلام کی کفالت کے بارے میں قرعہ اندازی سے کام لیا گیا تھا: اِذۡ یُلۡقُوۡنَ اَقۡلَامَہُمۡ ....[1]

۲۔ فَکَانَ مِنَ الۡمُدۡحَضِیۡنَ: المدحض۔ قرعہ حضرت یونس علیہ السلام نام نکل آتا ہے۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ تین مرتبہ قرعہ اندازی ہوئی تینوں مرتبہ حضرت یونس علیہ السلام کا نام نکل آیا۔ بالآخر انہیں سمندر میں پھینک دیا گیا۔

فَالۡتَقَمَہُ الۡحُوۡتُ وَ ہُوَ مُلِیۡمٌ ﴿۱۴۲﴾ ۱۴۲۔ پھر مچھلی نے انہیں نگل لیا اور وہ (اپنے آپ کو) ملامت کر رہے تھے۔

تشریح کلمات

اَلۡتَقَمَہُ: (ل ق م) لقم کسی چیز کو نگل لینا۔ رجلٌ تلقام بڑے بڑے لقمے نگلنے والا۔

اَلۡحُوۡتُ: (ح و ت) بڑی مچھلی۔

تفسیر آیات

۱۔ فَالۡتَقَمَہُ الۡحُوۡتُ: مچھلی نے انہیں نگل لیا۔ مچھلی بڑی تھی جو دانتوں سے چبائے بغیر نگل لیتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ وہی مچھلی تھی جسے مغرب والے بالین کہتے ہیں۔

۲۔ وَ ہُوَ مُلِیۡمٌ: وہ ملامت کرنے والا تھا۔ مچھلی کے شکم میں جانے کے بعد حضرت یونس علیہ السلام اپنے اس عمل پر ملامت کرتے تھے کہ اپنے رَبّ کی اجازت کے بغیر اپنی ذمے داری چھوڑ کر نکل پڑے۔

بعض کے نزدیک یہ کشتی دریائے دجلہ پار کر رہی تھی۔ دریائے دجلہ میں اتنی بڑی مچھلیاں نہیں ہوتیں اس لیے بعض اسے غلط قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں یہ کشتی بحر روم میں سفر کر رہی تھی۔ و العلم عند اللّٰہ۔

فَلَوۡ لَاۤ اَنَّہٗ کَانَ مِنَ الۡمُسَبِّحِیۡنَ ﴿۱۴۳﴾ ۱۴۳۔ پھر اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتے۔

لَلَبِثَ فِیۡ بَطۡنِہٖۤ اِلٰی یَوۡمِ یُبۡعَثُوۡنَ ﴿۱۴۴﴾ ۱۴۴۔ تو قیامت تک اس مچھلی کے پیٹ میں رہ جاتے۔

---

[1] ۳ آل عمران: ۴۴

تفسیر آیات

ا۔ اس تسبیح کا ذکر سورۂ انبیاء میں ہو گیا ہے۔ وہ یہ تھا: لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنۡتَ سُبۡحٰنَکَ ٭ۖ اِنِّیۡ کُنۡتُ مِنَ الظّٰلِمِیۡنَ ۔[1] اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام اللہ کو ہمیشہ یاد رکھنے والوں میں سے تھے۔ اس یاد خدا کی وجہ سے انہیں نجات دے دی گئی اور دوبارہ نبوت کے منصب پر فائز کیا۔

۲۔ لَلَبِثَ فِیۡ بَطۡنِہٖۤ اِلٰی یَوۡمِ یُبۡعَثُوۡنَ: اگر تسبیح کا ذریعہ ان کے ہاتھ میں نہ ہوتا تو اس مچھلی کا شکم ان کی قبر بن جاتا اور سمندر کی تہ میں قیامت تک مدفون رہ جاتے۔ اگر وہ مچھلی کے شکم میں نہ جاتے تو بھی انہیں دوبارہ منصب نبوت پر برقرار نہ کیا جاتا۔ اگر تسبیح کی صورت میں یاد خدا میں رہنے والا نہ ہوتے تو سورہ قلم میں فرمایا:

لَوۡ لَاۤ اَنۡ تَدٰرَکَہٗ نِعۡمَۃٌ مِّنۡ رَّبِّہٖ لَنُبِذَ بِالۡعَرَآءِ وَ ہُوَ مَذۡمُوۡمٌ ۝[2]　　اگر ان کے رب کی رحمت انہیں سنبھال نہ لیتی تو وہ برے حال میں چٹیل میدان میں پھینک دیے جاتے۔

آپ کی اس تسبیح کی وجہ سے نعمت الٰہی نے انہیں سنبھالا دیا اور نبوت کا منصب برقرار رکھا۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ وہ تین دن تک، بعض میں ایک دن، بعض میں آیا ہے کہ چند گھنٹے شکم میں رہے۔

فَنَبَذۡنٰہُ بِالۡعَرَآءِ وَ ہُوَ سَقِیۡمٌ ﴿۱۴۵﴾　　۱۴۵۔ اور ہم نے بیمار حالت میں انہیں چٹیل میدان میں پھینک دیا۔

تفسیر آیات

اگر اللہ کی رحمت شامل حال نہ ہوتی تو مچھلی کے شکم کے ترشحات کی وجہ سے ان کا وجود ہضم ہو جاتا تاہم اتنی دیر مچھلی کے شکم میں رہے ہیں کہ مریض ہو گئے اور حکم خدا سے مچھلی نے حضرت یونس علیہ السلام کو ایک بے آب و گیاہ میدان میں اگل دیا۔

یہاں ایک سوال ذہنوں میں آتا ہے کہ مچھلی کے پیٹ سے کسی انسان کا زندہ نکل آنا کیسے ممکن ہے؟ اس کے جواب میں معجزے کا حوالہ دیے بغیر پیش آنے والا وہ واقعہ کافی ہے جس میں ایک شخص ۷۰ گھنٹے مچھلی کے پیٹ میں رہنے کے بعد زندہ نکل آیا۔ یہ واقعہ انگلینڈ میں پیش آیا۔ مچھیرے بڑی وہیل مچھلیوں کا شکار کر رہے تھے۔ ایک شخص کو مچھلی نے نگل لیا۔ دوسرے دن وہ مچھلی مر گئی تھی۔ اس کے پیٹ سے وہ آدمی

[1] ۲۱ انبیاء : ۸۷　　[2] ۶۸ القلم: ۴۹

زندہ برآمد ہوا۔(اردو ڈائجسٹ ۱۹۶۴ء۔بحوالہ تفہیم القرآن)

وَاَنْۢبَتْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّنْ يَّقْطِيْنٍ ﴿۱۴۶﴾ ۱۴۶۔اور ہم نے ان پر کدو کی بیل اگائی۔

تفسیر آیات

یَّقۡطِیۡنٍ ایسے درخت کو کہتے ہیں جو تنے پر کھڑا نہ ہو اور بیل کی شکل میں ہو۔ جیسے کدو، خربوزہ وغیرہ۔ بعض مفسرین تصریح کرتے ہیں کہ یَّقۡطِیۡنٍ سے مراد کدو ہے۔ یہ درخت حضرت یونس علیہ السلام کے لیے سائے اور کھانے پینے کا کام دیتا تھا۔

وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ ﴿۱۴۷﴾ ۱۴۷۔اور ہم نے انہیں ایک لاکھ یا اس سے زائد لوگوں کی طرف بھیجا۔

تفسیر آیات

نجات کے بعد آپ علیہ السلام کو دوبارہ اپنی قوم کی طرف بھیجا جو ابھی ایمان لا چکی تھی۔ ان کی تعداد ایک لاکھ سے کچھ زیادہ تھی۔ اَوۡ کا مطلب بعض کے نزدیک ''بلکہ'' ہے۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ ''زیادہ'' کا مطلب بیس ہزار ہے۔ اس طرح تعداد ایک لاکھ بیس ہزار بنتی ہے۔ قوم یونس کے ایمان کا واقعہ سورہ یونس آیت ۹۸ کے ذیل میں مذکور ہے۔

فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۱۴۸﴾ ۱۴۸۔ پھر وہ ایمان لے آئے تو ہم نے ایک وقت تک انہیں متاع حیات سے نوازا۔

ایمان لانے اور عذاب ٹل جانے کے بعد قوم یونس کو ایک مدت تک زندگی دی گئی۔

فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُوْنَ ﴿۱۴۹﴾ ۱۴۹۔پس آپ ان سے پوچھیں: کیا تمہارے رب کے لیے تو بیٹیاں ہوں اور ان کے لیے بیٹے ہوں؟

اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓئِكَةَ اِنَاثًا وَّهُمْ شٰهِدُوْنَ ﴿۱۵۰﴾ ۱۵۰۔کیا ہم نے فرشتوں کو جب مؤنث بنایا تو وہ دیکھ رہے تھے؟

تفسیر آیات

۱۔ اے رسول ان سے سوال کریں کہ ان لوگوں نے آپ کے رب کے حصے بیٹیاں رکھی ہیں اور خود اپنے لیے بیٹے۔ بیٹیاں اور بیٹوں میں یہ لوگ خود تفریق کے قائل ہیں:

وَ اِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمۡ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحۡمٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجۡهُهٗ مُسۡوَدًّا وَّهُوَ كَظِيۡمٌ ۝ ۱	حالانکہ جب ان میں سے کسی ایک کو بھی اس (بیٹی) کا مژدہ سنایا جاتا ہے جو اس نے خدائے رحمٰن کی طرف منسوب کی تھی تو اندر ہی اندر غصے سے پیچ و تاب کھا کر اس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے۔

اپنی ذہنیت کے مطابق اللہ کے لیے غیر مرغوب بیٹیاں رکھ دیں اور اپنے لیے مرغوب بیٹے:

تِلۡكَ اِذًا قِسۡمَةٌ ضِيۡزٰى ۝ ۲	یہ تو پھر غیر منصفانہ تقسیم ہے۔

مشرکین فرشتوں کو بیٹیاں سمجھتے تھے اور یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ ان بیٹیوں کو اللہ نے اپنا لیا، برگزیدہ کیا ہے۔ مجمع البیان کا موقف یہی ہے:

علی وجه الاصطفا لا علی وجه الولادة۔	برگزیدہ کر کے، نہ ولادت سے۔

۲۔ اَمۡ خَلَقۡنَا الۡمَلٰٓئِكَةَ اِنَاثًا: فرشتوں کے مؤنث ہونے پر ان کے پاس کیا شواہد ہیں؟ فرماتا ہے کہ جب ہم فرشتے خلق کر رہے تھے، کیا تم اس وقت حاضر تھے؟

اَلَاۤ اِنَّهُمۡ مِّنۡ اِفۡكِهِمۡ لَيَقُوۡلُوۡنَ ﴿۱۵۱﴾	۱۵۱۔ آگاہ رہو! یہ لوگ اپنی طرف سے گھڑ کر کہتے ہیں،
وَلَدَ اللّٰهُ ۙ وَ اِنَّهُمۡ لَكٰذِبُوۡنَ ﴿۱۵۲﴾	۱۵۲۔ کہ اللہ نے اولاد پیدا کی اور یہ لوگ یقیناً جھوٹے ہیں۔

تفسیر آیات

اسی طرح ان مشرکین کا یہ بھی ایک افترا اور جھوٹ ہے جو کہتے ہیں اللہ نے اولاد پیدا کی ہے۔ اللہ کے لیے اولاد کا ہونا ممکن نہیں ہے۔ اس پر ہم نے سورہ مریم آیت ۳۵ میں تشریح کی ہے۔

اَصۡطَفَى الۡبَنَاتِ عَلَى الۡبَنِيۡنَ ﴿۱۵۳﴾	۱۵۳۔ کیا اللہ نے بیٹوں کی جگہ بیٹیوں کو پسند کیا؟

---

۱ ۴۳ زخرف: ۱۷ ۲ ۵۳ نجم۔ ۲۲

مَا لَكُمْ ۟ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ۝١٥٤ | ۱۵۴۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تم کیسے فیصلے کرتے ہو؟

اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝١٥٥ | ۱۵۵۔ کیا تم غور نہیں کرتے؟

اَمْ لَكُمْ سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ ۝١٥٦ | ۱۵۶۔ یا تمہارے پاس کوئی واضح دلیل ہے؟

فَاْتُوْا بِكِتٰبِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝١٥٧ | ۱۵۷۔ پس اپنی کتاب پیش کرو اگر تم سچے ہو۔

تفسیر آیات

۱۔ اللہ تعالیٰ نے بیٹیوں کو برگزیدہ کیا ہے۔

۲۔ تمہیں، تمہاری عقل و خرد کو کیا ہو گیا ہے؟ ایسی بات کرتے ہو جو تمہارے دائرۂ علم و ادراک میں نہیں ہے۔ اس کے لیے سند درکار ہے۔ اگر کوئی سند موجود ہے تو اسے پیش کرو۔

۳۔ فَاْتُوْا بِكِتٰبِكُمْ: اپنی کتاب پیش کرو۔ تم لوگ سرے سے کسی کتاب و وحی کے قائل نہیں ہو تو بتاؤ تمہارے پاس کیا سند ہے؟

وَ جَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا ۭ وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ۝١٥٨ | ۱۵۸۔ اور انہوں نے اللہ میں اور جنوں میں رشتہ بنا رکھا ہے، حالانکہ جنات کو علم ہے کہ وہ (اللہ کے سامنے) حاضر کیے جائیں گے۔

تفسیر آیات

۱۔ مشرکین جن اور اللہ کے درمیان کسی قسم کے رشتے کے قائل تھے؟ مفسرین کے اقوال میں اضطراب ہے۔ بعض کہتے ہیں رشتے سے مراد یہ ہے کہ مشرکین نے شیطان کو اللہ کے ساتھ عبادت میں شریک کیا۔ دیگر بعض کے نزدیک اس رشتے سے مراد مشرکین کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ نے جنات سے ازدواج کیا جس سے فرشتے پیدا ہوئے۔ بعض کہتے ہیں جنات سے مراد ملائکہ ہیں۔ بعض کہتے ہیں اس سے مراد ثنویت ہے کہ شیطان کو شر کا خالق اور اللہ کو خیر کا خالق ٹھہراتے ہیں۔

ان اقوال میں سے بعض اقوال مفہوم و سیاق سے دور ہیں تاہم ان میں سے دیگر کسی قول کا انتخاب مشکل ہے۔

۲۔ وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ: جنات کا اللہ کے ساتھ رشتہ کیا ہو سکتا ہے، خود جنات کو اللہ کی عدالت میں پیش ہونا ہے جہاں اپنی قسمت کا فیصلہ سننا ہے۔ اس جملے سے معلوم ہوا کہ جنات سے

مراد فرشتے نہیں ہیں۔

سُبۡحٰنَ اللّٰہِ عَمَّا یَصِفُوۡنَ ﴿۱۵۹﴾
اِلَّا عِبَادَ اللّٰہِ الۡمُخۡلَصِیۡنَ ﴿۱۶۰﴾

۱۵۹۔ اللہ ان کے ہر بیان سے پاک ہے،
۱۶۰۔ سوائے اللہ کے مخلص بندوں کے (جو ایسی بات منسوب نہیں کرتے)۔

تفسیر آیات

۱۔ جب کہ اللہ کی ذات بہت بالا اور منزہ ہے ان باتوں سے جن کی نسبت یہ مشرکین اللہ کی طرف دیتے ہیں۔ اللہ کے لیے فرزند اور رشتے کا تصور اللہ کی شان میں گستاخی ہے جس میں وہ لوگ ملوث ہوتے ہیں جن کا ذہن کفر و شرک کی نجاست میں ملوث ہے۔

۲۔ مگر اللہ کے لیے خالص ہونے والے بندے ایسی جسارت میں ملوث نہیں ہوتے۔

فَاِنَّکُمۡ وَ مَا تَعۡبُدُوۡنَ ﴿۱۶۱﴾
مَاۤ اَنۡتُمۡ عَلَیۡہِ بِفٰتِنِیۡنَ ﴿۱۶۲﴾
اِلَّا مَنۡ ہُوَ صَالِ الۡجَحِیۡمِ ﴿۱۶۳﴾

۱۶۱۔ پس یقیناً تم اور جنہیں تم پوجتے ہو،
۱۶۲۔ سب مل کر اللہ کے خلاف (کسی کو) بہکا نہیں سکتے،
۱۶۳۔ سوائے اس کے جو جہنم میں جھلسنے والا ہے۔

تشریح کلمات

بِفٰتِنِیۡنَ : (ف ت ن) گمراہ کرنا۔ فتنے یعنی فساد میں ڈالنا۔

تفسیر آیات

۱۔ فرشتے یہ بھی کہتے ہیں کہ تم اور تمہارے معبود جنات سب مل کر اللہ کی مرضی اور فیصلے کے خلاف کسی کا کچھ نہیں کر سکیں گے۔ مشرکین لوگوں کو اس واہمے میں ڈالتے تھے کہ جو جنات اور اصنام کو ناراض کرے گا وہ برص اور جذام جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو جائے گا۔

۲۔ اِلَّا مَنۡ ہُوَ صَالِ الۡجَحِیۡمِ : البتہ جو لوگ جہنم میں جھلسنے والے ہیں ان پر ان لوگوں کا بس چلتا ہے اور وہ آسانی سے انہیں واصل جہنم کر دیتے ہیں۔

وَ مَا مِنَّاۤ اِلَّا لَہٗ مَقَامٌ مَّعۡلُوۡمٌ ﴿۱۶۴﴾

۱۶۴۔ اور (ملائکہ کہتے ہیں) ہم میں سے ہر ایک کے لیے مقام مقرر ہے،

تفسیر آیات

فرشتے کہتے ہیں: ہمارا معبود ہونا دور کی بات ہے ہمارا تو درجہ، ذمہ داری معلوم و متعین ہے۔ اس سے ہم ذرہ برابر بھی تجاوز نہیں کر سکتے۔ چونکہ فرشتے انسانوں کی طرح نہیں ہیں۔ انہیں جس کام کے لیے متعین کیا ہے اسی پرکار بند رہتے ہیں:

لَّا یَعۡصُوۡنَ اللّٰہَ مَاۤ اَمَرَہُمۡ ...[1]   اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے۔

وَّ اِنَّا لَنَحۡنُ الصَّآفُّوۡنَ ﴿۱۶۵﴾   ۱۶۵۔ اور ہم ہی صف بستہ رہتے ہیں۔

تفسیر آیات

ایک تفسیر یہ ہے کہ فرشتے کہتے ہیں کہ اللہ کے احکام کے انتظار میں صف بستہ کھڑے رہتے ہیں کہ تدبیر عالم کے بارے میں جو بھی حکم صادر ہوتا ہے اس کی فوری تعمیل ہو جاتی ہے۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ ہم عبادت کے لیے صف بستہ کھڑے رہتے ہیں۔ حدیث میں آیا ہے:

جعلت صفوفنا کصفوف الملائکۃ۔   ہماری صفوں کو فرشتوں کی صفوں کی طرح بنایا گیا ہے۔

صحیح مسلم، وسائل الشیعۃ میں صُفُوفَ اُمَّتِی کَصُفُوفِ الۡمَلَائِکَۃَ ہے۔ یعنی میری امت کی صفیں ملائکہ کی صفوں کی طرح ہے۔

وَ اِنَّا لَنَحۡنُ الۡمُسَبِّحُوۡنَ ﴿۱۶۶﴾   ۱۶۶۔ اور ہم ہی تسبیح کرنے والے ہیں۔

تفسیر آیات

تسبیح، اللہ تعالیٰ کو اس بات سے منزہ قرار دینا ہے جو اللہ تعالیٰ کی شان کے لیے لائق اور مناسب نہیں ہے۔ اس میں سرفہرست شرک آتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کو ظلم اور جبر و اکراہ سے منزہ قرار دینا وغیرہ۔

وَ اِنۡ کَانُوۡا لَیَقُوۡلُوۡنَ ﴿۱۶۷﴾   ۱۶۷۔ اور یہ لوگ کہا تو کرتے تھے:

لَوۡ اَنَّ عِنۡدَنَا ذِکۡرًا مِّنَ الۡاَوَّلِیۡنَ ﴿۱۶۸﴾   ۱۶۸۔ اگر ہمارے پاس اگلوں سے کوئی نصیحت آجاتی،

لَکُنَّا عِبَادَ اللّٰہِ الۡمُخۡلَصِیۡنَ ﴿۱۶۹﴾   ۱۶۹۔ تو ہم اللہ کے مخلص بندے ہوتے۔

فَکَفَرُوۡا بِہٖ فَسَوۡفَ یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۷۰﴾   ۱۷۰۔ لیکن (اب) اس کا انکار کیا لہٰذا عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا۔

---

[1] ۶۶ تحریم: ۶

تفسیر آیات

۱۔رخ کلام اب مکہ کے مشرکین کی طرف ہو گیا جو رسول صلی اللہ ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے کہا کرتے تھے کہ اگر ہمارے پاس اسی قسم کی نصیحت آ جاتی جو سابقہ امتوں کی طرف آ گئی تو ہم اللہ کے بڑے مخلص بندے ثابت ہوتے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ سابق انبیاء علیہم السلام ان کی طرف مبعوث نہیں ہوئے ہیں۔

۲۔فَکَفَرُوۡا بِہٖ: جب یہ نصیحت ان کی طرف آ گئی تو ان لوگوں نے اسے مسترد کر دیا۔ یہاں الذکر (نصیحت) سے مراد قرآن مجید ہے۔

۳۔فَسَوۡفَ یَعۡلَمُوۡنَ: آئندہ انہیں اپنے کفر کی عاقبت کا علم ہو جائے گا۔ اس جملے میں ان کافروں کے برے انجام کی خبر دی ہے۔

وَ لَقَدۡ سَبَقَتۡ کَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الۡمُرۡسَلِیۡنَ ﴿۱۷۱﴾ | ۱۷۱۔ اور بتحقیق ہمارے بندگان مرسل سے ہمارا یہ وعدہ ہو چکا ہے۔

اِنَّہُمۡ لَہُمُ الۡمَنۡصُوۡرُوۡنَ ﴿۱۷۲﴾ | ۱۷۲۔ یقیناً وہ مدد کیے جانے والے ہیں،

وَ اِنَّ جُنۡدَنَا لَہُمُ الۡغٰلِبُوۡنَ ﴿۱۷۳﴾ | ۱۷۳۔ اور یقیناً ہمارا لشکر ہی غالب آ کر رہے گا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ لَقَدۡ سَبَقَتۡ کَلِمَتُنَا: مکہ کے دل شکن حالات میں نازل ہونے والی اس سورت میں غیر مبہم الفاظ میں فتح و غلبہ کی یہ نوید صفحہ تاریخ پر پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہی ہے۔ کلمۃ یعنی اللہ کا حتمی فیصلہ اور یقینی وعدہ۔

اللہ تعالیٰ نے جب اپنے رسولوں کو ایک مقصد اور ایک منزل کا تعین کر کے اس کی طرف روانہ فرمایا ہے تو اس وقت اس بات کا فیصلہ ہو چکا ہوتا ہے کہ مرسلین اپنے مشن میں کامیاب رہیں گے۔ اللہ ناکام ہونے والے مشن کی طرف نہیں بھیجتا البتہ مرسلین کو اس کامیابی کے لیے انتہائی مشکلات کا مقابلہ کرنا ہو گا۔ اللہ کے اس فیصلے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بلا زحمت چشم زدن میں کامیابی مل جایا کرے گی۔ فرمایا:

حَتّٰۤی اِذَا اسۡتَیۡـَٔسَ الرُّسُلُ وَ ظَنُّوۡۤا اَنَّہُمۡ قَدۡ کُذِبُوۡا جَآءَہُمۡ نَصۡرُنَا ...[1] | یہاں تک کہ جب انبیاء (لوگوں سے) مایوس ہو گئے اور لوگ بھی یہ خیال کرنے لگے کہ ان سے جھوٹ بولا گیا تھا تو پیغمبروں کے لیے ہماری نصرت پہنچ گئی.

نصرت و غلبہ کے اس وعدے کا مطلق ذکر فرمایا لہٰذا اس میں دنیا و آخرت دونوں کی کامیابی ہے

---

[1] ۱۲ یوسف: ۱۱۰

جب کہ دوسری جگہ فرمایا:

اِنَّا لَنَنۡصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَیَوۡمَ یَقُوۡمُ الۡاَشۡہَادُ ۞[1]

ہم اپنے رسولوں اور ایمان لانے والوں کی دنیاوی زندگی میں بھی مدد کرتے رہیں گے اور اس روز بھی جب گواہ کھڑے ہوں گے۔

۲۔ وَاِنَّ جُنۡدَنَا لَہُمُ الۡغٰلِبُوۡنَ: غالب آنے کا مطلب وہ نہیں جو وقتی نگاہ سے دیکھنے والے کو نظر آتا ہے کہ فرعون و نمرود کو جو بالادستی حاصل ہے وہ ابراہیم و موسیٰ علیہما السلام کو حاصل نہیں ہے۔ یزید کی وسیع حکومت قائم ہوئی ہے، اس کے مقابلے میں حضرت امام حسین علیہ السلام اور مدینے کے مہاجرین و انصار بے بس ہیں، آج استعماری قوتوں کو بالادستی ہے حاصل ہے اور حق کے ماننے والے مسلمان تہی دست ہیں، بلکہ غالب آنے سے مراد یہ ہے کہ آج نمرود و فرعون کی طاقت خاک میں مل گئی لیکن کرۂ ارض پر ابراہیم و موسیٰ علیہما السلام کا بول بالا ہے۔ ابوجہل تاریخ کی تاریک تہوں میں دفن ہو گیا مگر عبداللہ کے یتیم زندہ و تابندہ ہیں۔ یزید کا نام داخل دشنام ہے جب کہ حسین علیہ السلام کا نام فاتحین میں سرفہرست ہے۔

جُنۡد لشکر کو کہتے ہیں اور جُنۡدَنَا ہمارا لشکر، اس الٰہی جماعت کو کہتے ہیں جو عیار دشمن کے خلاف برسرپیکار ہو۔ لہٰذا اس جملے میں اشارہ ہے کہ لشکر اور مجاہد ہونے کی صورت میں غلبہ ہے اور اگر دشمن کے خلاف صف بستہ ہونے کی بجائے دشمن کی صفوں میں شامل ہو جائیں تو نہ صرف فتح و غلبہ کا وعدہ نہیں ہے بلکہ اس کا قدرتی نتیجہ ذلت و رسوائی ہوگی۔

اہم نکات

۱۔ ہمارا لشکر غالب آئے گا۔ ہمارا غدار نہیں۔

فَتَوَلَّ عَنۡہُمۡ حَتّٰی حِیۡنٍ ۞

۱۷۴۔ لہٰذا آپ یک مدت تک ان سے منہ پھیر لیں۔

تفسیر آیات

ایک مدت تک ان سے منہ پھیرنے کے حکم میں غیر مبہم اور واضح الفاظ میں اس فتح و نصرت کے وقت کا تعین ہے۔ ایک مدت تک آپ انہیں اپنے جرائم میں مصروف رہنے دیں۔

فَتَوَلَّ عَنۡہُمۡ: ان کے جرائم، الزامات اور ان کی اہانتیں اعتنا میں نہ لائیں۔

وَّ اَبۡصِرۡہُمۡ فَسَوۡفَ یُبۡصِرُوۡنَ ۞

۱۷۵۔ اور انہیں دیکھتے رہیں کہ عنقریب یہ خود بھی دیکھ لیں گے۔

---

[1] ۴۰ مومن: ۵۱

تفسیر آیات

ا۔ البتہ ان پر نگاہ رکھو یا یہ انہیں راہ حق اور عذاب سے بچنے کا راستہ دکھاتے رہو۔ منطق و استدلال کا کام جاری رہے۔ الجھنے سے اجتناب کریں۔

۲۔ فَسَوۡفَ یُبۡصِرُوۡنَ: عنقریب یہ آپ کی کامیابی اور اپنی رسوائی کا منظر خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ اس میں بھی فتح نصرت کی بشارت ہے۔

اَفَبِعَذَابِنَا یَسۡتَعۡجِلُوۡنَ ﴿۱۷۶﴾

۱۷۶۔ کیا یہ ہمارے عذاب میں عجلت چاہ رہے ہیں؟

تفسیر آیات

وہ عذاب الٰہی کی تنبیہ کا مذاق اڑاتے اور کہتے تھے کہ وہ عذاب کب آئے گا؟ سورہ عنکبوت میں اس کا جواب آیا ہے:

وَ یَسۡتَعۡجِلُوۡنَکَ بِالۡعَذَابِ ؕ وَ لَوۡ لَاۤ اَجَلٌ مُّسَمًّی لَّجَآءَہُمُ الۡعَذَابُ .....[1]

اور یہ لوگ آپ سے عذاب میں عجلت چاہتے ہیں اور اگر ایک وقت مقرر نہ ہوتا تو ان پر عذاب آ چکا ہوتا.

فَاِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِہِمۡ فَسَآءَ صَبَاحُ الۡمُنۡذَرِیۡنَ ﴿۱۷۷﴾

۱۷۷۔ پس جب یہ (عذاب) ان کے دالان میں اترے گا تو تنبیہ شدگان کی صبح بہت بری ہو گی۔

تفسیر آیات

ا۔ جس عذاب کی یہ لوگ جلدی مچا رہے ہیں وہ عذاب جب ان کے گھروں کے دالان میں اترے گا تو اس وقت انہیں علم ہو گا کہ تنبیہ اور نصیحت پوری ہونے کے بعد آنے والا عذاب کتنا شدید ہے۔

۲۔ فَسَآءَ صَبَاحُ الۡمُنۡذَرِیۡنَ: وہ صبح بہت بری صبح ہو گی جس صبح ان پر عذاب نازل ہو گا۔ اللہ کا عذاب صبح کے وقت آیا کرتا ہے۔ جیسے فرمایا:

اِنَّ مَوۡعِدَہُمُ الصُّبۡحُ ؕ اَلَیۡسَ الصُّبۡحُ بِقَرِیۡبٍ ﴿﴾[2]

یقیناً ان کے وعدہ عذاب کا وقت صبح ہے، کیا صبح کا وقت قریب نہیں؟

وَ تَوَلَّ عَنۡہُمۡ حَتّٰی حِیۡنٍ ﴿۱۷۸﴾

۱۷۸۔ اور آپ ایک مدت تک ان سے منہ پھیر لیں۔

---

[1] ۲۹ عنکبوت: ۵۳　[2] ۱۱ ھود: ۸۱

تفسیر آیات

ایک مدت تک ان کی اذیتوں کو اعتنا میں نہ لائیں۔ صرف ایک مدّت تک۔ اس کے بعد آپ کو فتح و نصرت ملے گی۔ یہ لوگ نابود ہو چکے ہوں گے۔

وَّ اَبۡصِرۡ فَسَوۡفَ یُبۡصِرُوۡنَ ﴿۱۷۹﴾		۱۷۹۔اور دیکھتے رہیں عنقریب یہ خود بھی دیکھ لیں گے.

تفسیر آیات

چنانچہ چشم عالم نے دیکھ لیا کہ ان آیات کے نزول کے چند سال بعد رسول اسلام ﷺ فاتح بن کر مکے میں داخل ہوگئے اور یہ لوگ یا تو نابود ہو گئے یا اگر موجود تھے تو طلقاء (معافی ملنے والے) کے طور پر زندہ رہے اور انہیں بیت المال سے کچھ مل جاتا تو مؤلفة القلوب کی مد سے۔ اس طرح کل رسول اللہ ﷺ کی اہانت کرنے والے آج رسول ﷺ کی طرف سے خیرات کھاتے رہے۔

سُبۡحٰنَ رَبِّکَ رَبِّ الۡعِزَّۃِ عَمَّا یَصِفُوۡنَ ﴿۱۸۰﴾		۱۸۰۔ آپ کا رب جو عزت کا مالک ہے ان باتوں سے پاک ہے جو یہ بیان کرتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اے رسول آپ کا ربّ پاکیزہ ہے ان تمام باتوں سے جن کی نسبت یہ مشرکین اس کی طرف دیتے ہیں۔

۲۔ رَبِّ الۡعِزَّۃِ: وہ عزت کا مالک ہے، واحد مالک ہے۔ عزت کا حقیقی مالک آپ کا ربّ ہے۔ اگر کسی کو عزت ملتی ہے تو اس سے ملتی ہے اور آپ کا رَبّ جسے چاہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہے ذلیل بناتا ہے۔

وَ سَلٰمٌ عَلَی الۡمُرۡسَلِیۡنَ ﴿۱۸۱﴾		۱۸۱۔ اور پیغمبروں پر سلام ہو۔

تفسیر آیات

امن و سلامتی ہو مرسلین پر۔ اپنے دشمنوں پر فتح و نصرت کی سلامتی۔ اس آیت کی دوسری تفسیر یہ کی گئی ہے: ان مرسلین پر سلام کرو۔ ان میں کسی قسم کی تفریق نہ کرو۔

وَ الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۸۲﴾		۱۸۲۔ اور ثنائے کامل اس اللہ کے لیے ہے جو عالمین کا پروردگار ہے۔

تفسیر آیات

اس خدائے مہربان کی حمد و ثنا کرو جو عالمین کا مالک حقیقی ہے۔ جس نے ان مرسلین کو ہماری ہدایت کے لیے مبعوث فرمایا۔ جس نے ہماری نبی ﷺ کو اپنے عیار دشمنوں پر فتح و نصرت عنایت فرمائی۔ جس نے محمد و آل محمد کو عزت و سرفرازی عنایت فرمائی اور ان کے دشمنوں کو ذلیل و رسوا کیا۔

حدیث میں آیا ہے:

من اراد ان یکتال بالمکیال الاظفی من الاجر یوم القیامۃ فلیکن آخر کلامہ فی مجلسہ: سُبۡحٰنَ رَبِّکَ رَبِّ الۡعِزَّۃِ عَمَّا یَصِفُوۡنَ و سلام علی المرسلین والحمدللّٰہ رب العالمین.[1]

کوئی اگر قیامت کے دن اجر ثواب مکمل تول کے ساتھ لینا چاہتا ہے تو اسے چاہیے کہ اس کی نشست کا آخری کلام یہ ہو: سُبۡحٰنَ رَبِّکَ رَبِّ الۡعِزَّۃِ عَمَّا یَصِفُوۡنَ و سلام علی المرسلین و الحمدللّٰہ رب العالمین۔

---

[1] مجمع البیان

سُورَۃُ صٓ

خالی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اس سورۃ مبارکہ کا نام اس کی ابتدا میں مذکور حرف مقطع صاد سے ماخوذ ہے۔ یہ سورۃ مکی ہے۔ زمان نزول کا تعین مشکل ہے چونکہ اس سورۃ کے نزول کے بارے منقول روایات متصادم ہیں۔

شان نزول: طبرسی نے اپنی تفسیر میں روایت کی ہے:

رؤسائے قریش میں سے پچیس افراد جن میں ابوجهل، ابی بن خلف، امية بن خلف اور ربیعه کے دونوں بیٹے عتبه اور شیبه، نضر بن حارث وغیرہ شامل ہیں اپنے سردار ولید بن مغیرہ کے ساتھ ابو طالب علیہ السلام کے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں: آپ ہمارے سردار اور بزرگوار ہیں۔ ہم آپ کے پاس آئے ہیں کہ آپ ہمارے اور اپنے بھتیجے کے درمیاں انصاف کریں۔ وہ ہمیں کم عقل، ہمارے معبودوں کو برا کہتا ہے۔ ابو طالب علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بلایا اور کہا: بھتیجے! یہ تمہاری قوم ہے۔ آپ سے ایک خواہش رکھتے ہیں۔ فرمایا: کیا خواہش ہے؟ کہا: کہتے ہیں: ہمیں اپنے معبودوں کو پوجنے دو۔ تم اپنے معبود کی عبادت کرو۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ایک کلمہ کا اقرار کرلو۔ تم عرب وعجم پر حکمرانی کرو گے۔ اس پر ابوجہل نے کہا: ہم ایک نہیں دس کلمے کہیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لا الله الا الله کا اقرار کرو۔ یہ سن کر وہ اٹھ گئے یہ کہتے ہوئے کہ کئی معبودوں کی جگہ صرف ایک معبود بنا لیا۔

بعض روایت میں آیا ہے۔ یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غیض وغضب میں آئے اور فرمایا: چچا اگر سورج میرے داہنے ہاتھ پر رکھ دیا جائے اور چاند میرے بائیں ہاتھ پر تو بھی میں اس دعوت کو نہیں چھوڑوں گا اگرچہ میں قتل کیا جاؤں۔

حضرت ابو طالب علیہ السلام نے فرمایا:
اپنا کام جاری رکھو۔ قسم بخدا! میں کبھی آپ کی مدد کرنا نہیں چھوڑوں گا۔
چنانچہ حضرت ابو طالب علیہ السلام کا ردعمل ان کے اشعار میں آیا ہے:

والله لن يصلوا اليك بجمعهم حتى اوسد فى التراب دفينا
فاصدع بامرك ما عليك غضاضة و ابشر بذلك و قر منك عيونا
ولقد علمت بان دين محمد من خير اديان البرية دينا

قسم بخدا جب میں زیر خاک دفن نہ ہو جاؤں آپ کو کوئی گزند نہیں پہنچا سکیں گے۔ آپ اپنی دعوت جاری رکھیں۔ آپ کو کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ آپ مطمئن رہیں اور آنکھوں میں ٹھنڈک رہے۔ میں جان گیا ہوں کہ محمد کا دین، تمام ادیان سے بہتر دین ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ
بنام خدائے رحمٰن رحیم

صٓ وَ الۡقُرۡاٰنِ ذِی الذِّکۡرِ ؕ﴿۱﴾
۱۔صاد، قسم ہے اس قرآن کی جو نصیحت والا ہے۔

بَلِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فِیۡ عِزَّۃٍ وَّ شِقَاقٍ ﴿۲﴾
۲۔مگر جنہوں نے (اس کا) انکار کیا وہ غرور اور مخالفت میں ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ الۡقُرۡاٰنِ: نصیحتوں سے لبریز اس قرآن کی قسم۔ اس قرآن کی نصیحتوں میں کوئی خلل نہیں ہے، نہ اس کے قائم کردہ دلائل میں کوئی سقم ہے، نہ ان حقائق میں کوئی ابہام ہے جو یہ پیش کرتا ہے

۲ بلکہ خود کافروں کے ذہنوں پر تکبر اور غرور کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ ضد اور ہٹ دھرمی نے ان سے سوچنے کی صلاحیت چھین لی ہے۔

کَمۡ اَہۡلَکۡنَا مِنۡ قَبۡلِہِمۡ مِّنۡ قَرۡنٍ فَنَادَوۡا وَّ لَاتَ حِیۡنَ مَنَاصٍ ﴿۳﴾
۳۔ان سے پہلے ہم کتنی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں پھر (جب ہلاکت کا وقت آیا تو) فریاد کرنے لگے مگر وہ بچنے کا وقت نہیں تھا۔

تفسیر آیات

۱۔ یہ لوگ پہلی ہٹ دھرم، ضدی اور مغرور قوم نہیں ہیں ان سے پہلے بھی بہت سی اقوام نے اس قسم کی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا تھا لیکن ان کا یہ تکبر اس وقت خاک میں مل جاتا ہے جب ان کی ہلاکت و تباہی کا وقت آتا ہے۔

۲۔ فَنَادَوۡا: وہ چیخ اٹھتے، کسی بچانے والے کو پکارنے لگ جاتے ہیں مگر وقت گزر چکا ہوتا ہے۔
۳۔ وَّلَاتَ حِیۡنَ مَنَاصٍ: بچنے کا وقت نہیں تھا۔ بچنے کے وقت انہوں نے غرور و تکبر کیا۔

وَ عَجِبُوۡۤا اَنۡ جَآءَہُمۡ مُّنۡذِرٌ مِّنۡہُمۡ ۫ وَ قَالَ الۡکٰفِرُوۡنَ ہٰذَا سٰحِرٌ کَذَّابٌ ۖ﴿ۚ۴﴾

۴۔ اور انہوں نے اس بات پر تعجب کیا کہ خود انہی میں سے کوئی تنبیہ کرنے والا آیا اور کفار کہتے ہیں: یہ جھوٹا جادوگر ہے۔

تفسیر آیات

ا۔ وَ عَجِبُوۡۤا: حالانکہ تعجب اس پر ہونا چاہیے تھا کہ اگر ان کی طرف ایک ایسے اجنبی شخص نے آ کر نبوت کا دعویٰ کیا ہوتا جس کے ماضی کا علم نہ ہوتا اور کردار کا کسی کو تجربہ نہ ہوتا۔ اس کی قوم و قبیلہ کا پتہ نہ ہوتا تو اس صورت میں انہیں کہنا چاہیے تھا کہ تعجب کی بات ایک انجان شخص نے آ کر اچانک ہمارے درمیان نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ ہم اسے جانتے تک نہیں۔

اسی طرح اگر وہ رسول مِّنۡہُمۡ نہ ہوتا انسان نہ ہوتا۔ آسمان سے کوئی فرشتہ نازل ہوتا تو بھی تعجب کی بات تھی کہ بھلا ایسا رسول کس طرح ہمیں راہ راست پر لا سکتا ہے جو ہمارے ساتھ جذبات و ضروریات میں شریک نہ ہو۔ ہماری طرح کوئی احساسات نہ رکھتا ہو۔ ہمارے لیے نمونۂ عمل اور مشعل راہ نہ بن سکتا ہو۔

۲۔ وَ قَالَ الۡکٰفِرُوۡنَ ہٰذَا سٰحِرٌ کَذَّابٌ: اگرچہ وہ دل سے جانتے تھے رسول کریم ﷺ کی دعوت کا سحر اور جادو سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے اور یہ بھی جانتے تھے محمد ﷺ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا لیکن اس دعوت کو رد کرنے کے لیے اس قسم کی باتیں بنایا کرتے تھے۔

اَجَعَلَ الۡاٰلِہَۃَ اِلٰـہًا وَّاحِدًا ۚۖ اِنَّ ہٰذَا لَشَیۡءٌ عُجَابٌ ﴿۵﴾

۵۔ کیا اس نے بہت سے معبودوں کی جگہ صرف ایک معبود بنا لیا؟ یہ تو یقیناً بڑی عجیب چیز ہے۔

تفسیر آیات

بے شمار معبودوں کی جگہ صرف ایک معبود؟ کیسی عجیب بات ہے۔ زندگی کی ہر ضرورت کے لیے مشرکین کا الگ الگ معبود ہوا کرتا تھا۔ تمام ضروریات کے لیے ایک معبود مشرکین کی ثقافت میں ایک ناموس اور عجوبہ تھا۔ واضح رہے مشرکین زندگی کے ہر شعبے کے لیے ایک جدا معبود سے اپنی توقعات وابستہ رکھتے اور اس کی پوجا کرتے تھے۔

وَ انۡطَلَقَ الۡمَلَاُ مِنۡہُمۡ اَنِ امۡشُوۡا وَ اصۡبِرُوۡا عَلٰۤی اٰلِہَتِکُمۡ ۚۖ اِنَّ ہٰذَا لَشَیۡءٌ یُّرَادُ ۚ﴿۶﴾

۶۔ اور ان میں سے قوم کے سرکردہ لوگ یہ کہتے ہوئے چل پڑے: چلتے رہو اور اپنے معبودوں پر قائم رہو، اس چیز میں یقیناً کوئی غرض ہے۔

تفسیر آیات

۱۔رسول خدا ﷺ کی طرف سے کلمہ توحید کی پیش کش سن کر سرداران قریش یہ کہتے ہوئے اٹھ گئے:

۲۔ وَ اصۡبِرُوۡا عَلٰۤی اٰلِہَتِکُمۡ : اپنے معبودوں پر ڈٹے رہو۔ اس شخص کی باتوں میں نہیں آنا چاہیے۔ وَ اصۡبِرُوۡا صبر و استقامت دکھانے کا مطلب یہ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی دعوت میں اس قدر وزن تھا کہ تمام سرداران قریش دباؤ میں تھے۔

۳۔ اِنَّ ہٰذَا لَشَیۡءٌ یُّرَادُ : یہ تو کچھ عزائم رکھتا ہے۔ یہ ہم پر حکمرانی کرنا چاہتا ہے۔ اس دعوت کی غرض و غایت اپنی بالا دستی قائم کرنا ہے۔-

مَا سَمِعۡنَا بِہٰذَا فِی الۡمِلَّۃِ الۡاٰخِرَۃِ ۚۖ اِنۡ ہٰذَاۤ اِلَّا اخۡتِلَاقٌ ۖ﴿ۚ۷﴾

۷۔ہم نے کبھی یہ بات کسی پچھلے مذہب سے بھی نہیں سنی، یہ تو صرف ایک من گھڑت (بات) ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اس دعوت کی بنیاد ہماری پچھلی نسلوں کے ادیان میں بھی نہیں ملتی کہ صرف ایک ہی خدا پر اکتفا کرو۔ بعض کے نزدیک عیسائی مذہب مراد ہے کہ عیسائی مذہب کے لوگوں سے بھی ہم نے نہیں سنا کہ صرف ایک معبود پر انحصار کرو۔ کئی پشتوں سے ہم ان معبودوں سے اپنی حاجتوں کی برآوری کا کام لے رہے ہیں۔

۲۔ اِنۡ ہٰذَاۤ اِلَّا اخۡتِلَاقٌ : لہٰذا یہ کام ادیان سے ہٹ کر اپنا من گھڑت تصور ہے کہ معبود صرف ایک ہے۔

ءَاُنۡزِلَ عَلَیۡہِ الذِّکۡرُ مِنۡۢ بَیۡنِنَا ؕ بَلۡ ہُمۡ فِیۡ شَکٍّ مِّنۡ ذِکۡرِیۡ ۚ بَلۡ لَّمَّا یَذُوۡقُوۡا عَذَابِ ؕ﴿۸﴾

۸۔ کیا ہمارے درمیان اسی پر یہ ذکر نازل کیا گیا؟ درحقیقت یہ لوگ میرے ذکر پر شک کر رہے ہیں بلکہ ابھی تو انہوں نے عذاب چکھا ہی نہیں ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ مشرکین کو بنیادی مسئلہ یہ درپیش تھا کہ ہمارے درمیان نبوت کے عظیم منصب کے لیے عبد اللہ کے یتیم کا انتخاب کیسے ہوا؟ قریش کے بڑے بڑے طواغیت کے لیے یہ بات ناقابل برداشت تھی کہ سرفرازی بنی ہاشم کے کسی فرد کو مل جائے۔

جیسا کہ دوسری جگہ اس بات کا ذکر ہے:

وَقَالُوۡا لَوۡ لَا نُزِّلَ ہٰذَا الۡقُرۡاٰنُ عَلٰی رَجُلٍ مِّنَ الۡقَرۡیَتَیۡنِ عَظِیۡمٍ ۱؎ — اور کہتے ہیں: یہ قرآن دونوں بستیوں میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نازل نہیں کیا گیا؟

۲۔ بَلۡ ہُمۡ فِیۡ شَکٍّ مِّنۡ ذِکۡرِیۡ: وہ اس قرآن کی حقانیت پر شک کا اظہار کرتے رہیں گے عذاب کا مزہ چکھنے تک۔ جب عذاب میں مبتلا ہو جائیں گے تو یقین آئے گا کہ یہ دعوت سچی تھی۔

اَمۡ عِنۡدَہُمۡ خَزَآئِنُ رَحۡمَۃِ رَبِّکَ الۡعَزِیۡزِ الۡوَہَّابِ ۚ﴿۹﴾ — ۹۔ کیا ان کے پاس تیرے غالب آنے والے فیاض رب کی رحمت کے خزانے ہیں؟

تفسیر آیات

۱۔ مشرکین کے اس اعتراض کا جواب ہے: کیا ہمارے درمیان یہی ایک رہ گیا تھا جسے نبوت کے لیے منتخب کیا۔ فرمایا: کیا اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کے خزانوں کے مالک یہ لوگ ہیں جو یہ کہہ دیں کہ ہماری مرضی کے بغیر کسی کو نبوت کا منصب کیسے دیا؟

۲۔ الۡعَزِیۡزِ الۡوَہَّابِ: جب کہ آپ کا رب ہر قوت پر غالب آنے والا ہے۔ اس کے فیصلے کو غلبہ حاصل ہے۔ آپ کا رَبُ وَھَّاب، عنایتوں اور بخششوں کا مالک ہے۔ اللہ کسی عنایت پر بخل کرنے والا نہیں ہے۔ اپنی فیاضی اس وقت روکتا ہے جب کسی میں فیض لینے کی ظرفیت نہ ہو۔

اَمۡ لَہُمۡ مُّلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ مَا بَیۡنَہُمَا ۟ فَلۡیَرۡتَقُوۡا فِی الۡاَسۡبَابِ ﴿۱۰﴾ — ۱۰۔ یا آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب پر ان کی حکومت ہے؟ (اگر ایسا ہے) تو (آسمان کے) راستوں پر چڑھ دیکھیں۔

۱؎ ۴۳ زخرف: ۳۱

تفسیر آیات

۱۔ کسی کو نبوت دینا یا نہ دینا اللہ تعالیٰ کی کائنات پر حاکیت اعلیٰ کا حصہ ہے۔ اللہ اپنی قدرت قاہرہ اور حکیمانہ فیصلے کے مطابق نبوت کا منصب عنایت فرماتا ہے۔ اگر تمہارے پاس کوئی اختیار ہے تو کر کے دکھاؤ مثلاً:

۲۔ فَلۡیَرۡتَقُوۡا فِی الۡاَسۡبَابِ: آسمانی راستوں پر چڑھ کر وحی کا راستہ روکو یا آسمانوں پر چڑھ کر اپنے کسی منظور نظر پر وحی نازل کراؤ۔

جُنۡدٌ مَّا ہُنَالِکَ مَہۡزُوۡمٌ مِّنَ الۡاَحۡزَابِ ﴿۱۱﴾

۱۱۔ یہ لشکروں میں سے ایک چھوٹا لشکر ہے جو اسی جگہ شکست کھانے والا ہے۔

تفسیر آیات

آسمانی راستوں پر کیا چڑھیں گے، یہ مشرکین ایک دن اسی جگہ، مکہ میں شکست کھانے والا ایک چھوٹا سا بے وقعت لشکر ثابت ہوں گے۔ اسی مکہ میں وہ دن آنے والا ہے جب یہ تکبر کرنے والے اسی رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے سامنے سر جھکائے، ذلت و رسوائی کے ساتھ معافی کے انتظار میں کھڑے ہوں گے۔

کَذَّبَتۡ قَبۡلَہُمۡ قَوۡمُ نُوۡحٍ وَّ عَادٌ وَّ فِرۡعَوۡنُ ذُو الۡاَوۡتَادِ ﴿۱۲﴾

۱۲۔ ان سے پہلے نوح اور عاد کی قوم اور میخوں والے فرعون نے تکذیب کی تھی۔

وَ ثَمُوۡدُ وَ قَوۡمُ لُوۡطٍ وَّ اَصۡحٰبُ لۡئَیۡکَۃِ ؕ اُولٰٓئِکَ الۡاَحۡزَابُ ﴿۱۳﴾

۱۳۔ اور ثمود اور لوط کی قوم اور ایکہ والوں نے بھی اور یہ ہیں وہ بڑا لشکر۔

تفسیر آیات

۱۔ فرعون کو ”میخوں والا“، ممکن ہے اس لیے فرمایا ہو کہ اس کی حکومت میخوں کی طرح مضبوط تھی یا لشکر کی کثرت کی طرف اشارہ ہو کہ اس کا لشکر جب خیمہ زن ہوا تھا ہر طرف خیموں کی میخیں نظر آئی ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ فرعون جن کو سزا دیتا تھا انہیں سولی پر چڑھا کر میخوں سے آویزاں کرتا تھا۔

۲۔ اُولٰٓئِکَ الۡاَحۡزَابُ: تاریخ کی ان سات اقوام کا ذکر فرمایا جنہیں تباہ کیا گیا۔ پھر فرمایا: اُولٰٓئِکَ الۡاَحۡزَابُ یہ ہیں تاریخ کے احزاب جو اپنے اپنے وقت کی بڑی طاقتیں سمجھے جاتے تھے جن کے مقابلے میں

مکہ والوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

اِنۡ کُلٌّ اِلَّا کَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ عِقَابِ ﴿۱۴﴾

۱۴۔ ان میں سے ہر ایک نے رسولوں کو جھٹلایا تو میرا عذاب لازم ہو گیا۔

تفسیر آیات

۱۔ لازم اس لیے ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کا قانونِ عدل اٹل ہے۔ اس میں تبدیلی نہیں ہو سکتی تھی۔ اہل مکہ کو ہلا دینے والی ایک دھمکی اور تنبیہ ہے کہ اللہ کے اس اٹل فیصلے کی زد میں عنقریب تم بھی آنے والے ہو۔

وَ مَا یَنۡظُرُ ہٰۤؤُلَآءِ اِلَّا صَیۡحَۃً وَّاحِدَۃً مَّا لَہَا مِنۡ فَوَاقٍ ﴿۱۵﴾

۱۵۔ اور یہ لوگ صرف ایک چیخ کے منتظر ہیں جس کے ساتھ کوئی مہلت نہیں ہو گی۔

تشریح کلمات

فَوَاقٍ: (ف و ق) وقفہ اور راحت کے معنوں میں ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اس چیخ سے مراد جنگی نعرہ ہے جو جنگ بدر میں بلند ہوا یا صباحاہ یا اس سے مراد صور پھونکنے کی آواز ہے؟ بہرحال جب عذاب کا کڑکا ہو گا تو انہیں اتنی مہلت بھی نہیں ملے گی جتنی دیر اونٹنی کے تھن میں دودھ اترنے میں لگتی ہے۔ بعض کہتے ہیں فَوَاقٍ کے معنی یہ ہیں کہ دوبارہ دنیا کی طرف نہیں لوٹنا۔

وَ قَالُوۡا رَبَّنَا عَجِّلۡ لَّنَا قِطَّنَا قَبۡلَ یَوۡمِ الۡحِسَابِ ﴿۱۶﴾

۱۶۔ اور وہ (از روئے تمسخر) کہتے ہیں: اے ہمارے رب! ہمارا (عذاب کا) حصہ ہمیں حساب کے دن سے پہلے دے دے۔

تشریح کلمات

قِطَّنَا (ق ط ط) اصل میں قط، صحیفہ کو کہتے ہیں۔ پھر جو چیز لکھی گئی ہو اسے بھی قط کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے ازراہ تمسخر کہتے ہیں: یوم الحساب کے عذاب سے ہمیں کیا ڈراتے ہو جو

معلوم نہیں کب آنے والا ہے؟ آپ اگر سچے ہیں تو یوم الحساب والا عذاب فوری لے آئیں۔ اگر فوری نہ لا سکے تو آپ کی ساری باتیں بے حقیقت ہیں۔ جب کہ عذاب ان کے کہنے پر نہیں، اپنے مقرر وقت پر آتا ہے۔

اِصۡبِرۡ عَلٰی مَا یَقُوۡلُوۡنَ وَ اذۡکُرۡ عَبۡدَنَا دَاوٗدَ ذَا الۡاَیۡدِ ۚ اِنَّہٗۤ اَوَّابٌ ﴿۱۷﴾

۱۷۔ (اے رسول) جو یہ کہتے ہیں اس پر صبر کیجیے اور (ان سے) ہمارے بندے داؤد کا قصہ بیان کیجیے جو طاقت کے مالک اور (اللہ کی طرف) بار بار رجوع کرنے والے تھے۔

تفسیر آیات

۱۔ اِصۡبِرۡ عَلٰی مَا یَقُوۡلُوۡنَ: اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ اور اٹل فیصلے کے مطابق ان مشرکین پر فوری عذاب آنا نہ تھا۔ اس لیے ان کا یہ تمسخر اور طعنہ کچھ دیر کے لیے سننا پڑا جو صبر آزما تھا۔ اس لیے صبر کرنے کا حکم فرمایا:

۲۔ وَ اذۡکُرۡ عَبۡدَنَا دَاوٗدَ: صبر و تحمل کے لیے ہمارے نبی داؤد کو یاد کیجیے کہ ایک غیر معروف قبیلے کے گمنام فرد تھے۔ انہیں ہم نے بالادستی دی۔ سلطنت عنایت فرمائی۔ داؤد علیہ السلام میں دو باتیں تھیں:

۳۔ ذَا الۡاَیۡدِ: وہ طاقت کے مالک، شجاع تھے۔ انہوں نے طالوت کو قتل کیا اور بنی اسرائیل کو اپنے دشمن پر فتح دلائی۔

۴۔ اِنَّہٗۤ اَوَّابٌ: شجاعت کے ساتھ عبادت میں بھی سب سے آگے تھے۔ اس کے بعد گمنام جوان مرد داؤد علیہ السلام کو جن عنایات سے نوازا گیا ان کا ذکر آتا ہے:

اِنَّا سَخَّرۡنَا الۡجِبَالَ مَعَہٗ یُسَبِّحۡنَ بِالۡعَشِیِّ وَ الۡاِشۡرَاقِ ﴿ۙ۱۸﴾

وَ الطَّیۡرَ مَحۡشُوۡرَۃً ؕ کُلٌّ لَّہٗۤ اَوَّابٌ ﴿۱۹﴾

۱۸۔ ہم نے ان کے لیے پہاڑوں کو مسخر کیا تھا، یہ صبح و شام ان کے ساتھ تسبیح کرتے تھے۔

۱۹۔ اور پرندوں کو بھی (مسخر کیا)، یہ سب اکٹھے ہو کر ان کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔

تشریح کے لیے ملاحظہ سورۃ الانبیاء آیت ۷۹ اور سورہ سباء آیت ۱۰۔

وَ شَدَدۡنَا مُلۡکَہٗ وَ اٰتَیۡنٰہُ الۡحِکۡمَۃَ وَ فَصۡلَ الۡخِطَابِ ﴿۲۰﴾

۲۰۔ اور ہم نے ان کی سلطنت مستحکم کر دی اور انہیں حکمت عطا کی اور فیصلہ کن گفتار (کی صلاحیت) دے دی۔

تفسیر آیات

۱۔ وَشَدَدۡنَا مُلۡکَہٗ: اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو ایک مستحکم ناقابل تسخیر سلطنت عنایت فرمائی۔ روایت کے مطابق ان کی حکومت چالیس سال تک رہی۔

۲۔ وَاٰتَیۡنٰہُ الۡحِکۡمَۃَ: حکمت، حقائق کے فہم و ادراک اور جیسا عمل ہونا چاہیے ویسا عمل کرنے کو کہتے ہیں۔ یہ اللہ کی طرف سے ہر رسول کو عنایت ہوتی ہے۔ اس سے انبیاء علیہم السلام غلطی کا ارتکاب نہیں کرتے اور اجتہاد کی نوبت نہیں آتی چہ جائیکہ اجتہادی غلطی کی نوبت آئے۔

۳۔ وَفَصۡلَ الۡخِطَابِ: شیریں بیان۔ کسی مطلب کو بیان کرنے میں کوئی ابہام نہ ہو۔ جو مطلب بیان کرنا چاہیے تھا وہ واضح اور درست خدوخال کے ساتھ مخاطب کے ذہن میں اتر جائے۔ فصل الخطاب کا مطلب ہے نزاعات میں فیصلے کی قوت۔ اسی قوت بیان کی وجہ سے داؤد علیہ السلام نزاع کا فیصلہ نہایت احسن طریقہ سے کرتے تھے۔

وَ ہَلۡ اَتٰىکَ نَبَؤُا الۡخَصۡمِ ۘ اِذۡ تَسَوَّرُوا الۡمِحۡرَابَ ﴿ۙ۲۱﴾	۲۱۔ اور کیا آپ کے پاس مقدمے والوں کی خبر پہنچی ہے جب وہ دیوار پھاند کر محراب میں داخل ہوئے؟
اِذۡ دَخَلُوۡا عَلٰی دَاوٗدَ فَفَزِعَ مِنۡہُمۡ قَالُوۡا لَا تَخَفۡ ۚ خَصۡمٰنِ بَغٰی بَعۡضُنَا عَلٰی بَعۡضٍ فَاحۡکُمۡ بَیۡنَنَا بِالۡحَقِّ وَ لَا تُشۡطِطۡ وَ اہۡدِنَاۤ اِلٰی سَوَآءِ الصِّرَاطِ ﴿۲۲﴾	۲۲۔ جب وہ داؤد کے پاس آئے تو وہ ان سے گھبرا گئے، انہوں نے کہا: خوف نہ کیجیے، ہم نزاع کے دو فریق ہیں، ہم میں سے ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے لہٰذا آپ ہمارے درمیان برحق فیصلہ کیجیے اور بے انصافی نہ کیجیے اور ہمیں سیدھا راستہ دکھا دیجیے۔

تفسیر آیات

کیا آپ کے پاس مقدمے والوں کی خبر پہنچی ہے جب وہ دیوار پھاند کر محراب میں داخل ہوئے۔ جب وہ داؤد کے پاس آگئے تو وہ ان سے گھبرا گئے انہوں نے کہا خوف نہ کیجیے ہم نزاع کے دو فریق ہیں۔ ہم میں سے ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے لہٰذا آپ ہمارے درمیان فیصلہ کیجیے، بے انصافی نہ کیجیے اور ہمیں سیدھا راستہ دکھا دیجیے۔

ان آیات میں چند ایک نکات وضاحت طلب ہیں:

i۔ ان دونوں کے دیوار پھاند کر خلوت کے وقت حضرت داؤد علیہ السلام کی خدمت میں بلا اجازت داخل

ہونے کی وجہ کیا تھی؟ کیا عام طریقے سے اجازت لے کر اپنا مقدمہ پیش کرتے تو مناسب نہ تھا؟
اس سوال کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ مقدمے کی نوعیت عام اور معمولی نہ تھی۔ ایک خصوصی مسئلہ تھا جو حضرت داؤد علیہ السلام سے متعلق تھا۔ جیسے بعد میں اس کی وضاحت ہو گی۔

ii۔ فَفَزِعَ: حضرت داؤد علیہ السلام جیسے بہادر ان دو آدمیوں سے خوف زدہ کیسے ہو گئے کہ ان دونوں کو لَا تَخَفۡ کہنا پڑا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ کسی موذی سے ضرر کا احساس، خوف ہے جو ایک قدرتی امر ہے اور یہ احساس انسان کے انسانی شعور کا لازمہ ہے۔ یہ قابل مذمت نہیں ہے۔ ایک گرنے والی دیوار سے ہٹ جانا مذموم نہیں ہے۔ آگے فریقین میں سے ایک فریق اپنا مقدمہ پیش کرتا ہے:

اِنَّ هٰذَاۤ اَخِیۡ ۟ لَهٗ تِسۡعٌ وَّ تِسۡعُوۡنَ نَعۡجَةً وَّلِیَ نَعۡجَةٌ وَّاحِدَةٌ ۟ فَقَالَ اَکۡفِلۡنِیۡهَا وَعَزَّنِیۡ فِی الۡخِطَابِ ﴿۲۳﴾

۲۳۔ یہ میرا بھائی ہے، اس کے پاس ننانوے دنبیاں ہیں اور میرے پاس صرف ایک دنبی ہے، یہ کہتا ہے کہ اسے میرے حوالے کرو اور گفتگو میں مجھ پر دباؤ ڈالتا ہے۔

قَالَ لَقَدۡ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعۡجَتِكَ اِلٰی نِعَاجِهٖ ؕ وَاِنَّ کَثِیۡرًا مِّنَ الۡخُلَطَآءِ لَیَبۡغِیۡ بَعۡضُهُمۡ عَلٰی بَعۡضٍ اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَقَلِیۡلٌ مَّا هُمۡ ؕ وَظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسۡتَغۡفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاکِعًا وَّاَنَابَ ﴿۲۴﴾

۲۴۔ داؤد کہنے لگے: تیری دنبی اپنی دنبیوں کے ساتھ ملانے کا مطالبہ کر کے یقیناً یہ تجھ پر ظلم کرتا ہے اور اکثر شریک ایک دوسرے پر زیادتی کرتے ہیں سوائے ان لوگوں کے جو ایمان رکھتے ہیں اور نیک اعمال بجا لاتے ہیں اور ایسے لوگ تھوڑے ہوتے ہیں، پھر داؤد کو خیال آیا کہ ہم نے انہیں آزمایا ہے چنانچہ انہوں نے اپنے رب سے معافی مانگی اور عاجزی کرتے ہوئے جھک گئے اور (اللہ کی طرف) رجوع کیا۔

فَغَفَرۡنَا لَهٗ ذٰلِكَ ؕ وَاِنَّ لَهٗ عِنۡدَنَا لَزُلۡفٰی وَحُسۡنَ مَاٰبٍ ﴿۲۵﴾

۲۵۔ پس ہم نے ان کی اس بات کو معاف کیا اور یقیناً ہمارے نزدیک ان کے لیے تقرب اور بہتر بازگشت ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اس مقدمے کو اس انداز سے پیش کیا گیا کہ انسانی احساسات کو جھنجھوڑا جائے اور جذبات میں لا کر فیصلہ لیا جائے۔ انتہائی ناانصافی ہے کہ ننانوے (۹۹) والا دوسرے کے ایک کو بھی ہتھیانا چاہتا ہے۔ چنانچہ وہ انسانی جذباتی پہلو کو ابھارنے میں کامیاب ہو گئے اور حضرت داؤد علیہ السلام نے جذباتی فیصلہ دے دیا۔

۲۔ وَظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ: ظن بھی علم ہے۔ جب حضرت داؤد علیہ السلام نے دیکھا تو یہ تو میرا امتحان ہو گیا۔ یہ کسی نزاع کا مسئلہ نہ تھا بلکہ میری آزمائش کے لیے ایک تمثیلی صورت تھی جو فرشتوں نے صرف مجھے آزمانے کے لیے پیش کی تھی۔

کیا یہ آزمائش کسی حقیقی نزاع کی قضاوت کے بارے میں تھی؟ اور وہ خطا جو حضرت داؤد علیہ السلام سے سرزد ہوئی، کیا تھی؟ اس بارے میں مفسرین میں بڑا اختلاف ہے۔

حضرت امام رضا علیہ السلام سے مروی روایت کے مطابق ان کی خطا یہ تھی کہ انہیں خیال آیا کہ شاید مجھ سے زیادہ علم رکھنے والا کوئی نہیں۔ اس پر حضرت داؤد علیہ السلام کی آزمائش کے لیے دو فرشتے آئے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے مدعی کا بیان سنتے ہی اس کے حق میں فیصلہ دے دیا اور مدعی سے گواہ طلب نہ کیا۔ یہ عمل اللہ کو پسند نہ آیا۔

بائیبل میں حضرت داؤد علیہ السلام پر یہ بہتان لگایا ہے کہ آپؑ نے اوریا کی بیوی سے معاذ اللہ ناجائز تعلقات رکھے۔ پھر اوریا کو ایک جنگ میں روانہ کر کے ہلاک کروایا۔ پھر اس کی بیوی سے نکاح کیا اور لکھا ہے کہ یہی عورت حضرت سلیمان علیہ السلام کی ماں ہیں۔

غیر شیعہ مصادر میں تقریباً یہی روایت سوائے زنا کے الزام کے مذکور ہے جو اسرائیلیات کا ایک حصہ ہے۔

شیعہ مصادر میں حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

لا اوتی برجل یزعم ان داؤد ع تزوج بامرأۃ أوریا الا جلدته حدین حدا للنبوۃ و حدا للاسلام۔[۱]	اگر میرے پاس وہ شخص لایا جائے جو یہ کہتا ہو داؤد نے اوریا کی بیوی سے شادی کی ہے میں اس پر کوڑوں کی دو حدیں جاری کروں گا۔ ایک نبوت کی، دوسری اسلام کی۔

دوسری روایت میں فرمایا:

میں اس پر ایک سو ساٹھ کوڑے ماروں گا جو انبیاء پر بہتان لگانے کی سزا ہے۔[۲]

بائیبل کی الزام تراشی کے پیچھے اصل واقعہ کیا تھا؟ وہ ایک روایت میں ملتا ہے۔ حضرت امام رضا علیہ السلام سے روایت ہے:

حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے میں شوہر کے مرنے اور قتل ہونے کے بعد عورت شادی نہیں کر

---

۱ متشابه القرآن ۱: ۲۵۰　۲ زبدة التفسیر ۶: ۲۳

سکتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے پہلی بار حضرت داؤد علیہ السلام کے لیے یہ شادی جائز قرار دی۔ اس حکم کے مطابق حضرت داؤد علیہ السلام نے اوریا کے قتل اور عدت پوری ہونے کے بعد عقد کیا تو لوگوں کے لیے یہ عقد اوریا کے قتل سے زیادہ سنگین ہو گیا۔[1]

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ ﴿٢٦﴾

۲۶۔ اے داؤد! ہم نے آپ کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے لہٰذا لوگوں میں حق کے ساتھ فیصلہ کریں اور خواہش کی پیروی نہ کریں، وہ آپ کو اللہ کی راہ سے ہٹا دے گی، جو اللہ کی راہ سے بھٹکتے ہیں ان کے لیے یوم حساب فراموش کرنے پر یقیناً سخت عذاب ہو گا۔

تفسیر آیات

۱۔ اے داؤد! ہم نے آپ کو زمین میں اپنا نمائندہ بنایا ہے۔ لفظ خلیفة کی تشریح کے لیے ملاحظہ فرمائیں سورۃ البقرۃ آیت ۳۰۔

۲ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ: زمین پر خلیفہ بننے سے جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے وہ لوگوں کے درمیان حق اور عدل و انصاف کا فیصلہ کرنا ہے۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ خلیفة اللّٰہ وہ ہوتے ہیں جو زمین میں اللہ کی شریعت کا نفاذ کریں اور شریعت کے نفاذ میں سرفہرست، لوگوں میں عدل و انصاف قائم کرنا ہے۔

۳۔ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى: اور خواہش کی پیروی نہ کریں۔ بعض نے اس سے یہ سمجھا ہے کہ اس میں اشارہ ہے حضرت داؤد علیہ السلام کے فیصلے کی طرف کہ ان سے فیصلہ خواہش کے مطابق ہوا تھا۔ یہ درست نہیں ہے۔ اسی قسم کا حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے بھی ہوا ہے:

وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ...[2]

اور جو حکم اللہ نے نازل کیا ہے اس کے مطابق ان میں فیصلہ کریں اور آپ ان کی خواہشات کی پیروی نہ کریں۔

حقیقت امر یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے معصوم ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ خواہشات سے بچنے کے

[1] عیون الاخبار ۱: ۴ [2] ۵ مائدہ: ۴۹

مکلّف نہیں ہیں، ان کی طرف امر و نہی کا حکم نہیں آتا اور وہ گناہ کرنے پر قدرت ہی نہیں رکھتے بلکہ انبیاء علیہم السلام بھی باقی لوگوں کی طرح مکلّف ہیں اور گناہ پر قدرت رکھنے کے باوجود گناہ نہیں کرتے۔

وَ مَا خَلَقۡنَا السَّمَآءَ وَ الۡاَرۡضَ وَ مَا بَیۡنَہُمَا بَاطِلًا ؕ ذٰلِکَ ظَنُّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا ۚ فَوَیۡلٌ لِّلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنَ النَّارِ ﴿۲۷﴾

۲۷۔ اور ہم نے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کو بے مقصد پیدا نہیں کیا، یہ کفار کا گمان ہے، ایسے کافروں کے لیے آتش جہنم کی تباہی ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ سابقہ آیت میں دستور اور آئینی زندگی بیان کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ کائنات عبث اور بے مقصد وجود میں نہیں آئی اور انسان اس کائنات میں بے مقصد اور ماحول کے ہاتھوں کھلونا نہیں ہے۔ یہ کائنات ایک حکیمانہ مقصد کے تحت پیدا ہوئی ہے۔ انسان اس مقصد کے حصول کے لیے یہاں لایا گیا ہے۔ آخرت میں اس کا نتیجہ دیکھنا ہے۔

۲۔ ذٰلِکَ ظَنُّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا: اس کائنات کو بے مقصد قرار دینا اور اپنی زندگی کو کھلونا ماننا کافرانہ سوچ ہے۔ کافر کی زندگی کا تصور یہ ہے کہ انسان ایک بے مقصد کیڑا ہے جو درد دکھ سہ سہ کر نابود ہو جاتا ہے۔

اَمۡ نَجۡعَلُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کَالۡمُفۡسِدِیۡنَ فِی الۡاَرۡضِ ۫ اَمۡ نَجۡعَلُ الۡمُتَّقِیۡنَ کَالۡفُجَّارِ ﴿۲۸﴾

۲۸۔ کیا ہم ایمان لانے اور اعمال صالح بجا لانے والوں کو زمین میں فساد پھیلانے والوں کی طرح قرار دیں یا اہل تقویٰ کو بدکاروں کی طرح قرار دیں؟

تفسیر آیات

اگر یہ کائنات بے مقصد اور عبث وجود میں آئی ہے تو مؤمن اور مفسد، متقی اور فاجر میں کوئی فرق نہیں ہونا چاہیے۔

اگر ان قدروں کو تسلیم کیا جائے اور نیکی بجا لانے والا، برائی کا ارتکاب کرنے والے کے برابر ہو جائے اور اصلاح کا داعی، مفسدوں کے مساوی ہو جائے تو کائنات کا پورا نظام عبث اور باطل ہو کر رہ جاتا

ہے اور انسان ایک کھلونا بن جاتا ہے۔ یہ تصور بذات خود انسانیت کی توہین ہے۔
آیت میں اس بات کی صراحت موجود ہے۔ یہ کام اللہ سے صادر نہ ہو گا کہ صالح اور فسادی، متقی اور بدکار ایک جیسے ہوں کیونکہ ہر عاقل سمجھ لیتا ہے کہ ایسا کرنا اپنی جگہ ایک قبیح عمل ہے۔ حتیٰ جو لوگ شریعت کو نہیں مانتے ان کے نزدیک بھی یہ قبیح ہے۔ اسے قبح عقلی کہتے ہیں۔ آیت کی صراحت یہ ہے کہ اللہ اس قسم کے قبیح عمل کا ارتکاب نہیں کرتا۔ ایسا کرنا عدل کے خلاف ہے۔ اسی لیے ہم اپنے اصول عقائد میں اس بات کو شامل کرتے ہیں اور کہتے ہیں اللہ عادل ہے۔ شیعہ امامیہ نے عدل الٰہی کو اصول دین میں رکھا ہے۔

فضائل: حاکم حسکانی نے شواھد التنزیل میں تین طریقوں سے ابن عباس سے اور خود حضرت علی علیہ السلام سے روایت کی ہے:

> یہ آیت، تین شخصیتوں جو مؤمن اور نیک عمل بجا لانے والی ہیں اور تین مشرکین جو مفسد اور فاجر ہیں، کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ مسلمانوں میں تین، علی بن ابی طالب (علیہ السلام)، حمزۃ بن عبد المطلب اور عبیدۃ حارث بن عبد المطلب ہیں، جنہوں نے جنگ بدر کے دن جنگ لڑی۔ علی (علیہ السلام) نے ولید کو، حمزہ نے عتبہ کو اور عبیدہ نے شیبہ کو قتل کیا۔
>
> یہی روایت ابن عساکر نے بیان کی ہے اور روح المعانی میں بھی ذیل آیت ہے۔

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْۤا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۲۹﴾

۲۹۔ یہ ایک ایسی بابرکت کتاب ہے جو ہم نے آپ کی طرف نازل کی ہے تاکہ لوگ اس کی آیات میں تدبر کریں اور صاحبان عقل اس سے نصیحت حاصل کریں۔

تفسیر آیات

۱۔ مُبٰرَكٌ: خیر و سعادت کی افزونی کو کہتے ہیں۔ قرآن کے مبارک ہونے کے بارے میں کوئی کیا بیان کر سکتا ہے جس کی روشنی روئے زمین کے چار سو پھیلی ہوئی ہے۔ جس نے انسان کو بلوغت تک پہنچایا، تمدن و تہذیب دی، دستور حیات فراہم کیا اور انسان کو انسانی قدروں سے روشناس کرایا۔

۲۔ لِّيَدَّبَّرُوْۤا اٰيٰتِهٖ: تاکہ لوگ اس کتاب میں موجود تکوین و تشریع کے رموز میں تدبر کریں، اسے اپنے لیے دستور حیات بنا لیں اور دنیا و آخرت کی سعادت حاصل کریں۔

۳۔ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ: عقل و خرد رکھنے والے اپنی ابدی سعادت کے لیے اس کتاب میں

موجود نصیحتوں سے استفادہ کریں اور اس کتاب کی ہر حیات آفرین دعوت پر لبیک کہیں۔ مثلاً:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ....[1]

اے ایمان والو! اللہ اور رسول کو لبیک کہو جب وہ تمہیں حیات آفرین باتوں کی طرف بلائیں۔

وَ وَهَبْنَا لِدَاوٗدَ سُلَيْمٰنَ ؕ نِعْمَ الْعَبْدُ ؕ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ﴿۳۰﴾

۳۰۔ اور ہم نے داؤد کو سلیمان عطا کیا جو بہترین بندے اور (اللہ کی طرف) خوب رجوع کرنے والے تھے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کا ذکر پہلے سورہ ہائے بقرہ:۱۰۲، نساء: ۱۶۳، انبیاء: ۷۸، نحل: ۳۰ و دیگر آیات میں ہو چکا ہے۔

اِذْ عُرِضَ عَلَيْهِ بِالْعَشِيِّ الصّٰفِنٰتُ الْجِيَادُ ﴿۳۱﴾

۳۱۔ جب شام کے وقت انہیں عمدہ تیز رفتار گھوڑے پیش کیے گئے،

فَقَالَ اِنِّيْۤ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّيْ ۚ حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ ﴿۳۲﴾

۳۲۔ تو انہوں نے کہا: میں نے (گھوڑوں کے ساتھ ایسی) محبت کی جیسے خیر سے محبت کی جاتی ہے اور اپنے رب کے ذکر سے غافل ہو گیا یہاں تک کہ پردے میں چھپ گیا۔

رُدُّوْهَا عَلَيَّ ؕ فَطَفِقَ مَسْحًۢا بِالسُّوْقِ وَالْاَعْنَاقِ ﴿۳۳﴾

۳۳۔ (بولے) انہیں میرے پاس واپس لے آؤ، پھر ان کی ٹانگوں اور گردنوں پر ہاتھ پھیرنے لگے۔

تشریح کلمات

الصّٰفِنٰتُ: (ص ف ن) گھوڑے کا تین پاؤں پر کھڑے ہو کر چوتھے پاؤں کو اس طرح اٹھانا کہ اس کا اگلا حصہ زمین پر لگا رہے۔ عمدہ گھوڑے کی علامت۔

الْجِيَادُ: (ج و د) تیز رفتار گھوڑے۔

تفسیر آیات

۱۔ سیاق آیات کے قریب تر معنی یہ ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو بندگان خدا میں ممتاز مقام حاصل

---

[1] ۸ انفال: ۲۴

تھا کیونکہ وہ اللہ کی طرف خوب رجوع کرنے والے تھے۔

۲۔ اِذۡ عُرِضَ عَلَیۡہِ: جب سدھائے ہوئے تیز رفتار گھوڑے پیش کیے گئے جو راہ خدا میں جہاد کے لیے آمادہ تھے۔

۳۔ بِالۡعَشِیِّ: شام کے وقت ان گھوڑوں کو پیش کیا گیا چونکہ شام کے وقت جب گھوڑے اور دیگر حیوانات چراگاہ سے چرا کر واپس لائے جاتے ہیں تو اس وقت ان کا معائنہ کیا جاتا ہے کہ سب گھوڑے واپس آ گئے۔

۴۔ فَقَالَ اِنِّیۡۤ اَحۡبَبۡتُ: حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا: میں نے ان گھوڑوں کے ساتھ ایسی محبت کی جیسے عمدہ مال کے ساتھ کی جاتی ہے۔ حُبَّ الۡخَیۡرِ میں الۡخَیۡرِ سے مراد مال ہوسکتا ہے جیسے اِنۡ تَرَکَ خَیۡرَۨا ۚ الۡوَصِیَّۃُ ...[1] میں خَیۡرَ سے مراد مال ہے۔

۵۔ عَنۡ ذِکۡرِ رَبِّیۡ: اس جملے کا ایک ترجمہ وہی ہے جو متن میں ذکر ہوا ہے۔ عَنۡ بمعنی اعراض، منہ موڑنے، غفلت کرنے کے معنوں میں ہے۔ دوسرا ترجمہ یہ ہوسکتا ہے: بہ سبب ذکر رَبّ ان گھوڑں سے محبت کی۔ اس صورت میں عَنۡ سبب و علت بیان کرنے کے لیے ہے۔ یعنی حبا ناشئاً عن ذکر ربی۔

۶۔ حَتّٰی تَوَارَتۡ بِالۡحِجَابِ: یہاں تک پردے میں چھپ گیا۔ یعنی جب گھوڑوں کی دوڑ کرائی اور وہ نگاہ سے دور ہو گئے تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے حکم دیا کہ گھوڑے ان کے پاس واپس لائے جائیں۔ ممکن ہے توارت الصافنات بالحجاب مراد ہو۔ چنانچہ رُدُّوۡہَا عَلَیَّ اس پر قرینہ ہے۔ اکثر مفسرین توارت الشمس مراد لیتے ہیں جب کہ شمس پہلے مذکور نہیں ہے۔ صرف العشی کو قرینہ قرار دیتے ہیں جو واضح نہیں ہے۔

۷۔ فَطَفِقَ مَسۡحًۢا بِالسُّوۡقِ وَ الۡاَعۡنَاقِ: پھر از روئے محبت ان گھوڑوں کی گردنوں اور پنڈلیوں پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ انبیاء علیہم السلام دنیا کی عمدہ چیزوں سے اگر محبت کرتے ہیں تو محض برائے خدا محبت کرتے ہیں۔ عمدہ گھوڑوں پر بھی رضائے الٰہی کی خواہش کے بغیر فریفتہ نہیں ہوتے۔

اکثر مفسرین ان آیات سے اس طرح مطلب اخذ کرتے ہیں:

> حضرت سلیمان علیہ السلام گھوڑوں کے معائنے میں اس قدر منہمک ہو گئے کہ نماز عصر رہ گئی۔ یہاں تک کہ سورج چھپ گیا۔ اس پر انہوں نے حکم دیا ان گھوڑوں کو واپس لایا جائے۔ جب واپس لائے گئے تو تلوار سے ان گھوڑوں کی گردنیں اور پنڈلیوں پر مارنے لگ گئے۔ یعنی ان گھوڑوں کو تلف کر دیا گیا چونکہ یہ ذکر خدا سے غافل ہونے کے سبب بنے۔

اس تفسیر کے لیے آیت میں مطلوبہ قرائن و شواہد موجود نہیں ہیں۔

---

[1] ۲ بقرۃ: ۱۸۰

تَوَارَتۡ چھپ گیا سے مراد سورج لیتے ہیں جب کہ سورج کا یہاں کوئی ذکر ہے نہ قرینہ۔

مَسۡحًۢا سے مراد تلوار سے مسح لیتے ہیں جس کی عربی محاورے میں کوئی مثال نہیں ہے۔ مسح بالسیف مراد ہو، آیت میں اس کا کوئی قرینہ نہیں ہے۔

وَ لَقَدۡ فَتَنَّا سُلَیۡمٰنَ وَ اَلۡقَیۡنَا عَلٰی کُرۡسِیِّہٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ ﴿۳۴﴾

۳۴۔ اور ہم نے سلیمان کو آزمایا اور ان کے تخت پر ایک جسد ڈال دیا پھر انہوں نے (اپنے رب کی طرف) رجوع کیا۔

تفسیر آیات

یہ بے روح جسد حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے کس طرح امتحان تھا؟ اس کی تفصیل کے بارے میں وارد روایات کے الفاظ و عبارات متضاد، غیر معقول اور اسرائیلیاتی خرافات سے پُر ہیں۔ بعض لوگ اس جسد سے ان کے ولی عہد رحبعام مراد لیتے ہیں جو ان کے بعد حکومت چلانے میں بری طرح ناکام ہو گئے۔ جب کہ یہی قول آیت میں موجود لفظ جَسَدًا سے مطابقت نہیں رکھتا۔

بعض کہتے ہیں حضرت سلیمان علیہ السلام سے یہ کوتاہی سرزد ہوئی کہ ان کے گھر میں ایک بیگم بت پرستی کرتی رہی جس کی وجہ سے شیطان نے ان کی وہ انگوٹھی اڑا لی جس سے وہ جن و انس پر حکومت کرتے تھے۔ انگوٹھی نہ ہونے کی وجہ سے ان کی حکومت چھن گئی اور ایک شیطان ان کی جگہ حکومت کرتا رہا۔ کرسی پر ایک جسد سے مراد یہی شیطان ہے۔

بعض دیگر کے نزدیک حضرت سلیمان علیہ السلام نے ایک بار قسم کھائی کہ آج کی رات اپنی ستر ازواج سے ہمبستری کروں گا۔ ہر ایک سے ایک بچہ مجاہد فی سبیل اللہ پیدا ہو گا۔ قصور یہ ہوا کہ انہوں نے انشاء اللہ نہیں کہا جس کی وجہ سے ایک بچہ ناقص الخلقت بچہ پیدا ہوا جسے اس کی کرسی پر ڈالا گیا۔

تعجب کا مقام یہ ہے کہ یہ روایت صحیح بخاری میں متعدد مقامات پر مذکور ہے۔

بعض دیگر یہ موقف اختیار کرتے ہیں جسد سے مراد خود حضرت سلیمان علیہ السلام ہیں کہ کسی بیماری کی وجہ سے صرف جسم کا ڈھانچہ رہ گیا تھا۔

بعض حضرات یہ موقف اختیار کرتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا۔ شیاطین کو خطرہ لاحق ہوا کہ سلیمان علیہ السلام کے بعد اگر یہ بادشاہ بن جاتا ہے تو ہم پھر غلامی میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اس لیے شیاطین اسے قتل کر دینا چاہتے تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے شیاطین سے بچانے کے لیے اُس بچے کو بادلوں میں محفوظ کر لیا لیکن وہ بچہ فوت ہو گیا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کا قصور یہ ہوا کہ انہوں نے اللہ پر توکل کرنے کی جگہ بادلوں پر کیوں بھروسہ کیا۔
اس قسم کی روایات کے انبوہ میں اصل واقعہ سمجھنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔
صاحب تفسیر المیزان یہ موقف اختیار کرتے ہیں:

حضرت سلمان علیہ السلام کا ایک فرزند تھا۔ اللہ کے حکم سے اس بچے کا انتقال ہو گیا اور اس بچے کا جسد خاکی سلمان کی کرسی پر رکھ دیا گیا۔ سلیمان علیہ السلام نے اس بچے کے ساتھ بہت سی امیدیں وابستہ کر رکھی تھی۔ بچے کے انتقال سے سلیمان علیہ السلام کی تنبیہ ہو گئی کہ اپنی امیدیں اللہ کے ساتھ وابستہ رکھو۔

شاید یہی موقف نسبتاً بہتر موقف ہے۔ چنانچہ تفسیر التبیان میں ایک قول نقل ہوا: یہ بچہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی گود میں انتقال کر گیا جب آپ کرسی پر تھے۔

قَالَ رَبِّ اغۡفِرۡ لِیۡ وَ ہَبۡ لِیۡ مُلۡکًا لَّا یَنۡۢبَغِیۡ لِاَحَدٍ مِّنۡۢ بَعۡدِیۡ ۚ اِنَّکَ اَنۡتَ الۡوَہَّابُ ﴿۳۵﴾	۳۵۔ کہا: میرے رب! مجھے معاف کر دے اور مجھے ایسی بادشاہی عطا کر جو میرے بعد کسی کے شایان شان نہ ہو، یقیناً تو بڑا عطا کرنے والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ قَالَ رَبِّ اغۡفِرۡ لِیۡ: اس جملے کا تعلق اس آزمائش سے ہے جو ایک جسد کے ذریعے ہوئی تھی اور اسی سلسلے کی معذرت اور مغفرت طلبی ہے۔

۲۔ وَ ہَبۡ لِیۡ مُلۡکًا: یہاں سوال اٹھایا گیا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے بخل کا مظاہر کیا ہے کہ میرے بعد حکومت کسی کے لیے شایان شان نہ ہو۔

جواب: ممکن ہے جب اپنی اولاد سے نا امید ہو گئے تو یہ دعا کی ہو کہ جب میری اولاد میں میرے پائے کا حکومت کرنے والا کوئی نہ ہو گا تو اے اللہ مجھے ہی ایسی حکومت عنایت فرما جو میرے بعد میری اولاد میں سے کسی کے شایان شان نہ ہو۔

میری نظر میں صحیح جواب وہ ہے جو حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے علی بن یقطین کے جواب میں فرمایا:

الملك ملكان ملك ماخوذ بالغلبة والجور و اجبار الناس و ملك ماخوذ من قبل الله تعالى ذكره كملك آل	حکومت کی دو قسمیں ہیں: ایک حکومت غلبہ اور بالادستی اور لوگوں کو قابو کر کے حاصل کی جاتی ہے اور ایک حکومت اللہ کی طرف سے ہوتی ہے جیسے آل ابراہیم

ابراھیم... الی آخر الروایۃ۔[1]   کی حکومت... الی آخر۔

اس اعتبار سے سلیمان علیہ السلام نے اس قسم کی حکومت اپنی حد تک محدود رکھنے کی درخواست کی جو بالادستی اور قابو کرنے کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ آپ نے انسانوں کے علاوہ جنات کو بھی قابو کر کے حکومت قائم کی تھی۔ آپ کی حکومت کی نوعیت منحصر تھی۔ دعا اس نوعیت کی حکومت کے لیے ہے۔

ورنہ حکومت الٰہی ہو اور دلوں پر حکومت کرنا ہو تو انبیاء علیہم السلام اس حکومت کی اپنی اولاد کے لیے اللہ سے درخواست کرتے ہیں: قَالَ وَمِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ ....[2] ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کے لیے امامت کی درخواست کی تھی۔

فَسَخَّرۡنَا لَہُ الرِّیۡحَ تَجۡرِیۡ بِاَمۡرِہٖ رُخَآءً حَیۡثُ اَصَابَ ﴿۳۶﴾

۳۶۔ پھر ہم نے ہوا کو ان کے لیے مسخر کر دیا، جدھر وہ جانا چاہتے ان کے حکم سے نرمی کے ساتھ اسی طرف چل پڑتی تھی۔

تفسیر آیات

۱۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے تسخیر ہوا کے بارے میں تشریح سورہ انبیاء آیت ۸۱ اور سباء آیت ۱۲ میں ہو چکی۔ البتہ یہاں ہوا کے بارے میں فرمایا کہ رُخَآءً نرمی کے ساتھ چلتی تھی۔ نرمی سے مراد یہ ہو سکتا ہے کہ ہوا حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے مسخر اور ان کے اختیار میں ہوتی تھی ورنہ اپنی جگہ ہوا تیز چلتی تھی جیسا کہ سورۃ الانبیاء آیت ۸۱ میں فرمایا:

وَ لِسُلَیۡمٰنَ الرِّیۡحَ عَاصِفَۃً ....   اور سلیمان کے لیے تیز ہوا کو (مسخر کیا)۔

۲۔ حَیۡثُ اَصَابَ: جہاں کا قصد کریں۔ اَصَابَ کے معنی قصد کے ہیں۔ یعنی ہوا حضرت سلیمان علیہ السلام کے امر سے (بِاَمۡرِہٖ) چلتی تھی جہاں وہ چاہتے اور جس جگہ کا وہ قصد کرتے۔

وَ الشَّیٰطِیۡنَ کُلَّ بَنَّآءٍ وَّ غَوَّاصٍ ﴿۳۷﴾

۳۷۔ اور ہر قسم کے معمار اور غوطہ خور شیاطین کو بھی (مسخر کیا)۔

وَّ اٰخَرِیۡنَ مُقَرَّنِیۡنَ فِی الۡاَصۡفَادِ ﴿۳۸﴾

۳۸۔ اور دوسروں کو بھی جو زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔

تشریح کلمات

الۡاَصۡفَادِ: (ص ف د) صفد کے معنی لوہے کی زنجیر یا طوق کے ہیں۔

---

[1] القصص للجزائری ص ۳۶۶   [2] ۲ بقرۃ: ۱۲۴

تفسیر آیات

۱۔ وَالشَّیٰطِیۡنَ: اور شیاطین کو بھی مسخر کیا۔ ان جنات میں سے کچھ تو عمارتیں بنانے پر متعین تھے چنانچہ عصر سلیمانی میں تعمیراتی صنعت عروج پر تھی۔ ھیکل اورشلیم کی عمارت جسے اسلام نے مسجد اقصیٰ کا عنوان دیا معماری تاریخ کا ایک شاہکار ہے اور بعض جنات غوطہ خوری کے ذریعے سمندری ثروت نکالنے پر متعین تھے۔

۲۔ وَّاٰخَرِیۡنَ: اور دیگر کچھ جنات ایسے تھے جو نافرمانی کی وجہ سے زنجیروں میں جکڑ لیے جاتے تھے۔ زنجیر سے مراد وہ ذرائع ہیں جو جنات کو شرارت کرنے سے باز رکھنے کے لیے بروئے کار لائے جاتے ہیں۔ جنات کے مزید کاموں کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سورہ سبا آیت ۱۳۔

هٰذَا عَطَآؤُنَا فَامۡنُنۡ اَوۡ اَمۡسِكۡ بِغَیۡرِ حِسَابٍ ﴿۳۹﴾

۳۹۔ یہ ہماری عنایت ہے جس پر چاہو احسان کرو اور جس کو چاہو روک دو، اس کا کوئی حساب نہیں ہوگا۔

تفسیر آیات

۱۔ هٰذَا عَطَآؤُنَا: یہ بادشاہت، یہ تسخیر جنات، یہ وسیع و عریض مملکت ہماری طرف سے عنایت ہے۔ خاص کر جنوں کی تسخیر ایک منفرد نعمت ہے۔ ان جنوں میں سے جس پر چاہیں احسان کر کے اسے آزاد کریں یا روکے رکھیں، کل اختیار آپ کے پاس ہے۔ انہیں روکنے، چھوڑنے پر آپ کا کوئی محاسبہ نہ ہوگا۔

وَ اِنَّ لَهٗ عِنۡدَنَا لَزُلۡفٰی وَ حُسۡنَ مَاٰبٍ ﴿۴۰﴾

۴۰۔ اور ان کے لیے ہمارے ہاں یقیناً قرب اور نیک انجام ہے۔

تفسیر آیات

سب سے بڑی منزلت تو اللہ کا تقرب ہے اور عاقبت کا نیک ہونا بھی بڑی نعمت ہے چونکہ یہ دائمی اور ابدی مسئلہ ہے جس کا مقابلہ کوئی وقتی نعمت نہیں کر سکتی خواہ کتنی بڑی کیوں نہ ہو۔

وَ اذۡکُرۡ عَبۡدَنَاۤ اَیُّوۡبَ ۘ اِذۡ نَادٰی رَبَّهٗۤ اَنِّیۡ مَسَّنِیَ الشَّیۡطٰنُ بِنُصۡبٍ وَّ

۴۱۔ اور ہمارے بندے ایوب کا ذکر کیجیے جب انہوں نے اپنے رب کو پکارا: شیطان نے مجھے

عَذَابٍ ﴿٤١﴾ تکلیف اور اذیت دی ہے۔

تفسیر آیات

سورۃ الانبیاء میں ایوب علیہ السلام کا ذکر آیا۔ اس میں فرمایا: مجھے تکلیف پہنچی ہے۔ اس آیت میں ایک ایسی تکلیف کا ذکر ہے جو شیطان کی طرف سے ہے۔ آیا شیطان نے ہی حضرت ایوب علیہ السلام کو بیمار کیا تھا یا بیمار ہونے پر وسوسوں کے ذریعے اذیت پہنچائی تھی۔ میرے نزدیک شیطان کی طرف سے عذاب اور تکلیف یہ تھی کہ شیطان کی یہ کوشش تھی کہ حضرت ایوب علیہ السلام سات سالہ بیماری کے نتیجے میں اللہ سے بدظن ہو جائیں۔ شیطان طرح طرح کے وسوسے ذہن میں ڈالتا تھا۔ اللہ کے برگزیدہ بندہ ہونے کی وجہ سے انہیں معلوم تھا کہ یہ وسوسہ شیطان کی طرف سے ہے۔ روایت ہے:

> ایوب علیہ السلام کی بیماری بڑھ گئی یہاں تک کہ لوگوں نے ان سے دوری اختیار کرنا شروع کی۔ شیطان نے ان لوگوں کو اس وسوسے میں ڈالا کہ ایوب علیہ السلام کی غلاظت سے بچیں اور انہیں اپنے درمیان سے نکالیں۔ ان کی اہلیہ کو ان کی خدمت کرنے سے روکیں جس سے ایوب علیہ السلام کو اذیت ہوتی تھی مگر انہوں نے بیماری سے ہونے والی اذیت کا شکوہ نہیں کیا۔ یہ بیماری سات سال تک جاری رہی۔ (مجمع البیان)۔

اُرۡکُضۡ بِرِجۡلِکَ ۚ هٰذَا مُغۡتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّ شَرَابٌ ﴿٤٢﴾

۴۲۔ (ہم نے کہا) اپنا پاؤں ماریں، یہ ہے ٹھنڈا پانی نہانے اور پینے کے لیے۔

تفسیر آیات

۱۔ جب صبر و رضا کی آزمائش کی ساری منزلیں کامیابی طے کر لیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت ایوب علیہ السلام کو حکم آیا کہ پاؤں زمین پر ماریں۔ چنانچہ پاؤں زمین پر مارتے ہی چشمہ پھوٹا جس سے پانی پی کر اور نہا کر شفایابی ہوئی۔

بائبل کے مطابق حضرت ایوب علیہ السلام کی بیماری جلدی تھی اور سارے بدن پر پھوڑے تھے۔

۲۔ بَارِدٌ: میں اس چشمے کی طرف اشارہ ہے جس میں نہانے سے بیماری ختم ہو گئی

۳۔ وَّشَرَابٌ: اور پینے سے۔ بظاہر اسی ایک ہی چشمے سے نہائے اور پیا ہے۔ اگرچہ بعض روایات میں آیا ہے کہ دو بار پاؤں مارنے کا حکم تھا۔ ہر ایک بار ایک چشمہ پھوٹا۔ ایک سے نہائے دوسرے سے پیا۔

وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اَهْلَهٗ وَ مِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنَّا وَذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ۝۴۳

۴۳۔ہم نے انہیں اہل و عیال دیے اور ان کے ساتھ اتنے مزید دیے اپنی طرف سے رحمت اور عقل والوں کے لیے نصیحت کے طور پر۔

تفسیر آیات

۱۔ وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اَهْلَهٗ: ہم نے انہیں اہل و عیال دیے۔ اس کے بارے میں روایت تو یہ ہے کہ ان کی اہلیہ کے علاوہ باقی سب گھر کے افراد فوت ہو گئے تھے۔ بعد میں اللہ نے انہیں زندہ کیا۔

دیگر روایات میں آیا ہے جو قرین واقع ہے: ان کے گھر کے افراد نے انہیں ترک کر دیا تھا۔ بیماری سے تندرست ہونے پر سب واپس آ گئے۔ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ ان کے ساتھ مزید عنایت فرمائے۔ مزید اتنی اولاد عنایت ہوئی کہ اولاد دوگنی ہو گئی۔

۲۔ رَحْمَةً مِّنَّا: اللہ کی طرف سے رحمت کے طور پر ایوب علیہ السلام پر یہ عنایت ہوئی۔ چونکہ ایوب علیہ السلام اپنے صبر و تحمل کی وجہ سے اس رحمت کے اہل ثابت ہوئے تھے۔

۳۔ وَذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ: ایوب علیہ السلام پر ان عنایات کی دوسری مصلحت یہ ہے کہ آنے والی نسلوں کے صاحبان عقل و خرد ایوب علیہ السلام کی سرنوشت سے یہ سبق سیکھ لیں کہ گردش ایام کی وجہ سے رحمت الٰہی سے مایوس نہیں ہونا چاہیے چاہے حالات کتنے ہی بدتر اور مشکلات کتنی ہی گھمبیر ہوں۔ آزمائشیں کتنی ہی کٹھن ہوں روایت ہے کہ ہر حالت میں اللہ کی رحمتوں سے اپنی امیدوں کا رشتہ نہیں توڑنا چاہیے۔ اللہ کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔

وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ وَلَا تَحْنَثْ ؕ اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ؕ نِعْمَ الْعَبْدُ ؕ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ۝۴۴

۴۴۔(ہم نے کہا) اپنے ہاتھ میں ایک گچھا تھام لیں اور اسی سے ماریں اور قسم نہ توڑیں، ہم نے انہیں صابر پایا، وہ بہترین بندے تھے، بے شک وہ (اپنے رب کی طرف) رجوع کرنے والے تھے۔

تشریح کلمات

ضِغْثًا: (ض غ ث) ضغث خشک گھاس یا شاخیں جو انسان کی مٹھی میں آ جائیں۔

تَحْنَثْ: (ح ن ث) الحنث گناہ، نافرمانی، قسم توڑنے کو کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ خُذۡ بِیَدِکَ ضِغۡثًا: روایت کے مطابق حضرت ایوب علیہ السلام اپنی زوجہ کے کسی عمل پر برہم ہوئے اور قسم کھائی کہ اسے سو کوڑے ماریں گے۔ بعد میں جب وہ بے گناہ ثابت ہوئی تو پریشان ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم ہوا: سوتنکوں والا ایک جھاڑو اسے مارو کہ تمہاری قسم بھی پوری ہو جائے اور اسے تکلیف بھی نہ ہو۔

یہ حکم اسلامی حدود و تعزیرات میں نافذ ہو گا جہاں حد و تعزیر معاف ہونے کا مستحق ہو۔ جیسے مریض اور جہاں معاف نہیں ہو سکتا وہاں یہ حکم نہیں ہو گا۔ شیخ طوسی فرماتے ہیں یہ مسئلہ اختلافی ہے۔

۲۔ اِنَّا وَجَدۡنٰہُ صَابِرًا: ہم نے ایوب علیہ السلام کو صابر پایا۔ حوصلہ شکن حالات میں بھی استقامت دکھائی اور زبان پر حرف شکایت نہیں لائے۔ انتہائی سنگین حالات میں بھی اللہ کے ساتھ اپنی امیدوں کا رشتہ نہیں توڑا۔

۳۔ نِعۡمَ الۡعَبۡدُ: بندگی کا بہترین نمونہ پیش کیا۔ عبودیت کی تابناک مثال پیش کی۔

۴۔ اِنَّہٗۤ اَوَّابٌ: اس کا راز ہر مشکل میں اپنے رَب کی طرف رجوع کرنے میں مضمر تھا۔ اَوَّابٌ بار بار رجوع کرنے والا۔ یہ لفظ اوب سے صیغہ مبالغہ ہے۔ اللہ کی طرف رجوع کرنے والے آخر میں ہر غیر اللہ کی طرف رجوع کرنے سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔

وَ اذۡکُرۡ عِبٰدَنَاۤ اِبۡرٰہِیۡمَ وَ اِسۡحٰقَ وَ یَعۡقُوۡبَ اُولِی الۡاَیۡدِیۡ وَ الۡاَبۡصَارِ ﴿۴۵﴾

۴۵۔ اور ہمارے بندوں ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب کو یاد کیجیے جو طاقت اور بصیرت والے تھے۔

تفسیر آیات

۱۔ اُولِی الۡاَیۡدِیۡ: اللہ نے ان انبیاء علیہم السلام کو طاقتور بنایا کہ ان میں استقامت کی طاقت تھی۔ اپنے اپنے زمانے کے طاغوتوں کا مقابلہ کرنے کی طاقت رکھتے تھے اور ساتھ عبادت بجا لانے میں بھی طاقت والے تھے۔ کسی مرحلے میں کمزوری نہیں دکھائی۔

۲۔ وَ الۡاَبۡصَارِ: عزم و ارادے میں طاقت کے ساتھ قلب و نظر میں بصیرت بھی تھی جس سے حقائق کا مشاہدہ کرنے میں کسی قسم کی غلطی سے دوچار نہ ہوتے، نہ ہی کسی کے فریب میں آتے تھے۔

یہ انبیاء علیہم السلام اپنی مشن میں ان دو ارکان کی وجہ سے کامیاب ہو گئے: عزم و ارادے کی طاقت اور حقیقت شناس بصیرت۔ اگر عزم کی طاقت نہ ہو تو حقیقت سے فرار اختیار کیا جاتا ہے اور اگر حقیقت شناس نہیں ہے تو عزم و ارادے کی طاقت کو بے جا استعمال کیا جاتا ہے۔

اِنَّاۤ اَخۡلَصۡنٰہُمۡ بِخَالِصَۃٍ ذِکۡرَی الدَّارِ ﴿۴۶﴾

۴۶۔ہم نے انہیں ایک خاص صفت کی بنا پر مخلص بنایا (وہ) دار (آخرت) کا ذکر ہے۔

تفسیر آیات

جس خصوصی امتیاز کی وجہ سے ہم نے ان انبیاء علیہم السلام کو برگزیدہ کیا وہ ان کے دل میں یاد آخرت تازہ رہنا ہے۔ یاد آخرت یعنی ابدی اور دائمی زندگی پر یقین کی وجہ سے اس کا تذکرہ دل سے غائب نہیں ہوتا اور یہ یاد ہر قدم پر انسان کو شجاعت و بصیرت دلاتی ہے اور دنیا کی زندگی ہیچ اور بے قیمت ہو کر رہ جاتی ہے۔

وَ اِنَّہُمۡ عِنۡدَنَا لَمِنَ الۡمُصۡطَفَیۡنَ الۡاَخۡیَارِ ﴿۴۷﴾

۴۷۔ اور وہ ہمارے نزدیک یقیناً برگزیدہ نیک افراد میں سے تھے۔

تفسیر آیات

۱۔ یہ انبیاء علیہم السلام مذکورہ اوصاف کی وجہ سے ہماری برگزیدہ ہستیوں میں سے ہیں۔ قوت ایمان، قوت بصیرت، یاد آخرت جیسے ممتاز اوصاف کے ساتھ متصف ہونے کی وجہ سے انہیں باقی تمام لوگوں میں برگزیدہ کیا۔

۲۔ الۡاَخۡیَارِ: خیر کی جمع ہے۔ خیر ہی خیر کے مالک ہیں۔ جہاں شر کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔ چونکہ اخیار، خیر کا فعل تفضیل ہے لہٰذا اس کا مطلب ہوگا خیر کثیر کا مالک۔

وَ اذۡکُرۡ اِسۡمٰعِیۡلَ وَ الۡیَسَعَ وَ ذَا الۡکِفۡلِ ؕ وَ کُلٌّ مِّنَ الۡاَخۡیَارِ ﴿۴۸﴾

۴۸۔اور (اے رسول) اسماعیل اور یسع اور ذوالکفل کو یاد کیجیے، یہ سب نیک لوگوں میں سے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اذۡکُرۡ اِسۡمٰعِیۡلَ: حضرت اسماعیل علیہ السلام کا اس جگہ شاید اس لیے ذکر فرمایا چونکہ اسماعیل علیہ السلام عربوں میں سے عدنانیوں کے جد اعلیٰ ہیں۔

۲۔ وَ الۡیَسَعَ: ان کا اسم شریف عبرانی میں الیشع ہے۔ آپ حضرت الیاس علیہ السلام کے جانشین تھے۔ آپ نے بنی اسرائیل میں بت پرستی کے خلاف جہاد کیا۔ آپ کی وفات ۸۴۰ قبل مسیح میں ہوئی۔

۳۔ وَ کُلٌّ مِّنَ الۡاَخۡیَارِ: ان سب انبیاء علیہم السلام کا رتبہ اخیار کا رتبہ ہے جس کی تشریح ہو چکی ہے۔

هٰذَا ذِكۡرٌ ؕ وَ اِنَّ لِلۡمُتَّقِیۡنَ لَحُسۡنَ مَاٰبٍ ﴿۴۹﴾ ۴۹۔ یہ ایک نصیحت ہے اور تقویٰ والوں کے لیے یقیناً اچھا ٹھکانا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ هٰذَا ذِكۡرٌ: جن انبیائے کرام علیہم السلام کے بارے میں جو کچھ بیان ہوا ہے یہ ایک تذکر، یادآوری ہے۔ تاریخ انبیاء علیہم السلام کی طرف ایک توجہ دلانا ہے۔ خاصان خدا کی زندگی اور راہ خدا میں انہیں پیش آنے والی مشکلات کا ذکر ہے تاکہ مسلمان اپنی زندگی میں ان کی حیات طیبہ کو مشعل راہ بنائیں۔

۲۔ وَ اِنَّ لِلۡمُتَّقِیۡنَ لَحُسۡنَ مَاٰبٍ: اس ذکر سے جو سبق یاد رکھنا ہوگا وہ یہ ہے کہ حسن عاقبت، اچھا انجام ان لوگوں کے لیے ہے جو اپنا بچاؤ یعنی تقویٰ اختیار کرتے ہیں۔

جَنّٰتِ عَدۡنٍ مُّفَتَّحَۃً لَّہُمُ الۡاَبۡوَابُ ﴿۵۰﴾ ۵۰۔ وہ دائمی جنتیں ہیں جن کے دروازے ان کے لیے کھلے ہوں گے۔

تفسیر آیات

ان متقین کو جنت میں داخل ہونے کے لیے دروازہ کھلنے کا انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ حتیٰ کہ دروازہ کھولنے تک کی زحمت نہیں اٹھانا پڑے گی، کھلے ہوئے دروازوں سے داخل ہوں گے۔ چنانچہ سورہ زمر آیت ۷۳ میں فرمایا:

حَتّٰۤی اِذَا جَآءُوۡہَا وَ فُتِحَتۡ اَبۡوَابُہَا وَ قَالَ لَہُمۡ خَزَنَتُہَا سَلٰمٌ عَلَیۡکُمۡ طِبۡتُمۡ فَادۡخُلُوۡہَا خٰلِدِیۡنَ○ یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچ جائیں گے جنت کے دروازے کھول دیئے جائیں گے اور جنت کے منتظمین ان سے کہیں گے: تم پر سلام ہو، تم بہت خوب رہے، اب ہمیشہ کے لیے اس میں داخل ہو جاؤ۔

مُتَّکِـِٕیۡنَ فِیۡہَا یَدۡعُوۡنَ فِیۡہَا بِفَاکِہَۃٍ کَثِیۡرَۃٍ وَّ شَرَابٍ ﴿۵۱﴾ ۵۱۔ ان میں وہ تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے اور بہت سے میوے اور مشروبات طلب کر رہے ہوں گے۔

تفسیر آیات

۱۔ یَدۡعُوۡنَ فِیۡہَا: وہ تکیہ لگائے طلب کر رہے ہوں گے۔ جنت میں مؤمن کا ارادہ نافذ ہوگا۔ ادھر طلب کیا وہ مطلوبہ چیز حاضر ہوگی۔ دنیا کی زندگی کی طرح علل و اسباب جیسے ذرائع استعمال کرنا نہیں پڑیں

گے۔ ارادہ کیا فوری تعمیل کے لیے وَیَطُوۡفُ عَلَیۡہِمۡ وِلۡدَانٌ مُّخَلَّدُوۡنَ ...[1] ہمیشہ رہنے والے خادم ان کے اردگرد خدمت کے لیے گھوم رہے ہوں گے۔

۲۔ بِفَاکِہَۃٍ کَثِیۡرَۃٍ: ممکن ہے یہاں کثیر تعداد کے اعتبار سے نہ ہو بلکہ نوعیت کے اعتبار سے ہو۔ یعنی مختلف انواع کے میوے طلب کر رہے ہوں گے۔

۳۔ وَّشَرَابٍ: اسی طرح مختلف انواع کے مشروبات ہوں گے جو صرف طلب و ارادہ کرنے پر حاضر ہو جائیں گے۔

وَعِنۡدَہُمۡ قٰصِرٰتُ الطَّرۡفِ اَتۡرَابٌ ﴿۵۲﴾

۵۲۔ اور ان کے پاس نگاہیں نیچے رکھنے والی ہم عمر (بیویاں) ہوں گی۔

تفسیر آیات

۱۔ بیوی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کی نگاہ صرف اور صرف اپنے شوہر پر مرکوز ہو اور اس کی ساری توجہ کا مرکز اپنا شوہر ہو۔ شوہر کی رضا مندی اس کی منزل ہو اور شوہر کا توجہ حاصل کرنا اس کا اولین مقصد ہو۔

۲۔ اَتۡرَابٌ: ہم عمری میں ایک حسن، زیبائش اور کشش ہے۔ اگرچہ کم سنی میں زیادہ کشش ہے لیکن سنجیدگی اور مزاجوں میں ہم آہنگی میں ہم سنی کا بہت بڑا دخل ہے۔

ہٰذَا مَا تُوۡعَدُوۡنَ لِیَوۡمِ الۡحِسَابِ ﴿۵۳﴾

۵۳۔ یہ وہ بات ہے جس کا روز حساب کے لیے تم سے وعدہ کیا جاتا ہے۔

تفسیر آیات

یہ وہ جزا و ثواب ہے جس کا اہل تقویٰ سے وعدہ کیا جاتا ہے اور اس وعدے کا تعلق یوم حساب سے ہے۔ جس روز انسان کی ابدی قسمت اور دائمی نصیب کا فیصلہ دیا جانا ہے اور اپنے اپنے اعمال کا نتیجہ اخذ کرنا ہے۔

اِنَّ ہٰذَا لَرِزۡقُنَا مَا لَہٗ مِنۡ نَّفَادٍ ﴿۵۴﴾

۵۴۔ یقیناً یہ ہمارا وہ رزق ہے جو ختم ہونے والا نہیں ہے۔

---

[1] ۷۶ انسان: ۱۹

تفسیر آیات

جنت میں رزق ختم ہونے کا تصور نہیں ہے۔ جنت کی زندگی کا وہ تصور نہ ہوگا جو دنیوی زندگی کا ہے، وہاں کے زمان و مکان اور پیمانے بالکل مختلف ہوں گے جو ہمارے لیے قابل تصور نہیں ہیں۔

مثلاً شکم مادر میں موجود جنین کے لیے دنیا کا طرز زندگی قابل تصور نہیں ہے۔ دنیا میں ایک ادنیٰ سی مثال یہ دی جا سکتی ہے کہ ایک شمع سے جتنا شمعیں جلائی جائیں اس کی روشنی کم نہیں ہوتی۔ اسی طرح جس قدر علم دوسروں کو دیا جائے، دینے والے کے علم میں کمی نہیں آتی۔

هٰذَا ؕ وَاِنَّ لِلطّٰغِیۡنَ لَشَرَّ مَاٰبٍ ﴿ۙ۵۵﴾ جَهَنَّمَ ۚ یَصۡلَوۡنَهَا ۚ فَبِئۡسَ الۡمِهَادُ ﴿۵۶﴾

۵۵۔ یہ تو (اہل تقویٰ کے لیے) ہے اور سرکشوں کے لیے بدترین ٹھکانا ہے۔

۵۶۔ (یعنی) جہنم جس میں وہ جھلس جائیں گے، پس وہ بدترین بچھونا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ متقین کے مقابلے میں طاغین (سرکشوں) کا ذکر آتا ہے۔ جہاں اہل تقویٰ کے لیے بہترین انجام ہوگا، سرکشوں کے لیے بدترین انجام ہوگا۔ دونوں کا انجام انتہائی سرے کا ہوگا چونکہ دونوں کا انجام ابدی ہوگا۔

۲۔ جَهَنَّمَ ۚ یَصۡلَوۡنَهَا: اہل تقویٰ کا ٹھکانا جس طرح جنات عدن ہوگا، سرکشوں کا ٹھکانا جہنم ہوگا۔

۳۔ فَبِئۡسَ الۡمِهَادُ: اگر بچھونا آتشیں ہوگا تو اس بچھونے کی برائی کا حال کون بیان کر سکتا ہے۔

هٰذَا ۙ فَلۡیَذُوۡقُوۡهُ حَمِیۡمٌ وَّ غَسَّاقٌ ﴿۵۷﴾

۵۷۔ یہ ہے کھولتا ہوا پانی اور پیپ جس کا ذائقہ وہ چکھیں۔

تشریح کلمات

غَسَّاقٌ: (غ س ق) جہنمیوں کے جسم سے نکلنے والا خون یا پیپ۔

تفسیر آیات

اس قسم کی دوسری مزید غلاظتوں کا مزہ چکھنا ہوگا۔ اَزۡوَاجٌ سے مراد اقسام ہیں۔ یعنی دوسری اقسام

کی تلخیوں کا مزہ چکھنا ہوگا۔

هٰذَا فَوْجٌ مُّقْتَحِمٌ مَّعَكُمْ ۚ لَا مَرْحَبًا بِهِمْ ۭ اِنَّهُمْ صَالُوا النَّارِ ﴿۵۹﴾

۵۹۔ یہ ایک جماعت تمہارے ساتھ (جہنم میں) گھسنے والی ہے، ان کے لیے کوئی خیر مقدم نہیں ہے، یہ یقیناً آگ میں جھلسنے والے ہیں۔

تفسیر آیات

اہل جہنم کے سردار جب اپنے مریدوں کے ایک ٹولے کو جہنم میں داخل ہوتا دیکھیں گے تو وہ اس ٹولے سے کہیں گے: ان پر خدا کی مار۔ دیکھو یہ آتش میں جھلسنے والے ہیں۔

قَالُوْا بَلْ اَنْتُمْ ۣ لَا مَرْحَبًا بِكُمْ ۭ اَنْتُمْ قَدَّمْتُمُوْهُ لَنَا ۚ فَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴿۶۰﴾

۶۰۔ وہ کہیں گے: تمہارے لیے کوئی خیر مقدم نہیں ہے بلکہ تم ہی تو یہ (مصیبت) ہمارے لیے لائے ہو، پس کیسی بدترین جگہ ہے۔

تفسیر آیات

وہ ٹولہ سرداروں سے کہے گا: اللہ کی مار تم پر ہو۔ تمہاری وجہ سے تو ہمیں یہ دن دیکھنا پڑا۔ اس طرح اہل جہنم ایک دوسرے سے شماتت اور نفرت کریں گے۔

قَالُوْا رَبَّنَا مَنْ قَدَّمَ لَنَا هٰذَا فَزِدْهُ عَذَابًا ضِعْفًا فِي النَّارِ ﴿۶۱﴾

۶۱۔ وہ کہیں گے: ہمارے پروردگارا! جس نے ہمیں اس انجام سے دوچار کیا ہے اسے آگ میں دگنا عذاب دے۔

تفسیر آیات

یہ ٹولہ اپنے سرداروں کے خلاف اللہ سے یہ التجا کرے گا کہ یہ لوگ ہماری گمراہی اور ہلاکت کا سبب بنے ہیں لہٰذا اے ہمارے مالک! انہیں دگنا عذاب دے۔ سورہ اعراف: ۳۸ میں بھی اسی قسم کے واقعہ کا ذکر ہے:

قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰٓؤُلَاۗءِ

بعد والی جماعت پہلی کے بارے میں کہے گی: ہمارے

اَضَلُّوۡنَا فَاٰتِهِمۡ عَذَابًا ضِعۡفًا مِّنَ النَّارِ ۔ رب! انہوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا لہٰذا انہیں آتش جہنم کا دوگنا عذاب دے۔

مکہ کے مشرک سرداروں کو ان عاقبت کی خبر دینا مقصود ہے کہ قیامت کے دن تم لوگ کس قسم کے دن دیکھنے والے ہو۔

وَ قَالُوۡا مَا لَنَا لَا نَرٰی رِجَالًا کُنَّا نَعُدُّهُمۡ مِّنَ الۡاَشۡرَارِ ﴿۶۲﴾

۶۲۔ اور وہ کہیں گے: کیا بات ہے ہمیں وہ لوگ نظر نہیں آتے جنہیں ہم برے افراد میں شمار کرتے تھے؟

تفسیر آیات

ان مشرکین پر تو حقیقت حال، حالت نزع کے وقت واضح ہو گئی تھی کہ مسلمانوں کا حال کیا ہو گا اور ہمارا انجام کیا ہو گا لہٰذا وہ حقیقی طور پر تو سوال نہیں کریں گے کہ جن مسلمانوں کو ہم برے لوگ سمجھتے تھے وہ یہاں جہنم میں نظر نہیں آتے بلکہ وہ تاسف سے کہتے ہوں گے کہ یہ ہم کیا دن دیکھ رہے ہیں کہ ہم تو جہنم کی آتش میں ذلت وخواری کے عذاب کا مزہ چکھ رہے ہیں لیکن جنہیں ہم دنیا میں برے لوگ سمجھتے تھے وہ یہاں نہیں ہیں۔

اَتَّخَذۡنٰهُمۡ سِخۡرِیًّا اَمۡ زَاغَتۡ عَنۡهُمُ الۡاَبۡصَارُ ﴿۶۳﴾

۶۳۔ کیا ہم یونہی ان کا مذاق اڑایا کرتے تھے یا اب (ہماری) آنکھیں انہیں نہیں دیکھ پاتیں؟

تفسیر آیات

۱۔ اَتَّخَذۡنٰهُمۡ سِخۡرِیًّا: یہ جملہ خبریہ ہونے کی صورت میں اس کا مطلب یہ بنے گا: ہم نے دنیا میں ان کا مذاق اڑایا تھا۔ جیسے کُنَّا نَعُدُّهُمۡ مِّنَ الۡاَشۡرَارِ جملہ خبریہ ہے۔

۲۔ اَمۡ زَاغَتۡ عَنۡهُمُ الۡاَبۡصَارُ: اس صورت میں اس جملے کا تعلق لَا نَرٰی رِجَالًا کے ساتھ ہے۔ یعنی جن لوگوں کو ہم دنیا میں برے لوگ سمجھتے تھے وہ یہاں جہنم میں نظر نہیں آتے۔ کیا وہ جہنم میں نہیں ہیں؟ یا وہ بھی جہنم میں ہیں لیکن ہماری نگاہیں انہیں دیکھ نہیں پاتیں؟ اور اگر جملہ اَتَّخَذۡنٰهُمۡ کو سوالیہ سمجھتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ کیا ہم نے ان کا مذاق اڑایا تھا؟ اب وہ جہنم میں نہیں ہیں۔ ہمارا مذاق اڑانا کس قدر بڑی غلطی تھی یا یہ کہ یہ لوگ بھی جہنم میں موجود ہیں لیکن ہماری نگاہیں ان کو دیکھ نہیں پاتیں۔

ہمارے نزدیک پہلی تفسیر درست ہے۔

اِنَّ ذٰلِكَ لَحَقٌّ تَخَاصُمُ اَهْلِ النَّارِ ﴿٦٤﴾

٦٤۔ یہ جہنمیوں کے باہمی جھگڑے کی حتمی بات ہے۔

تفسیر آیات

جہنمیوں کا آپس میں جھگڑنا ایک حقیقت ہے۔ یہ واضح بات ہے کہ ہر شکست خوردہ جماعت اپنی شکست اور رسوائی کے بعد آپس میں جھگڑتی ہے، ذمہ داری ایک دوسرے پر ڈالتے ہیں اور کامیابی حاصل کرنے والے آپس میں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ چنانچہ جنت والے آپس میں سلام سلام کر رہے ہوں گے اور جہنم والے آپس میں جھگڑ رہے ہوں گے۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا مُنْذِرٌ ۖ وَّمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿٦٥﴾

٦٥۔ آپ کہد یجیے: میں تو صرف تنبیہ کرنے والا ہوں اور کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے جو واحد، قہار ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اے رسول ان مشرکین سے کہہ دیجیے: میں تمہیں عذاب الٰہی سے بچنے کی صرف تنبیہ کرنے والا ہوں۔ توحید کی طرف دعوت دینے والا ہوں۔ میری دعوت کی بنیاد کلمہ توحید ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور غرض نہیں ہے، نہ اپنا کوئی مفاد وابستہ ہے۔

۲۔ وَّمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ: میری دعوت کی بنیاد اللہ کی معبودیت کے علاوہ تمام مصنوعی معبودوں کی نفی ہے۔

۳۔ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ: وہ معبود صرف ایک، وہ ایک جو کثرت کو قبول نہیں کرتا۔ الْقَهَّارُ وہ ایک ہے لیکن ہر چیز پر غالب آنے والا ہے۔

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ﴿٦٦﴾

٦٦۔ وہ آسمان و زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا مالک ہے، وہ بڑا غالب آنے والا، بڑا معاف کرنے والا ہے۔

تفسیر آیات

وہ کل کائنات کا حقیقی مالک ہے۔ کائنات کا ہر ذرہ اس کے قبضہ قدرت میں ہے۔ کائنات کا رب

یعنی مالک ہے۔ ایسا مالک جو العزیز اپنی تمام مملوکات پر غالب آنے والا ہے۔ الۡغَفَّارُ اس کے باوجود وہ درگزر کرنے والا ہے کہ اگر اپنی مملوک میں سے کسی سے کوئی گناہ سرزد ہوتا ہے تو قہر و غلبہ کے باوجود معاف فرماتا ہے۔

قُلۡ ہُوَ نَبَؤٌا عَظِیۡمٌ ﴿۶۷﴾		۶۷۔ کہدیجیے: یہ ایک بڑی خبر ہے،

اَنۡتُمۡ عَنۡہُ مُعۡرِضُوۡنَ ﴿۶۸﴾		۶۸۔ جس سے تم منہ پھیرتے ہو۔

تفسیر آیات

۱۔ قُلۡ ہُوَ نَبَؤٌا عَظِیۡمٌ: کہہ دیجیے وہ عظیم خبر ہے۔ وہ یعنی قرآن عظیم خبر ہے یا کلمہ لا الہ الا اللہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، عظیم خبر ہے۔

نَبَؤٌا عَظِیۡمٌ سے مراد قرآن ہو یا کلمہ توحید، دونوں صورتوں میں عظیم خبر ہے۔ دنیا کے اعتبار سے عظیم ہے اور آخرت کے اعتبار سے بھی عظیم ہے۔

دنیا کے اعتبار سے اس نَبَؤٌا عَظِیۡمٌ نے دنیا کا نقشہ بدل دیا، انسانیت کو فکری بلوغت تک پہنچا دیا، دنیا کو تمدن دیا، تہذیب سکھائی اور انسان کو انسانی حقوق سے آشنا کیا۔

آخرت کے اعتبار سے شرک و کفر جیسی پلیدی سے انسانوں کو نجات دلائی۔ پتھر پرستی جیسی توہین آمیز کھائی سے نکال کر رب العالمین کی بندگی کی معراج پر پہنچا دیا۔ زندگی کے تصور میں ایک انقلاب پیدا کر کے ابدی زندگی آباد کرنے کی عظیم سوچ عنایت فرمائی۔ کس قدر عظیم ہے اس خبر کا مضمون۔ عظیم ہیں اس خبر کے نتائج۔ عظیم ہیں اس خبر کے پیش کرنے والے اور عظیم ہیں اس خبر کا تحفظ کرنے والے۔ صلوات اللہ علیہم۔

۲۔ اَنۡتُمۡ عَنۡہُ مُعۡرِضُوۡنَ: کس قدر بدنصیب ہیں وہ لوگ جو اس عظیم خبر کی عظمت جاننے کی زحمت گوارا نہیں کرتے بلکہ سوچے سمجھے بغیر اس سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ اس طرح وہ سعادت دارین سے اپنے آپ کو محروم کرتے ہیں۔

مَا کَانَ لِیَ مِنۡ عِلۡمٍۭ بِالۡمَلَاِ الۡاَعۡلٰۤی اِذۡ یَخۡتَصِمُوۡنَ ﴿۶۹﴾		۶۹۔ مجھے عالم بالا کا علم نہ تھا جب وہ (فرشتے) بحث کر رہے تھے۔

اِنۡ یُّوۡحٰۤی اِلَیَّ اِلَّاۤ اَنَّمَاۤ اَنَا نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ ﴿۷۰﴾		۷۰۔ میری طرف وحی محض اس لیے ہوتی ہے کہ میں نمایاں طور پر فقط تنبیہ کرنے والا ہوں۔

تفسیر آیات

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے بیان ہو رہا ہے کہ میرا واحد ذریعہ علم، وحی ہے۔ اگر وحی نہ ہوتی تو مجھے عالم بالا کا از خود علم نہ ہوتا کہ وہاں کس بات پر بحث ہو رہی ہے۔ اس بحث و جھگڑے سے مراد فرشتوں کی اللہ تعالیٰ کے ساتھ بحث ہو سکتی ہے، جب اللہ تعالیٰ نے زمین پر خلیفہ بنانے کا ذکر کیا تو فرشتوں نے سوال اٹھایا تھا یا اس جھگڑے کا ذکر ہو کہ جو ابلیس نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے انکار کے ساتھ کیا تھا جس کا اگلی آیات میں ذکر آ رہا ہے۔

۲۔ اِنۡ یُّوۡحٰۤی اِلَیَّ: میری طرف صرف وہ وحی ہوتی ہے جو انذار سے مربوط ہے۔ یعنی کافروں کی صرف تنبیہ ہوتی ہے۔ بشارت کا ان کافروں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اِذۡ قَالَ رَبُّکَ لِلۡمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیۡ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنۡ طِیۡنٍ ﴿۷۱﴾

۷۱۔ جب آپ کے رب نے فرشتوں سے فرمایا: میں مٹی سے ایک بشر بنانے والا ہوں۔

فَاِذَا سَوَّیۡتُہٗ وَ نَفَخۡتُ فِیۡہِ مِنۡ رُّوۡحِیۡ فَقَعُوۡا لَہٗ سٰجِدِیۡنَ ﴿۷۲﴾

۷۲۔ پس جب میں اسے درست بنا لوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو اس کے لیے سجدے میں گر پڑنا۔

ان آیات کی تشریح سورۃ حجر آیت ۲۹ میں ہو چکی ہے۔

فَسَجَدَ الۡمَلٰٓئِکَۃُ کُلُّہُمۡ اَجۡمَعُوۡنَ ﴿۷۳﴾

۷۳۔ چنانچہ تمام کے تمام فرشتوں نے سجدہ کیا،

اِلَّاۤ اِبۡلِیۡسَ ؕ اِسۡتَکۡبَرَ وَ کَانَ مِنَ الۡکٰفِرِیۡنَ ﴿۷۴﴾

۷۴۔ سوائے ابلیس کے جو اکڑ بیٹھا اور کافروں میں سے ہو گیا۔

تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورہ اعراف آیات ۱۲۔۱۳۔

قَالَ یٰۤاِبۡلِیۡسُ مَا مَنَعَکَ اَنۡ تَسۡجُدَ لِمَا خَلَقۡتُ بِیَدَیَّ ؕ اَسۡتَکۡبَرۡتَ اَمۡ کُنۡتَ مِنَ

۷۵۔ فرمایا: اے ابلیس! جسے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا ہے اسے سجدہ کرنے سے تجھے کس چیز نے روکا؟ کیا تو نے تکبر کیا ہے یا تو

الۡعَالِیۡنَ ﴿۷۵﴾ 　اونچے درجے والوں میں سے ہے؟

تفسیر آیات

۱۔ بِیَدَیَّ: جس مخلوق کو میں نے خود اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے میں بِیَدَیَّ سے مراد قدرت و قوت ہے۔ قوت کے لیے "ہاتھ سے" کی تعبیر ایک محاورہ ہے۔ "اپنے ہاتھوں سے" کے ذکر میں ایک خاص اہتمام ہے جس طرح کہا جاتا ہے: میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اس میں "میں نے دیکھا ہے" کے ساتھ آنکھوں کا ذکر کرنا ایک خاص اہتمام کی طرف اشارہ ہے۔

۲۔ اَمۡ کُنۡتَ مِنَ الۡعَالِیۡنَ: بعض حضرات نے اس جملے سے یہ مفہوم نکالا ہے کہ کچھ ہستیاں ایسی تھیں جن کا شمار عالین میں ہوتا ہے اور وہ سجدہ کرنے پر مامور نہ تھیں۔

قَالَ اَنَا خَیۡرٌ مِّنۡہُ ؕ خَلَقۡتَنِیۡ مِنۡ نَّارٍ وَّ خَلَقۡتَہٗ مِنۡ طِیۡنٍ ﴿۷۶﴾ 　۷۶۔ اس نے کہا: میں اس سے بہتر ہوں، مجھے تو نے آگ سے پیدا کیا ہے اور اسے مٹی سے بنایا ہے۔

اس آیت کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ الاعراف: ۱۲

قَالَ فَاخۡرُجۡ مِنۡہَا فَاِنَّکَ رَجِیۡمٌ ﴿۷۷﴾ 　۷۷۔ فرمایا: پس نکل جا یہاں سے کہ تو یقیناً مردود ہے۔

تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورہ حجر آیت ۳۴۔

وَّ اِنَّ عَلَیۡکَ لَعۡنَتِیۡۤ اِلٰی یَوۡمِ الدِّیۡنِ ﴿۷۸﴾ 　۷۸۔ اور یوم جزا تک تم پر میری لعنت ہے.

تفسیر آیات

یَوۡمِ الدِّیۡنِ: قیامت تک جب لعنت ہو گی تو قیامت کے دن ان لعنتوں کا نتیجہ بھگتنا ہو گا، نہ یہ کہ قیامت کے بعد لعنت ختم ہو جائے گی۔

قَالَ رَبِّ فَاَنۡظِرۡنِیۡۤ اِلٰی یَوۡمِ 　۷۹۔ اس نے کہا: میرے رب! پس (ان لوگوں

يُبۡعَثُوۡنَ ﴿۷۹﴾ — کے) اٹھائے جانے کے روز تک مجھے مہلت دے۔

قَالَ فَاِنَّکَ مِنَ الۡمُنۡظَرِیۡنَ ﴿۸۰﴾ — ۸۰۔ فرمایا: تو مہلت ملنے والوں میں سے ہے،

اِلٰی یَوۡمِ الۡوَقۡتِ الۡمَعۡلُوۡمِ ﴿۸۱﴾ — ۸۱۔ معین وقت کے دن تک۔

تفسیر آیات

۱۔ ابلیس کو مہلت مل گئی۔ اس طرح جن و انس میں سے گمراہ کرنے والوں کو مہلت مل جاتی ہے تاکہ نظام یکطرفہ نہ ہو۔ ایک طرف مجرم کے عذاب میں اضافہ ہو اور دوسری طرف مکلّف کا امتحان و آزمائش بحال رہے۔ اگر گمراہ کرنے والوں کی جڑ کاٹ دی جائے، انسان میں موجود خواہشات نفسانی ختم کر دی جائیں اور صرف فطرت سلیمہ، عقل سلیم، فرشتوں اور ہادیان برحق ہی کو موقع دیا جائے تو یہ نظام یک طرفہ ہو جاتا۔ آزمائش اور امتحان کے لیے کوئی جگہ نہ رہتی، انسان کو خودمختاری نہ ملتی اور اختیار و انتخاب کا حق نہ ملتا۔ فافهم ذلك۔

۲۔ اِلٰی یَوۡمِ الۡوَقۡتِ الۡمَعۡلُوۡمِ: ابلیس نے قیامت تک کے لیے مہلت مانگی۔ جواب میں وقت معلوم تک کے لیے مہلت دی گئی۔ مفسرین فرماتے ہیں وقت معلوم سے مراد نفخۂ اول ہے۔ پہلی بار صور پھونکنے تک مہلت ہے۔ اس کے بعد جب سب مر جائیں گے تو ابلیس کو مہلت دینے کا مطلب نہیں بنتا۔

قَالَ فَبِعِزَّتِکَ لَاُغۡوِیَنَّہُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ ﴿۸۲﴾ — ۸۲۔ کہنے لگا: مجھے تیری عزت کی قسم! میں ان سب کو بہکا دوں گا۔

اِلَّا عِبَادَکَ مِنۡہُمُ الۡمُخۡلَصِیۡنَ ﴿۸۳﴾ — ۸۳۔ ان میں سے سوائے تیرے خالص بندوں کے۔

تفسیر آیات

۱۔ ابلیس اللہ تعالیٰ کی عزت کی قسم کھا کر اپنے راسخ عزم کا اظہار کرتا ہے کہ میں اولاد آدم سے انتقام لے کر رہوں گا اور جس جس پر میرا بس چلے گا ان میں سے ایک کو بھی نہیں چھوڑوں گا۔ اَجۡمَعِیۡنَ۔

۲۔ اِلَّا عِبَادَکَ: مخلص بندوں کو وہ گمراہ نہیں کر سکے گا۔ نہ یہ کہ وہ گمراہ کرنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ یہاں اس نے اپنی عاجزی کا اظہار کیا ہے کہ میں تیرے مخلص بندوں کو گمراہ نہیں کر سکوں گا۔ یہاں سے معلوم ہوا کہ شیطان کے پاس ایسی طاقت نہیں ہے کہ وہ انسان کو گمراہ ہونے پر مجبور کر سکے۔ شیطان خود کہتا ہے:

وَمَا کَانَ لِیَ عَلَیۡکُمۡ مِّنۡ سُلۡطٰنٍ اِلَّاۤ — اور میرا تم پر کوئی زور نہیں چلتا تھا میں نے تو تمہیں

دَعَوۡتُکُمۡ فَاسۡتَجَبۡتُمۡ لِیۡ ...[1]　　صرف دعوت دی پھر تم نے میرا کہنا مان لیا۔

اہم نکات

۱۔ شیطان کے پاس گمراہی پر مجبور کرنے کی طاقت نہیں۔ رحمٰن ہدایت پر مجبور نہیں کرتا۔ دونوں کی طرف سے صرف دعوت ہوتی ہے اور ہر دعوت پر لبیک کہنے والے ہوتے ہیں۔

قَالَ فَالۡحَقُّ ۫ وَ الۡحَقَّ اَقُوۡلُ ﴿۸۴﴾　　۸۴۔ فرمایا: حق تو یہ ہے اور میں حق بات ہی کرتا ہوں

لَاَمۡلَـَٔنَّ جَہَنَّمَ مِنۡکَ وَ مِمَّنۡ تَبِعَکَ مِنۡہُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ ﴿۸۵﴾　　۸۵۔ کہ میں تجھ سے اور ان میں سے تیری پیروی کرنے والوں سے جہنم کو ضرور پر کر دوں گا۔

تفسیر آیات

۱۔ قَالَ فَالۡحَقُّ ۔ فھذا ھو الحق یا فاقسم بالحق۔ وَ الۡحَقَّ اَقُوۡلُ جملہ معترضہ ہے۔ ربط کلام اس طرح ہے:

حق کی قسم میں جہنم کو تجھ سے اور تیرے پیروکاروں سے بھر دوں گا۔ مِنۡکَ میں شیطان کے ہم نوع اور اس کا لشکر آ گئے اور مِمَّنۡ تَبِعَکَ میں جن و انس کے پیروکار شامل ہو گئے۔

قُلۡ مَاۤ اَسۡـَٔلُکُمۡ عَلَیۡہِ مِنۡ اَجۡرٍ وَّ مَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُتَکَلِّفِیۡنَ ﴿۸۶﴾　　۸۶۔ کہدیجیے: میں تم لوگوں سے اس بات کا اجر نہیں مانگتا اور نہ ہی میں بناوٹ والوں میں سے ہوں۔

تفسیر آیات

۱۔ نہ تو تم سے کسی دنیاوی مفاد کا طالب ہوں میں۔ تمہیں ایسی کوئی مثال نہیں ملے گی کہ میں نے اپنے مفاد کی خاطر کوئی غلط قدم اٹھایا ہو یا کوئی غلط بات کی ہو۔

۲۔ مَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُتَکَلِّفِیۡنَ: نہ ہی کسی تصنع کا عادی ہوں کہ اپنی بڑائی دکھانے کے لیے وحی کا دعویٰ کروں۔ میری زندگی کا کوئی گوشہ تم سے پوشیدہ نہیں ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں کس مزاج کا مالک ہوں۔

اِنۡ ہُوَ اِلَّا ذِکۡرٌ لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۸۷﴾　　۸۷۔ یہ تو عالمین کے لیے صرف نصیحت ہے۔

---

[1] ۱۴ ابراھیم: ۲۲

تفسیر آیات

عالمین، ہر مکان و زمان، ہر نسل اور پوری دنیا کے لیے ایک نصیحت، ایک پیغام ہے اور انسانی ضمیر و وجدان کی بیداری کے لیے ایک حیات بخش آواز ہے۔

مکہ میں نازل ہونے والی یہ آیت اور دیگر متعدد آیات شاہد ہیں کہ یہ پیغام روز اول سے عالمین کے لیے ہے۔ ایک علاقے یا نژاد کے ساتھ محدود نہیں ہے۔ جیسا کہ دشمنان اسلام مستشرقین کہتے ہیں کہ شروع میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خیال صرف مکہ اور اس کے گرد و پیش تک اپنی رسالت کو محدود کرنا تھا۔

وَلَتَعۡلَمُنَّ نَبَاَہٗ بَعۡدَ حِیۡنٍ ﴿۸۸﴾

۸۸۔ اور تمہیں اس کا علم ایک مدت کے بعد ہو گا۔

تفسیر آیات

مکہ کے نامساعد ترین حالات و فضا میں جہاں دور دور تک عام نظروں کو کامیابی کی کوئی علامت نظر نہیں آ رہی تھی، اس ضمن میں یہ اعلان ہو رہا ہے: ایک مدت کے بعد تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ جو میں آج کہہ رہا ہوں وہ پورا ہو کر رہے گا۔ چشم عالم نے دیکھ لیا کہ کوئی زیادہ مدت نہیں گزری تھی ان مشرکین کی گردنیں یا کٹ گئیں یا جھک گئیں اور اسلام کے خلاف تمام سازشوں کی جڑیں کٹ گئیں۔ وَخَسِرَ ہُنَالِکَ الۡمُبۡطِلُوۡنَ ۔[۱]

---

[۱] ۴۰ غافر: ۷۸ (ترجمہ) اور اس طرح اہل باطل خسارے میں پڑ گئے۔

خالی

سُورَۃُ الزُّمَرْ

خالی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اس سورۃ مبارکہ کا نام اس سورۃ میں مذکور آیت ۷۳ وَسِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا میں لفظ زمر سے ماخوذ ہے۔

زمان نزول: سورۃ المبارکہ کی آیت ۱۰ وَاَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ اللہ کی زمین وسیع ہے سے اس روایت کو تقویت ملتی ہے کہ یہ سورۃ مبارکہ ہجرت حبشہ کے موقع پر نازل ہوئی ہے اور تفسیر روح المعانی کی روایت کے مطابق یہ آیت حضرت جعفر اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

فضیلت: مجمع البیان میں یہ حدیث منقول ہے کہ رسول اللہ صلى الله عليه وآله وسلم نے فرمایا:

من قرء سورۃ الزمر لم یقطع اللّٰہ رجاہ واعطاہ ثواب الخائفین الذین خافو اللّٰہ تعالیٰ۔	جو سورہ زمر کی تلاوت کرے تو اللہ اس کی امید کو منقطع نہیں کرے گا اور اس کو اللہ سے خوف کرنے والوں کا ثواب عنایت فرمائے گا۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ	بنام خدائے رحمٰن رحیم
تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ①	۱۔ اس کتاب کا نزول بڑے غالب آنے والے اور حکمت والے اللہ کی طرف سے ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ یہ کتاب کسی بشری ذہن کی ایجاد و تصنیف نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو اس میں بشری کمزوری نظر آتی بلکہ یہ کتاب اس ذات کی نازل کردہ ہے جو العزیز ہے۔ قوت و قہاریت، عزت و غلبہ کی مالک ہے۔ اس کتاب میں اس ذات کی عزت و غلبہ کی جھلک نظر آتی ہے اور یہ ذات الحکیم، دانائے حقیقت ہے۔ اس کتاب میں اس حکیم ذات کا حکیمانہ قانون و دستور موجود ہے۔

اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ فَاعۡبُدِ اللّٰہَ مُخۡلِصًا لَّہُ الدِّیۡنَ ۲

۲۔ ہم نے آپ کی طرف یہ کتاب برحق نازل کی ہے لہٰذا آپ دین کو اسی کے لیے خالص کر کے صرف اللہ کی عبادت کریں۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنَاۤ: سابقہ آیت میں تَنۡزِیۡلُ سے تعبیر فرمایا اور اس آیت میں اَنۡزَلۡنَاۤ فرمایا۔ اکثر کا یہ نظریہ ہے کہ تَنۡزِیۡلُ تدریجی نزول کو اور اَنۡزَلۡنَاۤ دفعۃً نزول کو کہتے ہیں۔ مجھے اس نظریے کو قبول کرنے میں تردد ہے کیونکہ آیہ لَوۡلَا نُزِّلَ عَلَیۡہِ الۡقُرۡاٰنُ جُمۡلَۃً وَّاحِدَۃً ...[1] میں یکبارگی کے لیے نُزِّلَ کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔ لو لا انزلنا نہیں فرمایا۔ اس طرح دیگر قرآنی شواہد موجود ہیں جہاں اس مطلب کے تناظر میں قرآن کی تفسیر کرنا درست معلوم نہیں ہوتا۔ بعض فرماتے ہیں تَنۡزِیۡلُ کا وزن تکثیر یعنی کثرت بیان کرنے کے لیے آتا ہے۔ پھر لَوۡلَا نُزِّلَ میں کہتے ہیں۔ یہاں نزل، انزل کے معنوں میں ہے۔

۲۔ اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ: یہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس حق وحقیقت کو بیان کرنے کے لیے نازل کیا گیا ہے جسے قرآن کے علاوہ کسی اور چیز کے ذریعے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ ان حقائق کی طرف رسائی صرف قرآن کے ذریعے ہو سکتی ہے۔

۳۔ فَاعۡبُدِ اللّٰہَ: جب وہ حقائق جو نہایت اہمیت کے حامل ہیں آپ کی دست رس میں آ گئے تو اس کے نتیجے میں اللہ کی بندگی کرنی چاہیے چونکہ یہ حقائق ''راز بندگی'' میں خلاصہ ہوتے ہیں۔

عبادت کی تعریف یہ ہے کہ کسی ذات کی تعظیم اس بنیاد پر کی جائے کہ وہ خالق یا ربّ ہے۔ لہٰذا کسی کو خالق یا رب سمجھ کر بجا لانے والی تعظیم عبادت ہے۔ مطلق تعظیم عبادت نہیں ہے۔

۴۔ مُخۡلِصًا لَّہُ الدِّیۡنَ: دین کے معنی اس جگہ اطاعت ہو سکتے ہیں۔ پس اس جملے کے معنی یہ ہیں: اطاعت و فرماں برداری کو صرف اور خالصتاً اللہ کے لیے قرار دے کر عبادت کرو۔ خالص کا مطلب یہ ہے کہ اطاعت بے شائبہ اور شفاف ہو۔ اس فرمان برداری کا مقصد صرف ذات الٰہی ہو اور اس سے عشق و محبت ہو اور اس میں غیر اللہ کا کوئی شائبہ نہ ہو جو ایک مشکل کام ہے۔ دینداری آسان ہے لیکن اسے بے شائبہ اور شفاف بنانا مشکل ہے۔

حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام سے روایت ہے:

تَصۡفِیَۃُ الۡعَمَلِ اَشَدُّ مِنَ الۡعَمَلِ....[2] عمل کو صاف و شفاف بنانا خود عمل سے زیادہ مشکل ہے۔

---

[1] ۲۵ فرقان: ۳۲ [2] الکافی: ۲/۱۶

اَلَا لِلّٰہِ الدِّیۡنُ الۡخَالِصُ ؕ وَ الَّذِیۡنَ اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اَوۡلِیَآءَ ۘ مَا نَعۡبُدُہُمۡ اِلَّا لِیُقَرِّبُوۡنَاۤ اِلَی اللّٰہِ زُلۡفٰی ؕ اِنَّ اللّٰہَ یَحۡکُمُ بَیۡنَہُمۡ فِیۡ مَا ہُمۡ فِیۡہِ یَخۡتَلِفُوۡنَ ۬ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَہۡدِیۡ مَنۡ ہُوَ کٰذِبٌ کَفَّارٌ ③

۳۔ آگاہ رہو! خالص دین صرف اللہ کے لیے ہے اور جنہوں نے اللہ کو چھوڑ کر اوروں کو سرپرست بنایا ہے (ان کا کہنا ہے کہ) ہم انہیں صرف اس لیے پوجتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ کا مقرب بنا دیں، اللہ ان کے درمیان یقیناً ان باتوں کا فیصلہ کرے گا جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں، اللہ جھوٹے منکر کو یقیناً ہدایت نہیں کرتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اَلَا لِلّٰہِ الدِّیۡنُ الۡخَالِصُ: ایک ندائے عام ہے ہر عقل وشعور رکھنے والے کے لیے کہ خالص اور بے شائبہ اطاعت صرف اللہ تعالیٰ کی ہوتی ہے۔ بایں معنی کہ اطاعت اور عبادت بلا شرکت غیر ہو تو وہ اللہ کے لیے ہوگی۔ اگر کسی کی شرکت ہو تو وہ اطاعت اللہ کی اطاعت اور عبادت شمار نہ ہوگی۔

۲۔ وَ الَّذِیۡنَ اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اَوۡلِیَآءَ: صاحب تفسیر المیزان اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

> بت پرستوں کا نظریہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانی ادراک یعنی عقل، وہم اور حس کے احاطہ میں آنے سے بالاتر ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ اس بات سے بالاتر ہے کہ اس کی ہم براہ راست عبادت کریں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ہم اللہ کی مخلوق میں سے اس کی مقرب ہستیوں کے ذریعے اللہ کا قرب حاصل کریں جن کے ہاتھ میں اللہ تعالیٰ نے تدبیر کائنات کا کام سونپ رکھا ہے۔ وہ ان مقرب ہستیوں کو اللہ کی جگہ ربّ کے طور پر مانتے ہیں پھر ان کی عبادت کرتے ہیں تاکہ یہ اللہ کے ہاں ان کی سفارش کریں اور اللہ کا قرب حاصل ہو جائے۔ یہ ہستیاں فرشتے، جنات اور مقدس انسان ہیں۔ حقیقت میں یہی ربّ ہیں اور معبود بھی۔
>
> رہی بات عبادت گاہوں میں نصب شدہ بت کی تو یہ صرف ہمارے ارباب اور معبود کی شبیہ ہیں۔ یہ بذات خود ارباب اور معبود نہیں ہیں۔
>
> مگر مشرکین میں جاہل لوگ ان شبیہوں کو ذوات مقدسہ سمجھ بیٹھے۔ وہ خود ربّ اور ربّ کے بتوں میں فرق نہیں سمجھ سکے چنانچہ وہ ان بتوں کی اس طرح عبادت کرنے لگے جس طرح خود ارباب اور معبودوں کی عبادت کی جاتی ہے۔

مشرکین کے نزدیک اللہ تعالیٰ ان ارباب کا ربّ اور خالق ہے۔ لہٰذا مشرکین اللہ کے ساتھ غیر اللہ کو مدبر اور معبود سمجھتے ہیں، وہ بھی خالق صرف اللہ کو سمجھتے ہیں۔

۳۔ اِنَّ اللّٰہَ یَحۡکُمُ بَیۡنَہُمۡ :اللہ قیامت کے دن ان مشرکین اور موحدین کے درمیان موجود اختلاف کا فیصلہ دے گا۔ جس دن شرک اور توحید کا نتیجہ سامنے آنے والا ہے اسی دن اس اختلاف کا فیصلہ ہو گا۔

۴۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَہۡدِیۡ مَنۡ ہُوَ کٰذِبٌ کَفَّارٌ : جو اللہ کی وحدانیت اور معبودیت کے بارے میں خلاف واقع بات کرتے اور کفر اختیار کرنے میں ایک کردار ادا کرتے ہیں وہ صرف کافرین نہیں بلکہ کفّار ہیں۔ ان میں ہدایت لینے کی اہلیت نہ ہونے کی وجہ سے انہیں اللہ ہدایت نہیں دیتا بلکہ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔

لَوۡ اَرَادَ اللّٰہُ اَنۡ یَّتَّخِذَ وَلَدًا لَّاصۡطَفٰی مِمَّا یَخۡلُقُ مَا یَشَآءُ ۙ سُبۡحٰنَہٗ ؕ ہُوَ اللّٰہُ الۡوَاحِدُ الۡقَہَّارُ ④	۴۔ اگر اللہ کسی کو اپنا بیٹا بنانا چاہتا تو اپنی مخلوق میں سے جسے چاہتا منتخب کر لیتا، وہ پاکیزہ ہے اور وہ اللہ یکتا، غالب ہے۔

تفسیر آیات

ا۔ اول تو بفرض محال اللہ کا کوئی بیٹا ہے تو اس کا مطلب یہ بنتا ہے وہ اللہ کا حصہ ہے جو اس سے جدا ہوا ہے۔ یہ ناممکن ہے۔

دوم یہ کہ اگر اللہ کسی کو اپنا بیٹا بنانا چاہتا تو اللہ کی مخلوق میں سے کسی کو بیٹا بنایا جا سکتا ہے۔ اللہ کی مخلوق بیٹا نہیں ہو گا، دیگر مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہو گی۔ پس دونوں میں رشتہ خالق و مخلوق کا ہے، والد، ولد کا نہیں اور اگر مخلوق نہ ہوتا تو اللہ کی ذات میں تعدد لازم آتا۔

۲۔ سُبۡحٰنَہٗ ؕ ہُوَ اللّٰہُ الۡوَاحِدُ الۡقَہَّارُ : تعدد سے اللہ کی ذات منزہ ہے۔ وہ واحد ہے۔ اس میں تعدد آنا محال ہے۔ وہ قہار ہے اس کے مقابلے میں کسی اور وجود میں استقلال نہیں آ سکتا بلکہ وہ اللہ کی قہاریت کے قبضے میں ہے۔ لہٰذا اللہ کا کوئی فرزند نہیں ہو سکتا۔ رہا یہ سوال کہ حقیقی بیٹا نہیں ہو سکتا تو کسی کو اعزازی بیٹا بنایا جائے تو کیا حرج ہے؟ جواب یہ ہے کہ اعزاز کا مطلب عزت دینا، برگزیدہ کرنا ہے۔ اگر اللہ اپنی مخلوق، بندوں میں سے کسی کو عزت دیتا اور برگزیدہ فرماتا ہے تو وہ اس کا بیٹا نہیں کہلائے گا۔ یہ شان الٰہی میں گستاخی ہے بلکہ اسے اللہ کا مقرب بندہ کہا جائے گا۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ ۚ یُکَوِّرُ الَّیۡلَ عَلَی النَّہَارِ وَ یُکَوِّرُ	۵۔ اسی نے آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے، وہی رات کو دن پر لپیٹتا ہے اور دن کو

النَّهَارَ عَلَى الَّيۡلِ وَسَخَّرَ الشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ‌ ؕ كُلٌّ يَّجۡرِىۡ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى‌ ؕ اَلَا هُوَ الۡعَزِيۡزُ الۡغَفَّارُ ۝۵

رات پر لپیٹتا ہے اور اس نے سورج اور چاند کو مسخر کیا ہے، یہ سب ایک مقررہ وقت تک چلتے رہیں گے، آگاہ رہو! وہی بڑا غالب آنے والا معاف کرنے والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ: اس کائنات کو عبث اور بے مقصد خلق نہیں کیا بلکہ ایک حکیمانہ مقصد کے لیے خلق کیا ہے۔ تشریح کے لیے رجوع فرمائیں سورہ انعام آیت ۷۳۔

۲۔ يُكَوِّرُ الَّيۡلَ عَلَى النَّهَارِ: اللہ دن پر رات اور رات پر دن کو لپیٹتا ہے۔

تکویر لپیٹنے کو کہتے ہیں۔ جیسے عمامہ سر پر لپیٹنا۔ گویا زمین کو سر کی طرح گول تصور کیا گیا جس پر دن رات پر اور رات دن پر لپیٹ دی جاتی ہے کہ ایک طرف رات کی تاریکی دن کی روشنی کا تعاقب کر رہی ہوتی ہے دوسری طرف دن کی روشنی رات کی تاریکی کا تعاقب کر رہی ہوتی ہے۔ چونکہ مادّہ تکویر، کرہ سے ہے جو گول شکل کے جسم کو کہا جاتا ہے۔ اس لیے يُكَوِّرُ زمین کے کرہ اور گول ہونے کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے۔

۳۔ وَسَخَّرَ الشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ: سورج اور چاند کی تسخیر اسی دن اور رات کے دوران کی صورت میں ہے کہ اس شب و روز کے دوران سے سورج کی حیات بخش روشنی سے استفادہ ہوتا ہے اور رات کی وجہ سے سورج کے مضرات سے اہل ارض محفوظ رہتے ہیں۔

۴۔ كُلٌّ يَّجۡرِىۡ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى: سورج اور چاند میں سے ہر ایک، معین مدت تک جاری اور گردش میں رہے گا۔ اس معین مدت کا علم صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات تک محدود ہے۔ بالآخر ایک دن اس کائنات نے ختم ہونا ہے۔

۵۔ اَلَا هُوَ الۡعَزِيۡزُ الۡغَفَّارُ: آگاہ رہو وہ ذات غالب آنے والی ہونے کے باوجود درگزر کرنے والی ہے۔

واضح رہے اس آیت کا مطمع نظر اس کائنات کے خلق و تدبیر کی طرف متوجہ کرنا ہے کہ جس طرح مشرکین بھی مانتے ہیں خالق ایک ہی ذات ہے اسی طرح آیت نے یہ بات واضح فرمائی ہے کہ مدبر بھی ایک ہی ہے اور وہ وہی خالق ہے۔ چونکہ خلق اور تدبیر قابل تفریق نہیں ہیں۔ جس نے کائنات کو برحق خلق فرمایا ہے اسی نے شب و روز کے آنے جانے اور شمس و قمر کی تسخیر سے اس کائنات کی تدبیر فرمائی ہے۔ لہٰذا تخلیق

میں تدبیر ہے۔ پس اگر خالق صرف خدا ہے تو مدبر بھی صرف خدا ہے۔

خَلَقَكُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا وَ اَنۡزَلَ لَكُمۡ مِّنَ الۡاَنۡعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزۡوَاجٍ ؕ يَخۡلُقُكُمۡ فِىۡ بُطُوۡنِ اُمَّهٰتِكُمۡ خَلۡقًا مِّنۡۢ بَعۡدِ خَلۡقٍ فِىۡ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ؕ ذٰ لِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمۡ لَهُ الۡمُلۡكُ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَاَنّٰى تُصۡرَفُوۡنَ ۞

۶۔اسی نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا پھر اس سے اس کا جوڑا بنایا اور اسی نے تمہارے لیے چوپاؤں میں سے آٹھ جوڑے بنائے، وہی تمہیں تمہاری ماؤں کے شکموں میں تین تاریکیوں میں ایک خلقت کے بعد دوسری خلقت دیتا ہے، یہی اللہ تمہارا پروردگار ہے، اسی کی بادشاہی ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں، پھر تم کہاں پھرے جاتے ہو؟

تفسیر آیات

۱۔ خَلَقَكُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَةٍ: اس آیۂ شریفہ میں خلق اور تدبیر کے ناقابل تفریق ہونے پر استدلال ہے۔

نفس واحدہ سے مراد آدم علیہ السلام کی ذات ہے جن سے نسل انسانی پھیلی اور ثُمَّ جَعَلَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا پھر اس سے اس کا جوڑا بنایا۔ اس طرح زَوۡجَهَا کو بھی نفس واحدہ سے خلق فرمایا۔ ضروری نہیں ہے کہ نفس واحدہ عیناً وہی نفس واحدہ ہو جس سے آدم کو خلق فرمایا ہے۔ ممکن ہے ایک نفس واحدہ (آدم) سے مرد اور دوسرے نفس واحدہ (حوا) سے عورت کو پیدا کیا ہو۔ چنانچہ ایک روایت کا اسی بات کی طرف اشارہ ہے:

ان اللّٰہ تعالیٰ خلق حواء من فضل طینۃ التی خلق منھا آدم۔[1]

اللہ تعالیٰ نے حوا کو اس طینت سے خلق فرمایا جو آدم کی تخلیق سے بچی ہوئی تھی۔

۲۔ وَ اَنۡزَلَ لَكُمۡ مِّنَ الۡاَنۡعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزۡوَاجٍ: تدبیر معیشت کے بارے میں ایک اہم معاشی مسئلے کا ذکر ہے کہ الۡاَنۡعَامِ مویشی۔ اس سے مراد اونٹ، گائے، بھیڑ اور بکری چار نر اور چار مادہ مجموعاً آٹھ کی تعداد بنتی ہے جن پر انسانی معیشت کے اہم ستون کھڑے ہیں۔

اَنۡزَلَ لَكُمۡ سے مراد ممکن ہے یہ ہو: تمہارے دست رسی میں رکھ دیا۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے:

فانزالہ ذلک خلقہ ایاہ...۔[2]

انزل سے خلق مراد ہے۔

۳۔ يَخۡلُقُكُمۡ فِىۡ بُطُوۡنِ اُمَّهٰتِكُمۡ: تدبیر سے تخلیق کے ذکر کی طرف آتا ہے کہ اللہ ہی نے تمہیں

---

[1] مجمع البیان [2] بحار: ۹۰: ۱۱۴

خلق کیا ہے تمہاری ماؤں کے شکموں میں۔
۴۔ خَلۡقًا مِّنۡۢ بَعۡدِ خَلۡقٍ: یکے بعد دیگرے تخلیقی مراحل سے مراد، نطفہ، پھر لوتھڑا، پھر گوشت کا ٹکڑا، پھر ہڈیاں، پھر ہڈیوں پر گوشت، پھر خلق آخر ہے۔
۵۔ خَلۡقٍ فِیۡ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ: تخلیق کے یہ مراحل تین تاریکیوں میں انجام پاتے ہیں جہاں روشنی کا گزر نہیں ہوسکتا۔ شکم مادر، رحم اور مشیمہ (وہ جھلی جس میں بچہ محفوظ ہوتا ہے) کی تاریکیوں میں۔
۶۔ ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمۡ: تمہارا رب اور تمہارا مالک وہی ذات ہے جس کے ہاتھ میں تمہاری تخلیق و تدبیر ہے۔
۷۔ لَہُ الۡمُلۡکُ: کل کائنات پر اسی کی بادشاہی ہے۔ کوئی چیز اس کی بادشاہی سے خارج نہیں ہے۔ نہ کسی ایک چیز پر غیر اللہ کی بادشاہی ہے۔
۸۔ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ: پس عبادت بھی صرف اور صرف اسی کی ہو گی۔ اس کے علاوہ کوئی اور ذات قابل پرستش ہونا ممکن نہیں ہے جس کے پاس خلق و تدبیر اور بادشاہی کا کوئی حصہ ہو۔
۹۔ فَاَنّٰی تُصۡرَفُوۡنَ: پھر تم اے مشرکو! اس کائنات کے خالق، مدبر اور بادشاہ کو چھوڑ کر کہاں پھرے جا رہے ہو۔
انسانی تخلیق کے بارے میں مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورہ آل عمران آیت ۶۔

اہم نکات

۱۔ تمام انسانوں کا تعلق ایک نفس واحدہ سے ہے۔
۲۔ اللہ نے سب سے پہلے انسان کے لیے زوجہ خلق فرمائی۔
۳۔ انسان کی تخلیق تاریکی کے تین پردوں کے پیچھے ہوئی ہے۔

اِنۡ تَکۡفُرُوۡا فَاِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ عَنۡکُمۡ ۟ وَ لَا یَرۡضٰی لِعِبَادِہِ الۡکُفۡرَ ۚ وَ اِنۡ تَشۡکُرُوۡا یَرۡضَہُ لَکُمۡ ؕ وَ لَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰی ؕ ثُمَّ اِلٰی رَبِّکُمۡ مَّرۡجِعُکُمۡ فَیُنَبِّئُکُمۡ بِمَا کُنۡتُمۡ

۷۔ اگر تم کفر کرو تو یقیناً اللہ تم سے بے نیاز ہے اور وہ اپنے بندوں کے لیے کفر پسند نہیں کرتا اور اگر تم شکر کرو تو وہ اسے تمہارے لیے پسند کرے گا اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا پھر تمہیں اپنے رب کی بارگاہ کی طرف لوٹنا ہے پھر وہ تمہیں بتا دے گا

تَعۡمَلُوۡنَ ؕ اِنَّہٗ عَلِیۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ۞ | کہ تم کیا کرتے رہے ہو، یقیناً وہ دلوں کا حال خوب جاننے والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنۡ تَکۡفُرُوۡا: اگر تم اللہ کی بندگی چھوڑ کر ناشکری کے مرتکب ہو جاؤ تو اس کے منفی اثرات کے زد میں خود تم آجاؤ گے۔ اللہ تمہاری شکر گزاری سے بے نیاز ہے۔

۲۔ وَ لَا یَرۡضٰی لِعِبَادِہِ الۡکُفۡرَ: وہ اپنے بندوں کے لیے کفر پسند نہیں کرتا۔ ایک سوال کا جواب یہ ہے کہ اللہ کفران نعمت کو ناپسند کرتا ہے۔ اللہ کا ناپسند کرنا ہمارے لیے باعث ہلاکت ہے کیونکہ انسان کی کامیابی اللہ کی خوشنودی میں ہے۔

اس کی مثال استاد اور شاگرد کی ہے۔ اگر شاگرد محنت نہ کرے تو اس سے استاد کو کوئی ضرر نہیں پہنچتا البتہ استاد کو یہ عمل ناپسند ہے۔ استاد اس سے ہاتھ اٹھا لیتا ہے۔ اس سے اس کی زندگی تباہ ہو جاتی ہے اور اگر شاگرد محنت کرتا ہے تو استاد کو کوئی فائدہ نہیں ملتا البتہ استاد اس سے خوش ہو جائے گا۔ استاد کی توجہ اور پیار ملے گا جس سے اس کی زندگی سنور جائے گی۔

تصور آخرت کے مطابق انسان کی سعادت، کامیابی اور ارتقاء، رضائے رب کے ساتھ وابستہ ہے۔

۲۔ وَ اِنۡ تَشۡکُرُوۡا یَرۡضَہُ لَکُمۡ: مقام شکر پر فائز ہونے والا مقام رضائے رب پر فائز ہو جاتا ہے:

وَ رِضۡوَانٌ مِّنَ اللّٰہِ اَکۡبَرُ ... [۱] | اور اللہ کی طرف سے خوشنودی ان سب سے بڑھ کر ہے۔

۳۔ وَ لَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰی: اس جملے کی تشریح سورہ انعام آیت ۱۶۴، بنی اسرائیل آیت ۱۵ میں، سورہ فاطر آیت ۱۸ میں ہو چکی ہے۔

اللہ کی خوشنودی: اس آیۂ شریفہ کا یہ جملہ قابل توجہ ہے: وَ لَا یَرۡضٰی لِعِبَادِہِ الۡکُفۡرَ ۚ وَ اِنۡ تَشۡکُرُوۡا یَرۡضَہُ لَکُمۡ .... اللہ کفر کو پسند نہیں کرتا اور شکر کو پسند کرتا ہے۔

شیعہ امامیہ کا نظریہ ہے کہ کفر بذات خود یعنی عقلاً بُرا اور شکر بذات خود یعنی عقلاً اچھا ہے۔ اللہ تعالیٰ کبھی بھی کسی بری چیز کو پسند نہیں کرتا اور کسی اچھی چیز کو ناپسند نہیں کرتا۔ جب کہ ایک کلامی مکتب فکر کا نظریہ یہ ہے کہ اللہ کفر کو پسند کرتا ہے اسی لیے کافر اسے اختیار کرتا ہے اور وَ لَا یَرۡضٰی لِعِبَادِہِ الۡکُفۡرَ میں نیک بندوں سے کفر کو پسند نہیں کرتا۔ اسی لیے ان سے کفر سرزد نہیں ہوتا۔ اس طرح وہ عبادہ کی تخصیص صرف نیک بندوں کے لیے کرتے ہیں۔ مخصص ان کا اپنا نظریہ ہے۔

بہرحال ان کا یہ نظریہ ہے کہ جب تک اللہ کسی چیز کو پسند نہیں کرتا وہ وقوع پذیر نہیں ہوتی اور کفر کو

---

[۱] ۹ توبۃ: ۷۲

اللہ پسند کرتا ہے اس لیے کافر سے کفر وقوع پذیر ہوتا ہے۔ یہ نظریہ اس قدر واضح البطلان ہے کہ جواب کے محتاج نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کی خوشنودی کے حصول کا بہترین ذریعہ شکر ہے۔ وَ اِنۡ تَشۡکُرُوۡا یَرۡضَہُ لَکُمۡ....

وَ اِذَا مَسَّ الۡاِنۡسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّہٗ مُنِیۡبًا اِلَیۡہِ ثُمَّ اِذَا خَوَّلَہٗ نِعۡمَۃً مِّنۡہُ نَسِیَ مَا کَانَ یَدۡعُوۡۤا اِلَیۡہِ مِنۡ قَبۡلُ وَ جَعَلَ لِلّٰہِ اَنۡدَادًا لِّیُضِلَّ عَنۡ سَبِیۡلِہٖ ؕ قُلۡ تَمَتَّعۡ بِکُفۡرِکَ قَلِیۡلًا ٭ۖ اِنَّکَ مِنۡ اَصۡحٰبِ النَّارِ ﴿۸﴾

۸۔ اور جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اپنے رب کی طرف رجوع کر کے اسے پکارتا ہے، پھر جب وہ اسے اپنی طرف سے کوئی نعمت دیتا ہے تو جسے پہلے پکارتا تھا اسے بھول جاتا ہے اور اللہ کے لیے شریک بنانے لگتا ہے تاکہ اس کی راہ سے (دوسروں کو) گمراہ کر دے کہہ دیجیے: اپنے کفر سے تھوڑا سا لطف اندوز ہو جا یقیناً تو جہنمیوں میں سے ہے۔

تشریح کلمات

خَوَّلَہٗ: (خ و ل) التخویل کے اصل معنی حشم و خدام عطا کرنے کے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اِذَا مَسَّ الۡاِنۡسَانَ ضُرٌّ: اضطراری حالت میں اس کی فطرت بیدار ہو جاتی ہے۔ غیر فطری دباؤ ہٹ جاتا اور انسان اپنی فطرت سلیمہ سے سرگوشی کرنے لگتا ہے۔ وہاں اسے صرف اللہ ہی نظر آتا ہے۔ پھر اسی کو پکارتا ہے جب اضطراری حالت ختم ہو جاتی ہے تو معاشرتی عادات و رسوم، خواہشات اور مفادات کی طرف سے غیر فطری دباؤ شروع ہو جاتا ہے۔

اس آیت کی تشریح کے لیے سورہ یونس آیت ۱۲، سورہ روم آیت ۳۳ ملاحظہ فرمائیں۔

اَمَّنۡ ہُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّیۡلِ سَاجِدًا وَّ قَآئِمًا یَّحۡذَرُ الۡاٰخِرَۃَ وَ یَرۡجُوۡا رَحۡمَۃَ رَبِّہٖ ؕ قُلۡ ہَلۡ یَسۡتَوِی

۹۔ (مشرک بہتر ہے) یا وہ شخص جو رات کی گھڑیوں میں سجدے اور قیام کی حالت میں عبادت کرتا ہے، آخرت سے ڈرتا ہے اور اپنے رب کی رحمت سے

الَّذِیۡنَ یَعۡلَمُوۡنَ وَ الَّذِیۡنَ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ؕ اِنَّمَا یَتَذَکَّرُ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ ۹

امید لگائے رکھتا ہے، کہد یجیے: کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے یکساں ہو سکتے ہیں؟ بے شک نصیحت تو صرف عقل والے ہی قبول کرتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اَمَّنۡ ہُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّیۡلِ: کیا یہ شخص جو آسودہ ہوتے ہی شرک اختیار کرتا ہے اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جس کے اوصاف درج ذیل ہیں:

الف: وہ رات کے اوقات میں عبادت کرتا ہے جب لوگ سو رہے ہوتے ہیں۔ ہر قسم کی ریا کاری سے دور محض رضائے رب کے لیے عبادت کرتا ہے۔

ب: الَّیۡلِ سَاجِدًا وَّ قَآئِمًا: عبادت کی نوعیت بیان فرمائی کہ یہ عبادت سجدے اور قیام کی صورت میں بجا لاتا ہے۔ رات کی تاریکی میں، تنہائی میں حالت سجدہ میں ہو یا حالت قیام میں ہو۔

ج: یَّحۡذَرُ الۡاٰخِرَۃَ: وہ آخرت کی ہولناکیوں سے خائف رہتا ہے اور کسی کوتاہی یا گناہ کے ارتکاب کی صورت میں وہ اس عذاب کا خوف دل میں رکھتا ہے جو اس گناہ کے معاف نہ ہونے کی صورت میں آخرت کے دن درپیش ہوگا۔

د: وَ یَرۡجُوۡا رَحۡمَۃَ رَبِّہٖ: اور ساتھ امید کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ وہ خوف اور امید کے درمیان ہوتا ہے۔ خوف کی وجہ سے وہ گناہ سے بچتا ہے اور امید کی وجہ سے عبادت کرتا ہے۔

چنانچہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے آپ نے فرمایا: میرے پدر بزرگوار فرماتے تھے:

اِنَّہ لَیْسَ مِنْ عَبْدٍ مُؤْمِنٍ اِلَّا (وَ) فِی قَلْبِہِ نُورَانِ نُورُ خِیْفَۃٍ وَ نُورُ رَجَاءٍ لَوْ وُزِنَ ھَذَا لَمْ یَزِدْ عَلَی ھَذَا وَ لَو وُزِنَ ھَذَا لَمْ یَزِدْ عَلَی ھَذَا۔[1]

مؤمن بندے کے دل میں دو قسم کے نور ہوتے ہیں ایک خوف کا نور اور دوسرا امید کا نور اگر اس (خوف) کا وزن کیا جائے تو اس (امید) سے زیادہ نہ ہو اور اگر اس (امید) کا وزن کیا جائے تو اس (خوف) سے زیادہ نہ ہو۔

دوسری روایت میں فرمایا:

یَہْلِكُ الْمُتَّكِلُ عَلَی عَمَلِہِ و لَا یَنْجُو الْمُجْتَرِئُ عَلَی الذُّنُوبِ الْوَاثِقُ

اپنے عمل پر بھروسہ کرنے والا ہلاک ہو جائے گا۔ جیسا کہ اللہ کی رحمت پر بھروسہ کر کے گناہ کا ارتکاب

بِرَحْمَةِ اللّٰهِ قُلْتُ: فَمَنْ يَنْجُو؟ قَالَ: الَّذِينَ هُمْ بَيْنَ الْخَوْفِ وَ الرَّجَاءِ كَأَنَّ قُلُوبَهُمْ فِي مِخْلَبِ طَائِرٍ شَوْقاً إِلَى الثَّوَابِ وَ خَوْفاً مِنَ الْعَذَابِ۔ [2]

کرنے والے کو بھی نجات نہیں ملتی۔ راوی نے پوچھا: پھر کسے نجات ملے گی؟ فرمایا: جو خوف اور امید کے درمیان ہوتے ہیں گویا ان کے دل پرندوں کے پنجے میں ہیں ثواب کے شوق اور عذاب کے خوف کی وجہ سے۔

۲۔ قُلۡ هَلۡ يَسۡتَوِي الَّذِيۡنَ يَعۡلَمُوۡنَ: مشرک اور مؤمن کا برابر نہ ہونا ایسا ہے جیسے عالم اور جاہل برابر نہیں ہو سکتے کیونکہ اللہ کی بندگی، رازِ بندگی، آگہی سے سے مربوط ہے۔ جو راز حیات کو نہیں جانتا وہ اپنی عقل سے کام نہیں لے سکتا اور جو عقل سے کام نہیں لیتا وہ اپنی زندگی کو معقولیت نہیں دے سکتا۔

اس آیت سے عالم کی یہ تعریف سامنے آتی ہے:

عالم وہ ہے جو ابتدا و آخر شب میں عبادت کرتا ہے۔ قیامت کا خوف اور رحمت الٰہی کی امید رکھتا ہے، خواہ اصطلاح میں وہ ان پڑھ ہی کیوں نہ ہو اور جاہل وہ ہے جس میں یہ اوصاف نہ ہوں، خواہ اصطلاح میں اسے سب سے بڑا علامہ سمجھا جاتا ہو۔

چنانچہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے روایت ہے:

لَا يَكُونُ الرَّجُلُ مُؤْمِناً حَتّٰى يَكُونَ خَائِفاً رَاجِياً وَ لَا يَكُونُ خَائِفاً رَاجِياً حَتّٰى يَكُونَ عَالِماً لِمَا يَخَافُ وَ يَرْجُو۔ [3]

بندہ اس وقت تک مومن نہیں ہوتا جب تک خوف کرنے والا اور امید رکھنے والا نہ ہو اور خوف کرنے والا اور امید رکھنے والا نہیں ہو سکتا جب تک اس چیز کا علم نہ ہو جس سے خوف کرنا اور جس کی امید رکھنا ہے۔

حدیث میں آیا ہے۔

لَا خَيْرَ فِي الْعَيْشِ إِلَّا لِرَجُلَيْنِ عَالِمٍ مُطَاعٍ أَوْ مُسْتَمِعٍ وَاعٍ۔ [4]

صرف دو آدمیوں کی زندگی میں خیر ہے۔ ایک عالم جس کی بات مان لی جاتی ہو دوسرا بات سننے اور سمجھنے والا۔

قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ اس آیت میں يَعۡلَمُوۡنَ اور لَا يَعۡلَمُوۡنَ میں موازنہ ہے۔ یعنی جاننے والوں اور نہ جاننے والوں میں موازنہ ہے۔ یہ نہیں فرمایا کس چیز کے جاننے والے۔ اگر کسی خاص چیز کے نہ جاننے والے کا ذکر ہوتا تو اسی علم کے ساتھ مخصوص ہوتا۔ چونکہ کسی کا ذکر نہیں ہے لہٰذا ہر علم کی بلا امتیاز فضیلت ہے۔ لہٰذا علم کی بمقابلہ جہالت فضیلت ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

تَفَكُّرُ سَاعَةٍ خَيْرٌ مِنْ عِبَادَةِ سَنَةٍ (قَالَ

ایک گھڑی فکر سے کام لینا ایک سال کی عبادت سے

---

[1] الکافی ۲: ۹۷ [2] مستدرک الوسائل ۱۱: ۲۲۶ [3] مستدرک الوسائل ۱۱: ۲۲۶ [4] الکافی باب صفة العلم ۱: ۳۳

اللّٰہُ) اِنَّمَا یَتَذَکَّرُ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ۔[1] بہتر ہے اللہ کا ارشاد ہے نصیحت عقل والے ہی قبول کرتے ہیں۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

النَّاسُ ثَلَاثَۃٌ عَالِمٌ وَ مُتَعَلِّمٌ وَ غُثَاءٌ۔[2] لوگ تین قسم کے ہیں: عالم، طالب علم یا خس وخاشاک۔

فضیلت: ابن عباس سے روایت ہے: الَّذِیۡنَ یَعۡلَمُوۡنَ سے علی علیہ السلام اور ان کے اہل بیت علیہم السلام مراد ہیں۔ وَالَّذِیۡنَ لَا یَعۡلَمُوۡنَ سے بنی امیہ اور اُولُوا الۡاَلۡبَابِ سے ان کے شیعہ مراد ہیں۔[3]

اہم نکات

۱۔ مؤمن خوف و امید کے درمیان ہوتا ہے۔

۲۔ عالم وہ ہے جو رازِ بندگی جانتا ہو۔

قُلۡ یٰعِبَادِ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوۡا رَبَّکُمۡ ؕ لِلَّذِیۡنَ اَحۡسَنُوۡا فِیۡ ہٰذِہِ الدُّنۡیَا حَسَنَۃٌ ؕ وَ اَرۡضُ اللّٰہِ وَاسِعَۃٌ ؕ اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوۡنَ اَجۡرَہُمۡ بِغَیۡرِ حِسَابٍ ﴿۱۰﴾

۱۰۔ کہدیجیے: اے میرے مومن بندو! اپنے رب سے ڈرو، جو اس دنیا میں نیکی کرتے ہیں ان کے لیے بھلائی ہے اور اللہ کی زمین بہت وسیع ہے، یقیناً بے شمار ثواب تو صرف صبر کرنے والوں ہی کو ملے گا۔

تفسیر آیات

۱۔ اتَّقُوۡا رَبَّکُمۡ: اے اہل ایمان! اپنے رب کے عذاب سے اپنے آپ کو بچاؤ۔ اگلے جملے میں اس تقویٰ کے نتائج و آثار بیان فرمائے:

۲۔ لِلَّذِیۡنَ اَحۡسَنُوۡا: جو لوگ اس دنیا میں نیکی انجام دیتے ہیں ان کے لیے حسنہ یعنی نیکی کا ثواب ہے۔ چونکہ لفظ میں آخرت کا ذکر نہیں ہے لہٰذا دنیا و آخرت دونوں شامل ہیں۔ اس سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ تقویٰ کے اثرات و نتائج دنیا و آخرت دونوں کے لیے بہتر ہیں۔

۳۔ وَ اَرۡضُ اللّٰہِ وَاسِعَۃٌ: اگر تقویٰ اختیار کرنے کے لیے ہجرت کرنا، وطن چھوڑنا پڑے تو اللہ کی سرزمین وسیع ہے۔ مؤمن کو تقویٰ کے لیے ضرورت پڑنے پر ہجرت کرنی چاہیے۔

۴۔ اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوۡنَ: ترک وطن کے سلسلے میں جو مشکلات اُٹھانی پڑتی ہیں، ان پر صبر کرتا ہے۔ اللہ انہیں پورا ثواب عنایت فرمائے گا۔

---

[1] مستدرک الوسائل ۱۱: ۱۸۳ [2] الکافی ۱: ۳۴ [3] حسکانی شواھد التنزیل ذیل آیت

نہج البلاغہ میں آیا ہے:

فَاِنَّ التَّقْوی فِی الْیَوْمِ الْحِرْزُ وَ الْجُنَّۃُ وَ فِی غَدٍ الطَّرِیقُ اِلَی الْجَنَّۃِ...[1]

تقویٰ آج (دنیا میں) میں پناہ و سپر ہے اور جنت کی راہ ہے۔

اہم نکات

۱۔ تقویٰ میں خیر الدنیا و الآخرۃ ہے۔

قُلۡ اِنِّیۡۤ اُمِرۡتُ اَنۡ اَعۡبُدَ اللّٰہَ مُخۡلِصًا لَّہُ الدِّیۡنَ ﴿۱۱﴾

۱۱۔ کہدیجیے: مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں دین کو اس کے لیے خالص کر کے اللہ کی بندگی کروں۔

وَ اُمِرۡتُ لِاَنۡ اَکُوۡنَ اَوَّلَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ ﴿۱۲﴾

۱۲۔ اور مجھے یہ حکم بھی ملا ہے کہ میں سب سے پہلا مسلم بنوں۔

قُلۡ اِنِّیۡۤ اَخَافُ اِنۡ عَصَیۡتُ رَبِّیۡ عَذَابَ یَوۡمٍ عَظِیۡمٍ ﴿۱۳﴾

۱۳۔ کہدیجیے: اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔

قُلِ اللّٰہَ اَعۡبُدُ مُخۡلِصًا لَّہٗ دِیۡنِیۡ ﴿۱۴﴾

۱۴۔ کہدیجیے: میں اللہ ہی کی بندگی کرتا ہوں اپنے دین کو اس کے لیے خالص رکھتے ہوئے۔

تفسیر آیات

۱۔ قُلۡ اِنِّیۡۤ اُمِرۡتُ: لوگوں سے کہدیجیے: اللہ کی بندگی کی جو میں لوگوں کو دعوت دیتا ہوں: میرے لیے حکم ہے کہ اس پر سب سے زیادہ اخلاص کے ساتھ میں خود عمل کروں اور تسلیم و رضا کی منزل پر سب سے پہلے میں خود قدم رکھوں اور (اگرچہ معصوم ہیں، گناہ ارتکاب نہیں فرماتے تھے) بفرض محال گناہ سرزد ہوا تو عذاب عظیم سے ڈرتا ہوں۔

اپنے رسول کے لیے یہ حکم ہو رہا ہے: لوگوں میں اس بات کا اعلان کروں کہ اللہ کی بندگی کرنے میں نہ صرف یہ کہ مجھے کوئی مراعات حاصل نہیں ہیں بلکہ جو مراعات دوسرے عام لوگوں کو حاصل ہیں وہ مجھے حاصل نہیں ہیں۔

اہم نکات

۱۔ دینی قیادت کی سیرت میں رہنمائی ہے۔

[1] نہج البلاغۃ خ ۱۹۱

فَاعۡبُدُوۡا مَا شِئۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِہٖ ؕ قُلۡ اِنَّ الۡخٰسِرِیۡنَ الَّذِیۡنَ خَسِرُوۡۤا اَنۡفُسَہُمۡ وَ اَہۡلِیۡہِمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ ؕ اَلَا ذٰلِکَ ہُوَ الۡخُسۡرَانُ الۡمُبِیۡنُ ﴿۱۵﴾

۱۵۔ پس تم اللہ کے علاوہ جس جس کی بندگی کرنا چاہو کرتے رہو، کہد یجیے: گھاٹے میں تو یقیناً وہ لوگ ہیں جو قیامت کے دن خود کو اور اپنے عیال کو گھاٹے میں ڈال دیں، خبردار! یہی کھلا گھاٹا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ جب تم حقیقی معبود کی بندگی نہیں کرتے تو پھر جس کی چاہو بندگی کرو۔ جہاں خزانہ ہے وہاں تلاش و جستجو کے لیے آمادہ نہیں ہو، پھر جہاں چاہو اپنا سر مارو۔ سرمایۂ حیات کو منافع بخش تجارت میں لگانے کے لیے آمادہ نہیں ہو تو جس خسارے میں تباہ کرنا ہے کر ڈالو۔

۲۔ قُلۡ اِنَّ الۡخٰسِرِیۡنَ: جو لوگ اپنی ابدی زندگی کا خسارہ اٹھاتے اور ساتھ اپنے اہل و عیال کی زندگی کو خسارے میں ڈالتے ہیں اس سے بڑھ کر کوئی خسارہ قابل تصور نہیں ہے۔

۳۔ اَلَا ذٰلِکَ ہُوَ الۡخُسۡرَانُ الۡمُبِیۡنُ: ابدی زندگی کا گھاٹا قابل تلافی نہیں ہے۔ جب کہ دنیاوی زندگی میں اگر کوئی مالی یا جانی خسارہ ہوتا ہے تو یہ وقتی اور قابل تلافی ہے لیکن غیر اللہ کی بندگی کر کے جو لوگ ابدی زندگی کو تباہ کرتے ہیں وہ ابدی اور ناقابل تلافی خسارے میں ہیں۔

لَہُمۡ مِّنۡ فَوۡقِہِمۡ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَ مِنۡ تَحۡتِہِمۡ ظُلَلٌ ؕ ذٰلِکَ یُخَوِّفُ اللّٰہُ بِہٖ عِبَادَہٗ ؕ یٰعِبَادِ فَاتَّقُوۡنِ ﴿۱۶﴾

۱۶۔ ان کے لیے ان کے اوپر آگ کے سائبان اور ان کے نیچے بھی شعلے ہوں گے، یہ وہ بات ہے جس سے اللہ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے، پس اے میرے بندو! مجھ سے ڈرو۔

تفسیر آیات

۱۔ غیر اللہ کی بندگی کرنے والوں نے خسارہ اٹھایا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ وہ آتش جہنم میں گھرے ہوئے ہوں گے۔ اوپر آتشیں سائبان ہوں گے اور نیچے بھی آتش کا سائبان ہو گا۔ نچلے درجے کے اہل جہنم کے لیے سائبان ہو گا خود ان کے لیے آتشیں فرش ہو گا۔

۲۔ ذٰلِکَ یُخَوِّفُ اللّٰہُ بِہٖ عِبَادَہٗ: جہنم کے آتشیں سائبانوں میں گھرا ہوا ہونا وہ عذاب ہے جو غیر

اللہ کی بندگی کرنے والوں کے لیے ہے۔ اللہ قبل از وقت اپنے بندوں کو اس عذاب کا خوف دلاتا ہے تا کہ وہ اس عذاب سے اپنے آپ کو بچائیں۔

۳۔ یٰعِبَادِ فَاتَّقُوۡنِ: ایک رحمت بھرے لہجے میں ارشاد ہے: اے میرے بندو! میرے عذاب سے بچو۔ اللہ کو انہیں عذاب دینے کی کوئی ضرورت نہیں تھی اگر یہ خود اپنے آپ کو عذاب میں مبتلا نہ کرتے:

مَا یَفۡعَلُ اللّٰہُ بِعَذَابِکُمۡ اِنۡ شَکَرۡتُمۡ وَ اٰمَنۡتُمۡ ....[1]	اگر تم شکر ادا کرو اور ایمان لے آؤ تو اللہ تمہیں عذاب دے کر کیا کرے گا؟

حدیث نبوی ﷺ میں ہے:

الخاسر من غفل عن اصلاح المعاد ....[2]	خسارہ اٹھانے والا وہ ہے جو آخرت کو درست کرنے سے غافل رہتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ حقیقی معبود کو چھوڑنے کے بعد جس سے چاہو وابستہ ہو جاؤ، فرق نہیں کرتا۔

۲۔ ابدی زندگی کی خسارے سے بڑھ کر کوئی خسارہ نہیں ہے۔

۳۔ انسان خود کے ساتھ اپنے اہل و عیال کا بھی ذمہ دار ہے۔

۴۔ اللہ کی طرف سے تنبیہ، رحمت و شفقت کی بنیاد پر ہے۔

وَ الَّذِیۡنَ اجۡتَنَبُوا الطَّاغُوۡتَ اَنۡ یَّعۡبُدُوۡہَا وَ اَنَابُوۡۤا اِلَی اللّٰہِ لَہُمُ الۡبُشۡرٰی ۚ فَبَشِّرۡ عِبَادِ ﴿۱۷﴾	۱۷۔ اور جن لوگوں نے طاغوت کی بندگی سے اجتناب کیا اور اللہ کی طرف رجوع کیا ان کے لیے خوشخبری ہے، پس آپ میرے ان بندوں کو بشارت دے دیجیے،
الَّذِیۡنَ یَسۡتَمِعُوۡنَ الۡقَوۡلَ فَیَتَّبِعُوۡنَ اَحۡسَنَہٗ ؕ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ ہَدٰىہُمُ اللّٰہُ وَ اُولٰٓئِکَ ہُمۡ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ ﴿۱۸﴾	۱۸۔ جو بات کو سنا کرتے ہیں اور اس میں سے بہتر کی پیروی کرتے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے ہدایت دی ہے اور یہی صاحبان عقل ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ الَّذِیۡنَ اجۡتَنَبُوا الطَّاغُوۡتَ: غیر اللہ کی پرستش کرنے والے مشرکین کے مقابلے میں ان

---

[1] نساء: ۱۴۷ [2] مجموعۃ ورام ۲: ۱۱۸

موحدین کا ذکر ہے جو غیر اللہ کی بندگی سے اجتناب کرتے ہیں۔ طاغوت اگرچہ طغیان سے ہے اور حد سے تجاوز کرنے والے کو کہتے ہیں مگر قرآن اس لفظ کو معبود غیر اللہ کے لیے استعمال کرتا ہے۔

۲۔ وَاَنَابُوۡۤا اِلَی اللّٰہِ: غیر اللہ کی پرستش سے اجتناب کر کے اللہ کی طرف رخ کرتے ہیں۔ ایمان دوستونوں پر قائم کرتے ہیں۔ ترک شرک اور رجوع الی اللہ۔ ان دونوں ستونوں کی فراہمی پر اگلے جملے میں فرمایا:

۳۔ لَہُمُ الۡبُشۡرٰی ۚ فَبَشِّرۡ عِبَادِ ۙ الَّذِیۡنَ یَسۡتَمِعُوۡنَ الۡقَوۡلَ: میرے ان بندوں کو بشارت دو جو سنتے تو سب کی ہیں لیکن اتباع اور پیروی کی نوبت آتی ہے تو احسن الاقوال کا انتخاب کرتے ہیں۔ پھر اس کی پیروی کرتے ہیں۔

اس آیۂ مبارکہ میں حق اور حقیقت تک پہنچنے کے لیے ایک صائب طریقہ بیان فرمایا ہے۔ وہ ہے حق کی جستجو کے لیے جس جس کے پاس کوئی نظریہ ہے سب کو سن لیا جائے۔ کسی کی بات سن لینے سے پہلے اس کے موقف کے بارے میں کوئی نظریہ قائم نہیں کرنا چاہیے۔

۴۔ فَیَتَّبِعُوۡنَ اَحۡسَنَہٗ: سب کا موقف سن لینے کے بعد احسن اور بہتر کا انتخاب کرتے ہیں۔ یہ لوگ حسن اور احسن، خوب اور خوب تر میں امتیاز کر سکتے ہیں۔ ان میں اس انتخاب کی فکری اور عقلی صلاحیت موجود ہے۔ یہ صلاحیت ان میں حق کی جستجو کا عزم ہونے کی وجہ سے آ گئی ورنہ اگر وہ اپنے نظریے پر بضد رہیں اور حق کی جستجو کا عزم ہی نہ ہو، ان کے دلوں پر تالا لگ جاتا ہے۔

۵۔ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ ہَدٰىہُمُ اللّٰہُ: ان کے اس تلاش حق کے عزم کی وجہ سے اللہ انہیں راہ حق کی ہدایت عنایت فرماتا ہے۔

۶۔ وَاُولٰٓئِکَ ہُمۡ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ: یہی لوگ صاحبان عقل ہیں۔ اسی عقلی قوت کی وجہ سے وہ احسن کی تلاش میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

حضرت امام موسیٰ بن جعفر علیہما السلام سے روایت ہے:

اِنَّ اللّٰہَ تبارَكَ وَ تَعالٰی بَشَّرَ اَھْلَ الْعَقْلِ وَالْفَھْمِ فِی كِتَابِہِ۔۔۔[1]	اپنی کتاب (قرآن) میں اللہ نے عقل و فہم والوں کو بشارت دی ہے۔ (پھر اس آیت کی تلاوت فرمائی۔)

حدیث نبوی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہے:

العلم اکثر من ان تحصی فخذوا من کل شئی احسنه.[2]	علم شمار سے زیادہ ہے لہٰذا ہر چیز میں سے خوب تر کو لے لو۔

اہم نکات

۱۔ طاغوت سے دوری کے بعد ہی توبہ اور انابت ہو سکتی ہے۔

---

[1] الکافی ۱: ۱۳ [2] مجموعة ورام ۲: ۱۵

۲۔ عقل اس قوت کا نام ہے جو احسن کے انتخاب پر قادر ہو۔
۳۔ سب کی بات سننے میں اسلام کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔

اَفَمَنۡ حَقَّ عَلَیۡہِ کَلِمَۃُ الۡعَذَابِ ؕ اَفَاَنۡتَ تُنۡقِذُ مَنۡ فِی النَّارِ ﴿۱۹﴾

۱۹۔ بھلا جس شخص پر عذاب کا فیصلہ حتمی ہو گیا ہو کیا آپ اسے بچا سکتے ہیں جو آگ میں گر چکا ہو؟

تفسیر آیات

۱۔ ایک شخص کفر و شرک پر ڈٹ جاتا ہے۔ توحید کی طرف آنے کا نہ صرف عزم نہیں رکھتا بلکہ اپنی ضد پر قائم ہے۔ ایسے شخص کے بارے میں اللہ کا فیصلہ اٹل ہو جاتا ہے۔

حَقَّ عَلَیۡہِ کَلِمَۃُ الۡعَذَابِ اور حق القول اور اس قسم کی تعبیر ہمیشہ ان فیصلوں کے بارے میں اختیار فرماتا ہے جو اٹل ناقابل تنسیخ ہوں۔

واضح رہے۔ یہاں حَقَّ عَلَیۡہِ کَلِمَۃُ الۡعَذَابِ اور اسی سورہ کی آیت ۷۱ میں حَقَّتۡ کَلِمَۃُ الۡعَذَابِ اول تو کلمہ تانیث حقیقی نہیں۔ ثانیاً فعل اور کلمۃ کے درمیان فاصلہ آنے کی صورت میں فعل کا مذکر اور مؤنث لانا دونوں درست ہیں۔

۲۔ اَفَاَنۡتَ تُنۡقِذُ مَنۡ فِی النَّارِ: رسول اللہ ﷺ کو کچھ لوگوں کے آتش میں جانے سے ان پر ترس آتا تھا۔ اس لیے فرمایا: اللہ کی طرف سے فیصلہ اٹل ہونے کے بعد کیا آپ آتش میں جانے والے کو بچا سکیں گے؟ نہیں۔ اسے اللہ کے سوا کوئی نہیں بچا سکتا تھا لیکن اللہ کا عادلانہ فیصلہ بھی ضروری تھا اس لیے فیصلہ اٹل ہو گیا۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کا فیصلہ اٹل ہونے کے بعد عفو کے سارے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔

لٰکِنِ الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا رَبَّہُمۡ لَہُمۡ غُرَفٌ مِّنۡ فَوۡقِہَا غُرَفٌ مَّبۡنِیَّۃٌ ۙ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ ۬ؕ وَعۡدَ اللّٰہِ ؕ لَا یُخۡلِفُ اللّٰہُ الۡمِیۡعَادَ ﴿۲۰﴾

۲۰۔ لیکن جو اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں ان کے لیے بالاخانے ہیں جن کے اوپر (مزید) بالاخانے بنے ہوئے ہیں جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں، یہ اللہ کا وعدہ ہے اور اللہ وعدہ خلافی نہیں کرتا۔

تشریح کلمات

غُرَفٌ: (غ ر ف) بالا خانے۔

تفسیر آیات

ا۔ لٰکِنِ الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا رَبَّہُمۡ: اہل جہنم کے مقابلے میں اہل تقویٰ کا ذکر ہے۔

۲۔ لَہُمۡ غُرَفٌ: ان کے لیے بالا خانے ہوں گے۔ ان پر مزید بالا خانے ہوں گے۔ ان بالا خانوں کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی۔ بلندی سے نہروں کا نظارہ خوشنما ہوتا ہے۔

۳۔ وَعۡدَ اللّٰہِ: یہ اللہ کا وعدہ ہے۔ اللہ وعدہ خلافی نہیں کر سکتا۔ اللہ کو ایسا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔

اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَکَہٗ یَنَابِیۡعَ فِی الۡاَرۡضِ ثُمَّ یُخۡرِجُ بِہٖ زَرۡعًا مُّخۡتَلِفًا اَلۡوَانُہٗ ثُمَّ یَہِیۡجُ فَتَرٰىہُ مُصۡفَرًّا ثُمَّ یَجۡعَلُہٗ حُطَامًا ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَذِکۡرٰی لِاُولِی الۡاَلۡبَابِ ﴿۲۱﴾

۲۱۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اللہ آسمان سے پانی نازل کرتا ہے پھر چشمے بنا کر اسے زمین میں جاری کرتا ہے پھر اس سے رنگ برنگی فصلیں اگاتا ہے، پھر وہ خشک ہو جاتی ہیں تو تم دیکھتے ہو کہ وہ زرد پڑ گئی ہیں پھر وہ اسے بھوسہ بنا دیتا ہے؟ عقل والوں کے لیے یقیناً اس میں نصیحت ہے۔

تشریح کلمات

یَنَابِیۡعَ: (ن ب ع) ینبوع اس چشمے کو کہتے ہیں جس سے پانی ابل رہا ہو۔

یَہِیۡجُ: (ھ ی ج) سبزے کا خشک ہو جانا۔

حُطَامًا: (ح ط م) حطم اصل میں کسی چیز کو توڑ کر ریزہ ریزہ کرنے کے معنوں میں ہے۔

تفسیر آیات

اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور اعادۂ حیات پر ایک دعوت فکر:

ا۔ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً: اللہ نے سمندروں کے بخار سے پانی کو اوپر اٹھایا۔ پھر خشک علاقوں میں اس پانی کو پھیلا کر نازل کیا تا کہ وسیع علاقہ سیراب ہو جائے۔

۲۔ فَسَلَکَہٗ یَنَابِیۡعَ: اس نے پانی میں روانی رکھی۔ یہ انسان، حیوانات اور نباتات کے لیے خود چل کر دور دراز علاقوں تک پہنچ جاتا ہے۔ دوسری اشیاء کی طرح اسے اٹھا کر لے جانا نہیں پڑتا۔ جہاں اٹھا کر لے جانا پڑتا ہے اس کے لیے خود قدرت نے بادلوں کو مامور کیا کہ وہ آسانی سے اٹھا کر مختلف علاقوں تک پہنچاتے ہیں۔ اس طرح پانی کی دو قسم کی روانی ہے: ایک روانی بادلوں کے ذریعے اور دوسری روانی نہروں کے ذریعے۔

۳۔ ثُمَّ یُخۡرِجُ بِہٖ زَرۡعًا: پھر اس پانی سے مختلف رنگوں کی فصلیں اُگاتا ہے۔ زرع دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے: بونے یعنی زراعت کرنے کے معنوں میں اور اُگنے اور نشوونما کے معنوں میں۔ آیت میں زرع سے مراد نشوونما ہے۔

۴۔ مُّخۡتَلِفًا اَلۡوَانُہٗ: مختلف رنگ ہیں جب کہ اس کے لیے ایک قسم کی خاک اور ایک ہی قسم کا پانی فراہم کیا گیا ہے۔ یہ خالق کی صناعیت کی اہم علامت ہے کہ مختلف عناصر کی مختلف تراکیب سے مختلف رنگ، بو اور خاصیت کی فصلیں وجود میں آتی ہیں۔

۵۔ ثُمَّ یَہِیۡجُ فَتَرٰىہُ مُصۡفَرًّا: پھر یہ سرسبز و شاداب فصل یکدم خشک ہو جاتی ہیں اور رنگ بھی زرد ہو جاتا ہے جو زوال پذیری کی علامت ہے۔

۶۔ ثُمَّ یَجۡعَلُہٗ حُطَامًا: پھر اللہ اسے بھوسہ بنا دیتا ہے۔ اس سے روح نباتی نکال دی جاتی ہے تو اس کی لاش بھوسے کی شکل میں آ جاتی ہے۔ یہ بھوسا ایک دن دل فریب رنگوں اور اپنی پوری رعنائی کے ساتھ زمین سے نکل آیا تھا آج ایک خشک خس و خاشاک ہے۔

۷۔ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَذِکۡرٰی لِاُولِی الۡاَلۡبَابِ: صاحبان عقل کے لیے فطرت اور طبیعت **(nature)** کی طرف سے یہ نصیحت بھرا منظر روز سامنے آتا ہے۔ تدبیر کائنات کے بارے میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی مدبر کائنات ہے اور ہماری تدبیر حیات و بقائے حیات صرف اور صرف اسی کے ہاتھ میں ہے۔

اہم نکات

۱۔ اس کائنات کا ہر منظر اللہ کی ربوبیت کی ایک بین دلیل ہے۔

اَفَمَنۡ شَرَحَ اللّٰہُ صَدۡرَہٗ لِلۡاِسۡلَامِ فَہُوَ عَلٰی نُوۡرٍ مِّنۡ رَّبِّہٖ ؕ فَوَیۡلٌ لِّلۡقٰسِیَۃِ قُلُوۡبُہُمۡ مِّنۡ ذِکۡرِ

۲۲۔ کیا وہ شخص جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا ہو اور جسے اپنے رب کی طرف سے روشنی ملی ہو (سخت دل والوں کی طرح ہو سکتا ہے؟)، پس تباہی ہے ان لوگوں کے لیے

اللّٰہِ ؕ اُولٰٓئِکَ فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۲۲﴾	جن کے دل ذکر خدا سے سخت ہو جاتے ہیں، یہ لوگ صریح گمراہی میں ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اَفَمَنۡ شَرَحَ اللّٰہُ صَدۡرَہٗ: شرح صدر کا مطلب یہ ہے کہ دل میں قبول حق کی گنجائش موجود ہے۔ اس کا سینہ کشادہ ہے۔ اس میں حق بات سمجھنے کی صلاحیت موجود ہے۔

سورہ انعام آیت ۱۲۵ میں شرح صدر کے مقابلے میں ضیق صدر کی تعبیر اختیار فرمائی کہ جس کے سینے میں حق کے لیے کوئی جگہ نہ ہو وہ گمراہ ہوتا ہے۔ یہاں شرح صدر کے مقابلے قساوت قلبی کا ذکر ہوا ہے۔ اس کے دل میں نور اسلام کے لیے کوئی نرم گوشہ نہیں ہے۔ بات ایک ہے۔ نرم گوشہ نہ ہونے کی وجہ سے ہو یا تنگ ہونے کی وجہ سے، تعبیر الگ ہیں مقصد ایک ہے۔

۲۔ فَہُوَ عَلٰی نُوۡرٍ مِّنۡ رَّبِّہٖ: اسلام کو اس کے سینے میں جگہ ملنے کی وجہ سے تاریکیاں چھٹنا شروع ہو جاتی ہیں اور اس نور کی وجہ سے بہت سے پردے ہٹ جاتے اور حقائق سامنے آتے ہیں۔ جس کے دل میں اللہ کی طرف سے نور آجائے، اس کے سامنے کوئی حقیقت پوشیدہ نہیں رہتی۔ اس کا دل حقائق کا ایک سمندر بن جاتا ہے۔

۳۔ فَوَیۡلٌ لِّلۡقٰسِیَۃِ قُلُوۡبُہُمۡ: تباہی ہے ان لوگوں کے لیے جن کے دلوں میں اسلامی حقائق کے لیے کوئی نرم گوشہ نہیں ہے۔ وہ لوگ یقیناً واضح گمراہی میں ہوں گے جن کے دلوں میں حق کی بات جاننے کے لیے کوئی راستہ نہ ہو۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

وَ اعْلَمُوا انَّ اللّٰهَ اِذَا اَرَادَ بِعَبْدٍ خَیْراً شَرَحَ صَدْرَهُ لِلاسْلَامِ فَاِذَا اَعْطَاهُ ذَلِكَ اَنْطَقَ لِسَانَهُ بِالْحَقِّ وَ عَقَدَ قَلْبَهُ عَلَیْهِ فَعَمِلَ بِهِ فَاِذَا جَمَعَ اللّٰهُ لَهُ ذَلِكَ تَمَّ لَهُ اِسْلَامُهُ۔۔۔[1]	جب اللہ کسی بندے کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو اسلام کے لیے اس کا سینہ کشادہ کر دیتا ہے۔ جب یہ چیز اسے مل جاتی ہے تو اس کی زبان حق کی بات کرتی ہے اور اس کا دل حق کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے۔ پھر وہ حق پر عمل کرتا ہے۔ جب یہ باتیں اس میں جمع ہو جائیں تو اس کا اسلام مکمل ہو جاتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ اسلام کے نور سے منور وہ سینہ ہے جس میں قبول حق کے لیے گنجائش موجود ہو۔

---

[1] الکافی ۸: ۱۳

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحۡسَنَ الۡحَدِيۡثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِىَ ۖ تَقۡشَعِرُّ مِنۡهُ جُلُوۡدُ الَّذِيۡنَ يَخۡشَوۡنَ رَبَّهُمۡ ۚ ثُمَّ تَلِيۡنُ جُلُوۡدُهُمۡ وَقُلُوۡبُهُمۡ اِلٰى ذِكۡرِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهۡدِىۡ بِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَمَنۡ يُّضۡلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنۡ هَادٍ ﴿۲۳﴾

۲۳۔اللہ نے ایسی کتاب کی شکل میں بہترین کلام نازل فرمایا ہے جس کی آیات باہم مشابہ اور مکرر ہیں جس سے اپنے رب سے ڈرنے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں پھر ان کی جلدیں اور دل نرم ہو کر ذکر خدا کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں، یہی اللہ کی ہدایت ہے وہ جسے چاہتا ہے اس سے ہدایت دیتا ہے اور جسے اللہ گمراہ کر دے اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں ہے۔

تشریح کلمات

تَقۡشَعِرُّ: (ق ش ع ر) رونگٹے کھڑے ہونا۔

تفسیر آیات

۱۔ اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحۡسَنَ الۡحَدِيۡثِ: متعدد آیات میں قرآن کو حدیث یعنی قول یا کلام کہا ہے:

فَبِاَيِّ حَدِيۡثٍۢ بَعۡدَهٗ يُؤۡمِنُوۡنَ ۝[1] پس اس (قرآن) کے بعد کس کلام پر ایمان لائیں گے؟

قرآن احسن الحدیث، بہترین کلام ہے۔ کلام اللہ سے بہتر کون سا کلام ہو سکتا ہے؟ چنانچہ قرآن انسان کے لیے ابدی سعادت کا پیغام لے کر آنے والا دستور حیات ہے۔

۲۔ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا: اللہ نے اس قرآن کو متشابہ بنا کر نازل فرمایا۔ یہاں متشابہ، محکم کے مقابلے میں نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اول سے آخر تک قرآن کے تمام مضامین ایک دوسرے سے مربوط، ایک دوسرے کی تفصیل و توضیح، ایک دوسرے کی تصدیق و تائید کرتے ہیں۔کوئی مضمون کسی دوسرے مضمون سے متصادم نہیں ہے بلکہ ایک دوسرے کے متشابہ ہے۔

۳۔ مَّثَانِىَ: اس کے مضامین دہرائے گئے ہیں تاکہ قرآنی مطالب ذہنوں میں راسخ ہو جائیں۔ کسی بھی مطلب کو ذہن میں راسخ کرنے کے لیے دہرانے کو جو اہمیت حاصل ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اسی لیے تعلیم و تربیت میں دہرائی کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

۴۔ تَقۡشَعِرُّ مِنۡهُ: جن کے دل خوف خدا سے معمور ہیں وہ جب قرآنی آیات سنتے ہیں تو ان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے اعضاء لرز جاتے ہیں۔

---

[1] ۷۷ مرسلات: ۵۰

۵۔ ثُمَّ تَلِیۡنُ جُلُوۡدُہُمۡ وَ قُلُوۡبُہُمۡ: پھر اس کے اثرات شعور و وجدان پر مترتب ہوتے ہیں اور دل میں سکون و آرام آتا ہے۔ یہ وہ خوف ہے جو امن و سکون دیتا ہے۔ یہ ایسا اضطراب ہے جو اطمینان فراہم کرتا ہے۔

حدیث نبوی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہے:

اذا اقشعر جلد العبد من خشية الله تحاتت عنه ذنوبه كما يتحات عن الشجرة اليابسة ورقها۔[۲]	جب مومن خوف خدا سے لرزنے لگتا ہے تو اس کے گناہ ایسے جھڑتے ہیں جیسے خشک درخت سے پتے۔

۶۔ ذٰلِکَ ہُدَی اللّٰہِ یَہۡدِیۡ بِہٖ مَنۡ یَّشَآءُ: قرآن کی آیات سن کر جن کے قلب وجدان متاثر ہوتے ہیں پھر ذکر خدا سے انہیں سکون و اطمینان ملتا ہے۔ یہی وہ ہدایت ہے جسے اللہ ایسے شخص کو عنایت فرماتا ہے جو اس کی مشیت کے معیار پر پورا اترتا ہے۔

۷۔ وَ مَنۡ یُّضۡلِلِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ مِنۡ ہَادٍ: جس سے مصدر ہدایت ہاتھ اٹھا لے اسے کسی اور جگہ سے ہدایت مل نہیں سکتی۔

اہم نکات

۱۔ قرآن کے تمام مضامین ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں۔

۲۔ ہدایت یہ ہے کہ آیات قرآنی سے لرزہ براندام ہو جائے۔

۳۔ اللہ کی ہدایت، اس کی اہلیت رکھنے والوں کو ملتی ہے۔

اَفَمَنۡ یَّتَّقِیۡ بِوَجۡہِہٖ سُوۡٓءَ الۡعَذَابِ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ ؕ وَ قِیۡلَ لِلظّٰلِمِیۡنَ ذُوۡقُوۡا مَا کُنۡتُمۡ تَکۡسِبُوۡنَ ﴿۲۴﴾

۲۴۔ کیا وہ شخص جو قیامت کے دن برے عذاب سے بچنے کے لیے اپنے منہ کو سپر بناتا ہے (وہ امن پانے والوں کی طرح ہو سکتا ہے؟) اور ظالموں سے کہا جائے گا: چکھو اس کا ذائقہ جو تم کماتے تھے۔

تفسیر آیات

۱۔ اَفَمَنۡ یَّتَّقِیۡ بِوَجۡہِہٖ: کیا وہ لوگ جو قیامت کے دن عذاب سے بچنے کے لیے اپنے چہرے کو سپر بناتے ہیں۔ چونکہ ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اس لیے اپنے جسم کے اہم ترین عضو چہرے کو آگے کرنا پڑتا

۲۔ مجمع البیان

ہے۔ جیسا کہ سورہ نمل آیت ۹۰ میں فرمایا:

وَمَنۡ جَآءَ بِالسَّیِّئَۃِ فَکُبَّتۡ وُجُوۡہُہُمۡ فِی النَّارِ ... اور جو شخص برائی لے کر آئے گا پس انہیں اوندھے منہ آگ میں پھینک دیا جائے گا۔

کیا یہ شخص، جس کا یہ حال ہو، اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو عذاب الٰہی سے امن و سکون میں ہے۔

۲۔ وَ قِیۡلَ لِلظّٰلِمِیۡنَ: ظالموں سے کہا جائے گا: دنیا میں جن جرائم کا ارتکاب کرتے رہے ہو ان مظالم و جرائم کا آج سامنا کرو۔

کَذَّبَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ فَاَتٰىہُمُ الۡعَذَابُ مِنۡ حَیۡثُ لَا یَشۡعُرُوۡنَ ﴿۲۵﴾

فَاَذَاقَہُمُ اللّٰہُ الۡخِزۡیَ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ۚ وَ لَعَذَابُ الۡاٰخِرَۃِ اَکۡبَرُ ۘ لَوۡ کَانُوۡا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۶﴾

۲۵۔ ان سے پہلوں نے تکذیب کی تو ان پر ایسی جگہ سے عذاب آیا جہاں سے وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

۲۶۔ پھر اللہ نے انہیں دنیاوی زندگی میں رسوائی کا ذائقہ چکھا دیا اور آخرت کا عذاب تو بہت بڑا ہے، اے کاش! وہ جان لیتے۔

تفسیر آیات

۱۔ کَذَّبَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ: قرآن کی معاصر قوم، پہلی قوم نہیں ہے جس نے وحی و قیامت اور نبوت کی تکذیب کی ہے۔

۲۔ فَاَتٰىہُمُ الۡعَذَابُ: ان تکذیبی قوموں پر عذاب آیا ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ قرآن کی معاصر قوم پر بھی عذاب آنے والا ہے۔ اس خبر سے اس وقت کے تکذیبی لوگوں کے ذہن میں ایک سوال یہ آ رہا تھا کہ عبد اللہ کا یتیم، ہر چیز سے محروم مٹھی بھر لوگوں کے ساتھ ہم پر عذاب لائے گا۔ اس کا جواب دیا گیا:

۳۔ مِنۡ حَیۡثُ لَا یَشۡعُرُوۡنَ: وہ عذاب ایسی جگہ سے آئے گا جہاں سے سوچ بھی نہیں سکتے۔

۴۔ فَاَذَاقَہُمُ اللّٰہُ: چنانچہ ہوا بھی ایسا۔ ان قوموں پر دنیا ہی میں رسوائی کا عذاب آیا اور یہ قومیں آنے والی نسلوں کے لیے عبرت بن گئیں اور آخرت کا عذاب تو ناقابل وصف و بیان ہے۔

وَ لَقَدۡ ضَرَبۡنَا لِلنَّاسِ فِیۡ ہٰذَا الۡقُرۡاٰنِ مِنۡ کُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّہُمۡ یَتَذَکَّرُوۡنَ ﴿ۚ۲۷﴾

۲۷۔ اور ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لیے ہر طرح کی مثالیں دی ہیں شاید وہ نصیحت حاصل کریں۔

قُرۡاٰنًا عَرَبِیًّا غَیۡرَ ذِیۡ عِوَجٍ لَّعَلَّہُمۡ یَتَّقُوۡنَ ﴿۲۸﴾

۲۸۔ ایسا قرآن جو عربی ہے، جس میں کوئی عیب نہیں ہے تاکہ یہ تقویٰ اختیار کریں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ لَقَدۡ ضَرَبۡنَا لِلنَّاسِ: اس آیت کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورہ روم آیت ۵۸۔

۲۔ قُرۡاٰنًا عَرَبِیًّا: یہ مثالیں اس قرآن میں بیان کی ہیں جو عربی یا فصیح زبان میں ہے تاکہ مخاطبین اول کے لیے اس دستور حیات کا سمجھنا آسان ہو جائے چونکہ قرآنی تعلیمات کو دیگر اقوام اور آنے والی نسلوں تک پہنچانا ان مخاطبین اول کی ذمہ داری ہے۔

۳۔ غَیۡرَ ذِیۡ عِوَجٍ: اس کے بیان میں کوئی عیب نہیں ہے، نہ کوئی پیچیدگی نہ تضاد بیانی:

وَ لَقَدۡ یَسَّرۡنَا الۡقُرۡاٰنَ لِلذِّکۡرِ فَہَلۡ مِنۡ مُّدَّکِرٍ ۔[1]

اور بتحقیق ہم نے اس قرآن کو نصیحت کے لیے آسان بنا دیا ہے تو کیا ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا؟

اہم نکات

۱۔ بیان احکام کے بارے میں قرآن میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے۔

ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا رَّجُلًا فِیۡہِ شُرَکَآءُ مُتَشٰکِسُوۡنَ وَ رَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ ؕ ہَلۡ یَسۡتَوِیٰنِ مَثَلًا ؕ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ ۚ بَلۡ اَکۡثَرُہُمۡ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۹﴾

۲۹۔ اللہ ایک شخص (غلام) کی مثال بیان فرماتا ہے جس (کی ملکیت) میں کئی بدخو (مالکان) شریک ہیں اور ایک (دوسرا) مرد (غلام) ہے جس کا صرف ایک ہی آقا ہے، کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ الحمدللہ، بلکہ ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔

تشریح کلمات

مُتَشٰکِسُوۡنَ: (ش ك س) بدمزاج کو الشکس کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ مثال یہ ہے کہ ایک غلام ہے اس کے دو بدخصلت مالک ہیں۔ چونکہ دونوں بدخو اور بدخصلت ہیں اس لیے اس غلام سے کام لینے میں ایک مالک، دوسرے مالک کی خواہشات اور احکام کا خیال نہیں رکھتا۔

---

[1] ۵۴ قمر: ۱۷

اسی طرح دوسرا بدخصلت مالک بھی صرف اپنی سوچتا ہے دوسرے کا خیال نہیں رکھتا۔ ان دو بدخصلت مالکوں کے درمیان غلام کو جو پریشانی اور پیچیدگی پیش آئے گی وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ وہ کس مالک کو راضی کرے۔ دو متضاد رضایتوں کا حاصل کرنا اس بے چارے غلام کے لیے ممکن نہیں ہے۔

۲۔ وَرَجُلًا سَلَمًا: ایک غلام ہے۔ اس کا ایک ہی آقا ہے۔ اس کے لیے اپنے ایک آقا کے حکم کی تعمیل کرنا اور آقا کو راضی رکھنا ممکن اور آسان ہے۔

۳۔ هَلۡ یَسۡتَوِیٰنِ: کیا دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ یقیناً یہ دونوں برابر نہیں ہیں۔ بالکل اسی طرح مشرک اور مومن کا حال ہے۔ مشرکین متعدد مالکوں کو مانتے ہیں جب کہ موحد صرف ایک آقا کے حکم کی تعمیل کرتا ہے۔

۴۔ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ: موحدین کے لیے ایک معقول، قابل عمل اور صائب راستہ موجود ہے جو ایک نعمت ہے جس پر ہمیشہ حمد و ستائش بجا لانی چاہیے۔

۵۔ بَلۡ اَکۡثَرُهُمۡ لَا یَعۡلَمُوۡنَ: اکثر لوگ اہل توحید کی اس عظیم نعمت سے واقف نہیں ہیں لیکن جو لوگ اس نعمت سے آگاہ ہیں انہیں حمد و ثنا بجا لانی چاہیے۔

ءَاَرۡبَابٌ مُّتَفَرِّقُوۡنَ خَیۡرٌ اَمِ اللّٰهُ الۡوَاحِدُ الۡقَهَّارُ ۝[1]

کیا متفرق ارباب بہتر ہیں یا وہ اللہ جو یکتا ہے جو سب پر غالب ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ تک پہنچنا آسان ہے۔

۲۔ موحد مقام شکر میں ہے۔

اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّ اِنَّهُمۡ مَّیِّتُوۡنَ ۝۳۰

۳۰۔ (اے رسول) یقیناً آپ کو بھی انتقال کرنا ہے اور انہیں بھی یقیناً مرنا ہے۔

تفسیر آیات

اس دنیا میں ہمیشہ رہنے کے لیے کوئی نہیں آیا۔ رسول کریم ﷺ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے اس دنیا سے چلے جانے پر یہ مشن ختم نہ ہو گا جیسا کہ مشرکین اس انتظار میں ہیں۔

ثُمَّ اِنَّکُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ عِنۡدَ رَبِّکُمۡ

۳۱۔ پھر قیامت کے دن تم سب اپنے رب کے

---

[1] ۱۲ یوسف: ۳۹

تَخۡتَصِمُوۡنَ ﴿۳۱﴾	سامنے مقدمہ پیش کرو گے۔

تفسیر آیات

قیامت کے دن اللہ کے سامنے ہر مظلوم اپنا مقدمہ پیش کرے گا۔ اس جگہ نہایت قابل توجہ ہے کہ اس روایت میں جو صحیح بخاری اور دیگر کتب احادیث میں آئی ہے حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

انا اول من یجثو بین یدی الرحمن للخصومۃ یوم القیامۃ۔[1]	روز قیامت سب سے پہلے میں اللہ کے سامنے اپنا مقدمہ پیش کروں گا۔

چنانچہ آپ علیہ السلام کی قبر مبارک کی زیارت اور امام صادق علیہ السلام سے مروی روایت میں یہ جملہ موجود ہے:

اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا وَلِيَّ اللّٰهِ اَنْتَ اَوَّلُ مَظْلُومٍ وَ اَوَّلُ مَنْ غُصِبَ حَقُّهُ صَبَرْتَ...۔[2]	سلام تجھ پر اے ولی خدا! آپ پہلے وہ مظلوم ہیں اور پہلی ہستی ہیں جس کا حق غصب کیا گیا پھر آپ نے صبر کیا۔

اہم نکات

۱۔ قیامت کے دن دنیا میں سب سے پہلا مظلوم، اپنا مقدمہ سب سے پہلے پیش کرے گا۔

فَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنۡ کَذَبَ عَلَی اللّٰہِ وَ کَذَّبَ بِالصِّدۡقِ اِذۡ جَآءَہٗ ؕ اَلَیۡسَ فِیۡ جَہَنَّمَ مَثۡوًی لِّلۡکٰفِرِیۡنَ ﴿۳۲﴾	۳۲۔ پس اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہو گا جس نے اللہ پر جھوٹ باندھا اور جب سچائی اس کے پاس آئی تو اسے جھٹلا دیا؟ کیا کفار کے لیے جہنم میں ٹھکانا نہیں ہے؟

تفسیر آیات

۱۔ کَذَبَ عَلَی اللّٰہِ: وہ اس کائنات میں سب سے بڑا ظالم ہو گا جو خالق کائنات پر جھوٹ باندھے۔ یعنی اللہ کے لیے شریک ٹھہرائے اور اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ میں کسی کو مداخلت کا حق دے۔

۲۔ وَ کَذَّبَ بِالصِّدۡقِ: اور اس سچائی کی بھی تکذیب کرے جو اس کے پاس ایک ابدی سعادت لے کر آئی ہے۔ یعنی دین اسلام جسے رسول صادق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پیش کیا ہے۔

---

[1] صحیح البخاری ۴: ۱۴۵۸، کتاب المغازی، باب ۷ ح ۳۷۴۷۔ عمدۃ عیون صحاح الأخبار في مناقب إمام الأبرار، ص ۳۱۱ فصل ۳۶۔
[2] الکافی ۴: ۵۶۹

وَالَّذِیۡ جَآءَ بِالصِّدۡقِ وَصَدَّقَ بِہٖۤ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُتَّقُوۡنَ﴿۳۳﴾	۳۳۔ اور جو شخص سچائی لے کر آیا اور جس نے اس کی تصدیق کی وہی لوگ اہل تقویٰ ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَالَّذِیۡ جَآءَ بِالصِّدۡقِ: سچائی لے کر آنے والی ہستی حضرت خاتم الانبیاء ﷺ کی ذات ہے۔ جو ایک سچی کتاب، سچا دین، ایک سچا اور جامع نظام حیات لے کر آئے ہیں جس نے انسان کو اپنی شناخت دی۔ تہذیب و تمدن سکھایا۔

۲۔ وَصَدَّقَ بِہٖۤ: جس نے اس سچائی کی سب سے پہلے اور سب سے زیادہ تصدیق کی وہ مولائے متقیان حضرت علی علیہ السلام کی ذات والا صفات ہے۔

فضیلت: درج ذیل مصادر میں ہے:

وَالَّذِیۡ جَآءَ بِالصِّدۡقِ سے مراد رسول اللہ ﷺ اور وَصَدَّقَ بِہٖۤ سے مراد علی علیہ السلام ہیں۔

اس روایت کو قرطبی نے اپنی تفسیر ۱۶: ۲۵۷ میں، ابو حیان نے البحر المحیط ۹: ۲۰۳ میں، شوکانی نے فتح القدیر میں، ابن عساکر نے اپنی تاریخ ۲: ۱۹ میں، ابن بطریق نے العمدۃ صفحہ ۱۸۴ میں، حافظ ابو نعیم نے ما نزل من القرآن فی علی میں۔ مغازلی نے المناقب میں، سیوطی نے الدر المنثور میں، حسکانی نے شواھد التنزیل ۲: ۱۸۱ میں حضرت ابن عباس، ابوھریرہ، ابوالاسود، مجاھد، لیث سے روایت کیا ہے۔

اہم نکات

۱۔ اس حدیث کی روشنی میں حضرت علی علیہ السلام صدیق اکبر ہیں۔

لَہُمۡ مَّا یَشَآءُوۡنَ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ ؕ ذٰلِکَ جَزٰٓؤُا الۡمُحۡسِنِیۡنَ﴿ۚ۳۴﴾	۳۴۔ ان کے لیے جو کچھ وہ چاہیں ان کے پروردگار کے پاس ہے نیکی کرنے والوں کی یہی جزا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ ان کے لیے جنت میں اللہ کے پاس وہ سب کچھ ہے جو وہ چاہتے ہوں گے۔ واضح رہے جس طرح کائنات میں اللہ کا ارادۂ تکوینی نافذ ہے: یَفۡعَلُ مَا یَشَآءُ ...[1] جو کچھ اللہ تعالیٰ چاہے کر لیتا ہے۔ صرف ارادہ کرنے کی دیر ہوتی ہے:

---

[1] ۳ آل عمران: ۴۰

اِنَّمَاۤ اَمۡرُہٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَیۡـًٔا اَنۡ یَّقُوۡلَ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ ۝ۙ[1] جب وہ کسی چیز کا ارادہ کر لیتا ہے تو بس اس کا امر یہ ہوتا ہے: ہو جا پس وہ ہو جاتی ہے۔

اسی طرح کل جنت میں اہل جنت کا ارادہ نافذ العمل ہوگا۔ صرف چاہنے کی دیر ہوگی وہ چیز سامنے ہوگی۔

۲۔ ذٰلِکَ جَزٰٓؤُا الۡمُحۡسِنِیۡنَ: اس ارادے کا نفاذ وہ جزا اور ثواب ہے جو نیکی کرنے والوں کو ملے گا۔

اہم نکات

۱۔ اہل جنت کا ارادہ نافذ ہو گا۔

لِیُکَفِّرَ اللّٰہُ عَنۡہُمۡ اَسۡوَاَ الَّذِیۡ عَمِلُوۡا وَ یَجۡزِیَہُمۡ اَجۡرَہُمۡ بِاَحۡسَنِ الَّذِیۡ کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۳۵﴾

۳۵۔ تاکہ اللہ ان کے بدترین اعمال کو مٹا دے اور جو بہترین اعمال انہوں نے انجام دیے ہیں انہیں ان کا اجر عطا کرے۔

تفسیر آیات

۱۔ اس آیت کا تعلق ممکن ہے عام محسنین سے ہو جن کا ذکر ذٰلِکَ جَزٰٓؤُا الۡمُحۡسِنِیۡنَ میں ہے۔ یعنی جنت میں نیکی کرنے والوں کی خواہش نافذ ہوگی۔ اس سے ان سے سرزد شدہ بدتر گناہوں کا کفارہ یعنی تلافی ہو جائے گی۔ چنانچہ صاحب تفسیر مجمع البیان لِیُکَفِّرَ کے معنی اسقط اللّٰہ عنھم سے کیا ہے۔ چونکہ ایمان گزشتہ تمام گناہوں کا کفارہ ہوتا ہے۔

۲۔ وَ یَجۡزِیَہُمۡ اَجۡرَہُمۡ: ان کے بہتر اعمال کا ثواب بھی اسی میں یعنی ان کے ارادوں کے نفاذ میں ہے۔ اس آیت میں دو لفظ اَسۡوَاَ (بدتر) اور احسن (بہتر) کی تعبیر کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بعض فرائض و مستحبات حسن ہیں اور بعض احسن اور بعض گناہ سئی (بد) ہیں اور بعض اَسۡوَاَ (بدتر) ہیں بلکہ فرائض پر عمل کرنا سب احسن ہے اور گناہ سب کے سب اَسوأ (بدتر) ہیں۔

اہم نکات

۱۔ ایمان و تصدیق تمام گناہوں کا کفارہ ہے اور استحقاق ثواب کا ذریعہ۔

اَلَیۡسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبۡدَہٗ ؕ وَ یُخَوِّفُوۡنَکَ بِالَّذِیۡنَ مِنۡ دُوۡنِہٖ ؕ وَ

۳۶۔ کیا اللہ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں ہے؟ اور یہ لوگ آپ کو اس (اللہ) کے علاوہ دوسروں سے

---

[1] ۳۶ یس: ۸۲

مَنۡ یُّضۡلِلِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ مِنۡ ہَادٍ ﴿۳۶﴾ ڈراتے ہیں جب کہ اللہ جسے گمراہ کر دے اسے راہ دکھانے والا کوئی نہیں ہے۔

وَ مَنۡ یَّہۡدِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ مِنۡ مُّضِلٍّ ؕ اَلَیۡسَ اللّٰہُ بِعَزِیۡزٍ ذِی انۡتِقَامٍ ﴿۳۷﴾ ۳۷۔اور جس کی اللہ رہنمائی کرے اسے کوئی گمراہ نہیں کرسکتا، کیا اللہ بڑا غالب آنے والا ، انتقام لینے والا نہیں ہے؟

تفسیر آیات

۱۔ اَلَیۡسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبۡدَہٗ: اللہ جس کے ساتھ ہو، اس کے لیے کسی اور کی نہ کمک کی ضرورت ہے، نہ اس سے ضرر کا خوف ہے۔ جس کے ساتھ کل کائنات کا مالک ہو، اسے کسی اور کی کیا ضرورت ہے۔

۲۔ یُخَوِّفُوۡنَکَ بِالَّذِیۡنَ مِنۡ دُوۡنِہٖ: یہ مشرکین آپ کو غیر اللہ سے خوف دلاتے ہیں کہ آپ ان کے معبودوں کی اہانت کرتے ہیں لہٰذا آپ ان کے غضب سے نہیں بچ سکیں گے جب کہ ان کے معبود کسی کو نفع اور نقصان پہنچانے کے اہل ہی نہیں ہیں۔ وہ تو خود اپنے آپ کو تحفظ نہیں دے سکتے۔ وہ خود اپنے تحفظ کے لیے اپنے پجاری کے محتاج ہیں۔ مشرکین اس عقیدے کی وجہ سے ضلالت میں ہیں۔ جسے اللہ گمراہ کر دے اسے ہدایت دینے والا کوئی نہ ہو گا۔

۳۔ وَ مَنۡ یُّضۡلِلِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ مِنۡ ہَادٍ: پہلے بھی کئی بار ذکر ہو چکا ہے کہ ”اللہ کسی کو گمراہ کرتا ہے“ کا مطلب یہ نہیں کہ ابتداءً اللہ ایسا کرتا ہے بلکہ وہ لوگ کفر پر ڈٹ جاتے ہیں اور ہدایت کے اہل نہیں ہوتے، اللہ انہیں اپنے حال پر چھوڑ دیتا اور ان سے ہاتھ اٹھا لیتا ہے۔ جب اللہ نے ان سے ہاتھ اٹھا لیا تو پھر ان کے لیے ہدایت و نجات کا کوئی راستہ نہیں ہے، نتیجتاً یہ گمراہ ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا اللہ کی طرف سے ہدایت یافتہ نہ ہونے کا نتیجہ گمراہی ہے۔

۴۔ وَ مَنۡ یَّہۡدِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ مِنۡ مُّضِلٍّ: اصل سرچشمہ ہدایت اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اس کی طرف سے ملنے والی ہدایت اندھی بانٹ نہیں ہے بلکہ اہل اور سزاوار ہونے کی بنیاد پر ملتی ہے۔ لہٰذا جسے اللہ ہدایت عنایت فرمائے، اس سے اس ہدایت کو کوئی چھین نہیں سکتا۔

۵۔ اَلَیۡسَ اللّٰہُ بِعَزِیۡزٍ ذِی انۡتِقَامٍ: مشرکین اپنے بے شعور معبودوں سے ڈراتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی غالب آنے والا بالادست اور ان مجرموں سے انتقام لینے والا ہے تو خوف انہیں اللہ سے ہونا چاہیے۔

اہم نکات

۱۔ جو خدا کی پناہ میں جاتا ہے اس کے لیے وہی کافی ہے: اَلَیۡسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبۡدَہٗ....

۲۔ دشمنوں کی دھمکیوں کا حال بتوں کی طرح بے جان ہے۔

وَلَئِنۡ سَاَلۡتَہُمۡ مَّنۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ لَیَقُوۡلُنَّ اللّٰہُ ؕ قُلۡ اَفَرَءَیۡتُمۡ مَّا تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ اِنۡ اَرَادَنِیَ اللّٰہُ بِضُرٍّ ہَلۡ ہُنَّ کٰشِفٰتُ ضُرِّہٖۤ اَوۡ اَرَادَنِیۡ بِرَحۡمَۃٍ ہَلۡ ہُنَّ مُمۡسِکٰتُ رَحۡمَتِہٖ ؕ قُلۡ حَسۡبِیَ اللّٰہُ ؕ عَلَیۡہِ یَتَوَکَّلُ الۡمُتَوَکِّلُوۡنَ ﴿۳۸﴾

۳۸۔اور اگر آپ ان سے پوچھیں: آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا؟ تو وہ ضرور کہیں گے: اللہ نے، کہد یجیے: اللہ کے سوا جنہیں تم پکارتے ہو ان کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ اگر اللہ مجھے کوئی تکلیف پہنچانا چاہے تو کیا یہ معبود اس کی اس تکلیف کو دور کر سکتے ہیں؟ یا (اگر) اللہ مجھ پر مہربانی کرنا چاہے تو کیا یہ اس کی مہربانی کو روک سکتے ہیں؟ کہد یجیے: میرے لیے اللہ ہی کافی ہے، بھروسا رکھنے والے اسی پر بھروسا رکھتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔وَلَئِنۡ سَاَلۡتَہُمۡ مَّنۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ: آیت کے اس جملے کی تشریح سورۂ عنکبوت ۶۱۔۶۳ میں گزر چکی ہے۔

۲۔قُلۡ اَفَرَءَیۡتُمۡ مَّا تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ: تم اپنے غیر اللہ معبودوں کے بارے میں بتاؤ کہ وہ انسان کی زندگی کے کن امور میں کوئی کردار ادا کر سکتے ہیں کیونکہ اگر تم مشرکین اللہ ہی کو خالق تسلیم کرتے ہو تو تمہاری ان دیویوں کا کیا کام رہ جاتا ہے کیونکہ اس کائنات میں جو کچھ ہے وہ اللہ ہی کا پیدا کردہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہاری یہ دیویاں اس کائنات کی موجودات میں سے نہ کسی کی تکلیف کو دور کر سکتی ہیں، نہ کسی چیز کو روک سکتی ہیں۔

۳۔ہَلۡ ہُنَّ: اشارہ بتوں کی طرف ہے۔ مشرکین میں سے عوام کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ بت سب کچھ کر سکتے ہیں۔ واضح رہے مشرکین میں سے خواص کا عقیدہ یہ تھا کہ یہ بت، ان اصل معبودوں کی شبیہ ہیں اور ان بتوں کو صرف قبلہ کی حیثیت حاصل ہے مگر عوام رفتہ رفتہ خود ان بتوں کو ہی معبود سمجھنے لگے۔

اہم نکات

۱۔ اس کائنات کا خالق ہی اس کائنات کا مدبر ہے۔

قُلۡ یٰقَوۡمِ اعۡمَلُوۡا عَلٰی مَکَانَتِکُمۡ اِنِّیۡ عَامِلٌ ۚ فَسَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۳۹﴾

۳۹۔کہد یجیے: اے میری قوم! تم اپنی جگہ عمل کیے جاؤ، میں بھی عمل کر رہا ہوں، پس عنقریب

مَنۡ یَّاۡتِیۡهِ عَذَابٌ یُّخۡزِیۡهِ وَ یَحِلُّ عَلَیۡهِ عَذَابٌ مُّقِیۡمٌ ﴿۴۰﴾

تمہیں معلوم ہو جائے گا،
۴۰۔ کہ کس پر وہ عذاب آئے گا جو اسے رسوا کرے گا اور کس پر دائمی عذاب نازل ہونے والا ہے۔

تفسیر آیات

ان دو آیتوں کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورہ ھود آیت ۹۳، سورہ انعام آیت ۱۳۵

۱۔ عَلٰی مَکَانَتِکُمۡ: مکانۃ فکری و نظریاتی مقام کو کہتے ہیں جب کہ مکان، مادی اور محسوس مقام کو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو اپنے ایمان اور یقین پر قائم رہتے ہوئے اس چیلنج کا حکم ہے کہ آپ اس قوم سے کہہ دیجیے: تم اپنے نظریات پر قائم رہ کر جو کچھ کر سکتے ہو کر گزرو۔ اپنی پوری طاقت صرف کرو۔

۲۔ اِنِّیۡ عَامِلٌ: میں بھی اپنی جگہ اپنا کام جاری رکھتا ہوں۔ اپنے نظریے پر قائم رہتا ہوں۔

۳۔ فَسَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ: آنے والا وقت تمہیں بتائے گا رسوائی کس کی قسمت میں ہے اور نہ ختم ہونے والے عذاب سے کون دوچار ہونے والے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ اپنے موقف پر یقین سب سے طاقتور سہارا ہے۔

اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالۡحَقِّ ۚ فَمَنِ اہۡتَدٰی فَلِنَفۡسِہٖ ۚ وَ مَنۡ ضَلَّ فَاِنَّمَا یَضِلُّ عَلَیۡہَا ۚ وَ مَاۤ اَنۡتَ عَلَیۡہِمۡ بِوَکِیۡلٍ ﴿۴۱﴾

۴۱۔ ہم نے آپ پر یہ کتاب انسانوں کے لیے برحق نازل کی ہے لہٰذا جو ہدایت حاصل کرتا ہے وہ اپنے لیے حاصل کرتا ہے اور جو گمراہ ہوتا ہے وہ اپنا ہی نقصان کرتا ہے اور آپ ان کے ذمہ دار نہیں ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالۡحَقِّ: ہم نے لوگوں کی ہدایت اور سعادت کے لیے ایک دستور حیات اور وسیلۂ نجات نازل کیا ہے۔

۲۔ فَمَنِ اہۡتَدٰی فَلِنَفۡسِہٖ: اگر کوئی شخص اس کتاب سے ہدایت حاصل کرتا ہے تو اس نے اپنے آپ کو ابدی ہلاکت سے بچایا کسی اور پر احسان نہیں کیا۔ نہ کتاب نازل کرنے والے اللہ پر، نہ اس کتاب کو پہنچانے والے رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر۔

۳۔ وَ مَنۡ ضَلَّ فَاِنَّمَا یَضِلُّ عَلَیۡہَا: اگر وہ اس کتاب کی ہدایت کو مسترد کر دیتا ہے اور گمراہ ہو جاتا ہے تو اس نے خود اپنے آپ کو ابدی ہلاکت میں ڈال دیا۔ اس سے کسی اور کا کوئی نقصان نہیں ہوا۔

۴۔ وَمَاۤ اَنۡتَ عَلَیۡہِمۡ بِوَکِیۡلٍ: اے رسول! آپ کے ذمے پیغام حق ان لوگوں تک پہنچانا ہے۔ انہیں ایمان تک پہنچانا آپ کی ذمے داری نہیں ہے۔ پیغام حق ملنے کے بعد ایمان تک پہنچنا خود لوگوں کی ذمے داری ہے۔

اہم نکات

۱۔ انسان ہدایت و ضلالت میں سے ایک کا انتخاب کرنے میں خود مختار ہے۔

اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الۡاَنۡفُسَ حِیۡنَ مَوۡتِہَا وَ الَّتِیۡ لَمۡ تَمُتۡ فِیۡ مَنَامِہَا ۚ فَیُمۡسِکُ الَّتِیۡ قَضٰی عَلَیۡہَا الۡمَوۡتَ وَ یُرۡسِلُ الۡاُخۡرٰۤی اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ ﴿۴۲﴾

۴۲۔ موت کے وقت اللہ روحوں کو قبض کرتا ہے اور جو ابھی نہیں مرا اس کی (روح) نیند میں (قبض کر لیتا ہے) پھر وہ جس کی موت کا فیصلہ کر چکا ہوتا ہے اسے روک رکھتا ہے اور دوسری کو ایک وقت تک کے لیے چھوڑ دیتا ہے، فکر کرنے والوں کے لیے یقیناً اس میں نشانیاں ہیں۔

تشریح کلمات

یَتَوَفّٰی: (و ف ی) وفاء مکمل اور پورا کرنے کے معنوں میں ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الۡاَنۡفُسَ: یہاں الۡاَنۡفُسَ سے مراد ارواح ہیں۔ اللہ ارواح کو پورا قبض (وصول) کرتا ہے، روح کو جسم سے نکال کر الگ اور لاتعلق کر دیتا ہے۔ قبض روح کے بارے میں تین قسم کی تعبیرات پائی جاتی ہیں:

الف: اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الۡاَنۡفُسَ خود اللہ روحوں کو قبض کرتا ہے۔

ب: قُلۡ یَتَوَفّٰىکُمۡ مَّلَکُ الۡمَوۡتِ ....[۱]: ملک الموت قبض روح کرتا ہے۔

ج: اِذَا جَآءَ اَحَدَکُمُ الۡمَوۡتُ تَوَفَّتۡہُ رُسُلُنَا ....[۲]: اللہ کے فرشتے روح قبض کرتے ہیں۔

---

[۱] ۳۲ سجدہ: ۱۱　[۲] ۶ انعام: ۶۱

ان تعبیروں میں کوئی تضاد نہیں ہے چونکہ روح قبض کرنے کا حکم اللہ صادر فرماتا ہے۔ اللہ کے اس حکم کو ملک الموت وصول کرتا ہے۔ آگے ملک الموت اپنے کارندوں کے ذریعے روحیں قبض کرتا ہے۔ مثلاً ایک سڑک تعمیر ہوتی ہے۔ کہتے ہیں حکومت نے بنائی ہے۔ ٹھیکیدار نے بنائی، انجینئر نے بنائی، ان میں تضاد نہیں ہے۔ حکومت نے حکم صادر کیا، ٹھیکیدار نے اس حکم کو وصول کیا، آگے کارندوں کے ذریعے کام انجام دیا۔

۲۔ حِیۡنَ مَوۡتِہَا: مجمع البیان اور المیزان کے نزدیک مَوۡتِہَا کی ضمیر ابدان کی طرف ہے۔ واقع میں عبارت اس طرح ہے: حین موت ابدانھا۔ چونکہ روح کے لیے موت نہیں ہے اور اگر نفس کو ذات کے معنوں میں لیا جائے، جیسے وَ فِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ ؕ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ۔[1] میں ہے تو بدن اور روح کے مجموع کا نام ہو گا۔ اس صورت میں موت ذات کو لاحق ہو گی جو ایک دوسرے سے جدا ہونے سے عبارت ہو گی لیکن یمسك اور یرسل قرینہ بن سکتا ہے کہ نفس سے مراد روح ہے چونکہ امساك و ارسال روح کے بارے میں ہے، بدن اس میں شامل نہیں ہے۔

۳۔ وَ الَّتِیۡ لَمۡ تَمُتۡ فِیۡ مَنَامِہَا: یتوفی الانفس و التی لم تمت فی منامھا۔ اللہ ان کی ارواح کو قبض کر لیتا ہے جو اپنی نیند میں نہیں مرے۔ یہاں سے وفات اور موت میں فرق بھی سامنے آیا کہ نیند میں وفات ہے، موت نہیں ہے چونکہ توفی پورا وصول کرنے کو کہتے ہیں۔ وصولی کے بعد اگر واپس ہو گئیں تو یہ نیند ہے، واپس نہ ہوئیں تو یہ موت ہے۔ اس طرح نیند کے مقابلے میں بیداری ہوتی ہے اور موت کے مقابلے میں حیات ہوتی ہے۔

۴۔ فَیُمۡسِکُ الَّتِیۡ قَضٰی عَلَیۡہَا الۡمَوۡتَ: یہاں بھی حذف مضاف فرض کرنا پڑے گا۔ یعنی قضی علی ابدانھا الموت۔ جس بدن کے لیے موت کا فیصلہ ہو گیا ہے اسے روک لیتا ہے، بدن کی طرف واپس نہیں کرے گا اور بدن سے ہمیشہ کے لیے رابطہ ختم ہو جائے گا۔

۵۔ وَ یُرۡسِلُ الۡاُخۡرٰۤی: اور دوسری کو ایک وقت کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔ اس چھوڑنے سے بیداری آ جاتی ہے۔ جیسا کہ پہلی صورت میں امساك روکے رکھنے پر موت آ گئی تھی۔ اس طرح نیند ایک قسم کی موت ہے یعنی انسان کی مختلف قوتوں کا تعطل ہے۔

نیز اس بات کی دلیل ہے کہ روح جسم سے ہٹ کر ایک الگ حقیقت ہے۔ روح عالم خواب میں جدا ہو کر عالم تجرد میں آ جاتی ہے اور عالم تجرد میں آنے سے روح غیر زمانی، زمانے کی قید و بند سے آزاد ہو جاتی ہے۔ پھر اس کے لیے ماضی، مستقبل برابر ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ وہ مستقبل میں آنے والی چیزوں کو حاضر پاتی ہے۔ اس سے یہ بات سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے کہ انسان خواب میں آنے والے ان واقعات کو کیسے

---

[1] ۵۱ ذاریات: ۲۱

دیکھ لیتا ہے جو ابھی وقوع پذیر نہیں ہوئے۔

روح خواب میں دماغ کے طبیعاتی عمل سے استفادہ کیے بغیر از خود سماعت و بصارت کی قوت رکھتی ہے۔ چنانچہ وہ خواب میں آوازیں سنتی ہے، باتیں سمجھتی ہے، شکلیں پہچان لیتی ہے حالانکہ خواب میں اس کی آنکھیں بند ہیں، کانوں سے کوئی طبیعی آواز نہیں ٹکرائی اس کے باوجود اس نے خواب میں دیکھا، سنا، پہچانا اور وہ سچا اور واقع کے عین مطابق ہے۔

خواب کے بارے میں مراح لبید ۲: ۳۳۵ میں حضرت علی علیہ السلام سے ایک روایت نقل ہوئی ہے:

> سونے والے کا نفس اگر آسمان میں ہو اور جسم میں واپس ہونے سے پہلے خواب دیکھے وہ سچا خواب ہے اور اگر آسمان سے واپس بھیجے جانے کے بعد جسم میں استقرار سے پہلے دیکھا ہے تو یہ جھوٹا خواب ہو گا۔

مجمع البیان میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے بھی ایک روایت ہے:

مھمارات فی ملکوت السمٰوات فھو ممالہ تأویل وما رات فیما بین السماء والارض فھو یخیلہ الشیطان ولا تأویل لہ۔	جو آسمانوں کی مملکت میں خواب دیکھا ہے اس کی تاویل ہے اور جو خواب آسمان اور زمین کے درمیان دیکھا ہے وہ شیطانی خیالات ہیں اس کی تاویل نہیں ہے۔

۶۔ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ: اس میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو روح پر اللہ تعالیٰ کی حاکمیت پر اس طور پر غور کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ارواح کو کبھی ہمیشہ کے لیے قبض کرتا ہے اور کبھی وقتی طور پر اور روح کے ذریعے نظامِ جسم کی تدبیر کرتا ہے، جیسا کہ ہم خواب میں روح اور جسم کے تعلق اور روح کی کرشمہ سازیوں کو درک کرتے ہیں۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی تدبیری نشانیوں میں سے ایک اہم نشانی ہے جو اس حقیقت کی نشاندہی کرتی ہے کہ انسان پر اللہ تعالیٰ کا مکمل تدبیری نظام حاکم ہے اور اس میں کسی غیر خدا کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ جسم کا نظام چلانے والی مدبر جسم پر حاکم، روح ہے۔

۲۔ روح ایک مستقل موجود ہے۔

۳۔ نیند اور موت کا تعلق ایک نظام سے ہے۔

اَمِ اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ شُفَعَآءَ ؕ	۴۳۔ کیا انہوں نے اللہ کے سوا اوروں کو شفیع بنا لیا ہے؟
قُلۡ اَوَ لَوۡ کَانُوۡا لَا یَمۡلِکُوۡنَ شَیۡئًا وَّ	کہد یجیے: خواہ وہ کسی چیز کا اختیار نہ رکھتے ہوں اور نہ

لَا يَعۡقِلُوۡنَ ﴿۴۳﴾ ہی کچھ سمجھتے ہوں (تب بھی شفیع بنیں گے)؟

تفسیر آیات

۱۔ اَمِ اتَّخَذُوۡا: کیا ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے معبودوں کو شفیع بنایا ہے؟ مشرکین کہتے تھے:

هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنۡدَ اللّٰهِ ...[۱] یہ اللہ کے پاس ہماری شفاعت کرنے والے ہیں۔

ان کا عقیدہ یہ تھا کہ ان بتوں کی پوجا کرنے سے اللہ کا تقرب حاصل ہوتا ہے:

مَا نَعۡبُدُهُمۡ اِلَّا لِيُقَرِّبُوۡنَاۤ اِلَى اللّٰهِ ...[۲] ہم انہیں صرف اس لیے پوجتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ کا مقرب بنا دیں،

۲۔ اَوَلَوۡ كَانُوۡا لَا يَمۡلِكُوۡنَ شَيۡـًٔا: اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا: یہ اللہ کے ہاں تمہاری شفاعت کیسے کریں گے؟ ان کے ہاتھ میں کسی قسم کا اختیار نہیں ہے کہ کچھ کر سکیں۔ وَّ لَا يَعۡقِلُوۡنَ یہ جامد، بے شعور، عقل و حواس بھی تو نہیں رکھتے۔ تمہاری وہ سفارش کیسے کریں گے؟

قُلۡ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيۡعًا ؕ لَهٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ ثُمَّ اِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۴۴﴾

۴۴۔ کہد یجیے: ساری شفاعت اللہ کے اختیار میں ہے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اسی کی ہے پھر تم اسی کی طرف پلٹائے جاؤ گے۔

تفسیر آیات

۱۔ قُلۡ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيۡعًا: شفاعت کے سارے اختیارات اللہ کے پاس ہیں۔ یہ اختیار اللہ سے کسی اور کی طرف منتقل ہونے کی دو شرائط ہیں:

الف: اللہ کی طرف سے اذن ہو: مَا مِنۡ شَفِيۡعٍ اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ اِذۡنِهٖ ...[۳] ہر کوئی شفیع نہیں ہو سکتا۔

ب: جس کی شفاعت کی جاتی ہے وہ اللہ کا پسندیدہ ہو: وَلَا يَشۡفَعُوۡنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارۡتَضٰى ...[۴] ہر کسی کی شفاعت نہیں ہو سکتی۔

۲۔ لَهٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ: اس کائنات پر اللہ کی بادشاہت ہے۔ اس میں کسی کا کوئی دخل نہیں ہے کہ اللہ کی اجازت کے بغیر کسی اور کے لیے کوئی گنجائش موجود ہو۔

وَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحۡدَهُ اشۡمَاَزَّتۡ ۴۵۔ اور جب صرف اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو

---

[۱] ۱۰ یونس: ۱۸ [۲] ۳۹ زمر: ۳ [۳] ۱۰ یونس: ۳ [۴] ۲۱ انبیاء: ۲۸

قُلُوۡبُ الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَۃِ ۚ وَ اِذَا ذُکِرَ الَّذِیۡنَ مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اِذَا ہُمۡ یَسۡتَبۡشِرُوۡنَ ﴿۴۵﴾

آخرت پر ایمان نہ رکھنے والوں کے دل متنفر ہو جاتے ہیں اور جب اللہ کے سوا اوروں کا ذکر کیا جاتا ہے تو وہ خوش ہو جاتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَحۡدَہُ: شرک وکفر کی ایک اہم علامت یہ ہے کہ صرف اللہ کے ذکر سے ان کے دل متنفر ہو جاتے ہیں جب کہ ایمان کی علامت یہ ہے کہ اللہ کے ذکر سے ان کے دلوں کو سکون و اطمینان حاصل ہوتا ہے:

اَلَا بِذِکۡرِ اللّٰہِ تَطۡمَئِنُّ الۡقُلُوۡبُ ﴿﴾[1]

اور یاد رکھو! یاد خدا سے دلوں کو اطمینان ملتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ سے ایک حدیث روایت ہے:

عَلَامَۃُ حُبِّ اللّٰہِ حُبُّ ذِکْرِہٖ وَ عَلَامَۃُ بُغْضِ اللّٰہِ بُغْضُ ذِکْرِہٖ۔[2]

اللہ کی محبت کی علامت یہ ہے کہ ذکر خدا پسند کرے اور اللہ سے عداوت کی علامت یہ ہے کہ ذکر خدا ناپسند کرے۔

۲۔ وَ اِذَا ذُکِرَ الَّذِیۡنَ مِنۡ دُوۡنِہٖۤ: جب غیر اللہ، اپنے خود ساختہ معبودوں کا ذکر آتا ہے تو ان کے چہروں پر بشاشت آ جاتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ ذکر خدا کو پسند کرنا ہی ایمان بخدا و آخرت کی علامت ہے۔

۲۔ ذکر خدا کا پسند نہ کرنا شرک کی علامت ہے۔

قُلِ اللّٰہُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ عٰلِمَ الۡغَیۡبِ وَ الشَّہَادَۃِ اَنۡتَ تَحۡکُمُ بَیۡنَ عِبَادِکَ فِیۡ مَا کَانُوۡا فِیۡہِ یَخۡتَلِفُوۡنَ ﴿۴۶﴾

۴۶۔ کہد یجیے: اے اللہ! آسمانوں اور زمین کے خالق، پوشیدہ اور ظاہری باتوں کے جاننے والے! تو ہی اپنے بندوں کے درمیان ان باتوں کا فیصلہ کرے گا جن میں وہ اختلاف کر رہے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ قُلِ اللّٰہُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ: یہ مشرکین ذکر خدا کو پسند نہ کریں تو نہ کریں۔ قُلِ

---

[1] ۱۳ رعد: ۲۸　[2] مستدرک الوسائل ۵: ۲۸۶

اے رسول! آپ اس طرح ذکر خدا کریں: تو ہی کائنات کا خالق، غیب و شہود کا جاننے والا ہے۔ آخری اور اٹل فیصلہ سنانے والا تو ہی ہے۔

اس طرح ذکر خدا میں اللہ تعالیٰ کے ان اوصاف کا ذکر کیا جائے جن کا تعلق ہمارے وجود و بقا سے ہے۔ جس میں علم خدا اور حتمی اور اٹل فیصلے کا ذکر ہے۔ اس قسم کے ذکر سے انسان کے شعور اور وجدان پر مثبت اثر پڑتا ہے۔ ان اوصاف کے ذکر سے اللہ کی معرفت اور معرفت سے محبت حاصل ہوتی ہے جیسے مؤمن کے دل میں اللہ کی محبت آ گئی، ایمان آ گیا۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

هَلِ الدِّيْنُ اِلَّا الْحُبُّ.... [1]   کیا دین، محبت کے علاوہ کسی اور چیز کا نام ہے؟

اہم نکات

۱۔ دینداری یہ ہے کہ اس فیصلے کا خیال رکھا جائے جو قیامت کے دن اللہ کی طرف سے ہونے والا ہے۔

وَلَوْ اَنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّ مِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ مِنْ سُوْٓءِ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَ بَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ ﴿۴۷﴾

۴۷۔ اور اگر ظالموں کے پاس وہ سب (دولت) موجود ہو جو زمین میں ہے اور اتنی مزید بھی ہو تو قیامت کے دن برے عذاب سے بچنے کے لیے وہ اسے فدیہ میں دینے کے لیے آمادہ ہو جائیں گے اور اللہ کی طرف سے وہ امر ان پر ظاہر ہو کر رہے گا جس کا انہوں نے خیال بھی نہیں کیا تھا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَوْ اَنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا: اس جگہ ظالموں سے مراد منکر آخرت اور کفر اختیار کرنے والے ہیں:

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ ظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَ لَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا ۙ [2]   جنہوں نے کفر اختیار کیا اور ظلم کرتے رہے اللہ انہیں ہرگز نہیں بخشے گا اور نہ ہی ان کی راہنمائی کرے گا۔

اگر ان ظالموں، جو قیامت کے منکر ہیں، کی ملکیت میں روئے پر موجود تمام خزانوں کے دو برابر ہوتے تو وہ اس دن کے عذاب سے بچنے کے لے ان تمام خزانوں کو فدیہ میں دے دیتے۔

۲۔ وَ بَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ: لیکن قیامت کے دن انہیں ایسے عذاب کا سامنا کرنا پڑے گا جس کا انہوں نے خیال بھی نہیں کیا تھا۔ ان کے وہم و خیال میں بھی نہ تھا اس قسم کے شدید ترین عذاب درپیش ہوں گے۔

---

[1] الکافی ۸: ۷۹   [2] ۴ نساء: ۱۶۸

وَ بَدَا لَهُمۡ سَیِّاٰتُ مَا کَسَبُوۡا وَ حَاقَ بِهِمۡ مَّا کَانُوۡا بِهٖ یَسۡتَهۡزِءُوۡنَ ﴿۴۸﴾

۴۸۔اوران کی بری کمائی بھی ان پر ظاہر ہو جائے گی اور جس بات کی وہ ہنسی اڑاتے تھے وہ انہیں گھیر لے گی۔

تفسیر آیات

اس دن ان کے اپنے برے اعمال سامنے آئیں گے۔خود ان کے جرائم عذاب بن کر ان کے سامنے ہوں گے۔

۲۔ وَحَاقَ بِهِمۡ : وہ اپنی بداعمالیوں کی لپیٹ میں آ جائیں گے۔

اس آیت سے بھی اس نظریہ کی تقویت ہو جاتی ہے کہ قیامت کے دن انسان کو خود اپنا عمل کا سامنا کرنا پڑے گا۔اگر اچھا عمل ہے تو ساتھ نہیں چھوڑے گا اور اگر برا عمل ہے تو جان نہیں چھوڑے گا۔

فَاِذَا مَسَّ الۡاِنۡسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ۫ ثُمَّ اِذَا خَوَّلۡنٰهُ نِعۡمَةً مِّنَّا ۙ قَالَ اِنَّمَاۤ اُوۡتِیۡتُهٗ عَلٰی عِلۡمٍ ؕ بَلۡ هِیَ فِتۡنَةٌ وَّ لٰکِنَّ اَکۡثَرَهُمۡ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۴۹﴾

۴۹۔جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ ہمیں پکارتا ہے، پھر جب ہم اپنی طرف سے اسے نعمت سے نوازتے ہیں تو کہتا ہے: یہ تو مجھے صرف علم کی بنا پر ملی ہے، نہیں بلکہ یہ ایک آزمائش ہے لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔

تفسیر آیات

۱۔فَاِذَا مَسَّ الۡاِنۡسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا: تکلیف کے وقت فطرت کی آنکھوں سے پردے ہٹ جاتے ہیں۔ جب مصیبت کا وقت ختم ہوتا ہے تو وہ اس نعمت کو اپنی ذاتی مہارت کا نتیجہ تصور کرتا ہے۔حالانکہ یہ نعمت اس کے لیے ایک آزمائش ہے۔ چونکہ اللہ نافرمان بندوں کو نعمت دے کر آزماتا ہے اور یہ نعمت و دولت ان کے لیے عذاب بن جاتی ہے۔

مزید تشریح کے لیے سورہ یونس آیت ۱۲، سورہ روم آیت ۳۳۔

قَدۡ قَالَهَا الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ فَمَاۤ اَغۡنٰی عَنۡهُمۡ مَّا کَانُوۡا یَکۡسِبُوۡنَ ﴿۵۰﴾

۵۰۔ان سے پہلے (لوگ) بھی یہی کہا کرتے تھے تو جو کچھ وہ کرتے تھے ان کے کسی کام نہ آیا۔

تفسیر آیات

۱۔ قَدۡ قَالَہَا: آیت کے اس جملے کا اشارہ ممکن ہے قارون کی طرف ہو۔ اس کا یہ قول تھا:

اِنَّمَاۤ اُوۡتِیۡتُہٗ عَلٰی عِلۡمٍ عِنۡدِیۡ ...[۱] یہ سب مجھے اس مہارت کی بنا پر ملا ہے جو مجھے حاصل ہے.

وہ اسے عطیہ الٰہی سمجھنے پر آمادہ نہیں تھا۔

۲۔ فَمَاۤ اَغۡنٰی عَنۡہُمۡ مَّا کَانُوۡا یَکۡسِبُوۡنَ: تو ان کی مال و دولت نے انہیں نہ صرف کوئی فائدہ نہیں دیا بلکہ خود ان کے خلاف وبال جان بن گئی۔

فَاَصَابَہُمۡ سَیِّاٰتُ مَا کَسَبُوۡا ؕ وَ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا مِنۡ ہٰۤؤُلَآءِ سَیُصِیۡبُہُمۡ سَیِّاٰتُ مَا کَسَبُوۡا ۙ وَ مَا ہُمۡ بِمُعۡجِزِیۡنَ ﴿۵۱﴾

۵۱۔ پس ان پر ان کے برے اعمال کے وبال پڑ گئے اور ان میں سے جنہوں نے ظلم کیا ہے عنقریب ان پر بھی ان کے برے اعمال کے وبال پڑنے والے ہیں اور وہ (اللہ کو) عاجز نہیں کر سکتے ۔

تفسیر آیات

۱۔ فَاَصَابَہُمۡ سَیِّاٰتُ مَا کَسَبُوۡا: اس آیت سے بھی اس نظریے کی تائید ہو جاتی ہے کہ انسان کا عمل خود عذاب بن جاتا ہے۔ قدیم مفسرین لفظ ''عقاب'' محذوف فرض کرتے تھے جب کہ اس لفظ کو محذوف ماننے کی ضرورت نہیں ہے۔

فرمایا: جس طرح سابق کفرانِ نعمت کرنے والوں کو ان کے عمل نے گرفت میں لیا تھا ان مشرکین کو بھی خود ان کا عمل گرفت میں لینے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طاقت و قوت اور قانون مکافات کے سامنے یہ لوگ بے بس ہوں گے۔

اہم نکات

۱۔ عذاب الٰہی آنے کی صورت میں مال و دولت کچھ فائدہ نہیں دیتی۔

۲۔ انسان کو خود اپنے عمل سے دوچار کیا جائے گا۔

اَوَ لَمۡ یَعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ یَبۡسُطُ

۵۲۔ کیا انہیں معلوم نہیں کہ اللہ جس کے لیے چاہتا

---

[۱] ۲۸ قصص: ۷۸

الرِّزۡقَ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَ یَقۡدِرُ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ ﴿۵۲﴾

ہے رزق کشادہ اور تنگ کر دیتا ہے؟ ایمان لانے والوں کے لیے یقیناً اس میں نشانیاں ہیں۔

تفسیر آیات

یہ بات درست ہے کہ رزق کا حصول اس کے علل و اسباب کے ساتھ مربوط ہے لیکن اول تو اللہ تعالیٰ مسب الاسباب یعنی سبب پیدا کرنے والا ہے، ان علل و اسباب کے پیچھے ارادہ الٰہی کارفرما ہے۔ ثانیاً ان علل و اسباب کو باہم مربوط کریں، ان کی کڑیوں کو صحیح طریقے سے ملایا جائے تو نتیجہ نکلتا ہے۔ ورنہ ایک شخص بہت محنت کرتا ہے لیکن نتیجہ حاصل نہیں ہوتا کیونکہ ان مطلوبہ کڑیوں کو ملانے میں ارادۂ الٰہی کا دخل ہوتا ہے لہٰذا مشیت الٰہی سے ہٹ کر کسی کی مہارت اور وسائل کارگر ثابت نہیں ہو سکتے۔

رزق کی کشادگی متقی کے لیے نعمت اور فاجر کے لیے عذاب کا پیش خیمہ ہے۔ اسی طرح رزق میں تنگی شکر گزاروں اور صابروں کے لیے رحمت اور ناشکروں اور بے صبروں کے لیے عذاب ہے۔ اللہ تعالیٰ بندوں میں سے ہر ایک کو اس کی اہلیت کے مطابق آزماتا ہے۔ کسی کو رزق دے کر، کسی کو تنگی میں رکھ کر۔

اہم نکات

۱۔ اگرچہ انسان کو حصول رزق کے لیے اسباب وسائل بروئے کار لانا پڑتے ہیں تاہم نتیجہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

قُلۡ یٰعِبَادِیَ الَّذِیۡنَ اَسۡرَفُوۡا عَلٰۤی اَنۡفُسِہِمۡ لَا تَقۡنَطُوۡا مِنۡ رَّحۡمَۃِ اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ یَغۡفِرُ الذُّنُوۡبَ جَمِیۡعًا ؕ اِنَّہٗ ہُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِیۡمُ ﴿۵۳﴾

۵۳۔ کہدیجیے: اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا، یقیناً اللہ تمام گناہوں کو معاف فرماتا ہے، وہ یقیناً بڑا معاف کرنے والا، مہربان ہے۔

تشریح کلمات

قنط: (ق ن ط) قنوط۔ راغب کے مطابق کسی خیر سے ناامید ہونا۔ دیگر نے خیر کی قید نہیں لگائی۔

تفسیر آیات

۱۔ قُلۡ یٰعِبَادِیَ: اے میرے بندو۔ محبت بھرا خطاب تمام انسانوں سے ہے۔ میرے بندو کہہ کر ندا دینے میں ایک امید، ایک نوید رحمت ہے۔ عبادی کی تعبیر میں بندگی اور عبودیت کے رشتے کی طرف

اشارہ ہے جو عبد اور معبود میں قائم ہے۔ جس کے تحت عبد کی ذمہ داری اطاعت و بندگی ہے اور مولا کے ذمے رحمت و مغفرت ہے۔

۲۔ عبادی: اس جگہ عبادی سے مراد تمام انسان ہیں، مسلم ہو یا غیر مسلم۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر مسلم، غیر مسلم سب کے لیے عبادی کی تعبیر اختیار فرمائی ہے:

وَقَلِيۡلٌ مِّنۡ عِبَادِیَ الشَّكُوۡرُ ۝ [۱]
اور میرے بندوں میں شکر کرنے والے کم ہیں۔

اِنۡ تُعَذِّبۡهُمۡ فَاِنَّهُمۡ عِبَادُكَ ... [۲]
اگر تو انہیں عذاب دے تو یہ تیرے ہی بندے ہیں۔

بعض نے تو یہ کہا ہے کہ عبادی سے مراد صرف مشرکین ہیں۔

۳۔ اَسۡرَفُوۡا عَلٰۤی اَنۡفُسِهِمۡ: اپنے ساتھ زیادتی کرنے والے۔ اس میں بھی مسلم اور مشرک دونوں شامل ہیں۔ شرک، اسراف علی النفس میں سرفہرست ہے۔

۴۔ لَا تَقۡنَطُوۡا مِنۡ رَّحۡمَةِ اللّٰهِ: اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا۔ مایوس نہ ہونے کا حکم عام ہے۔ سب گناہ گاروں کے لیے لیکن یہ عام ہے ان لوگوں کے لیے جو رحمت الٰہی کے طالب ہوں اور جو لوگ اللہ کی رحمت کے طالب ہی نہیں ہیں ان کے لیے اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ لہٰذا اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونے کا حکم دنیوی زندگی میں مؤمن اور مشرک دونوں کے لیے ہے جب توبہ کر کے اللہ کی رحمت کے طلبگار ہوں۔ یہ توبہ موت سامنے آنے سے پہلے ہونی چاہیے۔ ارشاد فرمایا:

وَلَيۡسَتِ التَّوۡبَةُ لِلَّذِيۡنَ يَعۡمَلُوۡنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰۤى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الۡمَوۡتُ قَالَ اِنِّىۡ تُبۡتُ الۡـٰٔنَ وَلَا الَّذِيۡنَ يَمُوۡتُوۡنَ وَهُمۡ كُفَّارٌ ؕ اُولٰٓـئِكَ اَعۡتَدۡنَا لَهُمۡ عَذَابًا اَلِيۡمًا ۝ [۳]

اور ایسے لوگوں کی توبہ (حقیقت میں توبہ ہی) نہیں جو برے کاموں کا ارتکاب کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ ان میں سے کسی کی موت کا وقت آ پہنچتا ہے تو وہ کہ اٹھتا ہے: اب میں نے توبہ کی اور نہ ہی ان لوگوں کی (توبہ قبول ہے) جو مرتے دم تک کافر رہتے ہیں، ایسے لوگوں کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

دیگر آیات میں ان لوگوں کے لیے عدم مغفرت کا ذکر ہے جو کفر و فسق کی حالت میں مرتے ہیں:

اِنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا وَمَاتُوۡا وَهُمۡ كُفَّارٌ فَلَنۡ يُّقۡبَلَ مِنۡ اَحَدِهِمۡ مِّلۡءُ الۡاَرۡضِ ذَهَبًا ... [۴]

جنہوں نے کفر اختیار کیا اور کفر کی حالت میں مر گئے ان میں سے کسی سے اس قدر سونا بھی، جس سے روئے زمین بھر جائے، ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔

اِنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا وَصَدُّوۡا عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ ثُمَّ مَاتُوۡا وَهُمۡ كُفَّارٌ فَلَنۡ يَّغۡفِرَ اللّٰهُ لَهُمۡ ۝ [۵]

یقیناً جنہوں نے کفر کیا اور راہ خدا سے روکا پھر کفر کی حالت میں مر گئے تو اللہ انہیں ہرگز نہیں بخشے گا۔

۱؎ ۳۴ سباء: ۱۳ ۲؎ ۵ مائدہ: ۱۱۸ ۳؎ ۴ نساء: ۱۸ ۴؎ ۳ آل عمران: ۹۱ ۵؎ ۴۷ محمد: ۳۴

آخرت میں یہ نوید صرف مومن کے لیے ہے اور مشرک کے لیے آخرت میں مغفرت کا کوئی امکان نہیں ہے:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغۡفِرُ اَنۡ یُّشۡرَکَ بِہٖ وَ یَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِکَ لِمَنۡ یَّشَآءُ ...۔[1]
اللہ اس بات کو یقیناً معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ (کسی کو) شریک ٹھہرایا جائے اور اس کے علاوہ دیگر گناہوں کو جس کے بارے میں وہ چاہے گا معاف کر دے گا۔

۵۔ رَّحۡمَۃِ اللّٰہِ: اللہ کی رحمت ہر چیز کو شامل ہے:

وَ رَحۡمَتِیۡ وَسِعَتۡ کُلَّ شَیۡءٍ[2]
اور میری رحمت ہر چیز کو شامل ہے۔

یہ رحمت دنیا میں مومن، کافر، مشرک سب کو شامل ہے۔ قیامت کے دن اللہ کی رحمت میں شمول کے لیے ضابطہ موجود ہے:

قَالَ وَ مَنۡ یَّقۡنَطُ مِنۡ رَّحۡمَۃِ رَبِّہٖۤ اِلَّا الضَّآلُّوۡنَ ﴿۵۶﴾[3]
اپنے رب کی رحمت سے تو صرف گمراہ لوگ ہی مایوس ہوتے ہیں۔

۶۔ اِنَّ اللّٰہَ یَغۡفِرُ الذُّنُوۡبَ جَمِیۡعًا: اللہ سب گناہوں کو معاف فرماتا ہے۔ چونکہ اللہ کی رحمت تمام گناہوں سے زیادہ وسیع ہے۔ دعا میں وارد ہے:

وَ رَحْمَتُكَ اَوْسَعُ مِنْ ذُنُوبِي....[4]
اور تیری رحمت میرے گناہوں سے زیادہ وسیع ہے۔

لہٰذا کوئی گناہ ایسا نہیں ہے جو معاف نہ ہو سکے۔ حتیٰ شرک کا گناہ بھی معاف ہو جائے گا جو سب گناہوں سے بہت بڑا گناہ اور جرم ہے لیکن یہ مغفرت بے ضابطہ نہیں ہے۔

قاعدے اور ضابطے کے تحت سارے گناہ معاف ہو سکتے ہیں اور وہ ہے توبہ۔ توبہ کی صورت میں تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا، رحمت خدا سے مایوس وہ لوگ نہیں ہوں گے جو اس کی رحمت کی طرف رجوع کرتے ہیں اور جو رحمت کا طالب ہی نہیں ہوتا اس کے لیے اس بات کی نوبت نہیں آتی کہ اس کے گناہ معاف ہوں گے یا نہیں ہوں گے۔ توبہ نہ کرنے والوں کا تو ذکر ہی نہیں ہے بلکہ وہ توبہ بھی قبول نہ ہو گی جو موت سامنے آنے کی صورت میں کی جائے جیسا کہ پہلے ذکر ہو گیا جس کی صراحت سورہ نساء آیت ۱۸ میں موجود ہے۔ لہٰذا وہ نظریہ قابل قبول نہیں ہے جو کہتا ہے کہ آیت میں مشرک کے علاوہ سب شامل ہیں، خواہ توبہ کریں یا نہ کریں۔

روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا:

اسْتَغْفِرُوا بَعْدَ الذَّنْبِ اَسْرَعَ مِنْ طَرْفَةِ عَيْنٍ فَاِنْ لَمْ تَفْعَلُوا فَبِالْاِنْفَاقِ فَاِنْ لَمْ
گناہ کرنے کے بعد چشم زدن میں مغفرت مانگو۔ نہ ہو سکے تو راہ خدا میں کچھ خرچ کر کے مانگو۔ نہ ہو

[1] ۴ نساء: ۴۸ [2] ۷ اعراف: ۱۵۶ [3] ۱۵ حجر: ۵۶ [4] الکافی ۲: ۵۸۰

تفعَلُوا فبكظم الغيظ فان لم تفعلوا فبالعفو عن الناس فان لم تفعلوا فبالاحسان اليهم فان لم تفعلوا فبترك الاصرار فان لم تفعلوا فبالرجاء لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۔[1]

سکے تو غصہ پی کر مانگو۔ نہ ہو سکے تو لوگوں کو معاف کر کے مانگو۔ نہ ہو سکے تو لوگوں پر احسان کر کے مانگو۔ نہ ہو سکے تو اصرار کرنا ترک کر کے مانگو۔ نہ ہو سکے تو امید رکھ کر مانگو: لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۔ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔

حضرت علی علیہ السلام سے مروی ہے:

مافی القرآن اية اوسع من يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا ....[2]

قرآن میں اس آیت سے زیادہ گنجائش والی آیت موجود نہیں ہے: يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا ....

اہم نکات

۱۔ یہ بندہ خود رحمت خدا کا لائق نہیں بنتا ورنہ اللہ کے نزدیک سب لائق رحمت ہیں۔

۲۔ اللہ کی رحمت سے مایوسی کفر ہے۔

وَاَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۵۴﴾

۵۴۔ اور اپنے رب کی طرف پلٹ آؤ اور اس کے فرمانبردار بن جاؤ قبل اس کے کہ تم پر عذاب آ جائے، پھر تمہاری مدد نہیں کی جائے گی۔

تشریح کلمات

اَنِيْبُوْٓا : (ن و ب) النوب کسی چیز کا بار بار لوٹ کر آنا۔ الا نابة الى الله توبہ اور اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹنا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَاَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ : اپنے رب کی طرف توبہ کرو۔ کفر و شرک چھوڑ اور غیر اللہ کی پرستش ترک کر کے اللہ کی بارگاہ میں پلٹ آؤ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سابقہ آیت کے نتیجے کا ذکر ہے کہ جب اللہ کی رحمت کے سائے میں جانے کی صورت میں کسی کو مایوس نہیں کیا جائے گا اور تمام گناہ بخشے جائیں گے تو اس آیت میں حکم ہوا: اپنے رب کی طرف پلٹ آؤ۔

---

[1] مستدرک الوسائل ۱۲: ۱۲۴　[2] کنز العمال ۲: ۴۹۲

۲۔ وَ اَسۡلِمُوۡا: اور رب کے فرماں بردار بن جاؤ تا کہ رحمت الٰہی کے سائے میں آ جاؤ۔

۳۔ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّاۡتِیَکُمُ الۡعَذَابُ: قبل اس کے کہ توبہ و تسلیم نہ کرنے کی صورت میں عذاب میں مبتلا ہو جاؤ۔

اہم نکات

۱۔ توبہ و تسلیم عذاب الٰہی سے بچنے کا واحد راستہ ہے۔

وَ اتَّبِعُوۡۤا اَحۡسَنَ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکُمۡ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّاۡتِیَکُمُ الۡعَذَابُ بَغۡتَۃً وَّ اَنۡتُمۡ لَا تَشۡعُرُوۡنَ ﴿۵۵﴾

۵۵۔ اور تمہارے رب کی طرف سے تم پر جو بہترین (کتاب) نازل ہوئی ہے اس کی پیروی کرو قبل اس کے کہ تم پر ناگہاں عذاب آ جائے اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اَسۡلِمُوۡا کے بعد وَ اتَّبِعُوۡۤا قابل توجہ ہے کہ فرماں بردار بن جانے، تسلیم و رضا کی منزل پانے کے بعد عمل کی نوبت آتی ہے۔ سابقہ آیت میں حکم ہوا تسلیم و قبول کی منزل پر قدم رکھو۔ اس آیت میں فرمایا: جس بات کو تسلیم کیا ہے اس پر عمل کرو۔

۲۔ اَحۡسَنَ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکُمۡ: بہترین چیز جو اس امت کی طرف نازل ہوئی ہے، قرآن ہے۔ یہ قرآن خود اپنی جگہ احسن ہے، نہ کسی اور چیز کی نسبت سے۔ احسن من ان یوصف ہے۔ وصف و بیان کی حد سے بہتر ہے۔

۳۔ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّاۡتِیَکُمُ الۡعَذَابُ: قبل اس کے کہ غفلت کے وقت عذاب ناگہانی میں آ جاؤ جس کے لیے تم تیار نہیں تھے بلکہ تم نے اس عذاب کے بارے میں سوچا بھی نہ تھا۔

اَنۡ تَقُوۡلَ نَفۡسٌ یّٰحَسۡرَتٰی عَلٰی مَا فَرَّطۡتُّ فِیۡ جَنۡۢبِ اللّٰہِ وَ اِنۡ کُنۡتُ لَمِنَ السّٰخِرِیۡنَ ﴿۵۶﴾

۵۶۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی شخص یہ کہے: افسوس ہے اس کوتاہی پر جو میں نے اللہ کے حق میں کی اور میں تو مذاق اڑانے والوں میں سے تھا۔

اَوۡ تَقُوۡلَ لَوۡ اَنَّ اللّٰہَ ہَدٰىنِیۡ لَکُنۡتُ مِنَ الۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۵۷﴾

۵۷۔ یا وہ کہے: اگر اللہ میری ہدایت کرتا تو میں متقین میں سے ہو جاتا۔

اَوۡ تَقُوۡلَ حِیۡنَ تَرَی الۡعَذَابَ لَوۡ اَنَّ لِیۡ کَرَّۃً فَاَکُوۡنَ مِنَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۵۸﴾

۵۸۔ یا عذاب دیکھ کر یہ کہے: اگر مجھے واپس (دنیا میں) جانے کا موقع ملتا تو میں نیکی کرنے والوں میں سے ہو جاتا۔

تشریح کلمات

جَنۡۢبِ اللّٰہِ: العین کے مطابق جنب شان کے معنوں میں ہے۔ کہا جاتا ہے: اتق اللّٰہ فی جنب اخیك۔ ای فی شانہ۔

تفسیر آیات

راغب کہتے ہیں جَنۡۢبِ اللّٰہِ سے مراد اللہ تعالیٰ کے اوامر اور حدود ہیں جو اس نے ہمارے لیے مقرر فرمائی ہیں۔ جنب کا معنی قربت ہے ۔یعنی قیامت کے دن اس کوتاہی پر افسوس ہوگا جو قرب الٰہی کے حصول میں سرزد ہوئی ہے۔ اگر شان معنی لیے جائیں تو مطلب یہ ہوگا کہ قیامت کے دن اس کوتاہی پر افسوس ہوگا جو شان الٰہی کے بارے میں سرزد ہوئی۔

۱۔ اَنۡ تَقُوۡلَ نَفۡسٌ یّٰحَسۡرَتٰی: توبہ و انابت، تسلیم و رضا اور اتباع و اطاعت کے مراحل اچھی طرح طے کرنے کا حکم دیا۔ کہیں اس بات پر کف افسوس ملنا نہ پڑے کہ اللہ کی اطاعت، اللہ کی شان میں کوتاہی سرزد ہوئی ہے۔

۲۔ وَ اِنۡ کُنۡتُ لَمِنَ السّٰخِرِیۡنَ: جو گستاخی یا کوتاہی اللہ کی شان میں سرزد ہوئی وہ یہ تھی کہ میں حدود اللہ یا اللہ کے نمائندے کا مذاق اڑاتا تھا۔

۳۔ اَوۡ تَقُوۡلَ لَوۡ اَنَّ اللّٰہَ ہَدٰىنِیۡ: ہم نے مذکورہ احکام اس لیے صادر کیے کہ کل روز قیامت جب تمہارا سامنا حساب کتاب سے ہوگا تو یہ نہ کہو کہ اگر اللہ ہماری ہدایت فرماتا تو ہم اسے مان لیتے۔ لو ہم اب ہم ہدایت دے رہے ہیں، مان جاؤ۔

۴۔ اَوۡ تَقُوۡلَ حِیۡنَ تَرَی الۡعَذَابَ: ہم مذکورہ دستور اس لیے بیان کر رہے ہیں کہ کل قیامت کے دن جب تم عذاب الٰہی کا مشاہدہ کرو گے تو یہ نہ کہو: ایک مرتبہ دنیا میں جانے کا موقع مل جاتا تو میں جی بھر کر نیکی کرتا۔

بَلٰی قَدۡ جَآءَتۡکَ اٰیٰتِیۡ فَکَذَّبۡتَ بِہَا وَ اسۡتَکۡبَرۡتَ

۵۹۔ (جواب ملے گا) کیوں نہیں! میری آیات تجھ تک پہنچیں مگر تو نے انہیں جھٹلایا اور تکبر کیا اور

وَ كُنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٥٩﴾ تو کافروں میں سے تھا۔

تفسیر آیات

اگر تم اس طرح کی باتیں کرو گے تو تمہیں یہ جواب ملے گا: کیوں نہیں! میری آیات تجھ تک پہنچ گئی تھیں۔ ہدایت کے سارے تقاضے پورے ہو گئے تھے۔ حجت پوری ہو گئی تھی۔ یہ تو تھا جو تکبر اور نخوت سے ان ہدایات کا مقابلہ کرتا تھا۔

وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تَرَى الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلَى اللّٰهِ وُجُوْهُهُمْ مُّسْوَدَّةٌ ؕ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿٦٠﴾

۶۰۔ اور جنہوں نے اللہ کی نسبت جھوٹ بولا قیامت کے دن آپ ان کے چہرے سیاہ دیکھیں گے، کیا تکبر کرنے والوں کا ٹھکانا جہنم میں نہیں ہے؟

تفسیر آیات

۱۔ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلَى اللّٰهِ: اللہ پر جھوٹ باندھنے والے مشرکین ہیں جو اللہ کے لیے شریک کے قائل ہیں اور جھوٹ اس طرح باندھتے ہیں: اللہ نے تدبیر کائنات ان معبودوں کے سپرد کر دی ہے۔ اللہ ان کی شفاعت قبول فرماتا ہے۔

۲۔ وُجُوْهُهُمْ مُّسْوَدَّةٌ: جس طرح دنیا میں ان کے دل سیاہ تھے، حق کی روشنی ان کے دلوں میں نہیں جا سکی، وہی تاریکی قیامت کے دن ان کے چہروں پر نمودار ہو جائے گی۔

۳۔ جہنم تکبر کرنے والوں کا ٹھکانہ ہو گی۔ وہ انبیاء علیہم السلام سے اپنے آپ کو برتر سمجھتے تھے۔ انبیاء علیہم السلام کی توہین کرتے اور مذاق اڑاتے تھے۔ ان کے اس تکبر کا نتیجہ جہنم ہے۔

وَ يُنَجِّي اللّٰهُ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا بِمَفَازَتِهِمْ ۫ لَا يَمَسُّهُمُ السُّوْٓءُ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٦١﴾

۶۱۔ اور اہل تقویٰ کو ان کی کامیابی کے سبب اللہ نجات دے گا، انہیں نہ کوئی تکلیف پہنچے گی اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے۔

تشریح کلمات

مفازۃ: (ف و ز) فوز سے۔ کامیاب ہونے کے معنوں میں ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَیُنَجِّی اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا: جن لوگوں نے دنیا میں اللہ کی ناراضگی سے بچنے کی کوشش کی انہیں اللہ جہنم سے نجات دے گا۔

۲۔ بِمَفَازَتِہِمۡ: یہ نجات ان کی کامیابی کی وجہ سے مل جائے گی۔ فوز اور کامیابی کا راز اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی اطاعت میں مضمر ہے:

وَمَنۡ یُّطِعِ اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ فَقَدۡ فَازَ فَوۡزًا عَظِیۡمًا ﴿۱﴾ اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی پس اس نے عظیم کامیابی حاصل کی۔

۳۔ لَا یَمَسُّہُمُ السُّوۡٓءُ: نجات حاصل ہونے کے بعد ہر قسم کی آسودگی میسر ہوگی۔ نہ کسی قسم کی تکلیف کا وہاں تصور ہوگا، نہ کسی چیز کے ہاتھ سے نکل جانے کا دکھ ہوگا۔ یہ اس کامیاب زندگی کی ایک جامع تعریف ہے۔

اَللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیۡءٍ ۫ وَّہُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ وَّکِیۡلٌ ﴿۶۲﴾

۶۲۔ اللہ ہر چیز کا خالق ہے اور وہ ہر چیز کا نگہبان ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اَللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیۡءٍ: قرآنی تعلیمات میں ایک مسلمہ امر ہے کہ خلق و تدبیر دو مختلف امور نہیں ہیں جیسا کہ مشرکین نے خیال کر رکھا ہے کہ خالق تو اللہ ہے لیکن امور کائنات کی تدبیر ان کے معبودوں یعنی شریکوں کے ہاتھ میں ہے۔ اس آیت میں اسی بات کو واضح لفظوں میں بیان فرمایا:

۲۔ وَّہُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ وَّکِیۡلٌ: وہ جہاں ہر چیز کا خالق ہے وہاں ہر چیز اس کے تحفظ میں ہے۔ ہر چیز کی بقا کا انحصار اسی ذات پر ہے۔ وَّکِیۡلٌ مدبر ہے، محافظ ہے، ذمہ دار ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ ہی خالق اور وکیل ہے کہ خلق و تدبیر دونوں اللہ ہی کے ہاتھ میں ہیں۔

لَہٗ مَقَالِیۡدُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ وَالَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ ﴿۶۳﴾

۶۳۔ آسمانوں اور زمین کی کنجیاں اسی کی ملکیت ہیں اور جنہوں نے اللہ کی آیات کا انکار کیا وہی نقصان اٹھانے والے ہیں۔

۱؎ ۳۳ احزاب: ۷۱

تفسیر آیات

۱۔ لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ: خلق و تدبیر چونکہ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہیں اسی کے تحت فرمایا: آسمانوں اور زمین کی کنجیاں اللہ ہی کے پاس ہیں۔ لہٰذا اس کائنات میں موجود خزانوں سے کوئی فیضیاب ہونا چاہتا ہے تو اس ذات کے پاس جائے جس کے ہاتھ میں ان خزانوں کی کنجیاں ہیں۔

۲۔ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ: جب کہ کافر لوگ ان خزانوں سے فیضیابی کی امید لے کر ایسوں کے پاس جاتے ہیں جن کے پاس نہ صرف یہ کہ ان خزانوں کی کنجیاں نہیں ہیں بلکہ وہ تو کنجی اور خزانے کا مفہوم سمجھنے کی اہلیت تک نہیں رکھتے۔ لہٰذا ایسے کم عقلوں کا خسارت میں جانا قدرتی امر ہے۔

اہم نکات

۱۔ غیر اللہ کے پاس جانے والے خسارے میں ہیں۔

قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّيْٓ اَعْبُدُ اَيُّهَا الْجٰهِلُوْنَ ﴿۶۴﴾

۶۴۔ کہدیجیے: اے نادانو! کیا تم مجھے کہتے ہو کہ میں غیر اللہ کی بندگی کروں؟

تفسیر آیات

غیر اللہ کی بندگی کرنا اور اس سے لو لگانا جہالت کا نتیجہ ہے کیونکہ جہالت کی وجہ سے واقع اور حقیقت پوشیدہ رہ جاتی ہے۔ جب واقع کا علم نہیں ہوگا تو جاہل ظن و گمان اور اپنے واہمے کے ذریعے اس غیر حقیقی چیز کو حقیقت کا لباس پہنائے گا۔

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

لَا تَرَى الْجَاهِلَ اِلَّا مُفْرِطاً اَوْ مُفَرِّطاً۔[1]

جاہل کو نہ پاؤ گے مگر یا حد سے آگے بڑھا ہوا اور یا اس سے بہت پیچھے۔

لہٰذا جاہل زیادتی اور کوتاہی کے گرداب میں پھنس جاتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ غیر اللہ کی بندگی علم سے دوری کا نتیجہ ہے۔

وَ لَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَ اِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ

۶۵۔ اور بتحقیق آپ کی طرف اور آپ سے پہلے انبیاء کی طرف یہی وحی بھیجی گئی ہے کہ اگر تم نے شرک

عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴿۶۵﴾	کیا تو تمہارا عمل ضرور حبط ہو جائے گا اور تم ضرور نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔
بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ﴿۶۶﴾	۶۶۔ بلکہ اللہ ہی کی عبادت کرو اور شکر گزاروں میں سے ہو جاؤ۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ: یہ بات کہ شرک سے اعمال حبط ہو جاتے ہیں، شرک اعمال پر گرنے والی آگ کا شعلہ ہے کہ وہ ہر نیک عمل کو بھسم کر کے چھوڑے گا، وحی آسمان کی بنیادی بات ہے جو ہر نبی سے ہوئی، ہر رسول کو بتائی چونکہ انبیاء علیہم السلام کے مبعوث ہونے کی بنیادی غرض و غایت توحید ہے اور شرک، توحید کی نفی ہے۔

۲۔ لَىِٕنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ: اے رسول! اگر خود آپ بھی بالفرض شرک کے مرتکب ہو جائیں تو آپ کا عمل بھی حبط ہو جائے گا۔ رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم معصوم ہیں۔ یہ کیسے فرمایا اگر آپ شرک کریں؟ اس کے دو جواب ہیں:

اول یہ فرض ہے۔ فرض میں مفروضہ کا وقوع ممکن ہونا شرط نہیں ہے۔ جیسے اللہ کی اولاد ہونا محال ہے تاہم فرمایا:

قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ ۖ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ ۝ [1]	کہد یجیے: اگر رحمٰن کی کوئی اولاد ہوتی تو میں سب سے پہلے (اس کی) عبادت کرنے والا ہوتا۔

اسی طرح ہے آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے شرک صادر نہیں ہو گا لیکن بالفرض اگر ہو گیا تو آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا عمل حبط ہو جائے گا۔

دوسرا جواب یہ ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اگرچہ معصوم ہیں لیکن معصوم ہونے کا مطلب مسلوب الاختیار ہونا نہیں ہے، نہ ہی مکلف نہ ہونا ہے۔ معصوم گناہ کرنے پر قادر ہوتے ہیں، پھر بھی گناہ نہیں کرتے۔ معصوم بھی گناہ نہ کرنے کے مکلّف ہیں لہٰذا یہ کہنا: آپ شرک کا ارتکاب نہ کریں، عصمت کے منافی نہیں ہے نیز اس حکم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے خطاب کر کے بیان کرنے سے اس کی اہمیت کا علم ہوتا ہے۔

۲۔ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ: عمل کا حبط ہونا، پوری متاع حیات کا تباہ ہونا ہے۔ اس سے بڑھ کر کسی خسارے کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔

---

[1] ۴۳ زخرف: ۸۱

۳۔ بَلِ اللّٰہَ فَاعۡبُدۡ: اے رسول ﷺ! شرک چھوڑ کر اللہ کی عبادت کرو۔ اس آیت سے بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ رسول حکم تکلیفی کے مخاطب واقع ہوتے ہیں۔

۴۔ وَ کُنۡ مِّنَ الشّٰکِرِیۡنَ: اپنے قول و عمل سے اللہ کی ان نعمتوں کا شکر ادا کرو کہ اللہ تعالیٰ نے نبوت و رسالت اور بھٹکی ہوئی انسانیت کو ایک دائمی دستور حیات عنایت کرنے جیسی عظیم نعمتوں سے نوازا ہے۔

اہم نکات

۱۔ شرک قابل درگزر جرم نہیں ہے۔

وَ مَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدۡرِہٖ ٭ۖ وَ الۡاَرۡضُ جَمِیۡعًا قَبۡضَتُہٗ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ وَ السَّمٰوٰتُ مَطۡوِیّٰتٌۢ بِیَمِیۡنِہٖ ؕ سُبۡحٰنَہٗ وَ تَعٰلٰی عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ ﴿۶۷﴾

۶۷۔ اور ان لوگوں نے اللہ کی قدر شناسی نہ کی جیسا کہ اس کی قدر کرنے کا حق ہے اور قیامت کے دن پوری زمین اس کے قبضہ قدرت میں ہو گی اور آسمان اس کے دست قدرت میں لپٹے ہوئے ہوں گے، وہ پاک اور بالاتر ہے اس شرک سے جو یہ کرتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَمَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدۡرِہٖ: لوگوں نے اللہ کی قدر و منزلت پہچاننے کا حق ادا نہیں کیا کہ اللہ کی بندگی چھوڑ کر بے جان پتھروں اور لاشعور چیزوں کی پوجا کی، پھر قیامت کے منکر ہو کر اللہ کو ایک عبث کار فرض کیا ہے۔

سورہ انعام آیت ۹۱ میں فرمایا:

وَمَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدۡرِہٖۤ اِذۡ قَالُوۡا مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ عَلٰی بَشَرٍ مِّنۡ شَیۡءٍ ...[۱]

اور انہوں نے اللہ کو ایسے نہیں پہچانا جیسے اسے پہچاننے کا حق تھا جب انہوں نے کہا: اللہ نے کسی بشر پر کچھ نازل نہیں کیا۔

ان لوگوں نے اللہ کی قدر و منزلت کو نہیں پہچانا جیسا قدردانی کا حق ہے جو کہتے ہیں اللہ نے کسی بشر پر کچھ نازل نہیں کیا۔ اس میں اللہ کی ناقدری یہ ہے کہ ان کے نزدیک اللہ نے انسان کو خلق تو کیا لیکن خلق کرنے کے بعد اسے بے لگام چھوڑ دیا۔ ان کے لیے ہدایت کا سامان فراہم نہیں کیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا انسان کو خلق کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں تھی۔ لہٰذا اسے عبث خلق کیا۔

۲۔ وَالۡاَرۡضُ جَمِیۡعًا قَبۡضَتُہٗ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ: قیامت کے دن زمین اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہو گی۔

------

[۱] ۶ انعام: ۹۱

اگر چہ یہ زمین اور کل کائنات آج بھی اللہ کے قبضہ قدرت میں ہے لیکن آج دنیا چونکہ دار التکلیف اور دار امتحان ہے لہٰذا یہاں اللہ کی نافرمانی ہوتی ہے۔ طاغوتوں کی بھی یہاں اچھل کود ہوتی ہے مگر قیامت کے دن حکم خدا کے مقابلے میں کسی قسم کی جنبش کی کسی کو بھی اجازت نہیں ہو گی۔ جیسے مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ اور لِمَنِ الۡمُلۡکُ الۡیَوۡمَ ؕ لِلّٰہِ الۡوَاحِدِ الۡقَہَّارِ ....[1] آج کس کی بادشاہت ہے؟ (جواب ملے گا) خدائے واحد، قہار کی، کے ذیل میں بیان ہوا ہے۔

۳۔ وَ السَّمٰوٰتُ مَطۡوِیّٰتٌۢ بِیَمِیۡنِہٖ: قیامت ایک کائناتی انقلاب کا نام ہے جس کے نتیجے میں آسمان لپیٹ لیا جائے گا اور نئی کائنات تخلیق ہو گی:

یَوۡمَ نَطۡوِی السَّمَآءَ کَطَیِّ السِّجِلِّ لِلۡکُتُبِ ؕ کَمَا بَدَاۡنَاۤ اَوَّلَ خَلۡقٍ نُّعِیۡدُہٗ ....[2]

اس دن ہم آسمان کو اس طرح لپیٹ لیں گے جس طرح طومار میں اوراق لپیٹتے ہیں، جس طرح ہم نے خلقت کی ابتدا کی تھی، اسے ہم پھر دہرائیں گے،

اہم نکات

۱۔ جو کائنات اللہ کے قبضۂ قدرت اور دست قدرت میں لپٹی ہوئی ہو گی اس میں کسی غیر اللہ کے لیے کون سا کام رہ جاتا ہے۔

وَ نُفِخَ فِی الصُّوۡرِ فَصَعِقَ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَنۡ فِی الۡاَرۡضِ اِلَّا مَنۡ شَآءَ اللّٰہُ ؕ ثُمَّ نُفِخَ فِیۡہِ اُخۡرٰی فَاِذَا ہُمۡ قِیَامٌ یَّنۡظُرُوۡنَ ﴿۶۸﴾

۶۸۔ اور (جب) صور میں پھونک ماری جائے گی تو جو آسمانوں اور زمین میں ہیں سب بیہوش ہو جائیں گے مگر جنہیں اللہ چاہے، پھر دوبارہ اس میں پھونک ماری جائے گی تو اتنے میں وہ سب کھڑے ہو کر دیکھنے لگیں گے۔

تشریح کلمات

صعق: (ص ع ق) شدید آواز۔ شدید آواز سے عقل کا زائل ہونا، موت واقع ہونا کے معنوں میں ہے۔ کہتے ہیں صاعقة الموت۔ مہلک عذاب کو بھی صاعقه کہتے ہیں۔ راغب نے اہل لغت کے حوالے سے تین صاعقة ذکر کیے ہیں: i۔ صاعقة الموت ii۔ صاعقة العذاب iii۔ صاعقة النار۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ نُفِخَ فِی الصُّوۡرِ: مسلم یہ ہے کہ صور دو مرتبہ پھونکا جائے گا۔ ایک صور سے سب کی موت

---

[1] ۴۰ غافر: ۱۶ [2] ۲۱ انبیاء: ۱۰۴

واقع ہو جائے گی، دوسرے صور سے سب کو زندہ کیا جائے گا۔

بعض کے نزدیک صور تین مرتبہ پھونکا جائے گا: ایک نفخة الفزع، دوسرا نفخة الصعق، تیسرا نفخة القیام ہے لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ نفخة الفزع اور نفخة الصعق ایک ہی صور کی دو تعبیریں ہیں چونکہ فزع ہولناکی کو کہتے ہیں اور پہلا صور پھونکنے کی صورت میں ظاہر ہے بڑی ہولناکی ہوگی جس سے سب مر جائیں گے چنانچہ قیام قیامت کو یوم الفزع الاکبر کہتے ہیں۔

چنانچہ صور پھونکنے کے بارے میں جن دو آیات میں فزع او صعق کے الفاظ کا ذکر ہے، دونوں کی تعبیر ایک جیسی ہے۔ فرمایا:

وَ یَوۡمَ یُنۡفَخُ فِی الصُّوۡرِ فَفَزِعَ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَنۡ فِی الۡاَرۡضِ اِلَّا مَنۡ شَآءَ اللّٰہُ ؕ وَ کُلٌّ اَتَوۡہُ دٰخِرِیۡنَ ۝ [1]	اور جس روز صور میں پھونک ماری جائے گی تو آسمانوں اور زمین کی تمام موجودات خوفزدہ ہو جائیں گی سوائے ان لوگوں کے جنہیں اللہ چاہے اور سب نہایت عاجزی کے ساتھ اس کے حضور پیش ہوں گے۔

اس آیت میں وَ کُلٌّ اَتَوۡہُ دٰخِرِیۡنَ قرینہ ہے کہ اس صور سے سب مر جائیں گے۔

۲۔ فَصَعِقَ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ: اس صور کے پھونکنے سے اس کائنات میں موجود سب مر جائیں گے۔

۳۔ اِلَّا مَنۡ شَآءَ اللّٰہُ: سوائے ان لوگوں کے جنہیں اللہ زندہ رکھنا چاہے۔ اس جملے سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ کچھ ہستیاں زندہ رہ جائیں گی۔

بعض کہتے ہیں یہ زندہ رہ جانے والے جبرائیل، میکائیل، اسرافیل اور عزرائیل ہیں جو سادات ملائکہ کہلاتے ہیں اور بعض کہتے ہیں مذکورہ ملائکہ اور حاملین عرش زندہ رہیں گے۔ چنانچہ بعض روایات میں اسی طرح آیا ہے۔

۴۔ ثُمَّ نُفِخَ فِیۡہِ اُخۡرٰی: دوسری مرتبہ صور پھونکنے پر سب زندہ ہو جائیں گے۔

واضح رہے قیامت ایک کائناتی انقلاب کا نام ہے۔ موجودہ کائنات کو لپیٹ لیا جائے گا اور پھر ایک نئی کائنات تخلیق ہوگی جس کی ابتداء نفخة الثانیه سے ہوگی۔

۵۔ فَاِذَا ہُمۡ قِیَامٌ یَّنۡظُرُوۡنَ: اس جملے کا ایک ترجمہ وہی ہے جو آیت کے ذیل میں اختیار کیا گیا ہے۔ دوسرا ترجمہ یہ ہو سکتا ہے: اتنے میں وہ سب کھڑے ہو کر (حکم خدا کا) انتظار کر رہے ہوں گے یا اس انتظار میں ہوں گے کہ ان کے ساتھ کچھ ہونے والا ہے۔

صور کیا ہے؟: صور کیا ہے؟ اس کی تفصیل کا سمجھنا ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔ صرف اس قدر سمجھ لینا کافی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے حکم تکوینی کی ایک صورت ہے جو اِنَّمَاۤ اَمۡرُہٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَیۡئًا اَنۡ یَّقُوۡلَ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ [2] ایک فیصلہ ہے۔

---

[1] ۲۷ نمل: ۸۷

[2] ۳۶ یٰس: ۸۲ (ترجمہ) جب وہ کسی چیز کا ارادہ کر لیتا ہے تو بس اس کا امر یہ ہوتا ہے کہ اسے یہ کہے: ہو جا پس وہ ہو جاتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ قیامت کل کائنات کا انقلاب ہے۔

وَ اَشۡرَقَتِ الۡاَرۡضُ بِنُوۡرِ رَبِّہَا وَ وُضِعَ الۡکِتٰبُ وَ جِایۡٓءَ بِالنَّبِیّٖنَ وَ الشُّہَدَآءِ وَ قُضِیَ بَیۡنَہُمۡ بِالۡحَقِّ وَ ہُمۡ لَا یُظۡلَمُوۡنَ ﴿۶۹﴾

۶۹۔ اور زمین اپنے رب کے نور سے چمک جائے گی اور (اعمال کی) کتاب رکھ دی جائے گی اور پیغمبروں اور گواہوں کو حاضر کیا جائے گا اور ان کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کیا جائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

وَ وُفِّیَتۡ کُلُّ نَفۡسٍ مَّا عَمِلَتۡ وَ ہُوَ اَعۡلَمُ بِمَا یَفۡعَلُوۡنَ ﴿۷۰﴾

۷۰۔ اور ہر شخص نے جو عمل کیا ہے اسے اس کا پورا بدلہ دیا جائے گا اور اللہ ان کے اعمال سے خوب واقف ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اَشۡرَقَتِ الۡاَرۡضُ: ارض سے مراد صحرائے محشر یعنی ارض قیامت ہے۔ جیسے فرمایا:

یَوۡمَ تُبَدَّلُ الۡاَرۡضُ غَیۡرَ الۡاَرۡضِ وَ السَّمٰوٰتُ ...[1]

یہ (انتقام) اس دن ہو گا جب یہ زمین کسی اور زمین سے بدل دی جائے گی اور آسمان بھی۔

اس بدلی ہوئی جدید کائنات کی سرزمین نور الٰہی سے منور ہو جائے گی۔

۲۔ بِنُوۡرِ رَبِّہَا: یہاں نور رب سے کیا مراد ہے؟ متعدد اقوال ہیں۔ نور سے مراد عدل ہے۔ یہ شمس و قمر کے بغیر اللہ کا خلق کردہ نور ہو گا۔ اس نور سے مراد حقائق کا انکشاف ہے کہ قیامت کے دن تمام پردے ہٹ جائیں گے۔

بعض روایات میں اس آیت کی تطبیق ظہور حضرت امام مہدی علیہ السلام پر ہوئی ہے کہ آپؑ کے ظہور سے زمین عدل و انصاف کے نور سے روشن ہو جائے گی۔ یہ روایات تفسیری نہیں، تطبیقی ہیں۔

۳۔ وُضِعَ الۡکِتٰبُ: کتاب رکھ دی جائے گی۔ کتاب سے مراد صحیفۂ اعمال یا لوح محفوظ دو موقف ہیں۔ زیادہ قرین واقع یہ ہے کہ کتاب سے مراد صحیفۂ اعمال ہے۔ اسے قرآن متعدد آیات میں کتاب سے تعبیر فرماتا ہے۔ چنانچہ سورہ کہف میں صحیفۂ اعمال کے لیے عیناً یہی تعبیر موجود ہے:

وَ وُضِعَ الۡکِتٰبُ فَتَرَی الۡمُجۡرِمِیۡنَ

اور نامۂ اعمال (سامنے) رکھ دیا جائے گا، اس وقت

---

[1] ۱۴ ابراھیم: ۴۸

مُشۡفِقِیۡنَ مِمَّا فِیۡہِ وَ یَقُوۡلُوۡنَ یٰوَیۡلَتَنَا مَالِ ہٰذَا الۡکِتٰبِ لَا یُغَادِرُ صَغِیۡرَۃً وَّ لَا کَبِیۡرَۃً اِلَّاۤ اَحۡصٰہَا ...۔[1]

آپ دیکھیں گے کہ مجرمین اس کے مندرجات کو دیکھ کر ڈر رہے ہیں اور یہ کہ رہے ہیں: ہائے ہماری رسوائی! یہ کیسا نامۂ اعمال ہے؟ اس نے کسی چھوٹی اور بڑی بات کو نہیں چھوڑا (بلکہ) سب کو درج کر لیا ہے۔

۴۔ وَ جِایۡٓءَ بِالنَّبِیّٖنَ: انبیاء علیہم السلام کو حاضر کیا جائے گا کہ خود ان سے سوال ہوگا کہ ان سے تبلیغ رسالت کا حق ادا ہو گیا تھا؟ اور امت کو بھی اپنے نبی کے سامنے حاضر کیا جائے گا اور امت سے بھی سوال ہو گا کہ تم نے انبیاء کی دعوت کا کیا جواب دیا تھا؟

فَلَنَسۡـَٔلَنَّ الَّذِیۡنَ اُرۡسِلَ اِلَیۡہِمۡ وَ لَنَسۡـَٔلَنَّ الۡمُرۡسَلِیۡنَ ۙ﴿۶﴾[2]

پس جن کی طرف پیغمبر بھیجے گئے ہم ہر صورت میں ان سے سوال کریں گے اور خود پیغمبروں سے بھی ہم ضرور پوچھیں گے۔

۵۔ وَ الشُّہَدَآءِ: گواہوں کو حاضر کیا جائے گا۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ تمام رازوں کا جاننے والا ہے تاہم اعمال عباد کے بارے میں گواہان سے گواہی لی جائے گی۔ قیامت کے دن گواہی دینے والے فرشتے ہوں گے۔

وَ جَآءَتۡ کُلُّ نَفۡسٍ مَّعَہَا سَآئِقٌ وَّ شَہِیۡدٌ ﴿۲۱﴾[3]

اور ہر شخص ایک ہانکنے والے (فرشتے) اور ایک گواہی دینے والے (فرشتے) کے ساتھ آئے گا.

وقت کا نبی، وقت کی حجت، اپنے اعضاء، زمین و زمان سب گواہی دیں گے۔

۶۔ وَ قُضِیَ بَیۡنَہُمۡ بِالۡحَقِّ: نامہ ہائے اعمال اور گواہوں کے بعد حق کے ساتھ فیصلہ کیا جائے گا۔ اگرچہ نامۂ اعمال اور گواہ نہ بھی ہوں، خود اللہ کی گواہی کافی تھا۔

۷۔ ہُمۡ لَا یُظۡلَمُوۡنَ: ان پر ظلم کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے چونکہ ظلم کرنے کی اللہ کو ضرورت بھی نہیں ہے اور ظلم ایک قبیح عمل ہے جس سے اللہ کی ذات بری ہے۔

۸۔ وَ وُفِّیَتۡ کُلُّ نَفۡسٍ مَّا عَمِلَتۡ: ہر شخص کو اس کے عمل کا بدلہ پورا پورا دیا جائے گا۔ یہ ممکن نہیں کہ کسی نیک عمل کی جزا رہ جائے اور اس کے عمل کے مطابق نہ ملے بلکہ وہ تو ایک نیکی کا ثواب عام طور پر دس گنا اور بعض حالات میں سات سو گنا دیتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ انسان کی ہر جنبش، نامہ عمل میں درج ہونے کے ساتھ متعدد گواہوں کی نگرانی میں ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کا ہر فیصلہ اپنے علم کے علاوہ شواہد کی بنیاد پر ہوگا۔

---

[1] ۱۸ کہف: ۴۹ [2] ۷ اعراف: ۶ [3] ۵۰ ق: ۲۱

وَسِيْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ زُمَرًا ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْهَا فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَتْلُوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ رَبِّكُمْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ؕ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۷۱﴾

۷۱۔اور کفار گروہ در گروہ جہنم کی طرف ہانکے جائیں گے، یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچ جائیں گے تو اس کے دروازے کھول دیے جائیں گے اور جہنم کے کارندے ان سے کہیں گے: کیا تمہارے پاس تم میں سے پیغمبر نہیں آئے تھے، جو تمہارے رب کی آیات تمہیں سناتے اور اس دن کے پیش آنے کے بارے میں تمہیں متنبہ کرتے؟ وہ کہیں گے: ہاں (کیوں نہیں!) لیکن (اب) کفار کے حق میں عذاب کا فیصلہ حتمی ہو چکا ہے۔

قِيْلَ ادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿۷۲﴾

۷۲۔کہا جائے گا: جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ جس میں تمہیں ہمیشہ رہنا ہے، پس تکبر کرنے والوں کا کتنا برا ٹھکانا ہے۔

تشریح کلمات

زُمَرًا: (ز م ر) زمر کے معنی چھوٹی جماعت کے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔وَسِيْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ: اعمال پر شواہد کی روشنی میں فیصلہ کرنے کے بعد کافروں کو جہنم کی طرف ہانک دیا جائے گا۔ سوق، سیاقت، چلانے کو کہتے ہیں۔ یہ ہانکنے والے فرشتے ہوں گے جو اس کام پر مامور ہیں۔ جو چھوٹے چھوٹے گروہوں کی شکل میں لا کر انہیں جہنم کی طرف دھکیلتے ہوئے لے جائیں گے۔

۲۔حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْهَا: جب یہ کافر لوگ جہنم کے پاس پہنچ جائیں گے اور جہنم کے دروازے ان کے لیے کھول دے جائیں گے تو جہنم کے کارندے ان سے چند ایک سوالات طعنے کے طور پر کریں گے۔

الف: کیا اللہ کے رسولوں نے اللہ کی وحدانیت اور اس کی ربوبیت پر دعوت فکر پر مبنی آیات پڑھ کر تمہیں نہیں سنائی تھیں۔

ب: وَيُنْذِرُوْنَكُمْ: اور آج کے دن کے بارے میں تمہیں تنبیہ اور حجت پوری نہیں کی تھی کہ

قیامت کا دن آنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح ہدایت کا سامان فراہم فرمایا ہے اس کے تحت تمہارے جہنم جانے کی نوبت نہیں آنی چاہیے تھی۔

۳۔ قَالُوۡا بَلٰی: ان طعنوں کے جواب میں کافر لوگ کہیں گے: رسولوں نے حجت پوری کرنے اور آج کے دن کے بارے میں تنبیہ کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔

۴۔ لٰکِنۡ حَقَّتۡ کَلِمَۃُ الۡعَذَابِ عَلَی الۡکٰفِرِیۡنَ: کافروں کو قیامت کے دن یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ ہم اللہ تعالیٰ کے عادلانہ اٹل فیصلے کی زد میں آ گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہ تھا:

اَفَمَنۡ کَانَ مُؤۡمِنًا کَمَنۡ کَانَ فَاسِقًا ؕ لَا یَسۡتَوٗنَ ○ [1]	بھلا جو مومن ہو وہ فاسق کی طرح ہو سکتا ہے؟ یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔
وَتَمَّتۡ کَلِمَۃُ رَبِّکَ لَاَمۡلَئَنَّ جَہَنَّمَ مِنَ الۡجِنَّۃِ وَالنَّاسِ اَجۡمَعِیۡنَ ○ [2]	اور تیرے رب کا وہ فیصلہ پورا ہو گیا (جس میں فرمایا تھا) کہ میں جہنم کو ضرور بالضرور جنات اور انسانوں سب سے بھر دوں گا۔

۵۔ قِیۡلَ ادۡخُلُوۡۤا اَبۡوَابَ جَہَنَّمَ: چنانچہ اس گفتگو کے بعد ان کافروں کو آتش جہنم میں ہمیشہ کے لیے ڈال دیا جائے گا۔ جہنم جانے کے اسباب میں سے جس اہم ترین چیز کا ذکر ہے وہ تکبر ہے: فَبِئۡسَ مَثۡوَی الۡمُتَکَبِّرِیۡنَ۔

اہم نکات

۱۔ قیامت کے دن پیش کرنے کے لیے کافروں کے پاس کوئی عذر نہ ہوگا۔

وَسِیۡقَ الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا رَبَّہُمۡ اِلَی الۡجَنَّۃِ زُمَرًا ؕ حَتّٰۤی اِذَا جَآءُوۡہَا وَفُتِحَتۡ اَبۡوَابُہَا وَقَالَ لَہُمۡ خَزَنَتُہَا سَلٰمٌ عَلَیۡکُمۡ طِبۡتُمۡ فَادۡخُلُوۡہَا خٰلِدِیۡنَ ﴿۷۳﴾	۷۳۔ اور جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے رہے ہیں انہیں گروہ در گروہ جنت کی طرف چلایا جائے گا یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچ جائیں گے اور اس کے دروازے کھول دیے جائیں گے اور جنت کے منتظمین ان سے کہیں گے: تم پر سلام ہو تم بہت خوب رہے، اب ہمیشہ کے لیے اس میں داخل ہو جاؤ۔

تفسیر آیات

۱۔ وَسِیۡقَ الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا: اہل تقویٰ کو جنت کی طرف گروہ در گروہ روانہ کیا جائے گا۔ یہاں یہ

---

[1] ۳۲ سجدہ: ۱۸ [2] ۱۱ ہود: ۱۱۹

سوال پیدا ہوا کہ اہل جہنم اور اہل تقویٰ دونوں کے لیے ایک تعبیر سِیۡقَ کیسے استعمال ہوئی جس کے لغوی معنی چلانے، ہانکنے کے ہیں؟

صاحب الکشاف نے جواب دیا ہے: خود اہل جہنم کو ہانک دیا جائے گا جب کہ اہل تقویٰ سوار ہوں گے۔ ان کی سواریوں کو ہانک دیا جائے گا۔ مجمع البیان نے جواب دیا ہے کہ مقابلتاً ایسا کہنا درست ہے جیسے اہل جہنم کے لیے فَبَشِّرۡهُمۡ بِعَذَابٍ اَلِیۡمٍ ''انہیں دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیں'' ہے۔

۳۔ حَتّٰۤی اِذَا جَآءُوۡهَا وَ فُتِحَتۡ اَبۡوَابُهَا: جنت کے کارندے یہاں تحیت و سلام پیش کر رہے ہیں۔ اہل جہنم کو کارندے طعنہ دے رہے ہیں اور یہاں فرشتے اہل جنت کو عزت و تکریم سے نواز رہے ہیں:

۴۔ طِبۡتُمۡ: تم خوب رہے۔ جنت میں داخل ہونے کی سعادت ملنے اور دنیا میں نیک اعمال بجا لانے پر یا معنی یہ ہوسکتا ہے: تم پاکیزہ رہے، گناہوں کی کثافت سے۔

۵۔ فَادۡخُلُوۡهَا خٰلِدِیۡنَ: یہ زندگی ختم ہونے کے لیے وجود میں نہیں آئی۔ یہ زندگی، خواہ جہنم میں جائے یا جنت میں، ابدی ہے۔

اہم نکات

۱۔ فرشتے جنت کے دروازے پر اہل جنت کا استقبال کریں گے۔

وَ قَالُوا الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِیۡ صَدَقَنَا وَعۡدَهٗ وَ اَوۡرَثَنَا الۡاَرۡضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الۡجَنَّةِ حَیۡثُ نَشَآءُ ۚ فَنِعۡمَ اَجۡرُ الۡعٰمِلِیۡنَ ﴿۷۴﴾

۷۴۔ اور وہ کہیں گے: ثنائے کامل ہے اس اللہ کے لیے جس نے ہمارے ساتھ اپنا وعدہ سچ کر دکھایا اور ہمیں اس سرزمین کا وارث بنایا کہ جنت میں ہم جہاں چاہیں جگہ بنا سکیں، پس عمل کرنے والوں کا اجر کتنا اچھا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ قَالُوا الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ: مومن جب جنت میں داخل ہو جائیں گے اور اپنی ابدی زندگی کی ہر آسائش کی جگہ کا معاینہ کریں گے تو درج ذیل مطالب بیان کریں گے:

الف: صَدَقَنَا وَعۡدَهٗ: اللہ تعالیٰ نے ایمان اور عمل صالح پر جس جنت کا وعدہ فرمایا ہے اسے پورا ہوتے دیکھ لیں گے تو بے ساختہ حمد الٰہی زبان پر جاری ہو گی۔

ب: وَ اَوۡرَثَنَا الۡاَرۡضَ: یہاں ارض سے مراد ارضِ جنت ہے۔ وارث بنانے کا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ جنت کی وسیع و عریض سلطنت کا مالک بنانا انسان کے عمل کے مقابلے میں نہیں ہے چونکہ

انسان سے تو اتنا عمل ہوتا بھی نہیں جس سے دنیا کی نعمتوں کا حق ادا ہو سکے۔ جنت اللہ کی طرف سے از روئے تفضل، بلا معاوضہ ہے اس لیے اسے میراث کہا ہے۔

ج: نَتَبَوَّاُ مِنَ الۡجَنَّۃِ حَیۡثُ نَشَآءُ: جہاں چاہے قیام کریں۔ اس سے معلوم ہوا جنت میں مومن کو ایک وسیع سلطنت مل جائے گی۔ اس میں وہ اس سلطنت کے جس علاقے میں چاہے جگہ بنا سکتا ہیں۔ دنیا کی طرح کسی ایک جگہ پر قیام کرنے پر انحصار نہیں ہے۔

۲۔ فَنِعۡمَ اَجۡرُ الۡعٰمِلِیۡنَ: کسی اجر اور ثواب کا مستحق صرف اور صرف عمل سے بنتا ہے۔ لہٰذا یہ نوید بھی صرف عمل کرنے والوں کے لیے ہے۔

اہم نکات

۱۔ جنت میں کسی ایک جگہ پر انحصار نہیں ہو گا۔

۲۔ جنت، عمل سے کہیں زیادہ ثواب پر مشتمل ہو گی۔

وَ تَرَی الۡمَلٰٓئِکَۃَ حَآفِّیۡنَ مِنۡ حَوۡلِ الۡعَرۡشِ یُسَبِّحُوۡنَ بِحَمۡدِ رَبِّہِمۡ ۚ وَ قُضِیَ بَیۡنَہُمۡ بِالۡحَقِّ وَ قِیۡلَ الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۷۵﴾

۷۵۔ اور آپ فرشتوں کو عرش کے گرد حلقہ باندھے ہوئے اپنے رب کی ثنا کے ساتھ تسبیح کرتے ہوئے دیکھیں گے اور لوگوں کے درمیان برحق فیصلہ ہو چکا ہو گا اور کہا جائے گا: ثنائے کامل اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ تَرَی الۡمَلٰٓئِکَۃَ: جب آسمانوں کو لپیٹ لیا جائے گا تو اس وقت عرش الٰہی اور اس کے گرد فرشتے موجود نظر آئیں گے۔

عرش اس مقام ربوبیت کو کہتے ہیں جہاں سے تدبیر کائنات سے متعلق اوامر صادر ہوتے ہیں اور عرش کے گرد موجود فرشتے ان اوامر کو نافذ کرتے ہیں۔ اس طرح آیت کا ظاہری مفہوم یہ بنتا ہے کہ جب آسمانوں کو لپیٹ لیا جائے گا تو اس وقت اوامر الٰہی اور اس کے نافذ کرنے والے ہی نظر آئیں گے۔ جو اللہ کی حمد کے ساتھ تسبیح میں مشغول ہیں۔

۲۔ وَ قُضِیَ بَیۡنَہُمۡ بِالۡحَقِّ: بَیۡنَہُمۡ کی ضمیر ملائکہ کی طرف نہیں جاتی چونکہ ملائکہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ فیصلے کی ضرورت پیش آئے۔ لہٰذا یہ فیصلہ لوگوں، جماعتوں اور امتوں کے درمیان ہو گا۔ جب کائنات لپیٹنے کے بعد عرش الٰہی اور فرشتے نظر آ رہے ہوں گے اس وقت جن کے درمیان فیصلہ ہونا تھا ہو چکا

ہو گا لہٰذا قُضِیَ کو ماضی کے معنوں میں لینا مناسب ہو گا۔

۳۔ وَ قِیۡلَ الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ: یہ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ کہنے والے کون لوگ ہوں گے، اس میں متعدد اقوال ہیں۔ بعض کے نزدیک یہ کہنے والے اہل تقویٰ ہوں گے۔ جیسے پہلے ذکر ہو گیا کہ اہل جنت کے آخری کلمات اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ہوں گے۔

خالی

سُورَةُ غَافِرٍ

خالی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اس سورة المبارکہ کو المؤمن اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں مؤمن آل فرعون کا ذکر ہے۔ چنانچہ اس سورہ میں مؤمن آل فرعون کا موقف بڑے اہتمام کے ساتھ دس سے زائد آیات میں اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا ہے۔

فضیلت سورہ ہائے حٰمٓ: سات سورہ ہائے قرآن المؤمن، السجدۃ، الشوریٰ، الزخرف، الدخان، الجاثیۃ اور الاحقاف کی ابتداء حروف مقطعات حٰمٓ سے ہوتی ہے۔ ان سورہ ہائے قرآن کو حوامیم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جن کی چند ایک خصوصی فضیلت اور اہمیت ہے۔ ذیل میں اس موضوع پر چند احادیث کا ذکر کرتے ہیں:

زر بن حبیش راوی ہیں کہتے ہیں:

میں نے کوفہ کی جامع مسجد میں حضرت امیرالمومنین علیہ السلام کی خدمت میں قرآن کی اول سے لے کر آخر تک تلاوت کی۔ جب میں سورہ ہائے حوامیم تک پہنچا تو آپ علیہ السلام نے فرمایا:

قَدْ بَلَغْتَ عَرَائِسَ الْقُرْآنِ....[1] تو قرآن کی زیبائشوں تک پہنچ گیا ہے۔

انس بن مالک راوی ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ نے فرمایا:

اَلْحَوَامِیْمُ دِیْبَاجُ الْقُرْآنِ۔[2] حوامیم قرآن کی زینت ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ سے روایت ہے:

اَلْحَوَامِیْمُ سَبْعَةٌ وَ اَبْوَابُ النَّارِ سَبْعَةٌ جَهَنَّمُ وَ الْحُطَمَةُ وَ لَظٰی وَ سَعِیرٌ وَ حوامیم کی تعداد سات ہے اور جہنم کے دروازے بھی سات ہیں: جهنم، الحطمة، لظی، سعیر،

---

[1] مستدرک الوسائل ۴: ۳۷۷ [2] مستدرک الوسائل۔ ۴: ۲۱۸

سَقَرُ وَ هَاوِيَةُ الْجَحِيمُ۔ وَ يَوْمِ الْقِيَامَةِ تَاتِی كُلُّ سُوْرَةٍ وَ تَقِفُ عَلَى بَابٍ مِنْ هَذِهِ الْاَبْوَابِ وَ لَا تَدِعُ قَارِئَهَا مِمَّنْ آمَنَ بِاللّٰهِ اَنْ يُذْهَبَ بِهِ اِلَى النَّارِ۔[1]

سقر، هاويه، جحیم۔ قیامت کے دن ان میں سے ہر سورہ جہنم کے ان دروازوں میں سے ایک کے آگے کھڑی ہوگی اور ایمان کے ساتھ ان سورہ ہائے قرآن کے پڑھنے والے کو آتش کی طرف جانے نہیں دے گی۔

یہ ایک سربستہ راز ہے کہ ان سات سورتوں کی ابتداء حٰمٓ سے ہوتی ہے۔ ان کی ابتداء میں حروف مقطعات کی وحدت کس بات کی علامت ہے؟ کیا حروف مقطعات کی وحدت ان سورہ ہائے مبارکہ میں مضامین کی وحدت کی علامت ہے یا کسی اور خصوصیت کی وحدت ہے؟ احادیث میں ان سورہ ہائے مبارکہ کو دیباج القرآن، قرآن کی زینت، ریحانة القرآن، قرآن کا گلدستہ فرمایا ہے۔ ایک راز ہے جو تشنۂ تحقیق ہے۔

---

[1] مستدرك الوسائل ۴: ۲۱۸

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بنام خدائے رحمن رحیم

حٰمٓ ۚ﴿۱﴾

۱۔ حا، میم۔

تَنۡزِیۡلُ الۡکِتٰبِ مِنَ اللّٰہِ الۡعَزِیۡزِ الۡعَلِیۡمِ ۙ﴿۲﴾

۲۔ اس کتاب کی تنزیل بڑے غالب آنے والے، دانا اللہ کی طرف سے ہے،

غَافِرِ الذَّنۡۢبِ وَ قَابِلِ التَّوۡبِ شَدِیۡدِ الۡعِقَابِ ۙ ذِی الطَّوۡلِ ؕ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ؕ اِلَیۡہِ الۡمَصِیۡرُ ﴿۳﴾

۳۔ جو گناہ معاف کرنے والا اور توبہ قبول کرنے والا، شدید عذاب دینے والا اور بڑے فضل والا ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔

تشریح کلمات

الطَّوۡلِ: (ط و ل) یہ لفظ فضل و احسان کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ تَنۡزِیۡلُ الۡکِتٰبِ: یہ کتاب اس ذات کی نازل کردہ ہے جس کے یہ اوصاف ہیں:

الف: الۡعَزِیۡزِ: وہ ہر چیز پر غالب آنے والا ہے۔ لہٰذا کوئی کلام ایسا نہ ہوگا جو اس کے کلام پر غالب آسکے۔

ب: الۡعَلِیۡمِ: وہ ایسا دانا ہے کائنات کے کسی گوشے میں کوئی چیز اس سے پوشیدہ نہ ہوگی لہٰذا اس کتاب میں کسی قسم کی علمی خامی نہیں ہوگی۔

ج: غَافِرِ الذَّنْۢبِ: گناہوں سے درگزر کرنے والے کی طرف سے ہے کہ وہ بہت سے گناہوں سے از خود درگزر فرماتا ہے۔

د: قَابِلِ التَّوۡبِ: وہ توبہ قبول کرنے والا ہے کہ کوئی مشرک یا مجرم اپنے شرک اور جرم کو چھوڑ کر اس کی بارگاہ کی طرف رجوع کرے تو وہ معاف کرنے والا ہے۔

ھ: شَدِیۡدِ الۡعِقَابِ: ساتھ منکرین، معاندین اور کفر پر ڈٹ جانے والوں سے خوب انتقام بھی لینے والا ہے لیکن اس کی نوبت غَافِرِ الذَّنۡۢبِ اور قَابِلِ التَّوۡبِ کے بعد آتی ہے۔ دعائے امیر المؤمنین علیہ السلام میں آیا ہے:

یا من سبقت رحمتُه غضبه...[1]　　اے وہ ذات جس کی رحمت اس کے غضب سے بہت پہلے ہے۔

ح: ذِی الطَّوۡلِ: بڑے فضل و کرم والا ہے۔ قابل توجہ ہے کہ شَدِیۡدِ الۡعِقَابِ کے بعد بھی اس کے فضل و کرم سے مایوس نہیں ہونا چاہیے کہ اگر ایک منکر اور معاند اپنے کفر پر ایسے ڈٹ جاتا ہے کہ شدید العقاب کا سزاوار ٹھہرتا ہے تاہم ابھی اللہ کے فضل و کرم کی طرف واپس آنے کی گنجائش موجود ہے۔

اس آیت میں رحمت کے تین اوصاف کے درمیان غضب کی ایک صفت بیان ہوئی ہے۔

مَا یُجَادِلُ فِیۡۤ اٰیٰتِ اللّٰہِ اِلَّا الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فَلَا یَغۡرُرۡکَ تَقَلُّبُہُمۡ فِی الۡبِلَادِ ﴿۴﴾

۴۔ اللہ کی آیات کے بارے میں صرف کفار ہی جھگڑتے ہیں لہٰذا ان کا شہروں میں چلنا پھرنا آپ کو دھوکے میں نہ رکھے۔

تفسیر آیات

۱۔ مَا یُجَادِلُ فِیۡۤ اٰیٰتِ اللّٰہِ: جب آیات الٰہی اپنی حقانیت کے واضح اور غیر مبہم دلائل کے ساتھ انسانیت کو حق اور نجات کی دعوت پیش کرتی ہیں تو جن کی فطرت سلیم، عقل اور وجدان بیدار ہے وہ ان آیات سے اپنی نجات کا راستہ پا لیتے اور حق کی طرف آ جاتے ہیں۔

البتہ جو لوگ کفر میں رسوخ رکھتے اور حق کے خلاف ڈٹ جاتے ہیں وہ ان آیات سے متاثر ہونے کی بجائے ان میں کج بحثی شروع کر دیتے اور حق ٹھکرا دیتے ہیں۔

۲۔ فَلَا یَغۡرُرۡکَ تَقَلُّبُہُمۡ فِی الۡبِلَادِ: مختلف ممالک میں ان کی رفت و آمد، ان کے دندناتے پھرنے

[1] بحار الانوار ۹۱: ۲۳۹

اوران کی پرتعیش زندگی سے کہیں اس دھوکے میں آ جاؤ کہ ہم لوگ حق پر ہیں تو محروم کیوں ہیں؟ وہ اگر باطل پر ہیں تو عیش وعشرت میں کیوں ہیں؟

اس دھوکے میں نہ آ ؤ کہ وہ عذاب الٰہی سے بچ گئے ہیں اور آیات الٰہی سے جنگ کرنے کے باوجود انہیں کوئی سزا نہیں ملے گی۔ ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ انہیں مہلت مل رہی ہے تا کہ وہ اپنے جرم میں اضافہ کریں اور مومنین کے ایمان کی آزمائش میں اضافہ ہو جائے۔

اہم نکات

۱۔ مومن کو اہل باطل کی وقتی اوچھل کود سے متاثر نہیں ہونا چاہیے۔ جرم کے باوجود مہلت ملنا بہت بڑے عذاب کا پیش خیمہ ہے۔

كَذَّبَتۡ قَبۡلَهُمۡ قَوۡمُ نُوۡحٍ وَّ الۡاَحۡزَابُ مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ ۪ وَ هَمَّتۡ كُلُّ اُمَّةٍۢ بِرَسُوۡلِهِمۡ لِيَاۡخُذُوۡهُ وَجٰدَلُوۡا بِالۡبَاطِلِ لِيُدۡحِضُوۡا بِهِ الۡحَقَّ فَاَخَذۡتُهُمۡ ۟ فَكَيۡفَ كَانَ عِقَابِ ۝

۵۔ ان سے پہلے نوح کی قوم اور ان کے بعد کے گروہوں نے بھی (انبیاء کی) تکذیب کی ہے اور ہر امت نے اپنے رسول کو گرفتار کرنے کا عزم کیا اور باطل ذرائع سے جھگڑتے رہے تا کہ اس سے حق کو زائل کر دیں تو میں نے انہیں اپنی گرفت میں لیا پس (دیکھ لو) میرا عذاب کیسا تھا۔

تفسیر آیات

۱۔ آیت کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیات اس وقت نازل ہو رہی تھیں جب کفار مکہ حضورؐ کے خلاف جھگڑے اور بحثیں کر رہے تھے اور ہر طرف سے الزامات لگائے جا رہے تھے نیز آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قتل کرنے کی سازش میں بھی مصروف تھے۔ ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے سابقہ امتوں کی مثال پیش کی جا رہی ہے:

۲۔ وَ هَمَّتۡ كُلُّ اُمَّةٍۢ بِرَسُوۡلِهِمۡ: ہر امت نے اپنے رسول کو پکڑنے کی کوشش کی اور باطل ذرائع سے جھگڑتے رہے۔

۳۔ فَاَخَذۡتُهُمۡ ۟ فَكَيۡفَ كَانَ عِقَابِ: لیکن وہ اس میں نہ صرف یہ کہ کامیاب نہیں ہوئے بلکہ وہ اللہ کی گرفت میں آ گئے اور ان کا خاتمہ عذاب الٰہی پر ہوا۔

وَ كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ۶

۶۔ اور اسی طرح کفار کے بارے میں آپ کے پروردگار کا یہ فیصلہ حتمی ہے کہ وہ اہل دوزخ ہیں۔

تفسیر آیات

جس طرح سابقہ امتوں میں تکذیب، جھگڑا کرنے والوں اور اپنے رسول کو شہید کرنے کی سازش کرنے والوں کو اللہ نے اپنی گرفت میں لے لیا ہے،

۱۔ كَذٰلِكَ: اسی طرح آپ کی قوم میں سے بھی ایسے ہی لوگوں پر اللہ کا فیصلہ اٹل ہو چکا ہے۔

۲۔ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ: ایک اٹل فیصلے کی خبر ہے کہ ان کا بھی وہی انجام ہو گا۔

اہم نکات

۱۔ جرم اور مکافات جرم میں قانون سب کے لیے یکساں ہے: فَاَخَذْتُهُمْ ....

اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَ مَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَ يَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّ عِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَ اتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ وَ قِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ۷

۷۔ جو (فرشتے) عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور جو (فرشتے) اس کے اردگرد ہیں سب اپنے رب کی ثناء کے ساتھ تسبیح کر رہے ہیں اور اس پر ایمان لائے ہیں اور ایمان والوں کے لیے مغفرت طلب کرتے ہیں، ہمارے پروردگار! تیری رحمت اور علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے پس ان لوگوں کو بخش دے جنہوں نے توبہ کی ہے اور تیرے راستے کی پیروی کی ہے اور انہیں عذاب جہنم سے بچا لے۔

رَبَّنَا وَ اَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ ِۨالَّتِيْ وَعَدْتَّهُمْ وَ مَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَ اَزْوَاجِهِمْ وَ ذُرِّيّٰتِهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۸

۸۔ ہمارے پروردگار! انہیں ہمیشہ رہنے والی جنتوں میں داخل فرما جن کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہے اور ان کے باپ دادا اور ان کی ازواج اور ان کی اولاد میں سے جو نیک ہوں انہیں بھی، تو یقیناً بڑا غالب آنے والا، حکمت والا ہے۔

وَ قِهِمُ السَّيِّاٰتِ ؕ وَ مَنْ تَقِ السَّيِّاٰتِ

۹۔ اور انہیں برائیوں سے بچا اور جسے تو نے اس

يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهٗ ۭ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ روز برائیوں سے بچا لیا اس پر تو نے رحم فرمایا اور یہی تو بڑی کامیابی ہے۔

تفسیر آیات

ا۔ الَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ: اللہ تعالیٰ کو کسی محسوس تخت کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ تو اس وقت بھی اپنی پوری ملکوتی طاقت وقوت کے ساتھ موجود تھا جب عرش و کرسی اور کوئی چیز وجود میں نہیں آئی تھی۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ اِذْ لَا كَانَ فَخَلَقَ الْكَانَ وَ الْمَكَانَ ....[1] اللہ اس وقت بھی تھا جب "تھا" بھی نہ تھا۔ پھر زمان و مکان کو خلق فرمایا۔

لہٰذا عرش الٰہی سے مراد اللہ تعالیٰ کا تدبیری مقام ہے جس تدبیر پر کائنات کا نظام قائم ہے اور ممکن ہے حاملین عرش سے مراد وہ ملائکہ مقربین ہوں جو اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے زیادہ قرب رکھتے ہیں۔ حاملین عرش کے بارے میں تفصیل میں ہم نہیں جا سکتے اور عرش کو اٹھانے کی تعبیر سے مراد کیا ہے؟ ہمارے لیے واضح نہیں ہے۔

حاملین عرش اور عرش کے گرد فرشتے اللہ کے نہایت مقتدر فرشتے ہیں۔ مکہ کے طاغوتیوں کے مقابلے میں بے بس اور دل شکستہ مومنین کو حوصلہ دیا جا رہا ہے کہ تم رنجیدہ اور دل شکستہ نہ ہوں۔ حاملین عرش الٰہی اور عرش کے گرد و پیش رہنے والے اللہ تعالیٰ کے مقتدر ترین ملائکہ تمہارے ساتھ ہیں۔

۲۔ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ: حاملین عرش اور عرش کے گرد و پیش کے فرشتے اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں۔ وہ صرف اللہ کی پرستش کرتے ہیں۔ مشرکین کو، جو فرشتوں کو اپنا معبود بناتے تھے، بتانا مقصود ہے کہ جنہیں تم معبود بناتے ہو وہ اللہ کی حمد و تسبیح کے ذریعے اللہ کی بندگی کر رہے ہیں۔

۳۔ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ: وہ اللہ کی معبودیت پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس میں بھی مشرکین کی رد ہے جو فرشتوں کو ربوبیت میں اللہ کا شریک سمجھتے ہیں۔

۴۔ وَ يَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: یہ ملائکہ اہل ایمان کے لیے طلب مغفرت کرتے اور ان کے حق میں دعا کرتے ہیں۔ اس دعا کا مضمون آیت کے اگلے جملوں میں ذکر ہو رہا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ ایمان والے، زمین سے زیادہ آسمان میں پہچانے جاتے ہیں اور ایمان ہی وہ رشتہ ہے جس سے عرش والے فرش والوں سے محبت اور ان کے لیے دعا کرتے ہیں۔

۵۔ رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا: اے ہمارے مالک! تیری رحمت اور تیرا علم کل کائنات

---

[1] الکافی ۱: ۴۴۱

کی ہر چیز سے وسیع تر ہے۔ آنے والے دعائیہ جملوں سے پہلے اللہ تعالیٰ کی صفات کے ذریعے حمد و ثنا ہو رہی ہے۔ جن دو صفات کا آنے والے دعا سے تعلق ہے یعنی ہم اس ذات سے دعا کر رہے ہیں جس کی نہ رحمت میں کمی ہے کہ کسی کو ملے، کسی کو نہ ملے، نہ علم میں کمی ہے کہ کسی محتاج کا علم ہو جائے اور کسی کا نہ ہو۔ ذیل میں فرش والوں کے حق میں عرش والوں کی دعا مذکور ہیں:

الف: فَاغۡفِرۡ لِلَّذِيۡنَ تَابُوۡا وَاتَّبَعُوۡا سَبِيۡلَكَ: اے اللہ! ان لوگوں کو بخش دے جنہوں نے کفر و شرک سے یا گناہ سے توبہ کر کے تیری راہ کو اختیار کیا ہے۔

ب: وَقِهِمۡ عَذَابَ الۡجَحِيۡمِ: ان کی توبہ قبول کر کے ان کو معاف کرنے کا نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ جہنم کے عذاب سے بچ جائیں گے۔

ج: رَبَّنَا وَاَدۡخِلۡهُمۡ جَنّٰتِ عَدۡنِ: اے ہمارے مالک! انہیں عدن کی جنتوں میں داخل فرما جس کا تو نے اپنے رسولوں کے ذریعے وعدہ فرمایا ہے۔

د: وَمَنۡ صَلَحَ مِنۡ اٰبَآئِهِمۡ: ان مومنین کے باپ دادا کو بھی جنت عدن میں داخل فرمایا جن میں جنت جانے کی صلاحیت ہو۔ یعنی وہ مشرک اور کافر نہ مرے ہوں۔ اس صورت میں ان میں یہ صلاحیت نہیں آتی کہ وہ جنت میں داخل ہوں بلکہ وہ بھی ہیں مومن لیکن اس درجے کے نہیں ہیں جس درجے کی ان کی اولاد ہے۔ دعا یہ ہے: مالک! ان کے باپ دادوں کو بھی ان کے درجے میں لا۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ قیامت کے دن نیک اولاد کام آتی ہے۔ اس آیت سے آیۂ:

يَوۡمَ لَا يَنۡفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوۡنَ ۙ﴿﴾ اِلَّا مَنۡ	اس روز نہ مال کچھ فائدہ دے گا اور نہ اولاد۔ سوائے
اَتَى اللّٰهَ بِقَلۡبٍ سَلِيۡمٍ ﴿﴾[1]	اس کے جو اللہ کے حضور قلب سلیم لے کر آئے۔

کا یہ مفہوم درست ہو جاتا ہے کہ اگر قلب سلیم لے کر آئے تو مال و اولاد نفع دے سکتی ہے۔

قیامت کے دن اولاد اس جگہ کام آتی ہے جہاں اولاد کا درجہ باپ سے بالاتر ہو تو اولاد اپنے آباء و اجداد کی شفاعت کر کے انہیں اپنے درجے پر لے جائے گی۔

ھ: وَاَزۡوَاجِهِمۡ وَذُرِّيّٰتِهِمۡ: ان مومنین کی ازواج و اولاد کو بھی جنت عدن میں داخل فرما، ان میں صلاحیت ہونے کی صورت میں۔ یعنی ایمان اور عمل صالح ہے لیکن اپنے شوہر اور اپنے باپ کے درجے کی نہیں ہے۔

اللہ کے مقتدر فرشتوں کی اس دعا سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قیامت کے دن اولاد اپنے باپ دادا کی اور باپ دادا اپنی اولاد کی، شوہر اپنی زوجہ کی اور زوجہ اپنے شوہر کی شفاعت کر کے اپنے درجے میں

---

[1] ۲۶ شعراء: ۸۸۔۸۹

ساتھ لے جا سکتی ہے۔

۲: وَقِهِمُ السَّيِّاٰتِ: اے مالک! ان مومنین کو برائیوں سے بچا لے۔ یہاں السَّيِّاٰتِ برائیوں سے مراد گناہ بھی ہو سکتے ہیں اور گناہ کی سزائیں بھی۔ جیسے قیامت کی ہولناکیاں، جہاں انسان کے سارے راز فاش ہو جائیں گے، اہل محشر کے سامنے رسوا ہو جائیں گے، اپنی سیاہ کاریاں دیکھ کر حساب و عذاب کے ایک ناقابل تصور خوف سے دوچار ہوں گے۔ اس قسم کی تمام سیئات سے بچانے کی دعا ہے۔

۳۔ وَمَنْ تَقِ السَّيِّاٰتِ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهٗ: قیامت کے دن جسے تو نے برائیوں سے بچا لیا اس پر تو نے رحم فرمایا۔ اس جملے میں يَوْمَئِذٍ "اس دن" قرینہ بن سکتا ہے کہ السَّيِّاٰتِ سے مراد برائیوں کی سزائیں ہیں چونکہ قیامت کے دن برائیوں کی سزا کا سامنا ہے۔

۴۔ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ: جو قیامت کی ہولناکیوں سے بچتا ہے وہ ایسی عظیم، ابدی اور دائمی کامیابی حاصل کرتا ہے جس سے بڑی کامیابی قابل تصور نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ دعائے ملائکہ اور شفاعت کے لیے صالح اور اہل ہونا شرط ہے۔

۲۔ قیامت کی ہولناکیوں سے نجات،

ہے۔

۳۔ نیک اور صالح لوگوں کو قیامت کے دن صالح اولاد فائدہ دے سکتی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنَادَوْنَ لَمَقْتُ اللّٰهِ اَكْبَرُ مِنْ مَّقْتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ اِذْ تُدْعَوْنَ اِلَى الْاِيْمَانِ فَتَكْفُرُوْنَ ۝۱۰

۱۰۔ جنہوں نے کفر اختیار کیا بلاشبہ انہیں پکار کر کہا جائے گا: (آج) جتنا تم اپنے آپ سے بیزار ہو رہے ہو اللہ اس سے زیادہ تم سے اس وقت بیزار تھا جب تمہیں ایمان کی طرف دعوت دی جاتی تھی اور تم کفر کرتے تھے۔

تفسیر آیات

قیامت کے دن کافروں کو اپنے کفر کا نتیجہ نظر آئے گا تو بڑی ندامت کے ساتھ اپنے جرائم پر اپنے آپ کو کوستے ہوں گے۔ اس وقت ندا آئے گی: آج اپنی جرائم دیکھ کر جتنا تم اپنے آپ سے بیزار ہو رہے ہو، اس سے زیادہ اللہ تم سے بیزار ہو رہا تھا جب اللہ تمہیں اپنی طرف بلا رہا تھا اور تم کفر اختیار کر کے اللہ سے

منہ موڑتے تھے۔ اللہ ہادیان برحق کے ذریعے اپنی رحمتوں کا دروازہ کھول رہا تھا تم ان کا مذاق اڑا رہے تھے۔

اہم نکات

۱۔ جو دنیا میں اللہ کی دعوت سے بیزار ہوتے ہیں، قیامت کے دن اللہ ان سے بیزار ہو گا۔

قَالُوۡا رَبَّنَاۤ اَمَتَّنَا اثۡنَتَیۡنِ وَ اَحۡیَیۡتَنَا اثۡنَتَیۡنِ فَاعۡتَرَفۡنَا بِذُنُوۡبِنَا فَہَلۡ اِلٰی خُرُوۡجٍ مِّنۡ سَبِیۡلٍ ﴿۱۱﴾

۱۱۔ وہ کہیں گے: اے ہمارے پروردگار! تو نے ہمیں دو مرتبہ موت اور دو مرتبہ زندگی دی ہے، اب ہم اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں تو کیا نکلنے کی کوئی راہ ہے؟

تفسیر آیات

۱۔ قَالُوۡا رَبَّنَاۤ اَمَتَّنَا اثۡنَتَیۡنِ: کفار اس پکار کے جواب میں کہیں گے: دو مرتبہ موت اور دو مرتبہ زندگی کے بعد تو ہم حقیقت کو سمجھ گئے ہیں۔ اب اعتراف گناہ کے مرحلے پر آ گئے ہیں۔

بعض کے نزدیک پہلی موت وہ ہے جو دنیا میں آتی ہے۔ پھر برزخی زندگی پہلا احیاء ہے، پھر برزخی زندگی کو دوسری موت دی جاتی ہے۔ پھر قیامت کی زندگی دوسرا احیاء ہے۔

بعض کے نزدیک پہلی موت وہ ہے جو اس زندگی سے پہلے تھی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

کَیۡفَ تَکۡفُرُوۡنَ بِاللّٰہِ وَ کُنۡتُمۡ اَمۡوَاتًا فَاَحۡیَاکُمۡ ...[1]

اللہ کے بارے میں تم کس طرح کفر اختیار کرتے ہو؟ حالانکہ تم بے جان تھے اللہ نے تمہیں حیات دی۔

اس آیت کے مطابق پہلی زندگی دنیوی زندگی ہے۔ دوسری موت وہ ہے جو دنیوی زندگی کا خاتمہ کرے اور دوسری حیات قیامت کی زندگی ہے۔ یہی نظریہ ہمارے نزدیک قرین واقع ہے۔

جب ان کافروں کو دوسری بار زندہ کیا جائے گا تو پردے ہٹ چکے ہوں گے۔ حقائق سامنے آ جائیں گے تو اپنے گناہوں کا اعتراف کریں گے۔

۲۔ فَہَلۡ اِلٰی خُرُوۡجٍ مِّنۡ سَبِیۡلٍ: اس ہولناک عذاب کا منظر دیکھ کر مایوسانہ استفہامیہ جملہ کہیں گے: کیا اس عذاب سے نکلنے کا کوئی راستہ ہے؟ خود انہیں معلوم ہو چکا ہو گا کوئی راستہ نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ مشاہدۂ عذاب کے بعد آرزوئے نجات ہر کافر کرے گا۔

۱؎ ۲ بقرہ: ۲۸

ذٰلِكُمۡ بِاَنَّهٗۤ اِذَا دُعِیَ اللّٰهُ وَحۡدَهٗ كَفَرۡتُمۡ ۚ وَ اِنۡ یُّشۡرَكۡ بِهٖ تُؤۡمِنُوۡا ؕ فَالۡحُكۡمُ لِلّٰهِ الۡعَلِیِّ الۡكَبِیۡرِ ﴿۱۲﴾

۱۲۔ایسا اس لیے ہوا کہ جب خدائے واحد کی طرف دعوت دی جاتی تھی تو تم انکار کرتے تھے اور اگر اس کے ساتھ شریک ٹھہرایا جاتا تو تم مان لیتے تھے، پس (آج) فیصلہ برتر، بزرگ اللہ کے پاس ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ ذٰلِكُمۡ بِاَنَّهٗ: اس عذاب سے نکلنے کے سارے راستے تم نے دنیا میں بند کر دیے تھے۔

۲۔ اِذَا دُعِیَ اللّٰهُ وَحۡدَهٗ كَفَرۡتُمۡ: تم نے سارے راستے بند اس طرح کیے کہ جب تمہیں صرف ایک اللہ کی طرف دعوت دی جاتی اور کہا جاتا: قولوا لا الٰه الا اللّٰه تفلحوا ....۱؎ کہو اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، نجات پاؤ گے تو اس نجات کا راستہ تم نے خود بند کر دیا۔

۳۔ وَ اِنۡ یُّشۡرَكۡ بِهٖ تُؤۡمِنُوۡا: تم سے کہا گیا تھا:

مَنۡ یُّشۡرِكۡ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخۡطَفُهُ الطَّیۡرُ ....۲؎

جو اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتا ہے تو وہ ایسا ہے گویا آسمان سے گر گیا پھر اسے پرندے اچک لیں ....

آج تم آسمان کی بلندی سے گر کر پاش پاش ہو رہے ہو چونکہ تم نے اللہ پر کفر اختیار کیا اور شرک پر ایمان لے آئے تھے۔

۴۔ فَالۡحُكۡمُ لِلّٰهِ الۡعَلِیِّ الۡكَبِیۡرِ: آج فیصلہ اسی خدائے واحد کے ہاتھ میں ہے جو ہر طاقت و قوت سے بالاتر قوت کا مالک ہے اور اپنی کبریائی میں بھی یکتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ مشرک نجات کے سارے راستے دنیا میں بند کر کے جاتا ہے۔

هُوَ الَّذِیۡ یُرِیۡكُمۡ اٰیٰتِهٖ وَ یُنَزِّلُ لَكُمۡ مِّنَ السَّمَآءِ رِزۡقًا ؕ وَ مَا یَتَذَكَّرُ اِلَّا مَنۡ یُّنِیۡبُ ﴿۱۳﴾

۱۳۔ وہ وہی ہے جو تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے اور آسمان سے تمہارے لیے رزق نازل فرماتا ہے اور نصیحت تو صرف وہی حاصل کرتا ہے جو (اس کی طرف) رجوع کرتا ہے۔

۱؎ حدیث نبویؐ۔ بحار ۱۸: ۲۰۲ ۲؎ ۲۲ حج: ۳۱

تفسیر آیات

۱۔ هُوَ الَّذِیۡ یُرِیۡکُمۡ اٰیٰتِهٖ: اللہ نے اس کائنات، آفاق و انفس میں اپنی ایک نہیں بے شمار نشانیاں دکھائی ہیں جو اللہ کی ربوبیت، وحدانیت اور مدبریت پر دلالت کرتی ہیں۔

کسی غیر خدا معبود کی طرف سے ایک آیت دکھاؤ:

هٰذَا خَلۡقُ اللّٰهِ فَاَرُوۡنِیۡ مَاذَا خَلَقَ الَّذِیۡنَ مِنۡ دُوۡنِهٖ ... ۱؎

یہ ہے اللہ کی تخلیق، اب ذرا مجھے دکھاؤ اللہ کے سوا دوسروں نے کیا پیدا کیا ہے....

اس جگہ حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

لَوْ کَانَ اِلٰهٌ آخَرُ لَاَتَتْكَ رُسُلُهٗ وَ لَرَاَیْتَ آثَارَ مَمْلَكَتِهٖ۔ ۲؎

اگر کوئی اور معبود ہوتا تو اس کی طرف سے رسول آتے اور اس کی مملکت کے آثار دکھائی دیتے۔

۲۔ وَ یُنَزِّلُ لَکُمۡ مِّنَ السَّمَآءِ رِزۡقًا: اللہ تعالیٰ کی تدبیری نشانیوں میں ایک اہم اور سب کے لیے محسوس نشانی روزی کی فراہمی ہے۔ یہ روزی اللہ آسمان سے فراہم کرتا ہے، جو آسمان خود مشرکین کے اعتراف کے مطابق اللہ کا بنایا ہوا ہے۔

پہلے بھی متعدد آیات میں اس بات کا ذکر آیا ہے کہ روزی کے بیشتر اسباب آسمان سے فراہم ہوتے ہیں۔ مثلاً ہوا، دھوپ، بارش اور بجلی۔ بجلی کی چمک سے فضا سے نائٹروجن زمین پر بارش کے پانی کے ذریعے گرتی ہے اور قدرتی کھاد کی صورت میں زمین کو سرسبز کرتی ہے۔

۳۔ وَ مَا یَتَذَکَّرُ اِلَّا مَنۡ یُّنِیۡبُ: ان سے آگاہ وہی ہو سکتے ہیں جو عناد اور ہٹ دھرمی چھوڑ کر ان نشانیوں میں غور کریں۔ ہٹ دھرمی کے ساتھ کسی کی فکر و ذکر فعال نہیں ہو سکتی۔

فَادۡعُوا اللّٰهَ مُخۡلِصِیۡنَ لَهُ الدِّیۡنَ وَ لَوۡ کَرِهَ الۡکٰفِرُوۡنَ ﴿۱۴﴾

۱۴۔ پس دین کو صرف اس کے لیے خالص کر کے اللہ ہی کو پکارو اگرچہ کفار کو برا لگے۔

تفسیر آیات

۱۔ فَادۡعُوا اللّٰهَ: پس اگر غیر خدا کے معبود و مدبر ہونے پر کوئی ایک علامت بھی نہیں ہے تو اس موہوم چیز کو ترک کر کے صرف اللہ کو پکارو۔

۲۔ مُخۡلِصِیۡنَ لَهُ الدِّیۡنَ: دینداری اور نظریے کو صرف اللہ کے لیے خالص کرو۔ اس میں کسی غیر اللہ

ا؎ ۳۱ لقمان: ۱۱ ۲؎ وسائل الشیعۃ ۲۷: ۱۷۵

کو شامل نہ کرو اور اللہ کی وحدانیت کا برملا اظہار کرو۔

۳۔ وَلَوۡ کَرِہَ الۡکٰفِرُوۡنَ: دینداری میں کسی کی کراہت اور ناپسندی کی اعتنا نہیں کرنا چاہیے چونکہ دینداری کا تعلق انسان کی اپنی ابدی نجات سے ہے۔ کسی شخص یا جماعت کی پسند، ناپسند سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

رَفِیۡعُ الدَّرَجٰتِ ذُوالۡعَرۡشِ ۚ یُلۡقِی الرُّوۡحَ مِنۡ اَمۡرِہٖ عَلٰی مَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِہٖ لِیُنۡذِرَ یَوۡمَ التَّلَاقِ ﴿۱۵﴾

۱۵۔ وہ بلند درجات کا مالک اور صاحب عرش ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اپنے حکم سے روح نازل فرماتا ہے تاکہ وہ ملاقات کے دن کے بارے میں متنبہ کرے۔

تفسیر آیات

۱۔ رَفِیۡعُ الدَّرَجٰتِ: رفیع اگر بمعنی رافع ہے تو معنی یہ ہوں گے: وہ اپنے نیک بندوں کے درجات بلند کرنے والا ہے اور اگر بمعنی المرتفع ہو تو معنی یہ ہوں گے: وہ بلند ذات ہے اپنے علم و قدرت اور تمام اوصاف کمالیہ میں۔ ممکن ہے ذُوالۡعَرۡشِ قرینہ بن جائے دوسرے معنی کے لیے۔

۲۔ ذُوالۡعَرۡشِ: وہ عرش کا مالک ہے۔ ہم نے عرش کی تفسیر اللہ تعالیٰ کے مقام تدبیری سے کی ہے۔ اس کے مطابق ذُوالۡعَرۡشِ کا مطلب یہ بنتا ہے کہ وہ تدبیر کائنات کا مالک ہے۔

۳۔ یُلۡقِی الرُّوۡحَ مِنۡ اَمۡرِہٖ: روح سے مراد یہاں وحی ہے۔ قرآن میں متعدد مقامات پر وحی کو روح کہا ہے۔ ملاحظہ ہو سورۃ النحل آیت ۲ اور سورہ شوریٰ آیت ۵۲۔

وحی چونکہ ایک حیات بخش دستور اور انسانیت کے لیے ابدی حیات کی سعادت لے کر آتی ہے اس لیے وحی کو روح کہا ہے۔

۴۔ مِنۡ اَمۡرِہٖ: وحی کا تعلق امر الٰہی سے ہے اور امر الٰہی وہ امر تکوینی ہے جو کن فیکون سے مربوط ہے۔

۵۔ عَلٰی مَنۡ یَّشَآءُ: یہ وحی اس ذات پر نازل ہو سکتی ہے جو مشیت الٰہی کے معیار وحی پر پوری اترتی ہو چونکہ وحی ظاہری حواس پر نہیں اترتی، اس ذات کے مرکزی نکتے پر اترتی ہے جسے قرآن قلب سے تعبیر کرتا ہے۔

۶۔ لِيُنۡذِرَ يَوۡمَ التَّلَاقِ: وحی نازل کرنے کا ہدف بیان ہوا ہے کہ وحی انسان کو ان تمام خطرات سے آگاہ کرتی ہے جو اللہ تعالیٰ سے ملاقات کے لیے حائل اور رکاوٹ ہیں۔

يَوۡمَ هُمۡ بٰرِزُوۡنَ ۚ لَا يَخۡفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنۡهُمۡ شَىۡءٌ ؕ لِمَنِ الۡمُلۡكُ الۡيَوۡمَ ؕ لِلّٰهِ الۡوَاحِدِ الۡقَهَّارِ ﴿۱۶﴾

۱۶۔ اس دن وہ سب (قبروں سے) نکل پڑیں گے، اللہ سے ان کی کوئی چیز پوشیدہ نہ رہے گی، (اس روز پوچھا جائے گا) آج کس کی بادشاہت ہے؟ (جواب ملے گا) خدائے واحد، قہار کی۔

تفسیر آیات

۱۔ يَوۡمَ هُمۡ بٰرِزُوۡنَ: اس دن وہ فاش ہو جائیں گے ان کے تمام اعمال سے پردہ اٹھ جائے گا:

يَوۡمَ تُبۡلَى السَّرَآئِرُ ۙ﴿﴾ اس روز تمام راز فاش ہو جائیں گے۔

۲۔ لَا يَخۡفٰى عَلَى اللّٰهِ: ان کے اعمال میں سے کوئی ایک چیز بھی اللہ سے پوشیدہ نہ ہو گی۔ وہ ان کے ظاہر و باطن، سب سے آگاہ ہے۔

۳۔ لِمَنِ الۡمُلۡكُ الۡيَوۡمَ: دنیا میں طاغوتوں کی سرکشی، سفاکوں کی خون ریزی، استحصالیوں کی سازش، ظالموں کی خونخواری اور مفاد پرستوں کی رہزنی کا بازار گرم رہتا تھا۔ آج کسی طاغوت کی جنبش، سفاک کے عذر پیش کرنے، استحصالیوں کی فدیہ ادا کرنے، ظالموں کی خون بہا دینے، مفاد پرستوں کے ذمے موجود قرض چکانے کی مجال نہ ہو گی۔ بتاؤ آج کس کی بادشاہی ہے؟

کائنات پر سناٹا چھایا ہو گا۔ فضائے کائنات میں ایک سکوت و جمود طاری ہو گا۔ عرصہ محشر میں ایک خاموشی چھائی ہوئی ہو گی۔

۴۔ لِلّٰهِ الۡوَاحِدِ الۡقَهَّارِ: اتنے میں ندا آئے گی: آج خدائے واحد قہار کی بادشاہی ہے۔ اس ذات کی بادشاہی ہے جو واحد ہونے کے باوجود قہار ہے۔ آج وہ سب مجرمین جو اللہ کی رحمت سے محروم ہیں اللہ کی قہاریت کی زد میں ہیں۔

اَلۡيَوۡمَ تُجۡزٰى كُلُّ نَفۡسٍۭ بِمَا كَسَبَتۡ ؕ لَا ظُلۡمَ الۡيَوۡمَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيۡعُ الۡحِسَابِ ﴿۱۷﴾

۱۷۔ آج ہر شخص کو اس کے عمل کا بدلہ دیا جائے گا، آج ظلم نہیں ہو گا، اللہ یقیناً جلد حساب لینے والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اَلۡیَوۡمَ تُجۡزٰی کُلُّ نَفۡسٍۭ: آج کا دن یوم جزا ہے۔ یوم عدالت عظمی ہے۔ آج ہر شخص نے اپنے

۱؎ ۸۶ طارق: ۹

عمل کا نتیجہ دیکھنا ہے۔ اچھا ہے تو اچھا، برا ہے تو برا۔ ہر شخص کا عمل خود سامنے آئے گا۔ فیصلہ عمل نے خود کرنا ہے۔

۲۔ لَا ظُلۡمَ الۡیَوۡمَ: آج ظلم کی نفی، یعنی ظلم کا وجود متصور نہیں ہے چونکہ جب فیصلہ خود عمل کے ہاتھ میں ہو گا تو ظلم کا وجود ممکن نہیں ہے۔

۳۔ اِنَّ اللّٰہَ سَرِیۡعُ الۡحِسَابِ: اللہ کو ایک کا حساب، دوسرے کے حساب سے مشغول نہیں رکھتا۔ بہ یک وقت سب سے حساب لیا جائے گا لہٰذا حساب میں بھی کسی سے زیادتی کا امکان نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ قیامت کے دن خود عمل یا ساتھ نہیں چھوڑے گا یا جان نہیں چھوڑے گا۔

وَ اَنۡذِرۡہُمۡ یَوۡمَ الۡاٰزِفَۃِ اِذِ الۡقُلُوۡبُ لَدَی الۡحَنَاجِرِ کٰظِمِیۡنَ ۬ؕ مَا لِلظّٰلِمِیۡنَ مِنۡ حَمِیۡمٍ وَّ لَا شَفِیۡعٍ یُّطَاعُ ﴿۱۸﴾

۱۸۔ انہیں قریب الوقوع دن کے بارے میں متنبہ کیجیے، جب دل حلق تک آ رہے ہوں گے، غم سے گھٹ گھٹ جائیں گے، ظالموں کے لیے نہ کوئی دوست ہو گا اور نہ ہی کوئی ایسا سفارشی جس کی بات سنی جائے۔

تشریح کلمات

الۡاٰزِفَۃِ: (ا ز ف) وقت کے ضیق اور قریب آنے کے معنوں میں ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اَنۡذِرۡہُمۡ یَوۡمَ الۡاٰزِفَۃِ: قیامت کے دن کے بارے میں ان کی تنبیہ کیجیے جو عنقریب آنے ہی والا ہے۔ دنیا کی زندگی چند روزہ ہے۔ اس کے مقابلے میں قیامت کے بعد کی زندگی ابدی ہے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے:

من مات قامت قیامته۔۱؎   جو مر گیا، اس کی قیامت برپا ہو گئی۔

اس کی یہ توضیح کی گئی ہے کہ اکثر لوگوں کے لیے حیات برزخی نہیں ہے۔ انہیں ایسا لگے گا کہ مرنے کے دوسرے لمحے میں قیامت برپا ہو گئی۔

۲۔ اِذِ الۡقُلُوۡبُ لَدَی الۡحَنَاجِرِ: اس دن کی ہولناکی کی یہ حالت ہو گی کہ کلیجے منہ کو آ رہے ہوں

گے۔ محشر میں ہر شخص اپنے مستقبل کا فیصلہ سننے کے لیے بے تاب ہو گا۔ ابدی زندگی کا فیصلہ، کس قدر کربناک

---

[1] بحار ۵۸: ۷

لمحات ہوں گے۔

۳۔ کٰظِمِیۡنَ: غم کے گھونٹ پی رہے ہوں گے۔ اظہار کریں تو کس سے کریں۔

۴۔ مَا لِلظّٰلِمِیۡنَ مِنۡ حَمِیۡمٍ: یہاں کوئی دوست ہے اور نہ سفارشی۔ کس سے فریاد کریں؟ جس کی طرف دیکھیں؟ نفسانفسی کی حالت میں ہر ایک حواس باختہ ہے۔

یَعۡلَمُ خَآئِنَۃَ الۡاَعۡیُنِ وَ مَا تُخۡفِی الصُّدُوۡرُ ﴿۱۹﴾

۱۹۔ اللہ، نگاہوں کی خیانت اور جو کچھ سینوں میں پوشیدہ ہے، سے واقف ہے۔

تفسیر آیات

دوسری طرف حساب لینے والی ذات وہ ہے جو سینوں میں پوشیدہ رازوں کو جانتی ہے۔ اپنا جرم چھپانا بھی ممکن نہیں ہے۔

خَآئِنَۃَ الۡاَعۡیُنِ میں خَآئِنَۃَ بعض کے نزدیک مصدر کے معنوں میں ہے۔ یعنی خیانۃ الاعین۔ نگاہوں کی خیانت، نامحرموں پر بری نگاہ ڈالنا ہے۔ حدیث ہے:

ان النظرۃ الاولی لک و الثانیۃ علیک.[1] پہلی نگاہ گناہ نہیں ہے اور دوسری نگاہ گناہ ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

الم تر الی الرجل ینظر الی الشئ و کانہ لاینظر فذلک خائنۃ الاعین۔[2]

کسی کی طرف (چور نگاہ سے) دیکھنا کہ ایسا لگے وہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہا، نگاہوں کی خیانت ہے۔

وَ اللّٰہُ یَقۡضِیۡ بِالۡحَقِّ ؕ وَ الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِہٖ لَا یَقۡضُوۡنَ بِشَیۡءٍ ؕ اِنَّ اللّٰہَ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ ﴿۲۰﴾

۲۰۔ اور اللہ برحق فیصلہ کرتا ہے اور اللہ کے سوا جنہیں یہ لوگ پکارتے ہیں وہ کسی چیز کا فیصلہ کرنے کے (اہل) نہیں ہیں، یقیناً اللہ ہی خوب سننے والا، دیکھنے والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اللّٰہُ یَقۡضِیۡ بِالۡحَقِّ: چونکہ تمام فیصلے اسی کے پاس ہیں، خالق وہی، رازق وہی اور تدبیر اسی

کی، تشریع اسی کی طرف سے، قانون اسی نے دیا ہے لہٰذا فیصلہ بھی وہی کرے گا۔ غیر اللہ کے پاس مذکورہ

۱؎ مجمع البیان ۲؎ نور الثقلین ذیل آیت۔ معانی الاخبار ص ۱۴۷

چیزوں میں سے کوئی ایک چیز بھی نہیں ہے وہ کس چیز کا فیصلہ کریں گے۔

اَوَلَمۡ یَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَیَنۡظُرُوۡا کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الَّذِیۡنَ کَانُوۡا مِنۡ قَبۡلِہِمۡ ؕ کَانُوۡا ہُمۡ اَشَدَّ مِنۡہُمۡ قُوَّۃً وَّ اٰثَارًا فِی الۡاَرۡضِ فَاَخَذَہُمُ اللّٰہُ بِذُنُوۡبِہِمۡ ؕ وَ مَا کَانَ لَہُمۡ مِّنَ اللّٰہِ مِنۡ وَّاقٍ ﴿۲۱﴾

۲۱۔ کیا یہ لوگ زمین پر چلے پھرے نہیں ہیں تاکہ وہ ان لوگوں کا انجام دیکھ لیتے جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں؟ وہ طاقت اور زمین پر اپنے آثار چھوڑنے میں ان سے کہیں زیادہ زبردست تھے، پس اللہ نے ان کے گناہوں کی وجہ سے انہیں گرفت میں لے لیا اور انہیں اللہ سے بچانے والا کوئی نہ تھا۔

اس آیت کی تشریح کے لیے ملاحظہ فرمائیں سورہ روم آیت ۹۔

ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ کَانَتۡ تَّاۡتِیۡہِمۡ رُسُلُہُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ فَکَفَرُوۡا فَاَخَذَہُمُ اللّٰہُ ؕ اِنَّہٗ قَوِیٌّ شَدِیۡدُ الۡعِقَابِ ﴿۲۲﴾

۲۲۔ یہ اس لیے کہ ان کے پیغمبر واضح دلائل لے کر ان کے پاس آتے تھے لیکن انہوں نے انکار کر دیا، پھر اللہ نے انہیں گرفت میں لے لیا، اللہ یقیناً بڑا طاقتور، عذاب دینے میں سخت ہے۔

تفسیر آیات

وہ اللہ کی گرفت میں اس لیے نہیں آئے کہ انہیں حقیقت حال کا علم نہ تھا، انہیں بتانے والا کوئی نہ تھا، ان پر حجت پوری نہ ہوئی بلکہ یہ سب کچھ ہونے کے بعد ان لوگوں نے اپنے کفر پر ڈٹ جانے کا فیصلہ کیا تھا۔

وَ لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا مُوۡسٰی بِاٰیٰتِنَا وَ سُلۡطٰنٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۲۳﴾

۲۳۔ اور بتحقیق ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں اور واضح دلائل کے ساتھ بھیجا،

اِلٰی فِرۡعَوۡنَ وَ ہَامٰنَ وَ قَارُوۡنَ فَقَالُوۡا سٰحِرٌ کَذَّابٌ ﴿۲۴﴾

۲۴۔ فرعون اور ہامان اور قارون کی طرف تو ان لوگوں نے کہا: یہ تو بہت جھوٹا جادوگر ہے۔

تفسیر آیات

ا۔ وَ لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا مُوۡسٰی: ہم نے موسیٰ کو آیات اور سلطان مبین دے کر بھیجا۔ قرآنی استعمالات میں سلطان مبین اس واضح دلیل کو کہتے ہیں جس کے بعد مزید کسی دلیل کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس دلیل کو سلطان اس لیے کہا گیا کہ جس کے پاس اس قسم کی دلیل ہو گی وہ بالا دست ہو گا اور مد مقابل زیر ہو گا۔

آیات سے مراد وہ معجزات ہو سکتے ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیے گئے۔

فَلَمَّا جَآءَہُمۡ بِالۡحَقِّ مِنۡ عِنۡدِنَا قَالُوا اقۡتُلُوۡۤا اَبۡنَآءَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَہٗ وَ اسۡتَحۡیُوۡا نِسَآءَہُمۡ ؕ وَ مَا کَیۡدُ الۡکٰفِرِیۡنَ اِلَّا فِیۡ ضَلٰلٍ ﴿۲۵﴾

۲۵۔ پس جب انہوں نے ہماری طرف سے ان لوگوں کو حق پہنچایا تو وہ کہنے لگے: جو اس کے ساتھ ایمان لے آئیں، ان کے بیٹوں کو قتل کر دو اور ان کی بیٹیوں کو زندہ رہنے دو (مگر) کافروں کی چال اکارت ہی جاتی ہے۔

تفسیر آیات

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مبعوث ہونے کے بعد فرعون کی طرف سے یہ حکم صادر ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کے ہاں پیدا ہونے والے ہر بچے کو قتل کر دیا جائے اور بچیوں کو چھوڑ دیا جائے۔

مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو الاعراف آیت ۱۴۱۔

وَقَالَ فِرۡعَوۡنُ ذَرُوۡنِیۡۤ اَقۡتُلۡ مُوۡسٰی وَلۡیَدۡعُ رَبَّہٗ ۚ اِنِّیۡۤ اَخَافُ اَنۡ یُّبَدِّلَ دِیۡنَکُمۡ اَوۡ اَنۡ یُّظۡهِرَ فِی الۡاَرۡضِ الۡفَسَادَ ﴿۲۶﴾

۲۶۔ اور فرعون نے کہا: مجھے چھوڑو کہ میں موسیٰ کو قتل کروں اور وہ اپنے رب کو پکارے مجھے ڈر ہے کہ وہ تمہارا دین بدل ڈالے گا یا زمین میں فساد برپا کرے گا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَقَالَ فِرۡعَوۡنُ ذَرُوۡنِیۡۤ اَقۡتُلۡ مُوۡسٰی: فرعون کا یہ کہنا کہ مجھے موسیٰ کو قتل کرنے دو، بتاتا ہے کہ اس کے سامنے کوئی رکاوٹ تھی ورنہ وہ بہت پہلے انہیں قتل کر چکا ہوتا۔

سورہ اعراف آیت ۱۱۱ اور سورہ شعراء آیت ۳۶ میں قتل نہ کرنے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پہلی بار فرعون کے دربار میں عصا اور ید بیضا کے دو عظیم معجزے دیکھائے تو فرعون نے اپنے درباریوں سے پوچھا تھا کہ تمہارا کیا خیال ہے موسیٰ و ہارون کے ساتھ کیا کرنا چاہیے؟ یہ دونوں جادوگر ہیں تو درباریوں نے رائے دی تھی: اَرۡجِہۡ وَاَخَاہُ ...۔ اسے اور اس کے بھائی کو مہلت دو۔

ممکن ہے مہلت کا مشورہ اس لیے دیا ہو کہ اگر فوری قتل کیا جائے تو لوگ انہیں سچے نبی تسلیم کریں گے۔ بہتر یہ ہے کہ جادو کا توڑ جادو سے کیا جائے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حیرت انگیز معجزات دیکھ کر فرعون کے درباریوں میں اس قسم کی سوچ موجود تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے دعویٰ میں سچے ہو سکتے ہیں لہٰذا ان کے خلاف انتہائی قدم اٹھانے میں تأمل سے کام لینا چاہیے۔ چنانچہ اگلی آیت میں اس مومن کا ذکر آتا ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قتل کے حق میں نہ تھے۔

۲۔ وَلۡیَدۡعُ رَبَّہٗ: پوری رعونت اور تکبر کے لہجے میں کہتا ہے: میں اسے قتل کرنے لگوں تو وہ اپنے رب کو مدد کے لیے پکارے کہ میرے ہاتھ قتل ہونے سے آ کر بچا لے۔

۳۔ اِنِّیۡۤ اَخَافُ اَنۡ یُّبَدِّلَ دِیۡنَکُمۡ: مجھے خطرہ ہے کہ موسیٰ تمہارا دین بدل ڈالے گا۔ اس خطرے کی وجہ یہ تھی کہ فرعونی سلطنت ان کے مذہبی نظریے پر قائم تھی۔ نظریہ یہ تھا: سلطنت و اقتدار کے معبود سورج (عشتار) کا زمین میں نمائندہ فرعون ہے لہٰذا اس کی سلطنت کا جواز اپنے معبود کا نمایندہ ہونا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے غیر اللہ معبودوں کی نفی کی اور خود کے رب العالمین کا نمایندہ (رسول) ہونے کا اعلان کیا تو اس کا مطلب فرعون کے دین وسلطنت کی نفی تھی۔

۴۔ اَوۡ اَنۡ یُّظۡهِرَ فِی الۡاَرۡضِ الۡفَسَادَ: اگر پوری طرح دین تبدیل کرنے میں کامیاب نہ بھی ہوا

اس کی دعوت سے زمین میں فساد ضرور برپا ہوگا۔ موجودہ یک طرفہ نظریہ ختم ہو جائے گا۔ دو نظریے وجود میں آئیں گے۔ اس طرح ملک میں فساد برپا ہوگا۔

فساد کے خطرے کا احساس ثابت کرتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کو پذیرائی مل رہی تھی اور فرعون کی سلطنت کا یہ پروپیگنڈہ کہ یہ جادوگر ہے، موثر واقع نہیں ہو رہا تھا۔

وَقَالَ مُوْسٰۤی اِنِّیۡ عُذۡتُ بِرَبِّیۡ وَ رَبِّکُمۡ مِّنۡ کُلِّ مُتَکَبِّرٍ لَّا یُؤۡمِنُ بِیَوۡمِ الۡحِسَابِ ﴿۲۷﴾

۲۷۔ اور موسیٰ نے کہا: میں اپنے اور تمہارے رب کی پناہ مانگتا ہوں ہر اس تکبر کرنے والے سے جو یوم حساب پر ایمان نہیں لاتا۔

۱۔ ۷ اعراف: ۱۱۱

تفسیر آیات

۱۔ وَقَالَ مُوۡسٰۤی اِنِّیۡ عُذۡتُ بِرَبِّیۡ: طاغوت اور متکبر کی دھمکیوں کے مقابلے میں اللہ کی پناہ سب سے بڑی طاقت ہے۔ چنانچہ فرعون کے اس جملے کے جواب میں "میں دیکھتا ہوں اس کا رب اس کو کیسے بچاتا ہے" فرمایا: میں اسی ذات کی پناہ میں جاتا ہوں جو نہ صرف میرا رب ہے، وہ تمہارا بھی رب ہے۔ میری اور تمہاری تقدیر، سب اس رب کے ہاتھ میں ہے۔

۲۔ مِّنۡ کُلِّ مُتَکَبِّرٍ لَّا یُؤۡمِنُ بِیَوۡمِ الۡحِسَابِ: ایک شخص اگر متکبر ہو، اپنے آپ کو سب سے طاقتور اور بالادست سمجھتا ہو اور انتہائی قدم اٹھانے میں کوئی رکاوٹ بھی نہ ہو، نہ قیامت کا تصور، نہ حساب کتاب کا ڈر تو یہ شخص نہایت سفاک اور خونخوار ہوتا ہے۔

وَ قَالَ رَجُلٌ مُّؤۡمِنٌ ٭ۖ مِّنۡ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ یَکۡتُمُ اِیۡمَانَہٗۤ اَتَقۡتُلُوۡنَ رَجُلًا اَنۡ یَّقُوۡلَ رَبِّیَ اللّٰہُ وَ قَدۡ جَآءَکُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ مِنۡ رَّبِّکُمۡ ؕ وَ اِنۡ یَّکُ کَاذِبًا فَعَلَیۡہِ کَذِبُہٗ ۚ وَ اِنۡ یَّکُ صَادِقًا یُّصِبۡکُمۡ بَعۡضُ الَّذِیۡ یَعِدُکُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَہۡدِیۡ مَنۡ ہُوَ مُسۡرِفٌ کَذَّابٌ ﴿۲۸﴾

۲۸۔ اور آل فرعون میں سے ایک مومن جو اپنا ایمان چھپائے ہوئے تھا کہنے لگا: کیا تم ایسے شخص کو قتل کرنا چاہتے ہو جو کہتا ہے میرا رب اللہ ہے اور تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس واضح دلائل لے کر آیا ہے؟ اگر وہ جھوٹا ہے تو اس کا جھوٹ خود اس کے خلاف جائے گا اور اگر وہ سچا ہے تو جس (عذاب) کا وہ تم سے وعدہ کر رہا ہے اس میں سے کچھ تو تم پر واقع ہو ہی جائے گا اللہ یقیناً تجاوز کرنے والے جھوٹے کو ہدایت نہیں دیتا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ قَالَ رَجُلٌ مُّؤۡمِنٌ ٭ۖ مِّنۡ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ: فرعون کے درباریوں میں ایک قبطی، بقولے فرعون کے قریبی رشتہ داروں میں سے تھا۔ یہ وہی حزقیل علیہ السلام ہیں جنہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے ارادہ قتل سے آگاہ کیا تھا۔ انہی کے مشورے پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ہجرت فرمائی۔

۲۔ یَکۡتُمُ اِیۡمَانَہٗۤ: یہ مومن اپنا ایمان چھپاتا تھا۔ ایمان چھپا کر اپنے آپ کو تحفظ بھی دیتا اور اس تقیہ کی وجہ سے اولوالعزم رسول کو بچانے کا موقع بھی میسر آتا تھا۔ چنانچہ دو اہم اور خطرناک مقامات پر اس مومن نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بچایا۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

التقیة من دینی و دین آبائی ولا دین لمن لا تقیة له والتقیة ترس اللّٰہ فی الارض لان مومن آل فرعون لو اظهر الاسلام لقتل۔[1]

تقیہ میرے اور میرے آباء کے دین میں سے ہے۔ جو تقیہ نہیں کرتا اس کا دین نہیں ہے۔ تقیہ روئے زمین پر اللہ کی سپر ہے۔ اگر مومن آل فرعون اسلام ظاہر کرتا تو قتل ہو جاتا۔

سورہ قصص آیت ۲۰ میں بھی اس مومن کا ذکر آیا ہے۔ حدیث نبویؐ ہے:

الصدیقون ثلاثۃ حبیب النجار مومن آل یاسین و مومن آل فرعون الذی قال اَتَقۡتُلُوۡنَ رَجُلًا اَنۡ یَّقُوۡلَ رَبِّیَ اللّٰہُ و الثالث علی بن ابی طالب و ھو افضلھم۔[2]

صدیق تین ہیں: حبیب النجار مومن آل یاسین اور مومن آل فرعون جس نے کہا تھا کہ تم ایسے شخص کو قتل کرتے ہو جو کہتا ہے میرا رب اللہ ہے۔ تیسرے علی بن ابی طالب ہیں جو ان میں افضل ہیں۔

افضل الانبیاء و الرسل صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو تحفظ دینے والے کا سب صدیقوں سے افضل ہونا قدرتی بات ہے۔ پھر حضرت علی علیہ السلام نے صرف شب ہجرت بستر رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر سو کر اپنی جان کا نذرانہ پیش نہیں کیا بلکہ شعب ابی طالب میں ہمیشہ خطرے کے وقت حضرت ابو طالب علیہ السلام اپنے بیٹے علیہ السلام کو بستر رسول پر سلاتے تھے۔ اور جنگ احد میں حضرت علی علیہ السلام نے ہی حضرت ختم المرسل صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو تحفظ فراہم فرمایا۔

۳۔ اَتَقۡتُلُوۡنَ رَجُلًا اَنۡ یَّقُوۡلَ رَبِّیَ اللّٰہُ: کیا تم اس شخص کو اس جرم میں قتل کرو گے کہ یہ اللہ کو رب تسلیم کرتا ہے۔ کسی پر ہاتھ دراز نہیں کیا، کسی کو ضرر نہیں پہنچایا، اپنا ایک نظریہ رکھتا ہے۔ کسی کو عقیدے کی بنیاد پر قتل کر ڈالنا کس قدر بڑا جرم ہے۔

۴۔ وَ قَدۡ جَآءَکُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ: پھر وہ اپنے عقیدے پر واضح دلیل بھی پیش کرتا ہے۔ دلیل نہ ماننا تو جرم ہو سکتا ہے لیکن دلیل پیش کرنا تو کوئی جرم نہیں ہے۔

۵۔ وَ اِنۡ یَّکُ کَاذِبًا فَعَلَیۡہِ کَذِبُہٗ: جابروں اور تنگ نظروں سے خطرہ لاحق ہونے کی صورت میں حق چھپانا جابروں کے لیے باعث ننگ و عار ہے، حق چھپانے والے کے لیے نہیں۔

چنانچہ جو لوگ حکمرانوں کے ہم مذہب رہے ہیں ان کے لیے تقیہ کی نوبت نہیں آتی تھی۔ البتہ انہیں تقیہ کا تجربہ ایک بار ہو گیا تھا جب خلق قرآن کے بارے میں بنی عباس کے تنگ نظر جابروں کے سامنے اہل سنت کے علماء کو بھی اپنا نظریہ چھپانا پڑا تھا۔

چنانچہ مومن آل فرعون اپنی تقریر میں حق کا برملا اظہار نہیں کرتے بلکہ بظاہر تردد کا اظہار کرتے ۴۷۶

---

[1] بحار الانوار ۱۳: ۱۵۸　[2] تفسیر رازی ذیل آیہ

ہیں کہ اگر موسی جھوٹا ہے تو اس کا جھوٹ خود اس کے خلاف جائے گا تمہیں جلدی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

۶۔ وَ اِنۡ یَّکُ صَادِقًا: اگر یہ اپنے دعویٰ میں سچے ہیں تو جس عذاب سے یہ ڈرا رہے ہیں اس میں سے کچھ عذاب تو آنے والا ہے۔

۷۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَہۡدِیۡ مَنۡ ہُوَ مُسۡرِفٌ کَذَّابٌ: خواہ یہ تجاوز کار کوئی ہو اسے اللہ ہدایت نہیں دیتا۔ اگر موسیٰ ایسا ہے تو اللہ اسے کامیاب نہیں ہونے دے گا۔

يٰقَوۡمِ لَكُمُ الۡمُلۡكُ الۡيَوۡمَ ظٰهِرِيۡنَ فِى الۡاَرۡضِ فَمَنۡ يَّنۡصُرُنَا مِنۡۢ بَاۡسِ اللّٰهِ اِنۡ جَآءَنَا ؕ قَالَ فِرۡعَوۡنُ مَاۤ اُرِيۡكُمۡ اِلَّا مَاۤ اَرٰى وَمَاۤ اَهۡدِيۡكُمۡ اِلَّا سَبِيۡلَ الرَّشَادِ ﴿۲۹﴾

۲۹۔ اے میری قوم! آج تمہاری بادشاہت ہے اور ملک میں تم غالب ہو پس اگر ہم پر اللہ کا عذاب آ گیا تو ہماری کون مدد کرے گا؟ فرعون نے کہا: میں تمہیں صرف وہی رائے دوں گا جسے میں صائب سمجھتا ہوں اور میں اسی راستے کی طرف تمہاری رہنمائی کرتا ہوں جو درست ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ يٰقَوۡمِ لَكُمُ الۡمُلۡكُ: آل فرعون کا یہ مومن اپنے ایمان کا کھل کر اظہار نہیں کر رہے ہیں بلکہ فرعون کا خیرخواہ ظاہر کر کے کہتے ہیں: آج تمہاری حکومت ہے۔ آج تمہاری بالادستی ہے۔ اپنی عاقبت کا سوچو۔

۲۔ فَمَنۡ يَّنۡصُرُنَا مِنۡۢ بَاۡسِ اللّٰهِ اِنۡ جَآءَنَا: اگر ہم پر عذاب آ گیا تو ہماری کون مدد کرے گا۔ یہ لہجہ بظاہر غیر جانبدارانہ ہے لیکن فی الواقع ایک دعوت فکر ہے۔

۳۔ قَالَ فِرۡعَوۡنُ مَاۤ اُرِيۡكُمۡ اِلَّا مَاۤ اَرٰى: فرعون اپنی رائے کے صائب ہونے پر مصر ہے۔ جیسا کہ ہر جابر کا یہ مزاج ہوتا ہے کہ وہ اقتدار کے نشے میں بدمست ہوتا ہے اور کبھی اپنے فردا کے بارے میں نہیں سوچتا، نہ ہی کسی ناصح کی نصیحت پر توجہ دیتا ہے۔

وَقَالَ الَّذِىۡۤ اٰمَنَ يٰقَوۡمِ اِنِّىۡۤ اَخَافُ عَلَيۡكُمۡ مِّثۡلَ يَوۡمِ الۡاَحۡزَابِ ﴿۳۰﴾

۳۰۔ اور جو شخص ایمان لایا تھا کہنے لگا: اے میری قوم! مجھے خوف ہے کہ تم پر کہیں وہ دن نہ آئے جیسا (پہلی) امتوں پر آیا تھا،

مِثۡلَ دَاۡبِ قَوۡمِ نُوۡحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوۡدَ

۳۱۔ جیسے قوم نوح اور عاد اور ثمود اور ان کے

وَالَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ؕ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ ﴿۳۱﴾	بعد والی امتوں پر آیا تھا اور اللہ تو بندوں پر ظلم کرنا نہیں چاہتا۔
وَيٰقَوْمِ اِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ يَوْمَ التَّنَادِ ۙ﴿۳۲﴾	۳۲۔ اور اے میری قوم! مجھے تمہارے بارے میں فریاد کے دن (قیامت) کا خوف ہے۔
يَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِيْنَ ۚ مَا لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿۳۳﴾	۳۳۔ جس دن تم پیٹھ پھیر کر بھاگو گے تمہیں اللہ (کے عذاب) سے بچانے والا کوئی نہ ہو گا اور جسے اللہ گمراہ کر دے اسے ہدایت دینے والا کوئی نہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَقَالَ الَّذِیْۤ اٰمَنَ: مومن آل فرعون کی نصیحت جاری ہے۔ اس مومن کے پیغمبرانہ اقوال دیکھ کر بعض کو یہ خیال گزرا کہ اس جگہ الَّذِیْۤ اٰمَنَ سے مراد خود حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں۔

۲۔ يَوْمِ الْاَحْزَابِ: احزاب سے مراد گزشتہ قومیں ہیں جن کا ذکر بعد کی آیت میں آ رہا ہے۔

۳۔ مِثْلَ دَاْبِ قَوْمِ نُوْحٍ: مجھے خوف ہے تمہاری سرنوشت بھی قوم نوح، عاد اور ثمود کی طرح نہ ہو جائے چونکہ صورت حال ایک جیسی ہے۔ ان کی طرف بھی اسی طرح رسول آئے تھے جیسے اب موسیٰ علیہ السلام آئے ہیں اور تمہاری قوم موسیٰ کی اسی طرح تکذیب کر رہی ہے جیسے ان قوموں نے تکذیب کی تھی۔ لہٰذا عذاب بھی اسی طرح آ سکتا ہے جیسے ان قوموں پر آیا تھا۔

۴۔ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا: اگر عذاب آیا تو یہ خود تمہارے اعمال کا نتیجہ ہو گا۔ اللہ ہر قسم کی ظلم و زیادتی سے مبرا ہے۔

۵۔ وَيٰقَوْمِ اِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ: يَوْمَ التَّنَادِ فریاد کے دن سے مراد روز قیامت ہے، جس میں کافر لوگ مدد کے لیے پکاریں گے مگر کوئی مدد کو آنے والا نہیں ملے گا۔

۶۔ يَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِيْنَ: قیامت کے دن عذاب کا مشاہدہ کرنے پر تم اس عذاب سے بھاگنا شروع کرو گے لیکن اللہ کی حکومت سے فرار کا کوئی راستہ نہیں ہے۔، نہ کوئی بچانے والا ہو گا۔

۷۔ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ: جس سے مصدر ہدایت (اللہ) ہاتھ اٹھا لے اور اس کے نتیجے میں گمراہی کے گھڑے میں گر جائے، اسے کہاں سے ہدایت ملے گی؟

وَلَقَدۡ جَآءَكُمۡ يُوسُفُ مِن قَبۡلُ بِٱلۡبَيِّنَٰتِ فَمَا زِلۡتُمۡ فِي شَكّٖ مِّمَّا جَآءَكُم بِهِۦۖ حَتَّىٰٓ إِذَا هَلَكَ قُلۡتُمۡ لَن يَبۡعَثَ ٱللَّهُ مِنۢ بَعۡدِهِۦ رَسُولٗاۚ كَذَٰلِكَ يُضِلُّ ٱللَّهُ مَنۡ هُوَ مُسۡرِفٞ مُّرۡتَابٌ ﴿٣٤﴾

۳۴۔ اور بتحقیق اس سے پہلے یوسف واضح دلائل کے ساتھ تمہارے پاس آئے مگر تمہیں اس چیز میں شک ہی رہا جو وہ تمہارے پاس لائے تھے یہاں تک کہ جب ان کا انتقال ہوا تو تم کہنے لگے: ان کے بعد اللہ کوئی پیغمبر مبعوث نہیں کرے گا اس طرح اللہ ان لوگوں کو گمراہ کر دیتا ہے جو تجاوز کرنے والے، شک کرنے والے ہوتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَقَدۡ جَآءَكُمۡ يُوسُفُ مِن قَبۡلُ: مومن آل فرعون کی ناصحانہ گفتگو جاری ہے۔ فرمایا: موسیٰ سے پہلے تمہارے پاس یوسف واضح دلائل کے ساتھ آئے تھے۔

یہاں ایک سوال ذہنوں میں آتا ہے کہ کیا حضرت یوسف علیہ السلام قوم مصر کی طرف ایک نبی مرسل کے طور پر مبعوث ہوئے تھے؟ اگر ایسا ہے تو آپ علیہ السلام نے مصر کے بادشاہ سے صرف خزائن الارض کی وزارت کیوں مانگی؟ اجۡعَلۡنِي عَلَىٰ خَزَآئِنِ ٱلۡأَرۡضِ....[1]

اس سوال کا جواب آسان نہیں ہے چونکہ حضرت یوسف علیہ السلام کی نبوت کی نوعیت معلوم نہیں ہے۔ ممکن ہے آپ علیہ السلام کو دعوت کا حکم نہ تھا صرف عادلانہ طور پر حکومت کرنے، عدل و انصاف متعارف کرانے کا حکم تھا اور آل ابراہیم کا تعارف اور آزمائش مقصود تھی۔ حکمت الٰہی کا تقاضا تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام عراق سے ہجرت کر کے کنعان کو اپنا مستقر بنائیں اور ایک فرزند کو حجاز کی خشک وادی میں آباد فرمائیں۔ آپ علیہ السلام کی آل میں سے چند ہستیاں مصر میں آباد ہوں۔ مصر سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک دعوت اور تحریک کا آغاز کرنا تھا۔ اس کے لیے اس تحریک سے پہلے آل ابراہیم کو ان مراحل سے گزارنا مقصود ہو سکتا ہے۔

۲۔ بِٱلۡبَيِّنَٰتِ: حضرت یوسف علیہ السلام واضح دلائل لے کر آئے تھے۔ یہاں بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب آپ نے کوئی دعوت پیش نہیں کرنا تھی اور کوئی توحیدی تحریک نہیں چلانی تھی تو بینات کی کیا ضرورت تھی؟ پھر وہ بینات کیا ہیں؟

جواب یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو جس مقصد کے لیے نبی بنایا گیا تھا اس کے لیے بھی بینات کی ضرورت تھی۔ مثلاً اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے تمہید کے طور پر بھیجا گیا ہو تو بھی آپ علیہ السلام کی شخصیت کی

---

[1] ۱۲ یوسف: ۵۵

طرف متوجہ ہونے کے لیے بینات لازم تھیں۔

رہا یہ سوال کہ وہ بینات کیا تھیں؟ جواب یہ ہے کہ وہ بینات یہ ہیں:

i۔ آپ علیہ السلام کی پاک دامنی۔

ii۔ بچے کی آپ علیہ السلام کے حق میں گواہی۔

iii۔ خواب کی سچی تعبیر۔

iv۔ مصری خواتین کا اعتراف۔

v۔ ایک عادلانہ حکومت کا قیام۔

vi۔ ملک کو مہلک قحط سے بچانا۔

۳۔ فَمَا زِلۡتُمۡ فِیۡ شَکٍّ: حضرت یوسف علیہ السلام نے کسی قسم کی توحیدی تحریک نہیں چلائی تھی اس لیے ان کی تکذیب و تردید کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ صرف اس آیت میں شک کا ذکر ملتا ہے۔ اس شک کی تفصیل نہیں ملتی۔ قرآن نے صرف اتنا فرمایا: یوسف علیہ السلام جو کچھ تمہارے پاس لائے تھے اس میں ان کو شک رہا۔ وہ کیا چیز تھی جو حضرت یوسف علیہ السلام لے کر آئے تھے؟

حضرت یوسف علیہ السلام نے جو کچھ پیش کیا وہ عدل و انصاف کی ایک لازوال مثال تھی۔ اس میں شک کا مطلب کیا یہ ہے کہ وہ پیغمبر تھے یا نہ تھے؟ ظاہر آیت سے یہی مفہوم ہوتا ہے۔ کیا ان کی زندگی میں ان کی رسالت پر شک کیا؟ یا زندگی کے بعد انہیں رسول تسلیم کیا؟ ایک امکانی صورت یہ ہے کہ حضرت علیہ السلام کی نبوت پر شک کرنے والوں سے مراد صرف بنی اسرائیل ہو سکتے ہیں اور حضرت یوسف علیہ السلام کی وفات کے بعد بنی اسرائیل نے ان کی رسالت کو قبول کیا ہو، ورنہ مصر والوں نے کسی کی رسالت کو کبھی قبول کیا ہو، اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا بلکہ فراعنہ کے زمانے کے لوگوں کی باتوں سے اس کے برعکس ثابت ہوتا ہے لیکن سیاق آیت اس توجیہ کے مطابق نہیں ہے چونکہ بظاہر وَلَقَدۡ جَآءَکُمۡ یُوۡسُفُ کے مخاطب مصری ہیں۔ اسی طرح قُلۡتُمۡ ہے۔ ۴۸۰

۴۔ حَتّٰۤی اِذَا هَلَکَ قُلۡتُمۡ لَنۡ یَّبۡعَثَ اللّٰهُ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ رَسُوۡلًا: اس کا ظاہری معنی یہ بنتا ہے کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام کا وصال ہوا تو انہیں رسول تسلیم کیا۔ ساتھ یہ عقیدہ بھی قائم کیا کہ ان کے بعد کوئی رسل نہیں آئے گا۔ ممکن ہے یہ عقیدہ رکھنے والے بنی اسرائیل ہوں۔

الَّذِیۡنَ یُجَادِلُوۡنَ فِیۡۤ اٰیٰتِ اللّٰهِ بِغَیۡرِ	۳۵۔ جو اللہ کی آیات میں جھگڑا کرتے ہیں بغیر
سُلۡطٰنٍ اَتٰىهُمۡ ؕ کَبُرَ مَقۡتًا عِنۡدَ	ایسی دلیل کے جو اللہ کی طرف سے ان کے پاس
اللّٰهِ وَعِنۡدَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ؕ کَذٰلِکَ	آئی ہو (ان کی) یہ بات اللہ اور ایمان لانے

يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ﴿٣٥﴾

والوں کے نزدیک نہایت ناپسندیدہ ہے، اسی طرح ہر متکبر، سرکش کے دل پر اللہ مہر لگا دیتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اَلَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ: جو آیات اور معجزات اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور ربوبیت پر دلالت کرتے ہیں، ان میں کج بحثی کرتے ہیں۔

۲۔ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ: ان آیات کے خلاف ان کے پاس کوئی قطعی دلیل نہیں ہے۔ صرف اندھی تقلید کی بنیاد پر ان آیات میں جدال کرتے ہیں۔

۳۔ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ: اللہ کی آیات کو بغیر دلیل کے رد کرنا اللہ کے ہاں انتہائی مبغوض، ناپسندیدہ عمل ہے نیز اہل ایمان بھی اسے شدید ناپسند کرتے ہیں۔

۴۔ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ: اس جرم میں وہ لوگ مبتلا رہتے ہیں جن کے دلوں پر اللہ نے مہر لگا دی ہے۔ مہر لگانے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کا ہاتھ ان سے اُٹھا لیتا ہے تو اس کے بعد گمراہی کے سوا کوئی صورت نہیں رہتی ہے۔ ان سے ہاتھ اٹھانے کی وجہ ان کا متکبر، جبار اور سرکش ہونا ہے۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰهَامٰنُ ابْنِ لِيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ ﴿٣٦﴾ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا ۭ وَكَذٰلِكَ زُيِّنَ لِفِرْعَوْنَ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَصُدَّ عَنِ السَّبِيْلِ ۭ وَمَا كَيْدُ فِرْعَوْنَ اِلَّا فِيْ تَبَابٍ ﴿٣٧﴾

۳۶۔ اور فرعون نے کہا: اے ہامان! میرے لیے ایک بلند عمارت بناؤ، شاید میں راستوں تک رسائی حاصل کر لوں،

۳۷۔ آسمانوں کے راستوں تک، پھر میں موسیٰ کے خدا کو دیکھ لوں اور میرا گمان یہ ہے کہ موسیٰ جھوٹا ہے، اس طرح فرعون کے لیے اس کی بدعملی کو خوشنما بنا دیا گیا اور وہ راہ راست سے روک دیا گیا اور فرعون کی چال تو صرف گھاٹے میں ہے۔

تشریح کلمات

صَرْحًا: (ص ر ح) بلند عمارت

الْاَسْبَابَ: (س ب ب) سبب اصل میں اس رسی کو کہتے ہیں جس سے درخت خرما وغیرہ پر چڑھا

جائے۔ پھر اسی مناسبت سے ہر اس شے کو سبب کہا جاتا ہے جو دوسری شے تک رسائی کا ذریعہ بنتی ہو۔

تفسیر آیات

۱۔ وَقَالَ فِرۡعَوۡنُ: فرعون اس مومن کے منطقی استدلال کا جواب تو نہ دے سکا البتہ ایک تمسخر کے طور پر کہا ہوگا: موسیٰ کا خدا زمین پر تو ہے نہیں، آسمان میں دیکھتا ہوں۔ بعض کا خیال ہے کہ فرعون، موسیٰ علیہ السلام کا خدا تلاش کرنے کے لیے ایک رصدگاہ بنانا چاہتا تھا تاکہ اپنی قوم کو دھوکہ دے سکے کہ موسیٰ علیہ السلام کا کوئی خدا نہیں ہے۔ اس آیت کی تشریح سورہ قصص آیت ۳۸ میں گزر چکی ہے اور مستشرقین کے اعتراض کا جواب بھی دیا گیا ہے۔

۲۔ وَكَذٰلِكَ زُيِّنَ لِفِرۡعَوۡنَ سُوۡٓءُ عَمَلِهٖ: طاغوت اور سرکش لوگ چونکہ فطرت سے بہت دور اور قدروں کے پیمانے بدل چکے ہوتے ہیں اس لیے ان کی باغیانہ نگاہ میں جرم خوشنما ہو جاتا ہے اور ظلم و زیادتی ان کے نزدیک عدل و انصاف سے زیادہ پسندیدہ ہوتی ہے۔

۳۔ وَصُدَّ عَنِ السَّبِيۡلِ: سوء عمل مزیّن ہونے، برائی اچھی لگنے کی وجہ سے اسے راہ راست سے دور کر دیا گیا۔

۴۔ وَمَا كَيۡدُ فِرۡعَوۡنَ اِلَّا فِيۡ تَبَابٍ: حضرت موسیٰ علیہ السلام کی توحیدی تحریک کے خلاف فرعون کی تمام تر سازش ناکام ہو کر رہ جائے گی۔

وَقَالَ الَّذِيۡۤ اٰمَنَ يٰقَوۡمِ اتَّبِعُوۡنِ اَهۡدِكُمۡ سَبِيۡلَ الرَّشَادِ ﴿۳۸﴾

۳۸۔ اور جو شخص ایمان لایا تھا بولا: اے میری قوم! میری اتباع کرو، میں تمہیں صحیح راستہ دکھاتا ہوں۔

تفسیر آیات

ایسا معلوم ہوتا ہے یہ مومن اپنا پیغمبرانہ موقف اختیار کرتے ہوئے اس مرحلے میں آکر اپنے ایمان کا اظہار کر کے تبلیغ شروع کرتے ہیں۔ چنانچہ فرعون کے وَمَاۤ اَهۡدِيۡكُمۡ اِلَّا سَبِيۡلَ الرَّشَادِ کے جواب میں فرمایا: اَهۡدِكُمۡ سَبِيۡلَ الرَّشَادِ۔

يٰقَوۡمِ اِنَّمَا هٰذِهِ الۡحَيٰوةُ الدُّنۡيَا مَتَاعٌ ۫ وَّ اِنَّ الۡاٰخِرَةَ هِيَ دَارُ

۳۹۔ اے میری قوم! یہ دنیاوی زندگی تو صرف تھوڑی دیر کی لذت ہے اور آخرت یقیناً دائمی

الْقَرَارِ ۝٣٩ قیام گاہ ہے۔

دنیا کی بے ثباتی اور آخرت کی دائمی زندگی میں موازنہ کر کے ضمیروں کو بیدار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا ۚ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ يُرْزَقُوْنَ فِيْهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝٤٠

۴۰۔ جو برائی کا ارتکاب کرے گا اسے اتنا ہی بدلہ ملے گا اور جو نیکی کرے گا وہ مرد ہو یا عورت اگر صاحب ایمان بھی ہو تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے جس میں انہیں بیشمار رزق ملے گا۔

تفسیر آیات

۱۔ مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً: ایک اہم نکتے کی وضاحت ہوگئی کہ گناہ کی مناسبت سے سزا ملے گی۔

۲۔ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا: لیکن نیکی کے ثواب کی کوئی حد متعین نہیں ہے۔ یہاں جو ثواب ملے گا اسے وصف و حساب میں نہیں لایا جا سکتا۔

واضح رہے قرآن جب دنیوی نعمتوں کے بارے میں رزق بغیر حساب فرماتا ہے تو بغیر حساب کا مطلب تفضّل ہے چونکہ انسان اللہ تعالیٰ کا مملوک ہے۔ مملوک جو کام کرے وہ مالک کا ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں جو کچھ بھی دیا جائے گا وہ بلا استحقاق اور تفضّل ہے۔ اپنے فضل و کرم سے عنایت فرماتا ہے۔

۳۔ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى: اس بات کی بھی وضاحت ہوگئی کہ عمل و ایمان کے اعتبار سے مرد اور عورت برابر ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کو اپنے عمل کے مطابق جزا و سزا ملے گی۔ یوں اس جاہلی موقف کو مسترد کر دیا کہ عورت ناپاک جنس ہے۔

وَيٰقَوْمِ مَا لِيْٓ اَدْعُوْكُمْ اِلَى النَّجٰوةِ وَتَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَى النَّارِ ۝٤١

۴۱۔ اور اے میری قوم! آخر مجھے ہوا کیا ہے کہ میں تمہیں نجات کی طرف بلاتا ہوں اور تم مجھے آتش کی طرف بلاتے ہو؟

تَدْعُوْنَنِيْ لِاَكْفُرَ بِاللّٰهِ وَاُشْرِكَ بِهٖ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ ۡ وَّاَنَا اَدْعُوْكُمْ اِلَى الْعَزِيْزِ الْغَفَّارِ ۝٤٢

۴۲۔ تم مجھے دعوت دیتے ہو کہ میں اللہ کے ساتھ کفر کروں اور اسے اللہ کا شریک قرار دوں جس کا مجھے علم ہی نہیں ہے اور میں تمہیں بڑے غالب آنے والے، بخشنے والے اللہ کی طرف بلاتا ہوں۔

لَا جَرَمَ اَنَّمَا تَدۡعُوۡنَنِیۡۤ اِلَیۡہِ لَیۡسَ لَہٗ دَعۡوَۃٌ فِی الدُّنۡیَا وَ لَا فِی الۡاٰخِرَۃِ وَ اَنَّ مَرَدَّنَاۤ اِلَی اللّٰہِ وَ اَنَّ الۡمُسۡرِفِیۡنَ ہُمۡ اَصۡحٰبُ النَّارِ ﴿۴۳﴾

۴۳۔ حقیقت یہ ہے کہ جس چیز کی طرف تم مجھے دعوت دیتے ہو اس کی نہ دنیا میں کوئی دعوت ہے اور نہ آخرت میں اور ہماری بازگشت یقیناً اللہ کی طرف ہے اور حد سے تجاوز کرنے والے تو یقیناً جہنمی ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ یٰقَوۡمِ مَا لِیۡۤ اَدۡعُوۡکُمۡ: مومن آل فرعون اپنے پیغمبرانہ دعوت کو جاری رکھتے ہوئے اپنے موقف اور مشرکین کے موقف میں موازنہ کر رہے ہیں اور فرماتے ہیں: میں تمہیں آتش جہنم سے نجات کی طرف بلاتا ہوں، تم مجھے آتش کی طرف بلا رہے ہو۔

۲۔ مَا لَیۡسَ لِیۡ بِہٖ عِلۡمٌ: تمہارے موقف پر کوئی دلیل نہیں ہے جو ثابت کرے کہ اللہ کا کوئی شریک موجود ہے۔ یہ شریک تمہارے وہم و خیال میں موجود ہے۔

جب کہ میرے موقف پر دلیل موجود ہے کہ اس کائنات کے نظام کی وحدت اس کے خالق کی وحدت پر دلیل ہے۔

۳۔ لَا جَرَمَ اَنَّمَا تَدۡعُوۡنَنِیۡۤ اِلَیۡہِ: اپنے موقف پر دلیل پیش کر رہے ہیں کہ جس شریک کی طرف تم بلا رہے ہو اس کی طرف سے نہ کوئی رسول آیا، نہ کوئی کتاب نازل ہوئی، نہ کوئی معجزات پیش کیے گئے لہٰذا تمہارے شریکوں کی طرف سے نہ دنیا کے لیے کوئی دعوت ہے کہ ان کی طرف سے کوئی دستور حیات دیا گیا ہو، نہ آخرت کے لیے کوئی دعوت ہے کہ ابدی زندگی کی سعادت کا کوئی پیغام دیا گیا ہو۔

۴۸۴

فَسَتَذۡکُرُوۡنَ مَاۤ اَقُوۡلُ لَکُمۡ ؕ وَ اُفَوِّضُ اَمۡرِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ بَصِیۡرٌۢ بِالۡعِبَادِ ﴿۴۴﴾

۴۴۔ جو بات (آج) میں تم سے کہ رہا ہوں (کل) تم اسے ضرور یاد کرو گے اور میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں، بے شک اللہ بندوں پر خوب نگاہ کرنے والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ فَسَتَذۡکُرُوۡنَ مَاۤ اَقُوۡلُ لَکُمۡ: جب عذاب الٰہی تم پر نازل ہو گا اور نجات کے سارے راستے تم پر بند ہو جائیں گے تو اس وقت تمہیں میری نصیحتیں یاد آئیں گی۔

۲۔ وَ اُفَوِّضُ اَمۡرِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ: یہاں ایک بات ذہن میں آنا ممکن ہے کہ اے مومن آل فرعون!

تم کسی آنے والے ممکنہ عذاب کی بات کر رہے ہو، عذاب تو تمہارے سر پر منڈلا رہا ہے. تم فرعون جیسے جابر کے سامنے ایسی باتیں کر رہے ہو۔ اس ممکنہ سوال کے جواب میں ایک نہایت ایمان اور یقین پر مبنی بات کرتے ہیں: میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔ وہ مجھے بچائے گا۔

۳۔ اِنَّ اللّٰہَ بَصِیۡرٌۢ بِالۡعِبَادِ: میں اللہ کی نگاہ میں ہوں. وہ دلوں کی کیفیت جانتا ہے لہٰذا مجھے کسی کا کوئی خوف نہیں ہے۔

فَوَقٰىہُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِ مَا مَکَرُوۡا وَ حَاقَ بِاٰلِ فِرۡعَوۡنَ سُوۡٓءُ الۡعَذَابِ ﴿۴۵﴾

۴۵۔ پس اللہ نے اس (مومن) کو ان کی بری چالوں سے بچایا اور آل فرعون کو برے عذاب نے گھیر لیا۔

تفسیر آیات

چنانچہ ہوا بھی ایسا۔ اس مومن نے اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کیا تو اللہ نے فرعونیوں کی بری چال سے بچا لیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے فرعونیوں نے اس مومن کے خلاف کوئی قدم اٹھایا ہے جسے اللہ نے ناکام بنایا اور آل فرعون کو اس عذاب نے آ لیا جس کی اس مومن نے پیش گوئی فرمائی تھی۔

اَلنَّارُ یُعۡرَضُوۡنَ عَلَیۡہَا غُدُوًّا وَّ عَشِیًّا ۚ وَ یَوۡمَ تَقُوۡمُ السَّاعَۃُ ۟ اَدۡخِلُوۡۤا اٰلَ فِرۡعَوۡنَ اَشَدَّ الۡعَذَابِ ﴿۴۶﴾

۴۶۔ وہ لوگ صبح و شام آتش جہنم کے سامنے پیش کیے جائیں گے اور جس دن قیامت برپا ہو گی (تو حکم ہو گا) آل فرعون کو سخت ترین عذاب میں داخل کرو۔

تفسیر آیات

۱۔ اَلنَّارُ یُعۡرَضُوۡنَ عَلَیۡہَا: آل فرعون برزخی زندگی میں آگ کے سامنے صبح و شام پیش کیے جاتے ہیں۔ یہ برزخی عذاب کا ذکر ہے۔

۲۔ وَ یَوۡمَ تَقُوۡمُ السَّاعَۃُ: قیامت کے دن کا عذاب، برزخی عذاب سے زیادہ شدید ہوگا۔

اس آیت سے اس نظریے کو تقویت ملتی ہے کہ برزخی زندگی یا تو شہیدوں اور بلند درجات والوں کو ملے گی یا سنگین جرائم کے مرتکب کافروں کے لیے ہو گی۔

وَ اِذۡ یَتَحَآجُّوۡنَ فِی النَّارِ فَیَقُوۡلُ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِیۡنَ اسۡتَکۡبَرُوۡۤا اِنَّا کُنَّا لَکُمۡ تَبَعًا فَہَلۡ اَنۡتُمۡ مُّغۡنُوۡنَ عَنَّا نَصِیۡبًا مِّنَ النَّارِ ﴿۴۷﴾

۴۷۔ اور جب وہ جہنم میں جھگڑیں گے تو کمزور درجے کے لوگ بڑا بننے والوں سے کہیں گے: ہم تو تمہارے تابع تھے، تو کیا تم ہم سے آتش کا کچھ حصہ دور کر سکتے ہو؟

قَالَ الَّذِیۡنَ اسۡتَکۡبَرُوۡۤا اِنَّا کُلٌّ فِیۡہَاۤ ۙ اِنَّ اللّٰہَ قَدۡ حَکَمَ بَیۡنَ الۡعِبَادِ ﴿۴۸﴾

۴۸۔ بڑا بننے والے کہیں گے: ہم سب اس (آتش) میں ہیں، اللہ تو بندوں کے درمیان یقیناً فیصلہ کر چکا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اِذۡ یَتَحَآجُّوۡنَ فِی النَّارِ: شکست خوردہ لوگ شکست کے بعد آپس میں لڑتے جھگڑتے ہیں۔ اہل جہنم میں جھگڑے کا قرآن میں دیگر مقامات پر بھی ذکر ہوا ہے۔

۲۔ کمزور درجے کے لوگ ان بڑے لوگوں سے، جن کی وہ دنیا میں تابعداری کرتے رہے ہیں یہاں بھی توقعات کا اظہار کریں گے۔

۳۔ فَہَلۡ اَنۡتُمۡ مُّغۡنُوۡنَ: توقع یہ ظاہر کریں گے کہ کیا تم آتش کا کچھ حصہ ہم سے دور کر سکتے ہو؟ انہیں معلوم ہے کہ وہ نہیں بچا سکتے۔ شاید یہ بات صرف انہیں مزید خوار کرنے کے لیے کہہ رہے ہوں گے یا دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے کہہ رہے ہوں گے یا ممکن ہے دنیا میں ان سرداروں کے آگے ہاتھ پھلانے کی عادت راسخ ہو گئی تھی اس کے تحت آخرت میں ان کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہوں۔

۴۔ قَالَ الَّذِیۡنَ اسۡتَکۡبَرُوۡۤا: سرداروں کی طرف سے جواب ملے گا: جس جہنم میں تم ہو اس میں ہم بھی ہیں۔ ہم اگر جہنم سے باہر ہوتے تو امکان کا تصور ہے کہ ہم تمہارے لیے کچھ کر سکیں گے مگر قیدی دوسرے قیدی کو کیسے چھڑا سکتا ہے۔

۵۔ اِنَّ اللّٰہَ قَدۡ حَکَمَ: جہنم میں آنے کی نوبت اللہ کے فیصلے کے مطابق آئی ہے۔ اللہ کے فیصلے کو کون ٹال سکتا ہے۔

وَ قَالَ الَّذِیۡنَ فِی النَّارِ لِخَزَنَۃِ جَہَنَّمَ ادۡعُوۡا رَبَّکُمۡ یُخَفِّفۡ عَنَّا

۴۹۔ اور جو لوگ آتش جہنم میں ہوں گے وہ جہنم کے کارندوں سے کہیں گے: اپنے پروردگار سے

يَوۡمًا مِّنَ الۡعَذَابِ ﴿۴۹﴾

درخواست کرو کہ ہم سے ایک دن کے لیے عذاب میں تخفیف کرے۔

تفسیر آیات

وَ قَالَ الَّذِیۡنَ فِی النَّارِ: اہل جہنم کو اس بات کا تو علم ہو گیا کہ یہ عذاب چند دنوں کے لیے نہیں، دائمی اور بلا فاصلہ ہے۔ دوسری یہ بات بھی ان کے علم میں آ گئی کہ اللہ تعالیٰ کافروں کی دعا نہیں سنے گا۔ اس لیے وہ جہنم کے خزانہ داروں سے درخواست کریں گے کہ وہ اللہ سے درخواست کریں۔ وہ صرف ایک دن کے لیے پورے عذاب کے ختم ہونے کی نہیں بلکہ اس میں تخفیف کی تمنا کرتے ہیں۔

قَالُوۡۤا اَوَ لَمۡ تَکُ تَاۡتِیۡکُمۡ رُسُلُکُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ ؕ قَالُوۡا بَلٰی ؕ قَالُوۡا فَادۡعُوۡا ۚ وَ مَا دُعٰٓؤُا الۡکٰفِرِیۡنَ اِلَّا فِیۡ ضَلٰلٍ ﴿۵۰﴾

۵۰۔ وہ کہیں گے: کیا تمہارے پیغمبر واضح دلائل لے کر تمہارے پاس نہیں آئے تھے؟ وہ کہیں گے: کیوں نہیں تو وہ کہیں گے: پس درخواست کرتے رہو اور کفار کی درخواست بے نتیجہ ہی رہے گی۔

تفسیر آیات

۱۔ قَالُوۡۤا اَوَ لَمۡ تَکُ تَاۡتِیۡکُمۡ رُسُلُکُمۡ: جہنم کے کارندے جواب میں کہیں گے: کیا تمہارے پاس واضح دلائل کے ساتھ اللہ کے رسولوں نے حجت پوری نہیں کی تھی۔

۲۔ قَالُوۡا بَلٰی: وہ کہیں گے ہاں! رسول بھی آئے تھے، حجت بھی پوری کی تھی۔

۳۔ قَالُوۡا فَادۡعُوۡا: اگر واضح دلائل کے ساتھ حجت پوری ہونے کے بعد تم نے انکار کیا تھا تو آج تمہاری دعا کے سنے جانے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

اس سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ اگر پیغام نہ پہنچا ہو، حجت پوری نہ ہوئی ہو تو دعا سنے جانے کا امکان ہے۔

اِنَّا لَنَنۡصُرُ رُسُلَنَا وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَ یَوۡمَ یَقُوۡمُ الۡاَشۡہَادُ ﴿۵۱﴾

۵۱۔ ہم اپنے رسولوں اور ایمان لانے والوں کی دنیاوی زندگی میں بھی مدد کرتے رہیں گے اور اس روز بھی جب گواہ کھڑے ہوں گے۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّا لَنَنۡصُرُ رُسُلَنَا وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا: اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ اپنے رسولوں اور مومنوں کی نصرت فرمائے گا۔ اللہ کبھی اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا اور یہ بھی وعدہ ہے جسے اللہ کی نصرت میسر آتی ہے اس پر کوئی غالب نہیں آ سکتا:

اِنۡ یَّنۡصُرۡکُمُ اللّٰہُ فَلَا غَالِبَ لَکُمۡ ...[1] (مسلمانو!) اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو کوئی تم پر غالب نہیں آ سکتا۔

کسی مشن کی کامیابی و ناکامیابی اس کے انجام کے اعتبار سے ہے۔ کسی تحریک نے اپنے لیے جس مقصد کا تعین کیا ہے وہ حاصل ہو جاتا ہے تو کامیابی ہے۔ دوسری صورت میں ناکامی ہے۔

یہاں سوال یہ آئے گا: اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کے سامنے کیا مقصد رکھا ہے؟ کیا وہ مقصد اہل حق کا اس طرح غلبہ ہے کہ اہل باطل کا وجود صفحۂ ہستی سے مٹ جائے اور معاملہ یکطرفہ ہو جائے۔ یعنی اہل حق کے موجود رہنے کا حق رہ جائے؟ یا یہ مقصد دیا ہے کہ اللہ کا پیغام انسانوں تک پہنچانے اور لوگوں پر حجت پوری کرنے کے لیے آوازِ حق کو زندہ کیا جائے؟

اگر اللہ نے پہلا مقصد اپنے رسولوں کے سامنے رکھا ہے تو یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اہل باطل ابھی تک اپنی پوری قوت کے ساتھ موجود ہیں۔ اللہ کا وعدۂ نصرت کب پورا ہو گا؟ اور اگر اللہ نے دوسرا مقصد سامنے رکھا ہے تو صاف نظر آتا ہے اللہ نے اپنا وعدہ نصرت پورا کیا ہے۔ آج آوازِ حق اپنی پوری قوت کے ساتھ زندہ ہے۔

آج نمرود و فرعون کی طاقت خاک میں مل گئی ہے لیکن کرۂ ارض پر ابراہیم و موسیٰ علیہما السلام زندہ ہیں۔ ابوجہل تاریخ کی تاریک تہوں میں دفن ہو گیا ہے مگر عبد اللہ کے یتیم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بول بالا ہے۔ یزید کا نام داخل دشنام ہے جب کہ حسین علیہ السلام کا نام فاتحین میں سرفہرست ہے۔

لہٰذا یہ بات واضح ہے کہ آوازِ حق کو اللہ کی نصرت حاصل رہی ہے اور یہ اپنی پوری طاقت و قوت کے ساتھ زندہ ہے جب کہ حق کو دبانے کی کوشش کرنے والی قوتیں اپنے مقصد میں ناکام ہیں۔

درست ہے باطل قوتیں ہماری سرزمینوں، اقتصادیات اور ہمارے سیاسی امور پر تسلط قائم کرتی ہیں لیکن حق کی آواز کو خود ان کے اپنے ملکوں میں پذیرائی مل رہی ہے۔ وہ ہمارے درمیان مادی طاقت کا نفوذ کرتے ہیں جو وقتی اور ناپائیدار ہے اور حق ان کے ذہنوں میں نفوذ کر رہا ہے جو ابدی اور دائمی ہے۔ فافھم ذلک۔

فرانس میں حجاب پر اور سوئزرلینڈ میں مساجد کے میناروں پر پابندی نفوذ حق سے خائف ہونے

---

[1] ۳ آل عمران: ۱۶۰

والوں کی پریشانی حال کا مظہر ہے۔

۲۔ وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ: جس دن گواہ اللہ کی عدالت میں پیش ہوں گے اس دن بھی اللہ اپنے رسولوں اور مومنین کی نصرت فرمائے گا۔ البتہ دنیا اور آخرت کی نصرت میں فرق ہو گا۔ دنیا دار امتحان ہے۔ یہاں باطل کو بھی سرکشی کی مہلت دی جاتی ہے۔ حق کی آواز مٹانے کی باطل کی کوشش ناکام بنا دی جاتی ہے اور اہل حق کو اللہ نصرت عطا فرماتا ہے۔

جب کہ قیامت کے دن کی نصرت یہ ہے کہ رسولوں اور مومنوں کو نعمتوں سے نوازا جائے گا اور ان کے دشمنوں کو دائمی رسوائی اور عذاب میں ڈال دیا جائے گا۔

يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظّٰلِمِيْنَ مَعْذِرَتُهُمْ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ﴿۵۲﴾

۵۲۔ اس روز ظالموں کو ان کی معذرت فائدہ نہیں دے گی اور ان پر لعنت پڑے گی اور ان کے لیے بدترین ٹھکانا ہو گا۔

تفسیر آیات

۱۔ قیامت کے دن یہ لوگ اپنی معذرت پیش ہی نہیں کر سکیں گے:

وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ ﴿﴾ [1] اور انہیں اجازت نہیں دی جائے گی کہ وہ عذر پیش کریں۔

یا ان کی معذرت قبول نہ ہو گی چونکہ معذرت قبول کرنا ایک قسم کی رحمت ہے۔

۲۔ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ: قیامت کے دن وہ ہر قسم کی رحمت سے دور ہوں گے لہٰذا ان کی کوئی بات نہیں سنی جائے گی۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْهُدٰى وَ اَوْرَثْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ ﴿۵۳﴾

۵۳۔ اور بتحقیق ہم نے موسیٰ کو ہدایت دی اور بنی اسرائیل کو ہم نے اس کتاب کا وارث بنایا،

هُدًى وَّذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۵۴﴾

۵۴۔ جو صاحبان عقل کے لیے ہدایت اور نصیحت تھی۔

تفسیر آیات

۱۔ اس جگہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر اس لحاظ سے ہے۔ اللہ کا یہ ارشاد ہے: ہم نے موسیٰ کو فرعون کے مقابلے کے لیے مامور کیا تو انہیں کامیاب بنانا ہمارے ذمے تھا، چنانچہ موسیٰ کو ہم نے کامیاب بنایا اور بنی اسرائیل کو مظلومیت کے بعد کتاب کا وارث بنا دیا۔

---

[1] ۷۷ مرسلات ۳۶

اس میں رسول اللہ ﷺ کے لیے ایک لطیف اشارہ ہے:

جس نے موسیٰ علیہ السلام کو فرعون جیسے طاغوت کے مقابلے میں کامیابی عنایت کی ہے وہ آپ ﷺ کو بھی کامیابی عنایت کرے گا۔

۲۔ هُدًى وَّ ذِكْرٰى: جو کتاب بنی اسرائیل کو دی گئی ہے وہ ہدایت اور نصیحت پر مشتمل تھی۔ اس ہدایت اور نصیحت کو صاحبان عقل وخرد سے سروکار تھا۔ صاحبان عقل سے توقعات وابستہ کرنا خود دلیل ہے اس بات کی کہ یہ باتیں حق وحقیقت پر مبنی ہیں۔

فَاصۡبِرۡ اِنَّ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاسۡتَغۡفِرۡ لِذَنۡۢبِكَ وَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ بِالۡعَشِیِّ وَالۡاِبۡكَارِ ﴿۵۵﴾	۵۵۔ پس آپ صبر کریں، یقیناً اللہ کا وعدہ برحق ہے اور اپنے گناہ کے لیے استغفار کریں اور صبح و شام اپنے رب کی ثناء کے ساتھ تسبیح کریں۔

تفسیر آیات

۱۔ فَاصۡبِرۡ اِنَّ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقٌّ: حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تاریخ بیان کرنے کے بعد نتیجہ اخذ کرتے ہوئے فرمایا: جب طاغوتوں کا انجام آپ نے دیکھ لیا تو درپیش مشکلات میں صبر سے کام لیں۔ ہم اپنے رسولوں اور مومنوں کی مدد کرنے والے ہیں۔ وعدۂ فتح و نصرت کے بعد صبر کا حکم دیا تاکہ رسول اللہ ﷺ کے لیے صبر کرنا آسان ہو جائے۔ البتہ یہ صبر اتنا آسان بھی نہیں ہوتا چونکہ اللہ کی طرف سے فتح و نصرت انتہائی مشکلات سر کرنے کے بعد آتی ہے۔

۲۔ وَّاسۡتَغۡفِرۡ لِذَنۡۢبِكَ: اپنے گناہ کے لیے استغفار کر۔ اس آیت میں وعدہ نصرت کے بعد استغفار کا حکم اس بات کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے کہ آپؐ کی تحریک میں کچھ افراد کی وجہ سے جو قصور موجود ہے۔ اس کی تلافی کر۔ چونکہ غفران کے ایک معنی تلافی کے ہیں۔ جیسا کہ سورہ فتح آیت ۱، ۲ میں فرمایا:

اِنَّا فَتَحۡنَا لَكَ فَتۡحًا مُّبِيۡنًا ۙ لِّيَغۡفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنۡ ذَنۡۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ ...	(اے رسول) ہم نے آپ کو فتح دی، ایک نمایاں فتح۔ تاکہ اللہ آپ کی (تحریک کی) اگلی اور پچھلی خامیوں کو دور فرمائے۔

اس آیت میں فتح مبین اور غفران ذنب کے درمیان ربط اسی صورت میں قائم ہو سکتا ہے اگر لِّيَغۡفِرَ میں غفران کو بمعنی تلافی لیا جائے کہ ہم نے آپ کو فتح مبین سے نوازا تاکہ آپ کی تحریک میں موجود اگلی اور پچھلی کوتاہیوں کی تلافی ہو جائے۔ والعلم عند اللّٰہ۔

۳۔ وَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ: ساتھ تسبیح کا حکم بھی فتح و نصرت کی صورت میں آیا کرتا ہے۔ جیسے اِذَا جَآءَ

نَصۡرُ اللّٰہِ وَ الۡفَتۡحُ ۔[1] کے آخر میں حکم ہوا: فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّکَ وَ اسۡتَغۡفِرۡہُ ....[2]

لہٰذا فتح و نصرت حاصل ہونے کے موقع پر تسبیح و استغفار کا حکم اور ان کا آپس میں ربط قابل غور اور مطالعہ ہے۔ ان میں ربط اور راز صرف ائمہ علیہم السلام بتا سکتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ یُجَادِلُوۡنَ فِیۡۤ اٰیٰتِ اللّٰہِ بِغَیۡرِ سُلۡطٰنٍ اَتٰىہُمۡ ۙ اِنۡ فِیۡ صُدُوۡرِہِمۡ اِلَّا کِبۡرٌ مَّا ہُمۡ بِبَالِغِیۡہِ ۚ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰہِ ؕ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ ﴿۵۶﴾

۵۶۔ بے شک جو لوگ اللہ کی آیات کے بارے میں جھگڑتے ہیں بغیر کسی دلیل کے جو ان کے پاس آئی ہو، ان کے دلوں میں بڑائی کے سوا کچھ نہیں، وہ اس (بڑائی) تک نہیں پہنچ پائیں گے، لہٰذا آپ اللہ کی پناہ مانگیں، وہ یقیناً خوب سننے والا، دیکھنے والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اس سورہ میں موجود متعدد آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت یہ سورہ نازل ہو رہا تھا اس وقت کفار مکہ نے کج بحثیاں شروع کر کے مختلف شبہات پیدا کر دیے اور الزامات کا ایک سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ ان کج بحثیوں میں یہ لوگ بغیر کسی قسم کی سند اور حوالے کے باتیں اٹھاتے تھے اور بغیر سلطان، دلیل و منطق کے صرف اندھی تقلید اور واہموں کی بنیاد پر جھگڑے چھیڑتے تھے۔

۲۔ اِنۡ فِیۡ صُدُوۡرِہِمۡ اِلَّا کِبۡرٌ: ان کے دلوں میں اگر کوئی بات ہے تو وہ صرف تکبر ہے۔ وہ اپنے آپ کو اس بات سے بالاتر سمجھتے ہیں کہ بنی ہاشم کے ایک فرد کو اللہ کا رسول تسلیم کریں اور اپنی بالا دستی رکھنا چاہتے ہیں۔

۳۔ مَّا ہُمۡ بِبَالِغِیۡہِ: وہ اس بالادستی کو قائم نہیں رکھ سکیں گے۔ اس میں ایک اہم نوید ہے کہ یہ لوگ عنقریب زیر ہونے والے ہیں۔

۴۔ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰہِ: آپ اللہ کی پناہ میں آ جائیں۔ وہ آپ کی باتیں سننے اور آپ کے حالات پر نظر رکھنے والا ہے۔

دشمنوں کی ذلت و خواری کی نوید اور اللہ کی پناہ، مشکل ترین حالات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے لیے بہت بڑی تقویت ہے۔

---

[1] ۱۱۰ نصر: ۱

[2] ۱۱۰ نصر: ۳ اپنے رب کی ثنا کے ساتھ اس کی تسبیح کریں اور اس سے مغفرت طلب کریں۔

لَخَلۡقُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ اَکۡبَرُ مِنۡ خَلۡقِ النَّاسِ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۵۷﴾

۵۷۔ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا انسانوں کے خلق کرنے سے زیادہ بڑا کام ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

تفسیر آیات

۱۔ اگرچہ اس کائنات میں انسان اور حیات کی تخلیق اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نشانی اور معجزہ ہے تاہم ایک بے بیکراں کائنات کی تخلیق انسان کی تخلیق سے کہیں زیادہ بڑا کام ہے۔

سورہ نازعات: ۲۷ میں فرمایا:

ءَاَنۡتُمۡ اَشَدُّ خَلۡقًا اَمِ السَّمَآءُ ؕ بَنٰہَا ﴿﴾

کیا تمہارا خلق کرنا زیادہ مشکل ہے یا اس آسمان کا جسے اس نے بنایا ہے؟

اس آیت کا مفہوم بھی یہی ہے کہ آسمانوں کا بنانا زیادہ اشد و اکبر ہے تو تمہارا یہ کہنا نہایت نادانی ہے: ان بوسیدہ ہڈیوں کو اللہ دوبارہ کیسے پیدا کرے گا؟ کیا تم نے کبھی غور کیا ہے کہ انسان کے دوبارہ بنانے سے کائنات کا بنانا زیادہ سنگین کام تھا جسے اللہ تعالیٰ نے خلق فرمایا ہے تو انسان کو دوبارہ خلق کرنے میں اللہ کو کون سی دشواری پیش آئے گی۔

وَ مَا یَسۡتَوِی الۡاَعۡمٰی وَ الۡبَصِیۡرُ ۬ۙ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ لَا الۡمُسِیۡٓءُ ؕ قَلِیۡلًا مَّا تَتَذَکَّرُوۡنَ ﴿۵۸﴾

۵۸۔ اور نابینا اور بینا برابر نہیں ہو سکتے نیز نہ ہی ایماندار اور عمل صالح بجالانے والے اور بدکار، تم لوگ بہت کم نصیحت قبول کرتے ہو۔

تفسیر آیات

۱۔ آخرت کا ہونا لازمی امر ہے ورنہ یہ کائنات بے مقصد اور عبث ہو جاتی ہے لہٰذا عدل الٰہی کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ قیامت ہو۔ جہاں ایمانی بصیرت رکھنے والے اندھوں کے برابر نہ ہوں گے اور نیک اعمال بجالانے والے، بدکاروں کے برابر نہ ہوں گے۔

قَلِیۡلًا مَّا تَتَذَکَّرُوۡنَ: کیا اس بات سے نصیحت نہیں لیتے کہ اس کائنات کی ساخت اور اس میں ظالم و مظلوم کا ہونا، صالح اور بدکار کا وجود عدل و انصاف کا متقاضی ہے۔ کوئی عدالت ایسی ہونی چاہیے جہاں ان میں فیصلہ ہو۔

اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۹﴾	۵۹۔ قیامت یقیناً آنے والی ہے، اس میں کوئی شک نہیں ہے لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔

تفسیر آیات

صالح اور بدعمل، ظالم اور مظلوم کے برابر نہ ہونے کا لازمہ یہ ہے کہ قیامت کا آنا ناقابل تردید حقیقت ہے۔ یہی وجہ ہے قرآن مجید میں تصور آخرت کی سب سے زیادہ تاکید کے ساتھ وضاحت کی گئی ہے۔

وَ قَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ ﴿۶۰﴾	۶۰۔ اور تمہارا پروردگار فرماتا ہے: مجھے پکارو، میں تمہاری دعائیں قبول کروں گا، جو لوگ از راہ تکبر میری عبادت سے منہ موڑتے ہیں یقیناً وہ ذلیل ہو کر عنقریب جہنم میں داخل ہوں گے۔

تفسیر آیات

۱۔ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ: اس آیت مبارکہ میں ایک حکم، ایک وعدہ ہے: ادْعُوْنِيْٓ مجھے پکارو، مجھ سے مانگو ایک حکم ہے۔ اَسْتَجِبْ لَكُمْ میں تمہاری دعائیں قبول کروں گا، ایک وعدہ ہے۔ یہ بات اپنی جگہ مسلم اور یقینی ہے کہ اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے:

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُفْتَحَ بَابَ الدُّعَاءِ وَ يُغْلِقَ عَلَيْهِ بَابَ الْاِجَابَةِ۔[1]	اللہ ایسے نہیں کر سکتا کہ دعا کا دروازہ کھولے اور قبول دعا کا دروازہ بند کر دے۔

بات رہ جاتی ہے حکم کی تعمیل کی۔

ادْعُوْنِيْٓ: مجھ سے مانگو۔ اس حکم کی تعمیل قابل توجہ، اہمیت کی حامل اور تقدیر ساز ہے۔ انسان سے دعا صادر ہو جائے، اللہ تعالیٰ کو پکار لے، اپنے معبود سے مانگنے کا عمل وجود میں آ جائے۔ اس تقدیر ساز عمل کا وجود چند عناصر کی ترکیب سے ممکن ہے:

الف۔ دعا خشوع قلب سے ہو، انسان کا پورا وجود سراپا احتیاج بن جائے، طلب اور درخواست کا اظہار پورے وجود سے ہو۔ جس طرح انسان بھوک سے نڈھال ہو جاتا ہے تو اس کا اظہار پورا وجود کرتا اور پورے وجود سے کھانے کی طلب اور درخواست ظاہر ہوتی ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا

----

[1] وسائل الشیعة ۷: ۲۷

ارشاد ہے:

اُدۡعُوۡا رَبَّکُمۡ تَضَرُّعًا وَّ خُفۡیَۃً ....[1] اپنے رب کی بارگاہ میں دعا کرو، عاجزی اور خاموشی کے ساتھ

حدیث نبوی ہے:

لَا یَقْبَلُ اللّٰہُ دُعَاءَ قَلْبٍ سَاہٍ۔[2] اللہ تعالیٰ غافل دل کی دعا قبول نہیں کرتا۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

اذا اقشعر جلدك و دمعت عيناك و وجل قلبك فدونك دونك فقد قصد قصدك۔[3] اگر دعا کے وقت تجھ پر لرزہ طاری ہو جائے، آنکھیں اشکبار ہوں، دل میں خوف آ جائے تو سمجھ لے تیری حاجت تیرے سامنے ہے۔ تیرا مقصد حاصل ہے۔

ب۔ معرفت: اس بات کی معرفت کے ساتھ دعا ہونی چاہیے کہ میں کس کی بارگاہ میں دست بدعا ہوں۔

روایت ہے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے سوال ہوا: کیا وجہ ہے ہم دعائیں کرتے ہیں قبول نہیں ہوتیں؟ آپ علیہ السلام نے فرمایا:

لِاَنَّکُمْ تَدْعُونَ مَنْ لَا تَعْرِفُونَہٗ۔[4] وہ اس لیے کہ تم ایسی ذات کو پکارتے ہو جس کی تم معرفت نہیں رکھتے۔

دوسری حدیث میں ہے۔

لَوْ عَرَفْتُمُ اللّٰہَ حَقَّ مَعْرِفَةِ لَزَالَتِ الْجِبَالُ بِدُعَائِکُمْ۔[5] اگر تم اللہ کی اس طرح معرفت حاصل کرو جیسی معرفت کا حق ہے تو تمہاری دعاؤں سے پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ سکتا ہے۔

ج۔ قبولیت کا عقیدہ ہو: دعا کرتے ہوئے اس بات پر اطمینان اور عقیدہ ہونا چاہیے کہ ایسی ذات کی بارگاہ میں ہاتھ پھیلا رہا ہوں جہاں سے کوئی سوالی خالی ہاتھ واپس نہیں ہوتا۔

حدیث نبوی ہے:

اُدْعُوا اللّٰہَ وَ اَنْتُمْ مُوقِنُونَ بِالْاِجَابَۃِ۔[6] اللہ سے اس حال میں دعا کرو کہ قبولیت پر یقین ہو۔

نیز حدیث میں آیا ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِی بِی فَلَا یَظُنَّ بِی میں اپنے بندے کے گمان کے پاس ہوتا ہوں لہٰذا

---

[1] الاعراف: ۵۵ [2] الوسائل ۷: ۵۳ [3] عدۃ الداعی: ۱۶۷ [4] مستدرک الوسائل ۵: ۱۹۱
[5] مستدرک الوسائل ۱۷: ۳۰۱ [6] مستدرک الوسائل ۵: ۱۹۰

اِلَّا خَیْراً۔[1]　　مجھ سے حسن ظن رکھو۔

د۔ قانون طبیعت کی خلاف ورزی نہ کرے: اگر ایک شخص اللہ تعالیٰ کے وضع کردہ قانون فطرت و طبیعت کی خلاف ورزی کر کے دعا کرتا ہے، اس کی دعا قبول نہ ہو گی۔

حدیث نبوی ہے:

خمسة لا یستجاب لھم احدھم رجل مر بحائط مائل و ھو یقبل الیه و لم یسرع المشی حتی سقط علیه...۔[2]	پانچ افراد کی دعا قبول نہ ہوگی: ایک وہ شخص جو گرنے والی دیوار کی طرف جا رہا ہو اور گزرنے میں تیزی نہ کرے یہاں تک کہ دیوار اس پر گر جائے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

اَرْبَعَةٌ لَا تُسْتَجَابُ لَهُمْ دَعْوَةٌ۔ رَجُلٌ جَالِسٌ فِی بَیْتِهِ یَقُولُ اللّٰهُمَّ ارْزُقْنِی فَیُقَالُ لَهُ اَلَمْ آمُرْكَ بِالطَّلَبِ...۔[3]	چار افراد کی دعا قبول نہ ہو گی۔ ایک وہ جو گھر بیٹھ کر دعا کرتا ہے: اے اللہ! مجھے روزی دے۔ اس سے کہا جائے گا کیا میں نے تجھے روزی کمانے کا حکم نہیں دیا تھا؟

ھ۔ بدعمل نہ ہو: ایک طرف اللہ کے حکم عدولی کو اپنا شیوہ بنایا ہو، دوسری طرف اللہ سے دعا کرتا ہو۔ ایک طرف اللہ سے منہ موڑتا ہو، دوسری طرف اللہ کی طرف رخ کر کے کچھ مانگتا ہو۔ ایسے شخص کی دعا قبول نہ ہو گی۔

حدیث نبوی ہے:

یَااَبَاذَرٍّ! مَثَلُ الَّذِی یَدْعُو بِغَیْرِ عَمَلٍ کَمَثَلِ الَّذِی یَرْمِی بِغَیْرِ وَ تَرٍ...۔[4]	اے ابوذر! جو عمل کے بغیر دعا کرتا ہے وہ اس شخص کی طرح ہے جو کمان کے بغیر تیراندازی کرنا چاہتا ہے

دوسری حدیث میں آیا ہے:

مَنْ سَرَّهُ اَنْ یُسْتَجَابَ دَعْوَتُهُ فَلْیُطَیِّبْ کَسْبَهُ۔[5]	جسے یہ پسند ہو اس کی دعا قبول ہو تو اپنی کمائی کو پاکیزہ رکھے۔

دعا کی دیگر خصوصیات کے بارے میں تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سورہ بقرہ آیت ۱۸۶۔

۲۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ یَسۡتَکۡبِرُوۡنَ عَنۡ عِبَادَتِیۡ: جو لوگ از راہ تکبر میری عبادت سے منہ موڑتے ہیں وہ خوار ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔ آیت کے اس جملے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ دعا کرنا عبادت ہے۔ دعا نہ کرنا، ترک عبادت ہے۔ جیسا کہ احادیث میں آیا ہے:

---

[1] وسائل الشیعة ۱۵: ۲۳۱　[2] بحار الانوار۔۵: ۱۰۵　[3] الکافی ۲: ۵۱۲　[4] الوسائل ۷: ۸۴　[5] مستدرك الوسائل ۱۳: ۲۷

اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ...۔[1] دعا مغز عبادت ہے۔

دوسری حدیث میں آیا ہے:

اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةِ...۔[2] دعا ہی عبادت ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الَّیۡلَ لِتَسۡکُنُوۡا فِیۡہِ وَ النَّہَارَ مُبۡصِرًا ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَذُوۡ فَضۡلٍ عَلَی النَّاسِ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَشۡکُرُوۡنَ ﴿۶۱﴾

۶۱۔ اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لیے رات بنائی کہ تم اس میں آرام کرو اور دن کو روشن بنایا، اللہ لوگوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے لیکن اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے۔

ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمۡ خَالِقُ کُلِّ شَیۡءٍ ۘ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۫ فَاَنّٰی تُؤۡفَکُوۡنَ ﴿۶۲﴾

۶۲۔ یہی اللہ تمہارا رب ہے جو ہر چیز کا خالق ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، پھر تم کہاں بھٹک رہے ہو؟

تفسیر آیات

۱۔ اَللّٰهُ الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الَّیۡلَ: اللہ وہ ہے جس نے تمہارے لیے رات بنائی تا کہ تم آرام کرو۔ رات اور دن کی آمد و رفت اللہ تعالیٰ کی آیات ربوبیت اور مدبریت میں سے ہے۔ سورہ یونس آیت ۶۷ میں آیت کے اس جملے کی تشریح ہو چکی ہے۔

۲۔ اِنَّ اللّٰہَ لَذُوۡ فَضۡلٍ عَلَی النَّاسِ: شب و روز کی گردش پر کرۂ ارض پر ہر ذی روح کی زندگی موقوف ہے۔ اسی لیے سورہ قصص آیت ۷۳ میں اسی گردش لیل و نہار کو رحمت خدا سے تعبیر فرمایا ہے۔

۳۔ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَشۡکُرُوۡنَ: مشرکین اس ذات کا شکر نہیں کرتے جس نے یہ رحمت، یہ فضل و کرم عنایت کیا ہے بلکہ وہ اپنے شرکاء کی مہربانی سمجھتے ہیں۔

۴۔ ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمۡ: یہی اللہ تمہارا رب ہے جس نے تمہارے لیے متاع حیات اور سامان زیست فراہم کیا، نہ تمہارے بے شعور معبود۔

۵۔ خَالِقُ کُلِّ شَیۡءٍ ۘ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ: وہ ہر شے کا خالق ہے لہٰذا خالق ہی لائق عبادت ہوتا ہے۔ اس قسم کی مختلف آیات کی روشنی میں ہم نے عبادت کی یہ تعریف اختیار کی ہے: کسی ذات کو خالق اور رب سمجھ کر اس کی تعظیم کرنا عبادت ہے۔

۶۔ فَاَنّٰی تُؤۡفَکُوۡنَ: حقیقی رب تو وہ ہے جو خالق ہے۔ اسی کے قبضے میں تمہاری جان ہے۔ اس ذات

---

[1] وسائل الشیعة ۷:۲۷
[2] الکافی ۲: ۴۶۷

ذات کو چھوڑ کر کس واہمے میں بھٹک رہے ہو۔

كَذٰلِكَ يُؤْفَكُ الَّذِيْنَ كَانُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ﴿۶۳﴾

۶۳۔ اسی طرح وہ لوگ بھی بھٹکتے رہے جو اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے۔

تفسیر آیات

جو کافر اللہ کی ان نشانیوں کا انکار کرتے ہیں جن سے اللہ کی ربوبیت اور مدبریت واضح طور پر ثابت ہے وہ راہ نجات سے بھٹک جائیں گے۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۭ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ښ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۶۴﴾

۶۴۔ اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو جائے قرار اور آسمان کو عمارت بنایا اور اسی نے تمہاری صورت بنائی تو بہترین صورت بنائی اور تمہیں پاکیزہ رزق دیا، یہی اللہ تمہارا رب ہے، پس بابرکت ہے وہ اللہ جو عالمین کا رب ہے۔

تفسیر آیات

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور تدبیریت پر دلالت کرنے والے واضح ترین دلائل کا ذکر ہے:

ا۔ اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا: کرۂ ارض اللہ نے اس طرح خلق فرمایا کہ یہاں حیات کے لیے ضروری چیزیں مہیا ہو سکیں اور جائے قرار ثابت ہو۔ زندگی کے لوازم کی فراہمی میں کرۂ ارض کی تخلیق کا انداز اور نوعیت ہی بنیاد ہے۔ اسے خلق فرماتے ہوئے اس کے حجم کو ایسا رکھا کہ یہاں زندگی کا ماحول سازگار ہو چونکہ کرۂ ارض موجودہ حجم سے بڑا یا چھوٹا ہونے کی صورت میں یہاں زندگی ممکن نہ تھی۔ اس کا سورج سے فاصلہ، اس کی گردش کی مختلف قسمیں، سب کو یہاں زندگی کے لیے سازگار بنایا۔ اگر زمین کی محوری اور سورج کے گرد گردش، موجودہ گردش کی رفتار سے تیز تر ہوتی تو یہاں زندگی ممکن نہ تھی۔ اگر اس کی محوری گردش نہ ہوتی تو سمندروں کا وجود ممکن نہ تھا اور موسم بھی مختلف نہ ہوتے۔ اگر آکسیجن کا موجودہ تناسب ۲۱ فیصد سے بڑھ کر ۵۰ فیصد ہو جاتا تو یہاں آگ ہی آگ ہوتی اور اگر ۲۱ فیصد سے گھٹ کر دس فیصد رہ جاتا تو حرارت کی کمی کی وجہ سے زندگی ممکن نہ ہوتی۔ اس طرح کی ہزاروں باتیں اس زمین کے جائے قرار ہونے کے لیے لازمی ہیں جو اللہ تعالیٰ نے فراہم فرمائی ہیں۔ اسی لیے ہم نے تکراراً یہ بات واضح کی کہ تخلیق اور

تدبیر نا قابل تفریق ہے۔

۲۔ وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً: اور آسمان کو ایسی عمارت بنایا جو چھت کا کام دے کہ آسمانوں سے آنے والے حیات بخش شعاعوں کو آنے دے اور حیات کے منافی اور مضر چیزوں، جیسے قاتل شعاعوں اور پتھروں کو نہ آنے دے۔

۳۔ وَّصَوَّرَكُمۡ فَاَحۡسَنَ صُوَرَكُمۡ: تمہاری صورت بنائی تو بہترین صورت گری فرمائی۔ انسان کو اللہ تعالیٰ جس انداز میں خلق فرمایا اس پر خود قدرت کو ناز ہے فرمایا: فَاَحۡسَنَ صُوَرَكُمۡ نیز فرمایا: لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِيۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِيۡمٍ ۔[1] بتحقیق ہم نے انسان کو بہترین اعتدال میں پیدا کیا۔ چنانچہ انسان کی ساخت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے اس کی قامت، دونوں ہاتھ، اس کی انگلیاں، انگلیوں کی ساخت کا انداز، دونوں پاؤں، گردن و دیگر اعضاء و جوارح کو اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ اس انسان کے لیے بہت سی چیزوں کو تسخیر کرنا ممکن ہو سکے:

وَلِسَانًا وَّشَفَتَيۡنِ وَهَدَيۡنٰهُ النَّجۡدَيۡنِ ۝[2] کیا ہم نے اس کے لیے نہیں بنائیں دو آنکھیں اور ایک زبان اور دو ہونٹ؟

۴۔ وَرَزَقَكُمۡ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ: اور تمہیں پاکیزہ رزق دیا۔ پاکیزہ، گوارا، لذیذ اور جسم و جان سے ہم آہنگ رزق، مختلف رنگوں، خصلتوں اور لذتوں پر مشتمل عنایت فرمایا۔ ان ارزاق کی فراہمی میں صرف انسان کو زندہ رکھنا نظر میں نہیں رکھا، ورنہ اس کے لیے گندم یا جو کا دانہ کافی تھا بلکہ انسانی ذوق اور خواہشات کا بھی لحاظ رکھا ہے۔

۵۔ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمۡ: یہ ہے تمہارا رب۔ جس نے زمین و آسمان کی تخلیق جو کا انداز اختیار کیا تمہاری صورت گری کے لیے جو طریقہ اپنایا اور تمہاری زندگی برقرار رکھنے اور ذوق کی تسکین کے لیے روزی فراہم کی وہ تمہارا رب ہے۔ اسی کی بندگی کرو۔ ۴۹۸

۶۔ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الۡعٰلَمِيۡنَ: ان بتوں میں کیا برکت ہوگی، جو نہ صرف عالمین کے رب نہیں بلکہ اپنی ذات کے بھی رب نہیں ہیں۔

هُوَ الۡحَيُّ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَادۡعُوۡهُ مُخۡلِصِيۡنَ لَهُ الدِّيۡنَ ؕ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۶۵﴾

۶۵۔ وہی زندہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں لہٰذا تم دین کو اس کے لیے خالص کر کے اسی کو پکارو، ثنائے کامل ہے اس اللہ کے لیے جو عالمین کا پروردگار ہے۔

---

[1] ۹۵ تین: ۴ [2] ۹۰ بلد: ۸۔۹

تفسیر آیات

۱۔ هُوَ الْحَيُّ: اللہ کی ذات ہی زندہ ہے۔ جو بذات خود زندہ اور دوسروں کی زندگی کا سرچشمہ ہے۔ باقی تمام زندوں کی زندگی مستعار ہے۔ وہی لائق عادت ہے۔

۲۔ فَادْعُوْهُ: پس عقل کا تقاضا ہے حیات دہندہ کی بندگی کی جائے۔ پکارنا اسی کو چاہیے جو ہمیشہ زندہ ہو، نہ وہ غافل ہو، نہ اسے نیند آتی ہو: لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ...[1]

۳۔ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ: بندگی میں اللہ کے علاوہ کسی موہوم معبود کو شریک نہ کیا جائے۔

۴۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ: لائق حمد وہی ہے جو عالمین کا واحد رب ہے۔

قُلْ اِنِّيْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَمَّا جَآءَنِيَ الْبَيِّنٰتُ مِنْ رَّبِّيْ ۡ وَاُمِرْتُ اَنْ اُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۶۶﴾

۶۶۔ کہد یجیے: مجھے اس بات سے روک دیا گیا ہے کہ میں ان کی عبادت کروں جنہیں تم اللہ کے علاوہ پکارتے ہو جب کہ میرے پاس میرے رب کی طرف سے واضح دلائل آچکے ہیں اور مجھے یہ حکم ہوا ہے کہ میں رب العالمین کا تابع فرمان رہوں۔

تفسیر آیات

قُلْ اِنِّيْ نُهِيْتُ: کہد یجیے غیر اللہ کی پرستش کو میں نے کسی ذاتی مفاد اور دنیوی مصلحت کی بنا پر مسترد نہیں کیا بلکہ مجھے اس سے روکا گیا ہے۔ وحی نے روکا، فطرت نے روکا، دلیل نے روکا ہے۔ چنانچہ ان سب دلائل کا مصدر اور سرچشمہ میرا ربّ ہے۔

۲۔ وَاُمِرْتُ اَنْ اُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ: اور ساتھ یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ میں رب العالمین کا تابع فرمان رہوں۔

لہٰذا غیر اللہ کی عبادت سے روگردانی اور رب العالمین کا تابع فرمان رہنا ان بینات کی بنا پر ہے جو میرے رب کی طرف سے مجھے ملی ہیں۔

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ

۶۷۔ وہ وہی ہے جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا پھر نطفے سے پھر لوتھڑے سے پھر تمہیں بچے کی صورت

[1] ۲ بقرۃ: ۲۵۵

يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُوْنُوْا شُيُوْخًا ۚ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى مِنْ قَبْلُ وَلِتَبْلُغُوْٓا اَجَلًا مُّسَمًّى وَّلَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۷﴾

میں پیدا کرتا ہے پھر (تمہاری نشوونما کرتا ہے) تاکہ تم اپنی جوانی کو پہنچ جاؤ پھر (تمہیں مزید زندگی دیتا ہے) تاکہ تم بڑھاپے کو پہنچ پاؤ اور تم میں سے کوئی تو پہلے ہی مر جاتا ہے اور (بعض کو مہلت ملتی ہے) تاکہ تم اپنے مقررہ وقت کو پہنچ جاؤ اور تاکہ تم عقل سے کام لو۔

تفسیر آیات

اس آیت کی تشریح کے لیے سورہ حج آیت ۵ ملاحظہ فرمائیں

کوئی تو اپنی طبعی عمر پوری کر لیتا ہے اور کوئی طبعی عمر پوری کرنے سے پہلے مر جاتا ہے۔ اَجَلًا مُّسَمًّى مقررہ وقت ہوتا ہے جس میں تغیر و تبدیل کا امکان نہیں ہوتا خواہ کتنی لمبی عمر کیوں نہ گزاری جائے۔

هُوَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۚ فَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۶۸﴾

۶۸۔ وہی تو ہے جو زندگی دیتا ہے اور وہی موت بھی دیتا ہے پھر جب وہ کسی امر کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اس سے صرف یہ کہتا ہے: ہو جا! پس وہ ہو جاتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ موت و حیات اسی کے ہاتھ میں ہے۔ جب کسی چیز کی ایجاد کے لیے اللہ کا صرف ارادہ کافی ہے تو اعادۂ حیات میں اسے کون سی رکاوٹ پیش آئے گی۔

۲۔ كُنْ فَيَكُوْنُ کے بارے میں تشریح پہلے ہو چکی ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ ۭ اَنّٰى يُصْرَفُوْنَ ﴿۶۹﴾

۶۹۔ کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اللہ کی آیات کے بارے میں جھگڑتے ہیں؟ یہ لوگ کہاں پھرے جاتے ہیں؟

الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِالْكِتٰبِ وَبِمَآ اَرْسَلْنَا بِهٖ رُسُلَنَا ڗ فَسَوْفَ

۷۰۔ جنہوں نے اس کتاب کی اور جو کچھ ہم نے پیغمبروں کو دے کر بھیجا ہے اس کی تکذیب کی

يَعْلَمُوْنَ ﴿٧٠﴾ ہے، انہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا۔

تفسیر آیات

اس سورہ مبارکہ میں مشرکین کے جھگڑوں کا تیسری بار ذکر ہو رہا ہے۔ اس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سورہ ایسے حالات میں نازل ہوا ہے جب مشرکین نے طرح طرح کے شبہات اور الزامات کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔

ان مشرکین کو، جو الزامات عائد اور الکتاب قرآن کی تکذیب کرتے ہیں، بتایا جا رہا ہے: اَنّٰی يُصْرَفُوْنَ وہ کہاں پھرے جا رہے ہیں۔ یہ لوگ اپنی تباہی کی طرف جا رہے ہیں نیز ان کے انجام بد کے بارے میں فرمایا: فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ لوگ کس انجام بد سے دوچار ہونے والے ہیں۔

اِذِ الْاَغْلٰلُ فِیْۤ اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ ؕ يُسْحَبُوْنَ ﴿٧١﴾ ۷۱۔ جب طوق اور زنجیریں ان کی گردنوں میں ہوں گی، گھسیٹے جا رہے ہوں گے،

فِی الْحَمِيْمِ ۙ ثُمَّ فِی النَّارِ يُسْجَرُوْنَ ﴿٧٢﴾ ۷۲۔ کھولتے پانی کی طرف، پھر آگ میں جھونک دیے جائیں گے۔

تشریح کلمات

الْاَغْلٰلُ: (غ ل ل) طوق کے معنوں میں ہے۔

السَّلٰسِلُ: (س ل ل) سلسلة زنجیر کے معنوں میں ہے۔

يُسْجَرُوْنَ: (س ج ر) السجر زور سے آگ بھڑکانے کے معنوں میں ہے۔

تفسیر آیات

اپنے انجام بد کا انہیں اس وقت علم ہو جائے گا جب انہیں طوق اور زنجیروں میں جکڑ کر کھولتے پانی میں، پھر آتش جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔

ثُمَّ قِيْلَ لَهُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ﴿٧٣﴾ ۷۳۔ پھر ان سے پوچھا جائے گا: کہاں ہیں وہ جنہیں تم شریک ٹھہراتے تھے،

مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ ؕ قَالُوۡا ضَلُّوۡا عَنَّا بَلۡ لَّمۡ نَکُنۡ نَّدۡعُوۡا مِنۡ قَبۡلُ شَیۡئًا ؕ کَذٰلِکَ یُضِلُّ اللّٰہُ الۡکٰفِرِیۡنَ ﴿۷۴﴾

۷۴۔ اللہ کو چھوڑ کر؟ وہ کہیں گے: وہ تو ہم سے ناپید ہوگئے بلکہ ہم تو پہلے کسی چیز کو پکارتے ہی نہیں تھے، اسی طرح کفار کو اللہ گمراہ کر دیتا ہے۔

تفسیر آیات

جب یہ مشرکین عذاب میں مبتلا ہو جائیں گے، حقائق کھل کر ان کے سامنے آ جائیں گے اس وقت طنزیہ طور پر ان سے پوچھا جائے گا: کہاں ہیں تمہارے شریک معبود؟ وہ اعتراف کریں گے کہ ہم اوہام پرستی میں مبتلا تھے۔ جنہیں ہم پوجتے تھے آج پتہ چلا یہ غیر اللہ اپنا وجود تک نہیں رکھتے تھے۔ ہم دنیا میں ایک لا شیء کی پرستش کرتے تھے۔

ذٰلِکُمۡ بِمَا کُنۡتُمۡ تَفۡرَحُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ بِغَیۡرِ الۡحَقِّ وَ بِمَا کُنۡتُمۡ تَمۡرَحُوۡنَ ﴿۷۵﴾ۚ

۷۵۔ یہ (انجام) اس لیے ہوا کہ تم زمین میں حق کے برخلاف (باطل پر) خوش ہوتے تھے اور اس کا بدلہ ہے کہ تم اترایا کرتے تھے۔

اُدۡخُلُوۡۤا اَبۡوَابَ جَہَنَّمَ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا ۚ فَبِئۡسَ مَثۡوَی الۡمُتَکَبِّرِیۡنَ ﴿۷۶﴾

۷۶۔ جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ جس میں تم ہمیشہ رہو گے، تکبر کرنے والوں کا کتنا برا ٹھکانا ہے۔

تشریح کلمات

تَمۡرَحُوۡنَ: (م ر ح) المرح کے معنی ہیں بہت زیادہ اور شدید خوشی، جس میں انسان اترانے لگ جائے۔

تفسیر آیات

۱۔ یہ عذاب خود تمہارے اعمال کی وجہ سے ہے کہ تم اپنے باطل پر ناحق خوش ہوتے اور حق کو ناکام دیکھ کر خوشی حاصل کرنا چاہتے تھے بلکہ جہاں اہل حق کو کوئی دشواری پیش آتی یا ان پر ظلم ہوتا تو تم اس پر خوش ہوتے تھے۔

۲۔ وَ بِمَا کُنۡتُمۡ تَمۡرَحُوۡنَ: اور یہ عذاب اس وجہ سے ہے کہ تم دنیا میں اپنے باطل پر مگن تھے اور اس پر اتراتے بھی تھے۔ مجمع البیان میں ہے کہ تَفۡرَحُوۡنَ کو بِغَیۡرِ الۡحَقِّ کی قید کے ساتھ اور تَمۡرَحُوۡنَ

کو قید کے بغیر ذکر اس لیے فرمایا کہ فرح خوشی برحق بھی ہو سکتی ہے جب کہ مرح اترانا کسی بھی صورت میں برحق نہیں ہے۔

۲۔ ان کا خوشی منانا اور اترانا ان کے تکبر کی وجہ سے تھا اور اسی تکبر کی وجہ سے وہ جہنم میں ہمیشہ کے لیے داخل ہوں گے۔

فَاصۡبِرۡ اِنَّ وَعۡدَ اللّٰہِ حَقٌّ ۚ فَاِمَّا نُرِیَنَّکَ بَعۡضَ الَّذِیۡ نَعِدُہُمۡ اَوۡ نَتَوَفَّیَنَّکَ فَاِلَیۡنَا یُرۡجَعُوۡنَ﴿۷۷﴾

۷۷۔ پس آپ صبر کریں، یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے، اب انہیں ہم نے جو وعدہ (عذاب) دیا ہے اس میں سے کچھ حصہ ہم آپ کو (زندگی ہی میں) دکھا دیں یا آپ کو دنیا سے اٹھا لیں بہر حال انہیں ہماری طرف پلٹ کر آنا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ فَاصۡبِرۡ اِنَّ وَعۡدَ اللّٰہِ حَقٌّ: ان مشرکین کی خوشی منانے، اترانے، الزام تراشیوں اور بحث و جدال پر آپ صبر کریں۔ آپ کے ساتھ جو وعدۂ فتح ہے وہ برحق ہے۔

۲۔ فَاِمَّا نُرِیَنَّکَ بَعۡضَ الَّذِیۡ نَعِدُہُمۡ: جس عذاب کا ہم ان مشرکین سے وعدہ کر رہے ہیں اس کا کچھ حصہ آپ کو آپ کی زندگی میں دکھا دیں۔ آیت کے اس جملے کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورہ یونس آیت ۴۶۔

وَ لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلًا مِّنۡ قَبۡلِکَ مِنۡہُمۡ مَّنۡ قَصَصۡنَا عَلَیۡکَ وَ مِنۡہُمۡ مَّنۡ لَّمۡ نَقۡصُصۡ عَلَیۡکَ ؕ وَ مَا کَانَ لِرَسُوۡلٍ اَنۡ یَّاۡتِیَ بِاٰیَۃٍ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰہِ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَمۡرُ اللّٰہِ قُضِیَ بِالۡحَقِّ وَ خَسِرَ ہُنَالِکَ الۡمُبۡطِلُوۡنَ﴿۷۸﴾

۷۸۔ اور بتحقیق ہم نے آپ سے پہلے بہت سے رسول بھیجے ہیں، ان میں سے بعض کے حالات ہم نے آپ سے بیان کیے ہیں اور بعض کے حالات آپ سے بیان نہیں کیے اور کسی پیغمبر کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اللہ کے اذن کے بغیر کوئی معجزہ پیش کرے، پھر جب اللہ کا حکم آ گیا تو حق کے ساتھ فیصلہ کر دیا گیا اور اس طرح اہل باطل خسارے میں پڑ گئے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلًا مِّنۡ قَبۡلِکَ: اس آیت میں رسول اللہ ﷺ سے خطاب کر کے فرمایا: ہم نے آپ سے پہلے بھی بہت سے رسول بھیجے ہیں۔ ان میں سے بعض کا ہم نے آپ سے ذکر کیا ہے اور بعض کا ذکر نہیں کیا۔ قرآن میں مذکور یا غیر مذکور مرسلین کو بھی آپ کی طرح مسائل پیش آئے۔

پہلا مسئلہ یہ پیش آیا کہ ان کی اپنی قوم نے تکذیب کی، انہیں اذیت پہنچائی اور ان کے مشن کو ناکام بنانے کے لیے ہر حربہ استعمال کیا لیکن آخر میں ہمیشہ کامیابی رسولوں ہی کی رہی اور ان کے دشمن ناکام ہو گئے۔

۲۔ وَمَا کَانَ لِرَسُوۡلٍ اَنۡ یَّاۡتِیَ بِاٰیَۃٍ: کسی رسول کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اللہ کے اذن کے بغیر معجزہ پیش کرے۔ معجزے کی دو قسمیں ہیں: پہلا معجزہ وہ ہے جو رسول کو ابتدائی طور پر اپنی رسالت و نبوت کی تائید و تصدیق کے لیے اللہ کی طرف سے عنایت ہوتا ہے۔ دوسرا معجزہ وہ ہے جو اس ابتدائی معجزے کے علاوہ لوگوں کے مطالبے پر پیش کیا جاتا ہے۔

پہلی قسم کے معجزے کو نہ ماننے سے عذاب اور فوری فیصلہ نہیں آتا بلکہ انکار و کفر کے باوجود مہلت مل جایا کرتی ہے۔

جب کہ دوسری قسم، لوگوں کے مطالبے پر دکھائے جانے والے معجزے کا اگر لوگوں نے انکار کیا تو منکریں کو مہلت نہیں ملتی۔ اس آیت میں دوسری قسم کے معجزے کی طرف اشارہ ہے

۳۔ فَاِذَا جَآءَ اَمۡرُ اللّٰہِ قُضِیَ بِالۡحَقِّ: کہ جب مطالبے پر معجزہ آئے گا تو یہ معجزہ امر الٰہی کا فیصلہ لے کر آئے گا، پھر مہلت نہیں ملے گی۔ جیسے قوم صالح نے اونٹنی کا معجزہ طلب کیا۔ انکار پر اس قوم پر تباہی آ گئی اور نزول مائدہ کا مطالبہ ہوا تو جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنِّیۡ مُنَزِّلُہَا عَلَیۡکُمۡ ۚ فَمَنۡ یَّکۡفُرۡ بَعۡدُ مِنۡکُمۡ فَاِنِّیۡۤ اُعَذِّبُہٗ عَذَابًا لَّاۤ اُعَذِّبُہٗۤ اَحَدًا مِّنَ الۡعٰلَمِیۡنَ ۝[1]

میں یہ خوان تم پر نازل کرنے والا ہوں لیکن اگر اس کے بعد تم میں سے کوئی کفر اختیار کرے گا تو اسے میں ایسا عذاب دوں گا کہ اس جیسا عذاب عالمین میں کسی کو نہ دیا ہوگا۔

اَللّٰہُ الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الۡاَنۡعَامَ لِتَرۡکَبُوۡا مِنۡہَا وَ مِنۡہَا تَاۡکُلُوۡنَ ﴿۷۹﴾

۷۹۔ اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لیے چوپائے بنائے تاکہ تم ان میں سے بعض پر سواری کرو اور بعض کا گوشت کھاؤ۔

وَ لَکُمۡ فِیۡہَا مَنَافِعُ وَ لِتَبۡلُغُوۡا عَلَیۡہَا

۸۰۔ اور تمہارے لیے ان میں منفعت ہے اور تاکہ

---

[1] ۵ مائدہ: ۱۱۵

حَاجَةً فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ۝٨٠

تمہارے دلوں میں (کہیں جانے کی) حاجت ہو تو ان پر (سوار ہو کر) پہنچ جاؤ نیز ان پر اور کشتیوں پر تم سوار کیے جاتے ہو۔

تفسیر آیات

اللہ نے حیوانات انسان کے لیے مسخر بنائے ہیں۔ چنانچہ انسان حیوانات پر سواری کرتا ہے، باربرداری کا کام لیتا ہے۔ ان سے دودھ، گوشت حاصل کرتا ہے۔ ان کی کھال، اون اور گوبر تک سے فائدہ اُٹھاتا ہے۔ مشرکین اگر اللہ کو ان حیوانات کا خالق تسلیم کرتے ہیں تو اللہ کو مدبر بھی تسلیم کرنا پڑے گا چونکہ ان حیوانات کو اللہ نے جس انداز سے خلق فرمایا ہے اس میں تدبیر حیاتِ انسان ہے ورنہ خود حیوانات کے وجود سے لے کر ان میں موجود مذکورہ اشیاء یا تو انسانی کی زندگی کے کسی کام میں نہ آتیں یا انسانی زندگی کی ضروریات کے منافی ہوتیں۔

وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ ۖ فَاَيَّ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُنْكِرُوْنَ ۝٨١

۸۱۔ اور وہ تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے پس تم اس کی کن کن نشانیوں کا انکار کرو گے۔

تفسیر آیات

تمہارے گرد و پیش میں موجود ہزاروں کی تعداد میں موجود ایسی واضح نشانیوں کی اللہ نشاندہی فرماتا ہے جن سے تم غافل ہو اور ان آیات کو روز کا معمول تصور کر کے نظر انداز کرتے ہو لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے نشاندہی کے بعد تمہارے پاس انکار کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ پھر تم اللہ کی کس کس نشانی کا انکار کرو گے۔

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْهُمْ وَاَشَدَّ قُوَّةً وَّاٰثَارًا فِي الْاَرْضِ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝٨٢

۸۲۔ کیا وہ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ انہیں ان لوگوں کا انجام نظر آتا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں؟ وہ تعداد میں ان سے کہیں زیادہ تھے نیز طاقت اور زمین میں (اپنے) آثار چھوڑنے میں بھی ان سے زیادہ تھے، (اس کے باوجود) جو کچھ انہوں نے کیا وہ ان کے کچھ بھی کام نہ آیا۔

تفسیر آیات

درس عبرت حاصل کرنے کے لیے ارضی مطالعہ کو قرآن نہایت اہمیت دیتا ہے جس سے طاغوتوں اور ظالموں کے انجام کا بخوبی علم ہوتا ہے۔

اس آیت کی تشریح کے لیے سورہ روم آیت ۹ ملاحظہ فرمائیں۔

فَلَمَّا جَآءَتۡهُمۡ رُسُلُهُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ فَرِحُوۡا بِمَا عِنۡدَهُمۡ مِّنَ الۡعِلۡمِ وَ حَاقَ بِهِمۡ مَّا كَانُوۡا بِهٖ یَسۡتَهۡزِءُوۡنَ ﴿۸۳﴾

۸۳۔ پھر جب ان کے پیغمبر واضح دلائل کے ساتھ ان کے پاس آئے تو وہ اس علم پر نازاں تھے جو ان کے پاس تھا، پھر انہیں اس چیز نے گھیر لیا جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔

تفسیر آیات

۱۔ فَلَمَّا جَآءَتۡهُمۡ رُسُلُهُمۡ: تم سے پہلے گزرے ہوئے قوموں کی طرف علوم الٰہی کی گوہر فشانی کرنے کے لیے انبیاء علیہم السلام آئے اور جاہلیت کے اندھیروں میں علم کی روشنی پھیلائی۔ تاریک دلوں میں ابدی سعادت پر مشتمل ضیا پاشی کی تو اس علم کو بڑی حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا گیا۔ اس کا مذاق اڑایا اور اس علم کے حاملین کو حقیر سمجھا۔

۲۔ فَرِحُوۡا بِمَا عِنۡدَهُمۡ مِّنَ الۡعِلۡمِ: اور ان کے پاس جو سطحی علم ہے اس پر یہ بہت خوش ہیں:

یَعۡلَمُوۡنَ ظَاهِرًا مِّنَ الۡحَیٰوةِ الدُّنۡیَا ...۔[۱] لوگ تو دنیا کی ظاہری زندگی کے بارے میں جانتے ہیں۔

لیکن یہ لوگ حقائق سے آگہی نہیں رکھتے۔ مفروضوں کو علم کا نام دیتے، واہموں کو معلومات شمار کرتے اور اندھی تقلید کو دانشمندی سمجھتے ہیں۔

جدید جاہلیت میں بھی یہی صورت حال ہے کہ سائنسی باتیں خواہ ابھی تھیوری کے مرحلوں میں ہی کیوں نہ ہوں لوگوں میں علوم انبیاء علیہم السلام سے زیادہ قابل توجہ ہیں بلکہ دینی علوم کا مذاق اڑاتے ہیں۔ دینی علوم کے حاملین کو حقیر سمجھتے بلکہ دینی علوم کو علم ہی شمار نہیں کرتے انہیں ان پڑھ کہ دیتے ہیں جب کہ خود چند اجنبی کھوکھلی اصطلاحات کے علاوہ ہر گونہ علم سے فارغ ہوتے ہیں۔

۳۔ وَ حَاقَ بِهِمۡ مَّا كَانُوۡا بِهٖ یَسۡتَهۡزِءُوۡنَ: جس چیز کا وہ مذاق اڑاتے تھے اسی چیز نے انہیں گرفت میں لے لیا۔ وہ اسی دام میں پھنس گئے جسے وہ تسلیم نہیں کرتے تھے۔

---

[۱] ۳۰ روم: ۷

فَلَمَّا رَاَوۡا بَاۡسَنَا قَالُوۡۤا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحۡدَهٗ وَكَفَرۡنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشۡرِكِيۡنَ ﴿۸۴﴾

۸۴۔ پھر جب انہوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا تو کہنے لگے: ہم خدائے واحد پر ایمان لاتے ہیں اور جسے ہم اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے تھے اس کا انکار کرتے ہیں۔

فَلَمۡ يَكُ يَنۡفَعُهُمۡ اِيۡمَانُهُمۡ لَمَّا رَاَوۡا بَاۡسَنَا ؕ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيۡ قَدۡ خَلَتۡ فِيۡ عِبَادِهٖ ۚ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الۡكٰفِرُوۡنَ ﴿۸۵﴾

۸۵۔ لیکن ہمارا عذاب دیکھ لینے کے بعد ان کا ایمان ان کے لیے فائدہ مند نہیں رہے گا، یہ اللہ کی سنت ہے جو اس کے بندوں میں چلی آ رہی ہے اور اس وقت کفار خسارے میں پڑ گئے۔

تفسیر آیات

۱۔ فَلَمَّا رَاَوۡا بَاۡسَنَا: جب عذاب کا مشاہدہ ہو گا تو سارے پردے ہٹ چکے اور حقائق سامنے آ گئے ہوں گے اس وقت ایمان لانا ایک قہری بات ہو گی اگرچہ اس وقت اللہ کی وحدانیت پر یقین ہو گا اور ایمان بھی پختہ ہو گا لیکن یہ قہری ایمان ہے۔

۲۔ فَلَمۡ يَكُ يَنۡفَعُهُمۡ اِيۡمَانُهُمۡ: لیکن اس قہری ایمان کا کوئی فائدہ نہ ہو گا چونکہ اس ایمان کا تعلق اختیار سے نہیں۔ دنیا میں انسان ایمان کا انتخاب کرتا ہے اور کفر و ایمان میں سے ایمان کو اختیار و ارادے کے ساتھ قبول کرتا ہے لیکن عذاب کے مشاہدے کے بعد سوائے ایمان کے دوسری صورت نہیں ہے۔

۲۔ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيۡ: تمام بندوں کے لیے بلا استثنا اللہ کا یہ دستور رہا ہے کہ موت سامنے آنے اور عذاب کا مشاہدہ کرنے کے بعد نہ توبہ قبول ہو گی، نہ ایمان کا کوئی فائدہ ہو گا۔

مروی ہے:

> حضرت امام رضا علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے فرعون کا ایمان کیوں قبول نہیں کیا حالانکہ وہ اللہ پر ایمان لے آیا اور توحید کا اقرار کیا تھا؟ فرمایا: چونکہ وہ عذاب کا مشاہدہ کرنے کے بعد ایمان لایا تھا۔[1]

---

[1] تفسیر البرہان ۴: ۷۷۲

فہرست مطالب

سورۃ الاحزاب

تعارف سورۃ ۹

شان نزول ۱۱

کافروں اور منافقوں کی سازش کو ناکام بنانے
کے لیے اللہ کی راہنمائی اور توکل سے کام لیں۔

انسان کے سینے میں دو دل نہیں، ایک دل میں
محبت اور عداوت جمع نہیں ہو سکتیں ۱۲

جسے ماں کہہ بیٹھتے ہو وہ ماں نہیں ہوتی اور جسے
منہ بولا بیٹا بنایا ہو وہ بیٹا نہیں ہوتا ۱۴

تکیۂ کلام کے تحت کسی کو ماں، بہن کہنے میں
کوئی حرج نہیں ۱۵

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ کی طرف سے
حاکمیت مطلقہ حاصل ہے ۱۶

ازواج نبی مؤمنین کی مائیں ہیں ۱۷

وراثت، خونی رشتہ داروں میں اقربیت کی بنیاد
پر تقسیم ہوتی ہے ۱۸

تمام انبیاءؑ سے عہد لیا گیا ہے ۱۹

جنگ خندق (احزاب) کا واقعہ ۲۰

جنگ خندق میں مؤمنوں کی آزمائش ۲۴

منافقین اور ضعیف الایمان لوگوں کا کفریہ موقف ۲۴

یہ لوگ اسلام سے دور کفر کے نزدیک ہو چکے تھے ۲۶

ان لوگوں نے عہد شکنی کی ۲۷

ارادۂ الٰہی کے مقابلے میں کسی کا بس نہیں چلتا ۲۸

حالت جنگ میں بزدل اور حالت امن میں شیر
بننا نفاق کی علامت ہے ۳۱

حبط اعمال کا مسئلہ ۳۲

منافق کو مسلمانوں کی سرنوشت میں دلچسپی
ہوتی ہے ۳۳

رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے تمام گوشے
نمونۂ عمل ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے رسولؐ
کا کوئی عمل نسیان اور خطا سے سرزد نہیں ہوتا ۳۴

آزمائش کے وقت مؤمن کا ایمان پختہ ہو جاتا ہے ۳۵

اللہ کے ساتھ عہد پورا کرنے والوں کا ذکر ۳۸

احزاب کے لشکر نامراد واپس گئے ۴۰

عہد توڑنے والے بنی قریظہ کا انجام ۴۱

بنی قریظہ کے یہود کی جائداد غنیمت میں ملنے
پر ازواج کی توقعات اور اس کا جواب ۴۳

ازواج رسولؐ کے لیے نصیحت ۴۵

قدیم جاہلیت کی مانند نکلنے سے
ازواج کو منع کیا گیا ۴۷

آیت تطہیر کی تفسیر، لفظ اہل کے استعمالات ____ ۴۸
اہل البیت کے تعیّن کا واحد طریقہ ____ ۴۹
سنت رسولؐ کی صراحت سے اہل البیت کا تعین ۵۱
مخالف روایتیں اور ان کی رد ____ ۵۲
احاطۂ خانہ کے اندر احاطۂ چادر یا گھر کے اندر گھر ۵۴
اہل البیت کے تعین میں دواہم دلائل ____ ۵۷
شش ماہہ دورانیہ ____ ۵۸
اہل البیت کے متعین کے دیگر مواقع ____ ۵۹
سیاق وسباق ____ ۶۰
سیاق اور سنت ثابتہ ____ ۶۲
ہمارا فہم مقدم ہے یا
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا؟ ____ ۶۳
اعمال صالحہ کے ثواب میں مرد وزن میں
اللہ کے ہاں کوئی امتیاز نہیں ہے ____ ۷۰
اللہ اور رسولؐ کے فیصلے پر اپنا فیصلہ مقدم کرنے
والا صریح گمراہی میں ہے ____ ۷۱
حضرت زینب بن جحش کو زید بن حارثہ کی
طلاق کا واقعہ ____ ۷۲
زید بن حارثہ کی غلامی وآزادی کا واقعہ ____ ۷۳
زینب بنت جحش کا رسولؐ سے نکاح کا راز ____ ۷۴
ازدواج کا یہ عمل سیرت انبیاء علیہم السلام کے مطابق ہے ۷۵
تبلیغ احکام کے لیے کسی سے خائف نہ ہونا
چاہیے صرف اللہ کا خوف ہونا چاہیے ____ ۷۶
ختم نبوت کا اعلان ____ ۸۷
رسول خاتم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد نبوت کی ضرورت
کیوں نہیں؟ اس کا مفصل جواب ____ ۷۸
کیا ثابت شریعت متغیر انسان کی قانونی ضروریات
پوری کرسکتی ہے؟ اس کا مفصل جواب ____ ۷۹
ثابت انسان ____ ۷۹
متحرک قوانین ____ ۸۰
اللہ کو کثرت سے یاد کرنے کا حکم ____ ۸۳
مؤمنین پر اللہ رحمت بھیجتا ہے اور فرشتے ان
کے لیے دعا کرتے ہیں ____ ۸۴
موت سے لے کر جنت میں داخل ہونے تک ہر
مرحلے میں اللہ کی طرف سے سلام سلام ہوگا ____ ۸۶
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان رسالت کا ذکر ____ ۸۷
مؤمنین کے لیے اللہ کی طرف سے فضل کبیر
کی بشارت دینے کا حکم ____ ۸۹
ہم بستری سے پہلے طلاق کی صورت میں
عدت نہیں ہے ____ ۹۱
ان خواتین کا ذکر جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
کی زوجیت میں آسکتی ہیں ____ ۹۳
زوجات کی تعدد میں پنہان راز ____ ۹۳
زوجات کے ساتھ روش کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
کو اختیار دے دیا ____ ۹۴
زوجات کی تعداد میں اضافہ اور تبدیلی
ممنوع ہوگی ____ ۹۶
رسول اللہؐ کے ہاں جانے کے آداب
کا بیان اور حکم حجاب ____ ۹۷
پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود کا حکم ____ ۱۰۱
نبیؐ پر درود بھیجنے کے فضائل ____ ۱۰۲
درود کے الفاظ ____ ۱۰۳
کعب بن عجرہ کی صحیح روایت ____ ۱۰۳
ابومسعود انصاری کی صحیح روایت ____ ۱۰۴

ابو سعید خدری اور ابو ہریرہ کی صحیح روایت ____ ۱۰۵
طلحہ بن عبید اللہ کی صحیح روایت ____ ۱۰۶
زید بن خارجہ کی صحیح روایت ____ ۱۰۷
بریدہ خزاعی کی معتبر روایت ____ ۱۰۸
عبدالرحمٰن بن بشر انصاری کی صحیح روایت ____ ۱۰۸
عبداللہ بن جعفر کی صحیح روایت ____ ۱۰۸
ازواج پر درود کی روایت کا جواب ____ ۱۰۹
ناقص درود ____ ۱۱۰
آل محمد کون ہیں؟ ____ ۱۱۱
آل پر درود نظریاتی موقف ____ ۱۱۵
آل پر درود عملی موقف ____ ۱۱۶
آل پر درود شعار رافضہ ہے ____ ۱۱۶
تشہد میں درود واجب ہے ____ ۱۲۳
اللہ اور رسول کو اذیت دینے والوں پر لعنت ____ ۱۲۵
مؤمنین و مومنات پر بہتان لگانا گناہ عظیم ہے ____ ۱۲۶
حجاب کا حکم ____ ۱۲۷
منافقین، بیمار دل اور افواہ سازوں کو ملک بدر
کرنے کی دھمکی ____ ۱۲۹
اللہ تعالیٰ کی تکوینی سنت ناقابل تبدیل ہے ____ ۱۳۰
اپنے سرداروں کی اطاعت میں گمراہ ہونے
والوں کی حسرت کا بیان ____ ۱۳۲
رسول اللہ ﷺ کو اذیت دینے والوں
سے خطاب ____ ۱۳۳
زبان کو لگام دینا تقویٰ ہے ____ ۱۳۴
انسان نے بار امانت اٹھایا ____ ۱۳۵
کائنات کا نظام صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ
میں ہے ____ ۱۴۱
زمین میں جانے اور زمین سے نکلنے
والی چیزوں کو صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے ____ ۱۴۲
اعادہ حیات کے لیے منتشر ذرات کا جمع کرنا
اللہ کے لیے مشکل نہیں ہے ____ ۱۴۴
منکرین قیامت کا جواب ____ ۱۴۶
حضرت داؤد علیہ السلام کی سلطنت کا ذکر ____ ۱۴۸
حضرت علیہ السلام کو زرہ سازی کا حکم ____ ۱۴۹
حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے ہوا کے مسخر ہونے
کا ذکر ____ ۱۵۰
حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے تسخیر جن کا ذکر ____ ۱۵۱
حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کا ذکر ____ ۱۵۳
ملک سبا (یمن) کی سرسبزی ____ ۱۵۵
بند ٹوٹنے سے سیلاب کی تباہی کا ذکر ____ ۱۵۶
ملک یمن کی آبادیوں کا ذکر ____ ۱۵۷
ناشکری پر قوم سبا کو تباہ کر دیا ____ ۱۵۹
ابلیس کی طرف سے جبر نہیں ہو سکتا وہ صرف
دعوت دیتا ہے ____ ۱۶۰
رزق دینے میں کل کائنات کو دخل ہے۔ صرف
اللہ تعالیٰ یہ کام کر سکتا ہے ____ ۱۶۳
ہر ایک اپنے عمل کا جوابدہ ہے، فیصلہ قیامت
کے دن ہوگا ____ ۱۶۴
رسول اللہ ﷺ کی رسالت محدود نہیں، عالمی ہے ۱۶۵
قیامت کا وقت مقرر ہے ____ ۱۶۷
منکرین قرآن، قیامت کے دن سردار اور مرید
کفر کی ذمہ داری ایک دوسرے پر ڈالیں گے ____ ۱۶۹
مراعات یافتہ طبقات ہمیشہ حق کے خلاف ڈٹ
جاتے ہیں ____ ۱۷۱

مؤمن نہ ہو تو مال اولاد سے اللہ کی قربت نہیں
ملتی۔ البتہ اگر مؤمن ہے تو یہ دونوں ذرائع خیر
بن جاتے ہیں ______ ۱۷۳
جو اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے اللہ اس کی جگہ
اسے مزید مال عنایت فرماتا ہے ______ ۱۷۵
مشرکین کے معبود قیامت کے دن انکار کریں گے
کہ ہم ان کے معبود تھے ______ ۱۷۶
مشرکین وحی کو مانتے ہیں نہ رسول کو، نہ کسی کتاب
کو، صرف قومی روایات اور اندھی تقلید کو مانتے ہیں ۱۷۸
اہل عرب کی پسماندگی کا ذکر ______ ۱۷۹
مشرکین کو انفرادی و اجتماعی طور پر غور وفکر سے
کام لینے کی ہدایت ______ ۱۸۰
رسول اللہ ﷺ نے اجر رسالت مانگا ہے مگر
یہ خود لوگوں کے مفاد میں ہے ______ ۱۸۱
حق کے آنے کے بعد باطل کا کوئی کردار نہ ہوگا ۱۸۲
جب عذاب سامنے آجائے تو ایمان فائدہ مند
نہیں ہے ______ ۱۸۴

سورۃ فاطر

فرشتوں کے بارے میں چند حقائق ______ ۱۹۰
اللہ کی عنایت کوئی روک نہیں سکتا اور اللہ کے عذاب
کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔ خالق ہی رازق اور معبود
ہوتا ہے ______ ۱۹۳
دنیا سے دھوکہ نہ کھانے اور شیطان کو دشمن سمجھنے
کا حکم ______ ۱۹۴
اللہ ناقابل ہدایت کو گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے
ہدایت کے اہل کو ہدایت سے نوازتا ہے ______ ۱۹۶
عزت کا سرچشمہ اللہ کی ذات ہے، ایمان اور
عمل صالح میں عزت ہے ______ ۱۹۸
انسان کی تخلیق اور تقدیر کا ذکر ______ ۲۰۰
شیرین پانی اور سمندر کا کھارا پانی ایک لحاظ سے
ایک جیسے نہیں تاہم دونوں سے نظام حیات قائم ہے ۲۰۱
جس کے قبضے میں لیل ونہار، شمس وقمر ہیں وہی
مالک ہے۔ دوسرے کسی چیز کے مالک نہیں ہیں ۲۰۳
تمہارے معبود تمہارے کسی کام نہیں آئیں گے
باخبر اللہ کے علاوہ تمہیں کوئی قیامت کی خبر
نہیں دے گا ______ ۲۰۳
ہر شخص اپنے گناہ کا بوجھ خود اٹھائے گا
کوئی دوسرا نہیں اٹھائے گا۔ ایمان سے روشنی،
بصارت، زندگی ملتی ہے ______ ۲۰۸
زمین کبھی حجت خدا سے خالی نہیں رہی ______ ۲۱۰
مخلوقات میں تنوع اللہ کی صناعیت کی دلیل ہے
اور عالم وہ ہے جس کا علم خوف خدا کا باعث بنے ۲۱۲
ایسی تجارت کی نشاندہی جس میں خسارا ممکن نہیں ۲۱۴
اس امت کے تین گروہوں، ظالم، میانہ رو
اور سابق کا ذکر ______ ۲۱۷
اس آیت کے شان نزول کا ذکر ______ ۲۱۸
سابقین بالخیرات کی منزلت کا ذکر ______ ۲۱۹
کافروں کے عذاب کا ذکر ______ ۲۲۱
انسانی نسلوں کو جانشین بنانے کا ذکر ______ ۲۲۳
مشرکین کے پاس اپنے نظریات پر کوئی دلیل
نہیں ہے ______ ۲۲۴
کائنات کا وجود اور بقاء دونوں اللہ کے
محتاج ہیں ______ ۲۲۵

تکبر اور بری چال خود انسان کی تباہی
کے اسباب ہیں ____ ۲۲۷

سورة یٰسٓ

تعارف سورة ____ ۲۳۳
حروف یاسین کی تفسیر ____ ۲۳۵
رسول ﷺ کی رسالت کے اثبات کے لیے
قرآن کی قسم کا راز ____ ۲۳۶
علی صراط مستقیم کی تفسیر ____ ۲۳۶
رسول اللہ ﷺ کی قوم کی تنبیہ نہیں ہوئی،
تنبیہ کنندہ آیا تھا ____ ۲۳۷
جن پر دلیل و برہان اثر نہیں کرتا وہ ایمان نہیں
لائیں گے کیونکہ ان سے اللہ نے ہاتھ اٹھا لیا ہے ۲۳۹
انسان کی اپنی زندگی میں بجا لائے جانے والے
اور اپنے بعد چھوڑ جانے والے اعمال
اللہ تعالیٰ ثبت فرماتا ہے۔ امام مبین کی تفسیر
درشان امیر المؤمنین علیہ السلام ____ ۲۴۴
کسی بستی کی طرف بھیجے گئے رسولوں اور ان کی
تکذیب کا ذکر ____ ۲۴۶
ان رسولوں کی تصدیق وحمایت کرنے والے
مؤمن کا ذکر ____ ۲۴۹
مؤمن آل یاسین اپنے ایمانی موقف پر دلیل
پیش کرتا ہے ____ ۲۵۲
مؤمن آل یاسین کو شہادت کے بعد جنت کی نوید ۲۵۳
مؤمن آل یاسین کو شہید کرنے والی قوم پر
عذاب کا نزول ____ ۲۵۴
رسولوں کا مذاق اڑانے والوں کے انجام کا ذکر _ ۲۵۵

اللہ تعالیٰ مردہ زمین سے روزی نکال کر تمہارے
مردہ خلیوں کو دوبارہ زندہ کر کے تجدید حیات
کرتا ہے۔ پھر بھی تم معاد کے منکر ہو ____ ۲۵۶
کائنات کا نظام جفت پر قائم۔ خود اللہ کا
کوئی جفت نہیں ہے ____ ۲۵۸
دن رات کا آنا جانا تدبیر الٰہی کا نشان ہے ____ ۲۵۹
سورج اپنی منزل کی طرف محو سفر ہے ____ ۲۶۰
صفحہ آسمان پر چاند اللہ کی طرف سے ایک
تدبیر وتقویم ہے ____ ۲۶۱
شمس وقمر میں سے ہر ایک اپنے مدار کو نہیں
چھوڑ سکتا ____ ۲۶۲
اللہ تعالیٰ نے حمل ونقل کے وسائل فراہم کیے _ ۲۶۳
دولت کی وجہ سے دولت مند لوگ پیمانے
بدلا دیتے ہیں ____ ۲۶۵
قیامت کا علم صرف اللہ کے پاس ہے جو دفعۃً
واقع ہوگی ____ ۲۶۶
دوسرا صور پھونکنے پر سب زندہ ہو جائیں گے ___ ۲۶۷
قبر سے اٹھانے پر مردوں کا ردعمل ____ ۲۶۸
اہل جنت کے زندگی بسر کرنے کے حالات ____ ۲۷۰
قیامت کے دن مجرموں کو الگ
دھتکار دیا جائے گا ____ ۲۷۲
اہل جنت کا ارادہ نافذ ہوگا ____ ۲۷۲
شیطان پرستی نہ کرنے کے عہد کا تذکر ____ ۲۷۳
عقل سے کام نہ لینے والے، شیطان کے
دام میں پھنستے ہیں ____ ۲۷۴
قیامت کے دن اعضائے بدن گواہ بن
جائیں گے ____ ۲۷۵

انسان کی زندگی ہر لمحے اللہ کے اختیار میں ہے ___ ۲۷۷
عمر رسیدہ ہونے کی صورت میں توانائی
ختم ہو جاتی ہے ___ ۲۷۸
قرآن شعری تخیلات نہیں ہے بلکہ یقینیات پر
مشتمل برہان اور دستور حیات ہے ___ ۲۷۹
انسان کی زندگی کو وہ ذات چلا رہی ہے جس
نے ان مویشیوں کو اس کے لیے مسخر کیا ہے ___ ۲۸۱
مشرکین ایسے معبودوں کی پوجا کرتے ہیں جو اپنی
حفاظت کے لیے لوگوں کے محتاج ہیں ___ ۲۸۲
حق کے داعی کو دشمن کا طعنہ نقصان نہیں
پہنچا سکتا ___ ۲۸۲
خاک سے خلق ہونے والا انسان سوال کرتا ہے
کہ انسان خاک سے ہونے کے بعد کیسے زندہ
ہو سکتا ہے؟ وہ یہ بھول گیا کہ اس کا وجود خاک
کا مرہون ہے ___ ۲۸۳
اعادۂ حیات، عدم سے حیات ایجاد کرنے
سے آسان تر ہے ___ ۲۸۴
لا متناہی کائنات بنانے والی ذات کے لیے
اعادۂ حیات کوئی مشکل کام نہیں ہے ___ ۲۸۵
اللہ کا ارادہ نافذ ہوتا ہے۔ خلق و ایجاد کے لیے
صرف ایک ارادہ کافی ہے ___ ۲۸۷

سورۃ الصافات
تعارف سورۃ ___ ۲۹۱
اللہ اپنے کارندے فرشتوں کی قسم کھا کر اپنی
توحید کا اعلان فرماتا ہے۔ ستارے صرف آسمان
اول سے مربوط ہیں ___ ۲۹۴
ان ستاروں کے ذریعے شیاطین کو
بھگایا جاتا ہے ___ ۲۹۵
انسان کی ابتدائی تخلیق اور اعادۂ تخلیق دونوں
کا تعلق مٹی سے ہے ___ ۲۹۶
اے رسولؐ! آپ اعادۂ حیات کے انکار پر
تعجب کرتے ہیں اور مشرکین اس کا مذاق
اڑاتے ہیں ___ ۲۹۷
مشرکین مٹی میں دوبارہ زندگی آنا ناممکن سمجھتے
ہیں۔ جواب میں فرمایا: نہ صرف ممکن ہے بلکہ اس
کے لیے صرف ایک جھڑکی کافی ہے ___ ۲۹۸
منکرین کو جہنم کی طرف لے جانے کے حکم کا ذکر ۳۰۰
لوگوں کو روک کر ان سے ولایت علی علیہ السلام
کے بارے میں سوال ہوگا ___ ۳۰۱
قیامت کے دن کافروں کے باہمی جھگڑوں
کا ذکر ___ ۳۰۳
کافروں کے لیے عذاب کا ذکر ___ ۳۰۵
اللہ کے مخلص بندوں کے لیے خوشخبری اور
نعمتوں کا ذکر ہے ___ ۳۰۷
ایک جنتی، دنیا میں اپنے کافر ساتھی کا ذکر کرے
گا اور اس کافر کو وسط جہنم میں دیکھ لے گا ___ ۳۱۰
مؤمن کا احساس کامیابی کا ذکر اور عمل کی دعوت ۳۱۲
جہنمیوں کے لیے درخت زقوم کا ذکر ___ ۳۱۳
انبیاء علیہم السلام کی تاریخ پر ایک طائرانہ نظر ___ ۳۱۵
حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر ___ ۳۱۶
حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر ___ ۳۱۸
حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بت شکنی کا ذکر ___ ۳۲۳
آتش نمرود سے نجات کا ذکر

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت کا ذکر ۳۲۴
حضرت اسماعیل علیہ السلام کی پیدائش کا ذکر ۳۲۵
حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی کا ذکر ۳۲۶
حضرت اسحاق علیہ السلام کی ولادت کا ذکر ۳۳۱
حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر ۳۳۲
حضرت الیاس علیہ السلام کا ذکر ۳۳۴
بنی اسرائیل کی بعل پرستی کا ذکر ۳۳۴
آل یاسین (آل محمد) پر سلام کا ذکر ۳۳۶
حضرت لوط علیہ السلام کا ذکر ۳۳۷
حضرت یونس علیہ السلام کا ذکر ۳۳۸
فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دینے والوں
سے سوال ۳۴۲
اللہ کے نزدیک فرشتوں کا مقام ۳۴۵
اللہ کا لشکر غالب آنے کی نوید ہے۔ لشکر اور جہاد
کی صورت میں یہ وعدہ ہے، دشمن کے لشکر میں
جانے کی صورت میں وعدہ نہیں ۳۴۷

سورۃ صٓ
تعارف سورہ ۳۵۳
کافروں کو اپنے میں سے ایک رسول کے
آنے اور کئی معبودوں کی جگہ ایک معبود قرار
دینے پر تعجب ہو رہا تھا ۳۵۶
اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا جواب ۳۵۸
مشرکین کی شکست کی پیشگوئی ۳۵۹
تاریخ میں تکذیبی اقوام کا ذکر ۳۵۹
حضرت داوٗد علیہ السلام کا ذکر ۳۶۱
حضرت داوٗد علیہ السلام کے پاس دو متنازعین
کا فیصلے کے لیے آنے کا ذکر ۳۶۲
حضرت داوٗد علیہ السلام کی خلافت کا ذکر ۳۶۵
اللہ نے کائنات کو عبث خلق نہیں کیا کہ مؤمن
اور مفسد، متقی اور فاجر میں کوئی فرق نہ ہو ۳۶۶
حضرت سلیمان علیہ السلام کا اپنے گھوڑوں کا معاینہ ۳۶۸
کرسی پر ایک جسد ڈال کر سلیمان علیہ السلام کا امتحان ۳۷۰
حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کی توجیہ ۳۷۱
حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے ہوا اور شیاطین کی
تسخیر کا ذکر ۳۷۲
حضرت ایوب علیہ السلام کی آزمائش اور بیماری کا ذکر ۳۷۴
حضرت ایوب علیہ السلام پر اللہ کے احسانات کا ذکر ۳۷۵
حضرات ابراہیم، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کا ذکر ۳۷۶
حضرات اسماعیل، الیسع اور ذوالکفل علیہم السلام کا ذکر ۳۷۷
متقین کا مقام ۳۷۸
سرکشوں کے انجام کا ذکر ۳۸۰
سرکشوں کا ایک دوسرے پر الزام ۳۸۱
جہنمیوں کا اپنے مخالفین جہنم میں نظر نہ
آنے پر تعجب ۳۸۲
قرآن، کلمۂ توحید کی عظمت کا ذکر ۳۸۵
ابلیس کو مہلت مل جاتی ہے اور ابلیس اپنے عزائم
کا اعلان کرتا ہے ۳۸۷
اللہ تعالیٰ ابلیس اور ابلیسیوں کی سزا کا اعلان
فرماتا ہے ۳۸۸
قرآن کی عالم گیری کی پیشگوئی ۳۸۹

سورۃ زمر
تعارف سورہ ۳۹۳

دین خالص صرف اللہ کے لیے ہے، مشرکین
بتوں کو وسیلہ سمجھ کر ان کی پوجا کرتے ہیں ____ ۳۹۵
اللہ کے لیے بیٹا ہونا ممکن نہیں ہے ____ ۳۹۶
شب و روز کی گردش اور شمس و قمر کی تسخیر کا ذکر ۳۹۷
انسانی تخلیقی مراحل کا ذکر ____ ۳۹۸
اللہ کفر کو ناپسند اور شکر کو پسند کرتا ہے ____ ۴۰۰
مؤمن کو خوف اور امید کے درمیان ہونا چاہیے _ ۴۰۲
جاننے والے نہ جانتے والوں کے برابر
نہیں ہوسکتے ____ ۴۰۳
تقویٰ خیر الدنیا والآخرہ ہے ____ ۴۰۴
رسول اللہ ﷺ کو اپنی ذمہ داری بیان کرنے
کا حکم ____ ۴۰۵
اللہ کی بندگی نہیں کرتے تو جس کی چاہو
بندگی کرو ____ ۴۰۶
صرف اللہ کی بندگی کرنے والے سنتے سب کی
ہیں پھر انتخاب حسن کی بصیرت رکھتے ہیں۔
ان کے لیے بشارت ____ ۴۰۷
اللہ کا فیصلہ اٹل ہونے کے بعد عفو کے دروازے
بند ہو جاتے ہیں ____ ۴۰۹
بارش اور زمین کی نباتات میں موجود
اللہ کی نشانیوں کا ذکر ____ ۴۱۱
جس کے سینے میں اسلام کے لیے کشادگی ہو
اسے اللہ نور عطا کرتا ہے ____ ۴۱۲
دلوں پر قرآن کے اثرات کا ذکر ____ ۴۱۴
مشرک کی بے سکونی اور مؤحد کے
سکون کا ذکر ____ ۴۱۷
قیامت کے دن اللہ کے سامنے مقدمے پیش
ہوں گے سب سے پہلا مقدمہ
حضرت علی علیہ السلام کا ہوگا ____ ۴۱۸
سچائی پیش کرنے اور اس کی تصدیق کرنے
والے کا ذکر، یعنی رسولؐ و علیؑ ____ ۴۱۹
ایمان و تصدیق تمام گناہوں کا کفارہ ہے ____ ۴۲۰
جسے اللہ گمراہ کرے اسے کوئی ہدایت نہیں دے
سکتا اور جسے اللہ ہدایت دے اسے کوئی
گمراہ نہیں کرسکتا ____ ۴۲۱
مشرکین کے معبودوں کے بے حقیقت ہونے
کا ذکر ____ ۴۲۲
مشرکین کی نابودی کی پیشگوئی ____ ۴۲۳
خواب اور قبض روح کا ذکر ____ ۴۲۵
شفاعت بتوں کے پاس نہیں، سب شفاعتیں
اللہ کے پاس ہیں ____ ۴۲۷
ذکر خدا کو ناپسند کرنے والا مشرک ہے خواہ
اپنے آپ کو کتنا مؤمن سمجھے ____ ۴۲۲۸
قیامت کے دن منکر بالفرض پوری دنیا کے
دو برابر فدیہ میں دے دے قبول نہ ہوگا ____ ۴۲۹
ان لوگوں کا ذکر جو تنگی کے وقت اللہ کو یاد کرتے
ہیں آسودگی ملنے پر کہتے ہیں یہ میری اپنی مہارت
کی وجہ سے ملی ہے ____ ۴۳۰
اللہ تعالیٰ کسی کو رزق دے کر کسی کو تنگی میں رکھ
کر آزماتا ہے ____ ۴۳۱
اللہ کی رحمت سے مایوسی کفر۔ توبہ کی صورت
میں بلا استثنا سب گناہ معاف ہو جائیں گے
(یغفر الذنوب جمیعاً) ____ ۴۳۴
قیامت کی حسرتوں سے پہلے قرآن کی تعلیمات

بر عمل ____ ۴۳۶
تمام خزانوں کی کنجیاں اللہ کے پاس ہیں ____ ۴۴۰
اے رسولؐ! اگر آپ بھی شرک کریں تو آپ کا
عمل برباد ہوگا ____ ۴۴۱
لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی قدردانی کا حق ادا
نہیں کیا ____ ۴۴۳
دومرتبہ صور پھونکنے کا ذکر ____ ۴۴۴
قیامت کے دن نامۂ اعمال پیش کیے جائیں
گے انبیاءؑ اور گواہوں کو حاضر کیا جائے گا ____ ۴۴۵
کافروں کو جہنم کی طرف ہانکنے اور ان سے
سوال کا ذکر ____ ۴۴۷
اہل تقویٰ گروہ درگروہ جنت کی طرف چلائے
جائیں گے اور سلام سے ان کا استقبال ہوگا ____ ۴۴۸
جنت میں داخل ہونے پر اہل جنت حمد الٰہی بجا
لائیں گے ____ ۴۴۹
عرش کے گرد فرشتوں کا ذکر ____ ۴۵۰

سورة غافر

تعارف سورة ____ ۴۵۵
قرآن نازل کرنے والی ذات کے چند اہم
اوصاف کا ذکر ____ ۴۵۷
رسول ﷺ کو کفار کی اوچھل کود سے متاثر
نہ ہونے کا حکم ____ ۴۵۸
ہر امت کی اپنے اپنے رسول کے ساتھ
بدسلوکی کا ذکر ____ ۴۵۹
حاملین عرش کی طرف سے مؤمنین
کے لیے دعاؤں کا ذکر ____ ۴۶۱
قیامت میں مؤمن کی شفاعت، صالح اولاد،
اولاد کی صالح باپ دادا شفاعت کریں گے ____ ۴۶۲
قیامت کے دن کافروں کی آرزوئے نجات
کا ذکر ____ ۴۶۴
اللہ کی نشانیوں میں اہم نشانی آسمان سے روزی
کا نزول ہے ____ ۴۶۶
وحی، روح حیات ہے ____ ۴۶۷
قیامت کے دن صرف اللہ کی بادشاہی ہوگی ____ ۴۶۸
قیامت کی ہولناکی بیان کرنے کا حکم ____ ۴۶۹
حضرت موسیٰؑ کا ذکر ____ ۴۷۱
فرعون حضرت موسیٰؑ کو قتل کرنا چاہتا تھا ____ ۴۷۲
مؤمن آل فرعون اور افضلیت علی علیہ السلام
کا ذکر ____ ۴۷۵
مؤمن آل فرعون کی نصیحتوں کا ذکر ____ ۴۷۶
مؤمن آل فرعون، حضرت یوسفؑ کی
رسالت کا ذکر کرتے ہیں ____ ۴۷۸
مؤمن آل فرعون اب اپنا ایمان ظاہر کرتے ہیں ۴۸۱
مؤمن آل فرعون ایمان کی دعوت دیتے ہیں ____ ۴۸۲
آل فرعون کے لیے برزخی عذاب کا ذکر ____ ۴۸۴
اہل جہنم کے مکالمے ____ ۴۸۵
اہل جہنم کی جہنم کے کارندوں سے درخواست ____ ۴۸۶
رسولوں اور مؤمنوں کو اللہ کی طرف سے وعدۂ
نصرت، نصرت کی توضیح ____ ۴۸۷
رسول اللہ ﷺ کو صبر کا حکم اور وعدہ کے
حق ہونے کی تاکید ____ ۴۸۹
رسول ﷺ کو اللہ کی پناہ میں آنے کا حکم اور
یہ نوید کہ متکبرین زیر ہونے والے ہیں ____ ۴۹۰

کائنات کی تخلیق انسان کی دوبارہ تخلیق سے
عظیم تر ہے ____________ ۴۹۱
دعا کا حکم، قبولیت کا وعدہ اور قبولیت دعا میں حائل
رکاوٹوں کا ذکر ____________ ۴۹۳
شب و روز کی گردش خلق کرنے والا ہی
تمہارا رب ہے ____________ ۴۹۵
زمین کی تخلیق کی نوعیت سے اللہ کی ربوبیت
اور مدبریت واضح ہو جاتی ہے ____________ ۴۹۶
انسان کا رب وہ ہے جس نے انسان کی بہترین
صورت گری فرمائی ____________ ۴۹۷
اللہ سے مانگنے اور غیر خدا سے نہ مانگنے کا حکم __ ۴۹۸
منکرین کے عذاب کا ذکر ____________ ۴۹۹
معجزہ اللہ کے اذن سے ہوتا ہے مطالبے پر معجزہ
آنے کی صورت میں انکار پر فوری
عذاب آتا ہے ____________ ۵۰۳
حیوانات کی تخلیق میں اللہ کی تدبیری
نشانیاں ہیں ____________ ۵۰۴
لوگوں نے انبیاء علیہم السلام کی پیش کردہ واضح دلیل
ٹھکرا کر اپنے سطحی واہمے کو علم سمجھا۔ پھر وہ اپنے
مذاق کے دام میں پھنس گئے ____________ ۵۰۵
کافر عذاب کا معائنہ کرنے کے بعد ایمان
لے آئیں گے لیکن یہ ایمان انہیں کوئی
فائدہ نہیں دے گا ____________ ۵۰۷